احمد شاہ ابدالی

ایک تاریخی ناول

رئیس احمد جعفری

AMINIA MUSLIM GIRLS SEC. SCHOOL
A. No. 78
Date 1.9.90
2687
LIBRARY

حسن برادرز ○ چوک انارکلی، لاہور

SULTAN HUSAIN & SONS, BOOKSELLERS

جملہ حقوق محفوظ

بار چہارم سنہ ۱۹۶۲ء

قیمت فی جلد [redacted] روپے

ریاض ہمایوں نے نقوش پریس لاہور سے چھپوا کر احسن برادرز
لاہور سے شائع کی۔

ر۔ع۔ قریشی کے نام!

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دُوسرا نہیں ہوتا

[illegible]

[illegible]

[illegible]

پیش لفظ

احمد شاہ ابدالی ایثار، بے لوثی اور قربانی کا پیکر تھا۔ وہ ایک طوفان کی طرح اٹھا سیلِ رواں کی طرح آیا اور مرہٹہ امپائر کے خوابِ شیریں کو درہم برہم کر کے جہاں سے آیا تھا وہیں واپس چلا گیا۔ اُس نے ہندوستان کی سرزمین پر ایک فاتح اور کشور کُشا کی حیثیت سے قدم رکھا۔ بڑی بڑی طاقتیں اس کے مقابلہ میں سینہ سپر ہوئیں لیکن بالآخر انھیں سرنگوں ہونا پڑا۔ وہ جب اس دیس میں آیا تو اُس نے سب کی تابِ مقاومت چھین لی۔ سب کو اطاعت پر مجبور کر دیا۔ دِلّی کا مغلِ اعظم اس کے دامن میں پناہ لے چکا تھا۔ اودھ کا شجاع الدولہ اس کی یکتائی کا سکّہ مان چکا تھا۔ فرخ آباد کے احمد خاں بنگش بریلی کے حافظ رحمت خاں، نجیب آباد کے نجیب الدولہ کو اس پر فخر تھا کہ وہ ابدالی کے وابستگانِ دامنِ دولت میں شمار ہوتے ہیں۔ مرہٹہ حکومت دم توڑ چکی تھی ہندوستان کے دوسرے ہندو راجہ دست بستہ اور مؤدّب اس کے حضور میں حاضر تھے اور اصرار کر رہے تھے کہ ہندوستان کی حکومت قبول فرمائیے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ ہندوستان کے تخت کا مالک اور وارث شاہ عالم بنگالہ کی سرزمین پر اپنی الجھنوں میں گھرا ہُوا تھا۔ احمد شاہ ابدالی بڑی آسانی سے سارے ہندوستان کا فرماں روا بن سکتا تھا لیکن اس نے یہ اسند ٹھکرا دی، یہ موقع کھو دیا۔ یہ جنگ مسلمانانِ ہند کی سربلندی کے لئے وہ لڑا تھا اس مقصد میں کامیاب ہونے کے بعد وہ خاموشی سے اپنے ملک واپس چلا گیا۔

اس ناول میں احمد شاہ ابدالی کے بارے میں جتنے واقعات لکھے ہیں وہ تقریباً سب کے سب صحیح اور مستند ہیں۔ احمد شاہ ابدالی کی اگر میں تاریخ لکھتا تو بھی مجھے اتنی ہی

محنت کرنی پڑتی اور اتنی ہی کتابوں کا مطالعہ کرنا پڑتا جتنا اس ناول کے سلسلہ میں کرنا پڑا۔ یہ ناول میں نے صرف ایک مقصد کے ماتحت لکھا ہے ——— اقبالؒ کے الفاظ میں:۔

کبھی اے نوجواں مُسلم تدبّر بھی کیا تُو نے!
وہ کیا گردوں تھا تو جس کا ہے اک ٹوٹا ہُوا تارا

اس کے پڑھنے سے مسلمانوں کو معلوم ہوگا کہ وہ کیا تھے اور پڑھنے کے بعد محسوس کریں گے کہ وہ کیا ہیں؟ اگر یہ مقصد پورا ہوگیا تو میں سمجھوں گا میں نے اپنا کام کر لیا۔

شادم از زندگیٔ خویش کہ کارے کردم!

ناول میں احمد شاہ ابدالی کے خاص خاص کارناموں کا جہاں میں نے ذکر کیا ہے تاریخی کتابوں کا حوالہ دے دیا ہے۔ ناول کا آخری باب لکھنے کے بعد ایک دوست کی وساطت سے ایک نایاب کتاب تک میری رسائی ہوئی۔ یعنی......

یہ انگریز مصنّف ایک اور بہترین تاریخی کتاب "مفتاح التواریخ" کا بھی مؤلف ہے۔ یہ کتاب ۱۸۸۱ء میں THE ASIATIC SOCITY OF BENGAL کی زیر سرکردگی مُرتّب ہوئی اور پارک اسٹریٹ کلکتہ سے شائع ہوئی۔ اس کتاب میں احمد شاہ ابدالی کی زندگی پر ایک اجمالی لیکن جامع نظر ڈالی گئی ہے۔ ذیل میں اس کا ترجمہ پیش کرتا ہوں یہ خاکہ اس ناول کے بہترین پس منظر کا کام دے گا:۔

"احمد شاہ ابدالی کو عام طور پر احمد شاہ دُرّانی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے یہ ایک

افغانی قبیلہ کے سردار کا لڑکا تھا جس کا وطن ابدالی تھا۔ ہرات سے بالکل قریب، بچپن ہی میں نادر شاہ درّانی نے اسے گرفتار کر لیا۔ رفتہ رفتہ ترقی کر کے یہ اس کی فوج کا سردار بن گیا اس کے بعد نادر شاہ قتل کر دیا گیا۔ احمد شاہ ابدالی نے اس واقعہ کے فوراً بعد ازبک قبیلہ کی مدد سے ایرانی افواج پر حملہ کر دیا۔ لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔ پھر تیزی کے ساتھ قندھار کی طرف بڑھا اور شہر پر قبضہ کر لیا۔ ساتھ ہی ساتھ ایک بہت بڑے خزانہ کو بھی چھین لیا، جو کابل اور سندھ سے شاہِ ایران (نادر شاہ درّانی) کی خدمت میں بھیجا گیا تھا۔ اسی روپے سے ابدالی نے اپنی حکومت کی بنیاد مستحکم کر لی اور رفتہ رفتہ اتنی قوت حاصل کر لی کہ آس پاس کی چھوٹی چھوٹی حکومتوں نے سرِ اطاعت خم کر دیا۔ ابدالی نے صرف قندھار اور کابل پر اکتفا نہیں کیا بلکہ بڑھتا ہوا پشاور اور لاہور تک پہنچ گیا۔ پھر اس نے ہندوستان کے پایۂ تخت دِلّی کا رُخ کیا۔ ۱۷۴۸ء کے آغاز میں وہ لاہور سے آگے بڑھا۔ محمد شاہ (رنگیلے) اتنا بیمار تھا کہ میدانِ جنگ کا رُخ نہ کر سکا۔ اس نے اپنے اکلوتے بیٹے احمد شاہ کو ایک بڑی فوج دے کر ابدالی سے مقابلہ کے لئے بھیجا۔ فوج کی کمان وزیر قمر الدین خاں اور گورنر اودھ صفدر جنگ کے ہاتھ میں تھی۔ دوسرے بڑے بڑے سردار بھی ہمراہ تھے۔ سرہند کے قریب دونوں فوجوں میں کچھ عرصہ تک جھڑپیں ہوتی رہیں۔ ۱۱ مارچ ۱۷۴۸ء کو قمر الدین خاں اپنے خیمہ میں بیٹھے تھے کہ اچانک توپ کا ایک گولہ آ کر گرا اور وہیں ڈھیر ہو گئے۔ اس حادثہ نے مغل فوج پر سراسیمگی طاری کر دی لیکن جنگ بہر حال جاری رہی۔ آتش باری سے طرفین کے بہت سے لوگ مجروح اور ہلاک ہو گئے۔ اب ابدالی نے یا تو بددل ہو کر یا وقتی کامیابی سے خوش ہو کر پیچھے ہٹنے کا فیصلہ کیا اور واپس چلا گیا۔

۱۷۵۷ء میں وہ پھر حملہ آور ہوا اور دِلّی و آگرہ تک بڑھتا ہوا چلا گیا۔ اس مرتبہ

اُس نے متھرا کو خوب پامال کیا اور وہاں کے باشندوں پر دھاک بٹھا کر واپس قندھار چلا گیا۔
۱۷۵۹ء میں مرہٹہ طاقت بہت بڑھ گئی اور ہندوستان کے ہر گوشہ تک اس کا
اثر پہنچ گیا۔ تب نجیب الدولہ روہیلہ سردار اور شجاع الدولہ نواب اودھ سے بہت سے
ہندو راجواڑوں کی تائید سے جو مرہٹوں کی دست درازیوں اور سفاکیوں سے تنگ آ
چکے تھے۔ ابدالی سے درخواست کی کہ وہ دِلّی کے تخت پر قبضہ کر لے۔ ساتھ ہی ساتھ ان
لوگوں نے ہر قسم کی رفاقت اور اعانت کا وعدہ کیا۔

ابدالی بڑھا، مرہٹوں سے لاہور چھین لیا اور بغیر کسی رکاوٹ کے دریائے انڈس
پار کر لیا اور اس وقت تک نہیں رُکا جب تک دِلّی کے سامنے نہ پہنچ گیا۔

مرہٹوں کو اُس نے چھوٹی چھوٹی جھڑپوں میں اُلجھائے رکھا۔ آخر کار ۱۷۶۱ء میں اس
نے مرہٹوں کی فوجی طاقت کا خاتمہ کر کے لازوال شہرت اور ناموری حاصل کر لی۔

اس فتح کے بعد ابدالی اپنے ملک واپس چلا گیا۔ جانے سے پہلے اُس نے شاہ عالم
کی بادشاہت تسلیم کر لی جو اس وقت بنگال میں مقیم تھا۔ نیز اس نے شجاع الدولہ اور
دوسرے سرداروں کو مجبور کیا کہ وہ شاہ عالم سے سرتابی کا ارادہ بھی نہ کریں۔

۲۶ سال حکومت کرنے کے بعد وہ صرف پچاس سال کی عمر میں (۱۷۷۲ء) انتقال
کر گیا۔ اس کا بیٹا تیمور شاہ جانشین ہُوا۔ ابدالی کا مقبرہ اب بھی زیارت گاہِ خلائق بنا ہُوا ہے"

کئی مہینہ کی رہروی کے بعد قلم کا مسافر آج ۸ ستمبر ۱۹۵۲ء کو منزلِ مقصود پر پہنچ کر دم لیتا ہے
یعنی آگے چلیں گے دم لے کر!

رئیس احمد جعفری

باب (۱)

محل سرا

نواب نجم الدولہ دِتی کے اُن چلے رئیسوں میں تھے ، بے اندازہ دولت کے مالک ، ایک بہت بڑی جاگیر کے پشتہاپشت سے وارث ، دربارِ شاہی کے ممتاز متوسلین میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ بڑے آزاد طبع اور وارفتہ مزاج شخص تھے ، درباری سازشوں سے متنفر ، خوشامد اور چاپلوسی سے بے زار ، نہ کسی کی بُرائی میں نہ بھلائی میں ، سب سے الگ تھلگ اپنی شاندار محلسرا میں پڑے رہتے تھے ، کبھی ترنگ میں آ گئے تو محلسرا سے اُٹھ کر جاگیر کے دورے پر روانہ ہو گئے ، وہاں سیر و شکار سے جی بہلایا ، لوگوں کا دُکھ درد سُنا مصیبت زدوں اور دُکھیاروں کی مدد کی ، اور پھر اپنے مرکز پر واپس آ گئے۔

نجم الدولہ ، زندگی کی ساٹھ بہاریں دیکھ چکے تھے۔ تابڑ توڑ کئی لڑکے ہوئے داغِ مفارقت دے گئے۔ صرف ایک لڑکی زندہ بچی ، ماہ طلعت —— بس یہی لڑکی اُن کی آنکھوں کی ٹھنڈک ، اور دل کا سکون تھی ، وہ اس لڑکی کے باپ بھی تھے اور ماں بھی ، ان کے سینہ میں جو دل دھڑک رہا تھا ۔ وہ ماں کا دل تھا۔ انھوں نے ساری زندگی ماہ طلعت کی تربیت اور نگہداشت پر صرف کر دی ۔ دوسری شادی کے لئے لوگوں نے اصرار کیا

دوستوں نے زور ڈالا، عزیزوں نے کمندیں پھینکیں لیکن نجم الدولہ کی نہیں کو ہاں سے کوئی نہ بدل سکا۔

اور ماہ طلعت تھی بھی اسی محبت کے لائق، وہ واقعی چاند کا ٹکڑا تھی، حُسنِ صورت میں لاجواب، حُسنِ سیرت میں بے مثل، اس کی عمر مشکل سے ۱۸ سال کی ہو گی، لیکن وہ ہر چیز میں برق تھی۔ فنونِ خانہ داری اور فنونِ سپہ گری، دونوں کی ماہر، عربی اور فارسی کی تمام متداول کتابیں اس کی نظر سے گذر چکی تھیں۔ قرآن و حدیث کا دورہ بھی وہ سبقاً سبقاً پورا کر چکی تھی۔ فقہ کی نصابی کتابیں بھی اس نے پڑھ ڈالی تھیں۔ عربی فارسی کے صدہا بہترین اشعار اسے زبانی یاد تھے۔ ہر روز نمازِ فجر کے بعد، تھوڑی دیر تک وہ ماہ طلعت کی قرأت سنتے، اس کی آواز میں ایسا سوز اور لہجہ میں ایسا گداز تھا کہ قرأت سنتے ہی اُن کی بڑی بڑی اور روشن آنکھوں میں آنسو جھلمل جھلمل کرنے لگتے جیسے شفاف کٹوری میں کہکشاں کا عکس۔ نغمہ و موسیقی سے بھی ماہ طلعت کو خاص دلچسپی تھی۔ قدرت نے اس کے گلے کو کچھ ایسا جادو، اور آواز کو کچھ ایسا رس عطا کیا تھا کہ اپنی ہمجولیوں کے جھرمٹ میں جب کبھی وہ کوئی مدھر گیت مدھم سُروں اور ہلکی تانوں میں گاتی، تو گو اس کی آواز بارہ دری کی سرحد سے باہر نہ نکلتی، لیکن زمین کی گردش رُک جاتی، سورج آسمان سے جھانکنے لگتا، اور ناہیدِ فلک کو شرم سے پسینہ آ جاتا۔

فنونِ سپہ گری کا جہاں تک تعلق ہے، تیر اندازی، شمشیر زنی اور نیزہ بازی میں بھی وہ فرد تھی۔ کبھی کبھی ایک بڑے احاطہ کے اندر جس کی دیواروں کی بلندی آسمانوں سے باتیں کرتی تھی۔ اپنی سہیلیوں کے ساتھ وہ چوگان کی مشق بھی کر لیتی تھی، یہ کھیل وہ ایسا

اچھا کھیلتی تھی کہ ہمیشہ سب سے بازی لے جاتی۔

محل سرا کے پائیں باغ میں، سنگ مرمر کی ایک خوب صورت بارہ دری تھی۔ ارد گرد سبزہ نورستہ کا فرش، سامنے ایک خوبصورت سی نہر جس کے صاف شفاف پانی میں رنگ برنگ کی مچھلیاں تیرا کرتیں۔ کبھی غوطہ لگاتیں تو تہہ تک پہنچ جاتیں، کبھی ابھرتیں تو سطح آب پر مچلنے لگتیں۔ ایک دن کا واقعہ ہے، ماہ طلعت اُدھر سے گزری، کچھ دیر تک مچھلیوں کا تماشہ دیکھتی رہی، پھر آہستہ آہستہ قدم بڑھاتی، بارہ دری میں پہنچ گئی۔ ہمراز اور دمساز سہیلیاں ساتھ تھیں، وہ آکر چپ چاپ بیٹھی اور کچھ سوچنے لگی۔

کچھ دیر بعد ماہ طلعت نے اپنی ہنس کی سی گردن اوپر اٹھائی اور گلشن سے پوچھا "صنوبر نہیں نظر آئی کئی دن سے؟"

گلشن نے دست بستہ عرض کیا۔ "جب سے اُن کی شادی ہوئی ہے، وہ تو ایک کہانی بن کر رہ گئی ہیں اور مجھے تو اندیشہ ہوتا ہے کچھ عرصہ بعد کہیں بھولا ہوا افسانہ بکر نہ رہ جائیں!"

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ نسیم بہار کی طرح بل کھاتی صنوبر آگئی۔ اُسے دیکھ کر ماہ طلعت مسکرا دی اور کہنے لگی۔ "بڑی عمر ہے تمہاری، ابھی تمہارا ہی ذکر ہو رہا تھا!"

صنوبر بڑی حاضر جواب اور منہ چڑھی سہیلی تھی۔ جھٹ سے بولی۔ "میں قربان۔ ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اِس محفل میں ہے!"

ماہ طلعت نے کہا۔ "گلشن کہہ رہی تھی، صنوبر تو اب ایک کہانی بن کر رہ گئی ہے!"

گلشن فوراً بولی۔ "ہاں سرکار، کہانی، اور وہ بھی بہت مختصر، بس سہ حرف تھی — خام بدم، پختہ شدم، سوختم۔ پہلے یہ ہری بھری کونپل تھیں، پھر شاخ نشیمن بنیں، اور اب

حکومت کرے؟"

ماہ طلعت کی آواز تیز ہوگئی۔ اُس نے کہا۔ "ہاں، ہماری بادشاہت خطرے میں ہے۔ ہماری قوم خطرہ میں گھری ہوئی ہے، قوم کے اندر سکت نہیں کہ وہ اس خطرہ کو ٹال سکے۔ بادشاہت کو اپنی رنگ رلیوں سے اتنی فرصت نہیں کہ وہ خطرہ کی اہمیت کو سوچ بھی سکے!"

صنوبر نے دانتوں تلے اُنگلی دبالی، اور آہستہ سے کہا۔ "خاموش ——— دیوار ہم گوش دارد، یہ الفاظ محلسرا سے باہر پہنچ کر غضب ڈھا سکتے ہیں!"

ماہ طلعت نے ایک بپھری ہوئی شیرنی کی طرح گرج کر کہا۔ "میں چاہتی ہوں، یہ الفاظ اِس محلسرا سے باہر پہنچیں، میں چاہتی ہوں، جہاں پناہ سے لے کر ہرادنے سے ادنے مسلمان کے کان، ان باتوں کو سُن لیں، یہ الفاظ اگر اب نہ سُنے گئے، تو کب سُنے جائیں گے؟ کیا اُس وقت جب اُن کا سُننا بے کار ہوگا؟ وقت ہاتھ سے نکل چکا ہوگا؟!"

صنوبر مبہوت بیٹھی سُنتی رہی۔ کچھ نہ بولی، ماہ طلعت نے کچھ دیر خاموش رہ کر بڑے جوش کے ساتھ صنوبر کو مخاطب کیا۔

"تمہاری ابھی ابھی شادی ہوئی ہے، میں جانتی ہوں تمہارے دولہا آصف زماں کتنے بہادر اور شجاع ہیں۔ وہ تمہیں کتنا چاہتے ہیں۔ تم اُن سے محبت کرتی ہو لیکن اگر تمہیں اپنے مذہب سے اور اپنی قوم سے محبت ہے، تو یہ ذاتی محبت تمہیں ٹھکرانی پڑے گی۔ تم آصف زماں سے کہو کہ وہ اپنی گردن کٹانے کے لئے تیار ہو جائیں۔ ہم اپنا سہاگ قوم پر نثار کرنے کا فیصلہ کر لیں، مرہٹوں کا طوفان، جنوبی ہند

جل بھن کر کوئلہ بنتی جا رہی ہیں۔ کیوں بی صنوبر، میں نے کچھ غلط تو نہیں کہا؟"

صنوبر نے جل کر تیکھے انداز میں جواب دیا۔ "میں تو جیسی تھی ویسی ہی ہری بھری ہوں۔ لیکن ماہ طلعت کے لب تبسم سے آشنا نہ ہوئے۔ وہ گلشن کی باتیں سنتے سنتے کسی گہری سوچ میں غرق ہو گئی۔ کھوئی کھوئی سی معلوم ہو رہی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد سب سہیلیاں ادھر ادھر ہو گئیں۔ خالی صنوبر بیٹھی رہ گئی۔ ماہ طلعت کو اس نے خاموش دیکھ کر کہا۔ "خیریت تو ہے؟ کیا سوچنے لگیں آپ؟"

ماہ طلعت نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر نظر اوپر اٹھائی اور کہا۔ "ویسے تو گلشن پگلی ہے۔ لیکن اس وقت بڑے پتہ کی بات کہہ گئی، اس نے تمہارے بارے میں جو کچھ کہا، وہ تو خیر مذاق تھا لیکن، کیا ہماری قوم کے لئے وہ ایک حقیقت نہیں ہے؟"

صنوبر کا مسکراتا ہوا چہرہ، ماہ طلعت کی باتیں سن کر سنجیدہ ہو گیا۔ اس پر خاموشی طاری ہو گئی۔ اس نے پھر ہمت کی اور کہا۔ "ہماری قوم، اس دیس کی حکمران ہے، صدہا برس سے اس کی قوت و شوکت کا ڈنکا بج رہا ہے، اس پر کیا آنچ آ سکتی ہے؟ اسے کون سا خطرہ درپیش ہے؟"

ماہ طلعت اور زیادہ سنجیدہ ہو گئی۔ اس نے کہا۔ "یہ نہ کہو صنوبر ——— ہاں اس دیس کے ہم حکمراں ہیں لیکن میری آنکھیں دیکھ رہی ہیں، کہ ہماری بساطِ حکومت اٹھائی جا رہی ہے۔ صدہا برس سے واقعی ہماری قوت و شوکت کا ڈنکا بج رہا ہے، لیکن اب اس کی آواز مدھم پڑتی جا رہی ہے، اور وہ جلد آنے والا ہے جب یہ آواز بالکل نہیں سنائی دے گی۔ خطرہ سر پہ آ پہنچا اور اب خدا ہی اسے روک سکتا ہے!"

صنوبر سہم گئی، اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ "خطرہ ہماری قوم کو؟ ہماری

سے دِلّی کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اِس طوفان کی لہریں اس سے پہلے بھی کئی دفعہ دِلّی کی فصیلوں سے ٹکرا چکی ہیں لیکن اس مرتبہ اس کا رنگ کچھ اور ہے، اگر اُسے نہ روکا گیا تو ہماری بادشاہت، ہماری قومی عظمت، تنکے کی طرح بہہ جائے گی اور ہم کچھ نہ کر سکیں گے آصف خاں سے پوچھنا، کیا وہ اِس کے لئے تیار ہیں؟ تم اپنا دل ٹٹولو، اور بتاؤ، کیا برداشت کر لوگی، ان باتوں کو؟"

نہ جانے کیوں صنوبر جواب دینے کے بجائے مسکرا دی، ماہ طلعت نے پوچھا۔ "یہ باتیں اتنی بے حقیقت ہیں کہ تم مُسکرا رہی ہو؟"

صنوبر پھر مُسکرا دی اور بولی۔ "میں حقیقت کی تہہ تک پہنچ گئی، لیکن اگر بے ادبی نہ ہو تو ایک بات پوچھوں؟"

ماہ طلعت نے کہا۔ "شوق سے پوچھو!"

صنوبر نے شریر نظروں سے ماہ طلعت کو دیکھا، اور بڑی سادگی سے کہا، "خیرات گھر سے شروع ہوتی ہے میری سرکار!"

ماہ طلعت نے حیرت سے صنوبر پر نظر ڈالی اور کہا۔ "کیا مطلب؟ — میں سمجھی نہیں!"

صنوبر نے جواب دیا۔ "کنیز کا مطلب یہ ہے کہ فیروز بخت اگر یہ وعظ سُن لیتے، تو فوراً مُرید ہو جاتے اور ابھی تلوار لے کر میدانِ جہاد میں کود پڑتے —"

اور پھر وہ مُسکرانے لگی!

ماہِ طلعت کا چہرہ شرم سے سُرخ ہو گیا، فیروز بخت ماہ طلعت کا خالہ زاد بھائی تھا نواب دبیر الملک کا اکلوتا اور چہیتا بیٹا، صورت میں لاجواب، سیرت میں انتخاب، تلوار کا دھنی، بات کا پکّا۔ دونوں ایک دوسرے کو چاہتے تھے لیکن دل ہی دل میں، کیا

مجال ہے جو کبھی بشرے، یا بات چیت سے کسی کے دل کا چور باہر آیا ہو، لیکن ـــ تاڑنے والے قیامت کی نظر رکھتے ہیں! ـــــ کچھ آنکھیں تھیں، جو ان دونوں کے دلوں کو دھڑکتا دیکھ رہی تھیں، کچھ کان تھے، جو دو دلوں کی دھڑکن لگاتار سُنتے رہتے تھے، صنوبر ماہ طلعت کی بڑی چہیتی سہیلی تھی، دونوں ایک دوسرے کی ہمدم و ہمراز تھیں۔ اُس نے لاکھ لاکھ ماہ طلعت کا دِل ٹٹولا، لیکن ایک حرف بھی اپنے خیال کی تائید میں نہ کھلا سکی۔ ماہ طلعت نے کبھی اقرار نہ کیا کہ وہ فیروز بخت سے محبت کرتی ہے۔ لیکن صنوبر نے ہار نہ مانی، وہ اپنے خیال پر جمی رہی، موقع موقع سے طعن کے تیر پھینکتی رہتی آج بھی یہی ہُوا۔

ماہ طلعت نے ذرا چڑتے ہُوئے کہا۔ "تم اپنی شرارت سے باز نہیں آؤ گی، فیروز بخت کو وعظ و تلقین کی ضرورت نہیں، وہ حضرت شاہ ولی اللہ کے عقیدت کیشوں میں سے ہیں، شاہ صاحب کو اُن کی ذات سے بڑی امیدیں ہیں، جو کچھ تم نے سُنا، انہی کے بول تھے، جو میں نے دُہرائے، ورنہ میں گھر کی رہنے والی ان تمام باتوں کو کیا جانوں؟ اب تو روز فجر کی نماز کے بعد ہمارے ہاں قرآن شریف کا ترجمہ بھی سُناتے ہیں، تم نے دیکھا نہیں امی حضور کتنی پابندی سے نماز پڑھنے لگی ہیں؟"

صنوبر نے عارفانہ انداز میں گردن ہلائی اور کہا۔ "اوہ میں سمجھی، میں سمجھ گئی، ـــــ تُو پہنچا کہاں سے ہے کہاں سلسلۂ درازِ عشق!

ماہ طلعت نے صنوبر کے مُنہ پر ہاتھ رکھ دیا، اور کہا۔ "ہشت پگلی کہیں کی، خبردار جو آگے کہا کچھ!

صنوبر مسکرانے لگی۔ اُس نے ماہ طلعت کا ہاتھ اُٹھاتے ہوئے کہا۔
میری زبان بند کر سکتی ہو۔ لیکن آنکھیں ـــــــ؟ کیا ان کی روشنی بھی چھین لو گی؟ یہ براہِ راست دل میں اترتی ہیں اور جا کر تہہ کی خبر لاتی ہیں، تم مجھے جھٹلا سکتی ہو، میری آنکھوں کو نہیں جھٹلا سکتیں!"

ماہ طلعت نے کہا۔ "تو بھی جھوٹی اور یہ تیری آنکھیں بھی جھوٹی؟"

مجلس برخاست

باب (۲)

ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات

کہتے ہیں ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات ــــــــ یہ مثل فیروز بخت پر بالکل صادق آتی تھی، وہ فطرت کی طرف سے کچھ عجیب اور انوکھی طبیعت لے کر آیا تھا بچپن ہی سے وہ اپنے مزاج، کردار، سیرت اور گفتار کے لحاظ سے ایک انفرادی شان رکھتا تھا۔ اُس نے بڑی سے بڑی سزا بھگت لی۔ لیکن جھوٹ کبھی نہیں بولا۔ اُس نے انجان اور مظلوم کی حمایت میں بڑے سے بڑے دوست کو، بڑے سے بڑا دشمن بنالیا اور ذرا پروانہ کی۔ حق بات کہنے کے جرم میں بارہا اُسے خاندان کے بزرگوں کی زجر و توبیخ کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن اپنے رویّہ پر وہ سختی سے قائم رہا۔

جب اُس نے جوانی کی سرحد میں قدم رکھا، تو اُس کے انوکھے پن نے سب کو حیرت میں ڈال دیا۔ اس کے ساتھی رنگ رلیوں میں زندگی بسر کر رہے تھے، یہ نواب زادے اور امیر زادے ۔ دن چوسر اور گنجفہ، تاش اور شطرنج میں صرف کرتے تھے رات کو شرابیں پیتے، نغمہ و موسیقی، اور رقص و سرود کی محفلیں برپا کرتے۔ مہینے میں کئی کئی بار، نئی نئی نوخیز اور الھڑ دوشیزاؤں پر عاشق ہوگئے، کامیابی حاصل کرنے کے لئے تھیلیوں کے منہ

کھول دیتے، اور کامیاب ہونے کے بعد در ماہے اور دشیقے مقرر کر کے انہیں داشتہ بنا لیتے۔ رات کی تاریکی میں، فانوس کی روشنی میں، وہ اُن کے ساتھ کھیل کھیلتے، ان کے غمزہ و عشوہ سے لطف لیتے۔ ان کے خنجرِ ابرو، اور شمشیرِ نگاہ سے گھائل ہوتے اُن کی زلفِ گرہ گیر کے اسیر ہوتے، اُن کی ایک ایک جاں ستاں ادا پر سو جان سے نثار ہوتے، اور صبح ہوتے ہوتے بساطِ نشاط اُلٹ کر پھر اپنی حویلی اور محل سرا میں پہنچ جاتے یہاں وہی خوشامدی مصاحبوں کی حاضر جوابیاں اور نکتہ سنجیاں، لطیفے اور فقرے، لہو و لعب، اور نت نئی اسکیمیں، یہ نوجوان امراء اپنی سرمستیوں، اور عیش پرستیوں پر پانی کی طرح روپیہ بہاڈالتے تھے پہلے گھر کا اندوختہ ختم ہوتا، پھر رہن، بیع اور قرض کا لامتناہی سلسلہ شروع ہوجاتا۔ غرض زندگی اسی ڈھرّے پر گزری چلی جارہی تھی —— صبح ہوتی تھی —— شام ہوتی تھی —— عمر یونہی تمام ہوتی تھی —— اور فیروز بخت؛

وہ اپنے ساتھیوں سے بالکل جدا زندگی بسر کر رہا تھا، رقص و موسیقی تو خیر بڑی چیز ہے، اُسے سیر و شکار تک سے کوئی خاص لگاؤ نہیں تھا۔ وہ نماز کا سختی سے پابند تھا، روزے پابندی سے رکھتا تھا، محلّے کے غریبوں اور اپاہجوں کی خدمت میں کافی وقت صرف کرتا تھا، نہ جانے کتنی بیوائیں تھیں، اپنے جیب خرچ سے، مخفی طور پر جن کی مدد کرتا تھا، نہ جانے کتنے یتیم تھے، جو اُس کی اولوالعزمی کی بدولت، عیش و آرام کی زندگی بسر کر رہے تھے، وہ خیرات اس طرح کرتا تھا کہ دوسرے ہاتھ کو خبر نہیں ہوتی تھی، صرف وہی جانتا تھا کہ کن لوگوں کا وہ کفیل ہے۔

فیروز بخت کے یہ "لچھن" دیکھ کر دبیر الملک کو بڑی مایوسی ہوتی۔ فیروز بخت کی عمر میں یعنی اپنی نوجوانی کے دور میں وہ کئی ناجائز لڑکیوں اور لڑکوں کے باپ بن چکے تھے

شہر کی طوائفوں اور کنچنیوں کے حلقہ میں کنہیا مانے جاتے تھے۔ کون سا ڈیرا ایسا تھا، جو ان کے قدم کی برکتوں سے سرفراز نہ ہو چکا ہو۔ باپ دادا کی جمع کی ہوئی دولت کا بڑا حصہ جوانی چڑھتے ہی انہوں نے ختم کر ڈالا تھا اور ایک یہ نالائق فیروز بخت تھا، جو زندگی کی ۲۲ بہاریں دیکھ چکا تھا، لیکن جانتا ہی نہیں تھا۔ دُنیا کیا ہوتی ہے؟ دُنیا کی رنگینیاں کیسی ہوتی ہیں؟ عیش و تنعم کی زندگی کیونکر بسر کی جاتی ہے؟ مولویوں کی سی ڈاڑھی، مولویوں کی سی وضع قطع، اُنہی کے سے طور طریقے بھلا اُسے میرے گھر میں پیدا ہونا چاہیئے تھا؟ اس کے ہم عمروں کو دیکھو زندگی کا لطف لُوٹ رہے ہیں، اسے دیکھو ملائے مسجد بنا ہُوا ہے، اپنے تئیں اس کا باپ کہلاتے مجھے تو شرم آتی ہے۔ اگر امراؤ دُوسا کے لڑکے ایسے دُنیا بیزار ہوں تو چل چکا دُنیا کا کاروبار، مغرور اتنا ہے کہ وزیرِ اعظم سے ملنا چاہتا ہے، نہ جہاں پناہ کی خدمت میں باریاب ہوتا ہے، جب تک میں زندہ ہوں۔ یہ کچھ نہ کچھ بن بھی سکتا ہے، میری آنکھیں بند ہونے کے بعد نہ دیوانِ خاص میں اُس کی رسائی ہو سکے گی، نہ دیوانِ عام میں۔

یہی سوچتے سوچتے، دبیر الملک نے ملازم کو آواز دی، وہ دست بستہ سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ دبیر الملک نے گرجدار آواز میں کہا۔ "فیروز بخت کو بلاؤ!"

"ابھی تھوڑی دیر ہُوئی خانقاہ تشریف لے گئے ہیں!"

خانقاہ کا لفظ سُن کر، دبیر الملک چونک پڑے، حیرت سے آنکھیں کُھلی کی کُھلی رہ گئیں، حواس مجتمع کر کے پُوچھا۔ "خانقاہ؟ کون سی خانقاہ؟ .... کیا اب وہ حضرت شاہ ولی اللہ کے ہاں جانے لگا ہے؟"

ملازم نے ادب کے ساتھ عرض کیا۔ جی وہیں! ..... وہ تو شاہ صاحب سے

بیعت بھی کر چکے ہیں!"

نواب دبیر الملک پر یہ منحوس خبر سُن کر بجلی گر پڑی۔

"کیا کہا؟ ——— بیعت کر چکے ہیں؟ یعنی مرید ہو چکے ہیں، حضرت شاہ صاحب کے؟

"جی! سُنا تو یہی ہے!"

دبیر الملک کے لئے یہ بڑا کٹھن وقت تھا حضرت شاہ ولی اللہ کا نام سُن کر ان کی زبان بند ہو گئی۔ شاہ صاحب کے زہد و اتقا، بزرگی، اور للہیّت کا لوہا، مسلمان تو مسلمان کافر تک مانتے تھے، اِس بارگاہ میں جانے والے کو ڈانٹنا، ایسی مقدس اور قابلِ احترام شخصیّت سے ارادت رکھنے والے پر اعتراض کرنا بڑے دِل گُردے والے کا کام تھا اور دبیر الملک کا دِل گردہ اگرچہ بہت بڑا تھا ——— لیکن اتنا بڑا نہیں کہ وہ حضرت شاہ صاحب کے خلاف کوئی لفظ زبان سے نکال سکتے، دِل ہی دِل میں پیچ و تاب کھا کر رہ گئے۔

اور عین اس وقت جب دبیر الملک فیروز بخت کے بارے میں پوچھ گچھ کر رہے تھے، وہ حضرت شاہ صاحب کے حضور میں بیٹھا آنسو بہا رہا تھا۔ ابھی ابھی شاہ صاحب نے، دُنیائے دُوں کے رذائل، انسانیت کے فرائض اور مردِ مومن کی ذمہ داریوں اور قرآن و حدیث کی روشنی میں ایک دل گداز اثر آفریں تقریر ارشاد فرمائی تھی حضرت شاہ صاحب کے فیضِ صحبت سے فیروز بخت کی رقّتِ قلب بڑھ گئی تھی، اِس تقریر کے آئینہ میں جب ایک نظر اُس نے اپنے وجود پر ڈالی تو بے ساختہ آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ اُس نے شاہ صاحب کا پائے مُبارک پکڑ لیا اور گلوگیر آواز میں کہا۔

"میں بہت گناہ گار ہوں۔ کوشش کے باوجود بارہا ایسا ہوا کہ اپنے دامن کو لغزشوں کی آلودگی سے بچا نہ سکا ــــــــ!"

اور یہ کہتے کہتے اُس کی آنکھوں سے پھر آنسو جاری ہو گئے۔ شاہ صاحب نے تسلی اور دل دہی کے لہجہ میں کہا۔ "خدا کی رحمت سے مایوس ہونا مسلمان کا شیوہ نہیں لیکن ضروری ہے کہ اپنے تئیں اس کی رحمت کا مستحق ثابت کرو۔"

"لیکن کیونکر؟"

"ایسے کام کرو جو اُس کی رضامندی سے تمہیں قریب کر دیں۔"

"وہی معلوم کرنا چاہتا ہوں میرے مُرشد!"

"ایسے بہت سے کام ہیں، غریبوں کی مدد کرو، اپاہجوں کے کام آؤ، خیرات کرو، نیکیاں کرو ــــــــ"

اور پھر شاہ صاحب نے فیروز بخت کی طرف دیکھا، کچھ دیر تامل کیا، پھر فرمایا۔ "اور تم تو بہت کچھ کر سکتے ہو!"

وہ ارادت اور جوش کے عالم میں بولا۔ "فرمائیے، میں سب کچھ کر گزروں گا!"

شاہ صاحب نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ فرمایا۔ "میں جوش نہیں چاہتا ہوں، جوش کا نتیجہ پسپائی ہوتا ہے اور سوچے سمجھے عمل کا انجام استقلال، و استقامت! عیسائی بادشاہ جبلہ نے جوش کے عالم میں اسلام قبول کیا تھا۔ حضرت عمرؓ کے عدل کے سامنے نہ ٹھہر سکا۔ بھاگ کھڑا ہوا، مرتد ہو گیا۔ لیکن بلال حبشیؓ نے سوچ سمجھ کر اسلام قبول کیا تھا، وہ گرم گرم ریت پر لٹائے گئے، کوڑوں سے اُن کا بدن لہولہان کر دیا گیا۔ رونگٹے کھڑے کر دینے والے مظالم کا انہیں مقابلہ کرنا پڑا۔ لیکن اُن کی جبینِ استقامت پر شکن نہ آئی۔"

شاہ صاحب نے ذرا برہمی کے ساتھ کہا: "پست ہمتی کی باتیں کیوں کرتے ہو؟ اگر تم گردن کٹانے کے لئے نکلو گے تو قتل ہو گے، اگر گردن کاٹنے کے لئے میدان میں اترو گے تو شہید ہو گے!"

مایوسی کے عالم میں فیروز بخت نے کہا: "لیکن میں اکیلا کیا کر سکتا ہوں؟"

"تم اکیلے ہو؟ —— کیا خُدا نے اپنا تختِ کبریائی چھوڑ دیا؟ کیا وہ فرشتے معطّل ہو گئے، جنہوں نے میدانِ بدر میں اقلیّت کو اکثریّت پر غالب کیا تھا؟ کیا تمہارے سینہ میں وہ جذبہ نہیں پلتا، جو بدر و حنین کے غازیوں اور مجاہدوں کے سینہ میں کروٹیں لیتا رہتا تھا؟ کیا اس سارے ہندوستان میں اکیلے تم ہی مسلمان ہو؟ تمہاری قوم مسلمانوں کے وجود سے محروم ہے؟ —— یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ تم اکیلے کیسے ہو؟"

"مسلمان نشۂ غفلت میں مست ہیں، انہیں کیسے جگاؤں؟"

"جھنجھوڑ ڈالو انہیں!"

"امراء عیش و تنعم کی زندگی کے خوگر ہیں۔ وہ میدانِ جہاد کی کڑیاں کیونکر جھیلیں گے؟"

"خدا دلوں کی کایا پلٹ سکتا ہے، وہ مقلب القلوب ہے، کوشش کر کے تو دیکھو! میں پھر کہتا ہوں، مایوس کیوں ہوتے ہو؟ خدا کی رحمت سے مایوس ہونا مسلمان کا شیوہ نہیں —— لاتقنطوا من رحمۃ اللہ!"

ان الفاظ نے فیروز بخت کے بدن میں ایک بجلی سی دوڑا دی، ایک نئی حرارت ایک نئے جذبے سے وہ آشنا ہو گیا۔ وہ اُٹھ کھڑا ہوا، اور اُس نے ایک خاص عزم کے ساتھ کہا: "میں آپ کے ارشاد کا مطلب سمجھ گیا۔ میں اپنا فرض ادا کروں گا، اس راہ سے

اور پھر حضرت شاہ صاحب نے کڑے تیوروں کے ساتھ پوچھا۔ "کیا تم بلالؓ کے نقشِ قدم پر چلنے کو تیار ہو؟ آج پھر بلالؓ جیسے سرفروشوں کی اسلام کو ضرورت ہے۔ آج پھر کفر نے یلغار کی ٹھانی ہے۔ وہ بڑھ رہا ہے تاکہ تمہیں کچل دے۔ وہ تیاریاں کر رہا ہے تاکہ تمہیں نیست و نابود کر دے، وہ لشکر جمع کر رہا ہے تاکہ تمہیں شکست دے۔ ——— کیا تم ہار مان لوگے؟"

ایک عجیب عالم میں فیروز بخت کے منہ سے نکلا۔ "ہرگز نہیں حضرت!"

شاہ صاحب نے فرمایا۔ "تو مجھے بتاؤ۔ تم نے مرہٹہ سیلاب کو روکنے کیلئے اب تک کیا کیا ہے؟ نادر شاہ بگولے کی طرح اُٹھا، آندھی کی طرح آیا، اور چلا گیا، لیکن مرہٹہ سیلاب ہمیں غرق کرنے کے لئے آ رہا ہے، جانے کے لئے نہیں، کیا تم اس کا رُخ نہیں بدل سکتے، کیا تم نہیں جانتے کہ مرہٹہ حکومت کے قیام کے معنی ہیں، ہندوستان سے اسلام کا اخراج، ہندوستان کے مسلمانوں کا قتلِ عام، مرہٹوں کی تاخت و تاراج، ایک افسانہ نہیں حقیقت ہے، وہ جب بھی بڑھے مسلمانوں کو کچلتے ہوئے مسلمانوں کے ناموس پر حملہ کرتے ہوئے مسلم روایات کو پامال کرتے ہوئے، وقت آگیا ہے کہ ہر مسلمان کمر ہمت کس کر میدان میں آ جائے جو سو رہا ہے وہ جاگ پڑے، جو جاگ رہا ہے وہ اُٹھ بیٹھے جو اُٹھ بیٹھا ہے، وہ کھڑا ہو جائے، جو کھڑا ہوا ہے وہ دوڑنے لگے، یہ سوچنے کا وقت نہیں، کام کا وقت ہے، جہاد کا وقت ہے سر کٹانے اور جان دے دینے کا وقت ہے!"

بے ساختہ فیروز بخت کے منہ سے نکلا۔ "میں تیار ہوں!"

حضرت شاہ صاحب نے فرمایا۔ "اپنی گردن کٹانے کے لئے؟"

وہ بولا۔ "جی، میرا یہی مطلب تھا!"

اب مجھے دُنیا کی کوئی طاقت نہیں ہٹا سکتی، میں سدِّ سکندری بن کر مرہٹہ سیلاب کو روکوں گا میں ابرِ باراں بن کر مرہٹوں کی آتشِ ملک گیری کو بجھا دوں گا، میں بجلی بن کر ان کے خرمنِ حیات پر گر دوں گا۔ میں تلوار بن کر ان کے سروں پر چمکوں گا۔ جب تک میں زندہ ہوں؛ وہ آگے نہیں بڑھ سکتے۔ دِلّی کی فصیل کے اندر وہ قدم نہیں رکھ سکتے۔ اور اگر آئے تو پیچھے دھکیل دیئے جائیں گے، جمنا کی لہریں انہیں اپنی آغوش میں لیں گی اور وہ ہمیشگی کی نیند سو جائیں گے!"

شاہ صاحب کا چہرہ فرطِ مسرت سے چمک اُٹھا۔ انہوں نے فیروز بخت کو شاباش دی اور کہا "جزاک اللہ —— مجھے تم سے یہی امید تھی۔ میں تمہارے چہرے پر وہ نور دیکھتا ہوں، جو ایک مجاہد اور ایک غازی کا خاص حصّہ ہے، تم میدان میں اُترو، خدا ضرور تمہاری مدد کرے گا۔ ایک حدیث میں وارد ہے کہ خدا فرماتا ہے کہ میں اپنے بندے کیلئے ویسا ہی بن جاتا ہوں، جیسا وہ خیال کرتا ہے —— یعنی اگر بندہ خدا کو رحمان و رحیم سمجھتا ہے تو ضرور خدا کی رحمت و شفقت اس کے سر پر سایہ فگن ہوگی اور اگر وہ خدا کو صرف قہار و جبّار سمجھتا ہے تو ممکن نہیں کہ وہ قہر و جبر کے پنجہ سے اپنے تئیں بچا لے جا سکے، تمہیں اگر یہ یقین ہے کہ تم ٹھیک کام کر رہے ہو۔ اِسلام کا کام کر رہے ہو، خدا کے لئے کر رہے ہو، تو خدا کی مدد تمہارے ساتھ چلے گی۔ ذرا اپنی چہار دیواری سے باہر نکل کر تو دیکھو!"

شاہ صاحب کی خانقاہ سے نکل کر فیروز بخت سیدھا نواب نجم الدولہ اپنے خالو کے ہاں گیا، اس گھر میں اس کی بڑی آؤ بھگت ہوتی تھی، اور اُس کی خالہ بلقیس زمانی تو اس پر جان چھڑکتی تھی۔ وہ باہر کے کمرہ میں بیٹھا تھا کہ اس کا بچپن کا ساتھی اور دوست آصف زماں آ گیا۔ آصف زماں اگرچہ ایک غریب گھرانے کا فرد تھا۔ لیکن بڑا شریف اور

اولوالعزم نوجوان تھا۔ فیروز بخت پر تو وہ جان چھڑکتی تھا، ابھی چند روز ہوئے اس کی شادی صنوبر سے ہوئی تھی۔ یہ نجم الدولہ کے ایک غریب لیکن شریف دوست کی لڑکی تھی اُسے نجم الدولہ نے ماہ طلعت کے ساتھ ساتھ پالا اور بڑا کیا، وہ اس میں اور اپنی بیٹی میں کوئی فرق روا نہیں رکھتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ صنوبر رفتہ رفتہ اپنی محسن زادی کی محبوب اور معتمد سہیلی بن گئی۔ دونوں ایک دوسرے کی ہمدم و ہمراز بلکہ ایک جان دو قالب بن گئیں۔ جو کیفیت آصف زماں کی فیروز بخت کے ساتھ تھی، بالکل وہی صنوبر کی ماہ طلعت کے ساتھ تھی۔

جس کمرہ میں اس وقت فیروز بخت اور آصف زماں بیٹھے تھے۔ اس سے ملا ہوا صنوبر کا کمرہ تھا، ان دونوں دوستوں میں ادھر ادھر کی باتیں ہونے لگیں۔ آصف زماں ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر لطیفے بیان کرتا، پُرلطف واقعات سناتا تھا۔ ہنسی مذاق کی باتیں کرتا تھا، لیکن فیروز بخت ہوں ہاں کر کے ٹال دیتا تھا۔ صاف معلوم ہو رہا تھا وہ اس وقت کھویا ہوا سا ہے، جسم یہاں ہے، دماغ کہیں اور، آصف زماں نے یہ کیفیت دیکھ کر رازدارانہ انداز میں کہا۔ "کیا بات ہے؟ یہ افسردگی۔ اور دل گرفتگی کیوں؟ کس لئے اور اب میں صاف الفاظ میں پوچھتا ہوں کس کے لئے؟"

فیروز بخت نے سنجیدہ تبسم کے ساتھ کہا۔ "تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں، ہم بیزار بیٹھے ہیں — !"

"وہی تو پوچھتا ہوں، آخر کیوں؟ میری رائے تو یہ ہے کہ اب تمہاری شادی بھی ہونی چاہیئے!"

فیروز بخت نے جھنجھلا کر کہا۔ "جو غلطی تُم سے سرزد ہو چکی اُس کا ارتکاب میں کیوں کروں؟

آصف زماں نے حیرت اور استعجاب کے ساتھ دریافت کیا۔ "غلطی کی میں نے شادی کرکے؟"

"ہاں —— بہت بڑی غلطی!"

اور پھر فیروز بخت نے وہ ساری تلقین آصف زماں کے سامنے دہرادی، جس سے ابھی ابھی وہ بہرہ ور ہو کر شاہ صاحب کے ہاں سے آیا تھا!

فیروز بخت کے بارے میں یوں تو ہمیشہ یہ کہا جا سکتا تھا — کہ ہی کی آنکھیں جادو ترے بیان میں ہے! —— لیکن آج تو واقعی اُس نے کچھ ایسے الفاظ میں اپنا مدعا بیان کیا کہ آصف زماں کی آنکھیں بھی آب گوں ہو گئیں، اُس نے رومال سے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ "فیروز بخت —— تم غلط سمجھے، یہ شادی میرے پاؤں کی زنجیر نہیں بن سکتی۔ میں صنوبر کو بہت چاہتا ہوں، لیکن تم سے زیادہ نہیں، بیشک مجھے اپنی جان عزیز ہے لیکن اس لئے کہ اسے اپنی قوم کے وقار اور عزت پر قربان کر دوں، تم جو بڑا کام چاہو بتاؤ، میں تمہارا ساتھ دوں گا، زندگی کی آخری سانس تک تم مجھے اپنا رفیق اور دمساز پاؤ گے، بتاؤ کیا حکم دیتے ہو مجھے؟"

فیروز نے کہا۔ "اتنی جلدی بھی ٹھیک نہیں، ہم نے ایک رائے قائم کی ہے، جلد ہی کوئی اسکیم بھی مرتب ہو جائے گی، ذرا صبر سے کام لو، پھر دیکھو خدا کیا کرتا ہے؟"

صنوبر اپنے کمرے سے غائب تھی۔ البتہ ماہ طلعت اس کے کمرے میں دیوار سے لگی، فیروز اور آصف زماں کی باتیں بڑے غور سے سن رہی تھی!

باب (۳)

نئی چنگاری

ماہ طلعت اپنے آراستہ پیراستہ کمرے میں ایک شاندار مسہری پر پاؤں لٹکائے بیٹھی تھی، یوں بھی وہ کچھ کم حسین نہ تھی۔ لیکن اس وقت اُس پر کچھ ایسی معصومیت برس رہی تھی جس نے اُس کے حُسن میں اور اضافہ کر دیا تھا، سامنے ایک مُرصّع چوکی پر صنوبر بیٹھی تھی۔ دونوں سہیلیوں میں گُھل مِل کے باتیں ہو رہی تھیں، صنوبر نے کہا۔ "تُم نے جو کچھ کہا، میں سمجھ گئی، مان لیا، اِس راستے میں کسی بڑی سے بڑی قربانی سے بھی مجھے دریغ نہ ہوگا۔ لیکن ایک سوال پھر بھی باقی رہ جاتا ہے!"

"وہ کیا؟" ماہ طلعت نے پوچھا۔

"وہ یہ کہ ہم پردہ میں بیٹھنے والیوں سے کیا ہو سکتا ہے؟ (مسکرا کر) وہی بات ہُوئی ——— نہ خنجر اُٹھے گا نہ تلوار ہم سے!"

ماہ طلعت بھی مسکرا دی، اُس نے کہا۔ "میرے سامنے تو نہ بنو، کیا تم نے میرے ساتھ فنونِ سپہ گری نہیں سیکھے ہیں؟"

"سیکھے ہیں، لڑنے کے لئے نہیں، زیادہ سے زیادہ اپنے بچاؤ کے لئے مجھے

تو یہ نہیں ہو سکتا کہ کسی مردوے سے آنکھیں چار کر کے، اُس کے سامنے فنونِ سپہ گری دکھانے لگوں، آخر شرم و غیرت بھی تو کوئی چیز ہے؟"

"ہاں ہے، اور بہت بڑی چیز ہے۔ لیکن شرم و غیرت کے یہ معنی تو نہیں، کہ ہم اپنی آنکھوں سے اپنے کاروانِ ملّت کو لٹتے دیکھتے رہیں، اپنی بہنوں، بیٹیوں اور ماؤں کا ناموس برباد ہوتے دیکھیں اور کچھ نہ بولیں۔ مانا کہ ہم میدانِ جنگ میں لڑ نہیں سکتے لیکن لڑنے والوں کی خدمت تو کر سکتے ہیں۔ اُن کی مرہم پٹی تو کر سکتے ہیں، انہیں پانی تو پلا سکتے ہیں، اپنے آدمیوں کا دل اور حوصلہ تو بڑھا سکتے ہیں . . . کیا یہ بھی نہیں کر سکتے؟"

صنوبر بولی۔ "ہاں یہ کیوں نہیں کر سکتے، ضرور کر سکتے ہیں۔ ضرور کریں گے!"

"بس یہی میرا مطالبہ ہے، اِس سے زیادہ کچھ نہیں!"

"لیکن تم تو اس طرح باتیں کر رہی ہو، جیسے آج ہی مجاہدین کی فوج رَن پر روانہ ہو رہی ہے، اور ہمیں ساتھ جانا ہے۔ سوت نہ کپاس ——"

ماہ طلعت بولی۔ "آج اور کل سے بحث نہیں۔ لیکن میں تمہیں یقین دلاتی ہوں، وہ وقت قریب آرہا ہے، ممکن ہے ہمارے اندازہ سے بھی پیشتر آجائے، اگر ہم تیار ہوں گے تو ہر وقت میدان میں کُود سکیں گے اور اگر تیار نہ ہُوئے تو وقت کسی کا انتظار نہیں کرتا۔ ہمارا بھی نہیں کرے گا!"

فیروز بڑی دیر سے حویلی میں موجود تھا، اور اپنی خالہ سے اِدھر اُدھر کی باتیں کر رہا تھا، وہ اُسے بہت چاہتی تھیں، جب دیکھ لیتیں گھنٹوں اپنے پاس بٹھائے رکھتیں چاہے لاکھ کا لیکھ ہو جائے، نہ خود اُٹھتیں نہ اُسے اُٹھنے دیتیں، یہی آج بھی ہُوا، اب جا کر اُسے چھٹی ملی، اور وہ اپنے گھر کی طرف جانے کے لئے اُٹھا، اُدھر سے گذرا تو دیکھا۔

ماہ طلعت اور صنوبر، سرجوڑے بیٹھی ہیں، اور نہ جانے کیا باتیں کر رہی ہیں، دروازے پر پہنچ کر وہ ٹھٹکا، اور صنوبر سے مخاطب ہو کر گویا ہُوا۔ "کیا باتیں ہو رہی ہیں چوری چھپے ؟"

صنوبر بولی۔ "راز کی باتیں ہیں، سُننا چاہتے ہیں تو اندر آجائیے !"

وہ اندر آگیا !

ماہ طلعت اُسے دیکھ کر سرو قد کھڑی ہوگئی، دوپٹہ ذرا ڈھلک گیا تھا۔ اُسے ٹھیک کیا اور آنکھیں نیچی کر کے چُپ چاپ کھڑی ہوگئی۔ فیروز بخت نے کہا۔ "ماہ تم بیٹھ جاؤ۔ جب تک نہیں بیٹھو گی میں کھڑا رہوں گا، ہزار دفعہ کہہ چُکا، تُم سے بڑا ہونے کے معنی یہ تو نہیں کہ میں جہاں پناہ ہوں ——— بیٹھو !"

وُہ مسکراتی ہُوئی بیٹھ گئی، پھر اُس نے نہایت شیریں آواز میں کہا۔ "لیجئے بیٹھ گئی آپ بھی تو تشریف رکھئے !"

فیروز بخت اِس چوکی پر بیٹھ گیا، صنوبر ماہ طلعت کی مسہری پر پائنتی بیٹھ گئی۔ فیروز بخت نے کہا۔ "ہاں بھئی کیا باتیں ہو رہی تھیں ؟"

صنوبر نے ذرا تیکھے تیوروں کے ساتھ کہا۔ "میں پوچھتی ہوں، آخر دشمنوں کو ہُوا کیا ہے ؟"

"کسے پوچھ رہی ہو ! مجھے ؟"

"جی اور کسے ؟ آپ ہی کو !"

"بخدا میں بالکل نہیں سمجھا، آخر تمہارا مطلب کیا ہے ؟ میں تو بالکل توانا و تندرست ہوں !"

"خود تو اچھے بھلے ہیں۔ لیکن دوسروں کی رات کی نیند اور دن کا چین حرام کر دیا

ہے، آپ نے ؟"

بڑے استعجاب کے ساتھ فیروز بخت نے کہا: "صنوبر بہن، تم کیا کہہ رہی ہو میں اب بھی نہیں سمجھا، ذرا صاف صاف کہو، کھُل کے !"

"صاف صاف کیا کہوں خاک ؟ —— ایک طرف آپ نے اُن کو نہ جانے کیا پٹی پڑھا دی ہے، جب دیکھو جہاد کا تذکرہ، جب سنو مرہٹوں کا ذکر، میرا تو ناک میں دم آگیا، مُوئے مرہٹوں کا ذکر سُنتے سُنتے، کیا کریں گے وہ ہمارا ؟"

فیروز بخت ہنس پڑا۔

اوہ اب میں سمجھا، اس پر خفا ہو کہ تمہارے آصف زماں کو چھینے لے رہا ہوں تم سے وہ پہلے میرا ہے، پھر کسی اور کا !"

"جی بھولی نہیں، خوب یاد ہے، آپ کیا یاد دلائیں گے، وہ خود یہی سبق روز مجھے سُنایا کرتے ہیں خیر انہیں آپ چھینے لیتے ہیں تو چھین لیجئے مرد ہیں تو ہی اس لئے ہیں کہ مردانگی کے جوہر دکھائیں، قوم اور مذہب پر جان قربان کریں، لیکن آپ تو میری بہن کو بھی چھینے لے رہے ہیں، واہ واہ یہ بھی کوئی بات ہُوئی !"

"بہن کو ؟ ——— تمہاری بہن کون ہے ؟ میں تو جانتا بھی نہیں۔ خدا سے ڈرو صنوبر !"

صنوبر نے ماہ طلعت کی طرف اشارہ کیا اور کہا: "یہ میری بہن نہیں تو اور کون ہیں —— ؟"

ماہ طلعت بیچ میں بول پڑی: "چپ لگی ؟"

پھر وہ فیروز سے کہنے لگی: "یہ تو دیوانی ہے اچھی خاصی !"

صنوبر نے کہا۔ "ان پر بھی جہاد طاری ہے، خواب میں بھی میدانِ جنگ ہی نظر آتا ہے، اور زخمی مجاہدوں کی مرہم پٹی ہوا کرتی ہے، آپ خود تو اُن کے پاس اُٹھتے بیٹھتے نہیں، لیکن آپ کے مُنہ سے نکلے ہُوئے بول، اُن کے کانوں میں سب سے پہلے پہنچ جاتے ہیں۔"

فیروز نے حیرت سے ایک نظر ماہ طلعت پر ڈالی، وہ لاجونتی کی طرح لجا گئی، صنوبر نے کہا۔ "ابھی چند روز کی بات ہے، میرے سامنے قوم پر مرمٹنے اور مذہب پر فدا ہونے مرہٹوں سے جہاد کرنے اور مسلم حکومت کی حفاظت اور بقا پر ایک بڑی زوردار تقریر کر ڈالی، خود بھی چیکوں ہیکوں روئیں، مجھے بھی رُلایا، یہاں سے اُٹھ کر اپنے کمرے میں جو گئی تو کیا دیکھتی ہوں "وہ" بھی سر جھکائے بیٹھے ہیں، آنکھیں ڈبڈبائی ہوئیں، اللہ جانے میرا تو دل دھک دھک کرنے لگا، یہ ہر وقت ہنسنے والا اور ہنسانے والا آدمی رو کیوں رہا ہے، پُوچھ بیٹھی کیا ہُوا؟ بس شروع ہو گئی، وہی تقریر جو ابھی ابھی سُن کر آئی تھی، پوچھا یہ سبق کس نے پڑھایا ہے؟" کہنے لگے۔ "فیروز نے، جس کے ایک اشارے پر گردن کٹا سکتا ہوں، اُس نے میری آنکھیں کھول دیں، زندگی کا مقصد بتا دیا..... اور نہ جانے کیا کیا کہتے رہے، میں چپ چاپ بظاہر سُنتی رہی، اور دل ہی دل میں سوچتی رہی کتنی کامیاب سازش آئی ہے آپ کو، یہ سازش اگر کامیاب ہو گئی تو بندی تو کہیں کی نہ رہے گی۔"

فیروز نے یہ باتیں سنیں تو بے تحاشا ہنسنے لگا، ہنستے ہنستے اُس کا بُرا حال ہو گیا صنوبر کہنے لگی۔ "یہ لیجئے، کسی کی جان گئی، آپ کی ادا ٹھہری، آپ کو ہنسی آ رہی ہے؟"

فیروز نے کہا۔

"تمہاری اس وقت کی باتوں سے مجھے بڑی خوشی ہُوئی۔

"ہاں آپ نہ خوش ہوں گے تو کون ہوگا؟"

"خوشی اس بات پر اور زیادہ ہُوئی کہ ہماری پردہ میں بیٹھنے والی لڑکیاں بھی اب سمجھنے لگی ہیں کہ اِسلام کا ان سے کیا مطالبہ ہے؟ قوم ان سے کیا چاہتی ہے؟ شاباش ماہ طلعت، اس مبارک جذبہ کو کبھی سرد نہ ہونے دینا!"

ماہ طلعت کا چہرہ پھول کی طرح کھل گیا، اُس نے ذرا شوخی کے ساتھ کہا: "آخر آپ ہی لوگ اپنے تئیں اسلام، مذہب اور قوم کا ٹھیکہ دار کیوں سمجھتے ہیں؟ قوم اور مذہب کی ذمّہ داریاں جس طرح آپ پر عاید ہوتی ہیں ہم پر بھی ہوتی ہیں!"

صنوبر نے کہا: "اب فرمائیے، اُستاد سے شاگرد بننے کا جی چاہنے لگا، یا نہیں؟"

فیروز نے جواب دیا۔ "ہاں بھئی چاہنے لگا!"

ماہ طلعت نے ذرا خفا ہو کر کہا۔ "ہمیں بنائیے نہیں —— ہاں آپ نے ہمیں پڑھانا تو بالکل چھوڑ دیا۔ مثنوی کا صرف ایک دفتر پڑھا کر رہ گئے۔"

"بس اتنا کافی ہے۔ اب تم خود پڑھ سکتی ہو، پڑھ ڈالو ساری کتاب۔ آج کل مجھے فرصت بھی کہاں ہے۔ فرصت کا ہر لمحہ، اسی کوشش میں صرف ہو رہا ہے کہ مجاہدین کی ایک فوج جلد از جلد تیار ہو جائے۔"

ماہ طلعت نے پوچھا۔ "سُنا ہے آپ نے حضرت شاہ صاحب سے بیعت کر لی؟"

"ہاں یہ واقعہ ہے، اپنی اس خوش بختی پر نازاں ہوں۔"

ذرا شرماتے ہُوئے وہ بولی۔ "کیا عورتوں کو بھی وہ بیعت کر لیتے ہیں؟"

خوشی سے فیروز کا چہرہ دمک اٹھا، اس نے کہا۔ "ہاں کیوں نہیں؟ —— ارادہ ہے —— ؟ —— ؟"

وہ گردن جھکا کر بولی۔ "ہے تو اگر —— ابا حضور کو اعتراض نہ ہو!"

فیروز اُٹھ کھڑا ہوا۔

"اتنے اچھے اور ستھرے کام پر اعتراض کرنے کی جرأت کیسے ہو سکتی ہے؟ —— ماہ تم فکر نہ کرو، ان کی رضامندی کا میں ذمّہ دار ہوں۔ لیکن ذرا اور غور کر لو۔ شاہ صاحب کا ارشاد ہے جلدی میں کوئی فیصلہ نہیں کرنا چاہیئے، جب کوئی رائے قائم کرو، تو بار بار سوچ لو!"

جاتے جاتے فیروز نے کہا۔

"میں حضرت شاہ صاحب کی کچھ کتابیں تمہیں بھیج دوں گا، ان کا مطالعہ کرنا کہیں کوئی بات سمجھ میں نہ آئے تو مجھ سے پوچھ لینا۔ کتابوں کے مطالعہ کے بعد، تمہاری جو رائے قائم ہو گی۔ وہ زیادہ معتبر ہو گی!"

فیروز چلا گیا۔

اِس مختصر سی ملاقات نے، دونوں کے دلوں کو کیف و نشاط سے بھر دیا۔ ماہ طلعت کی یہ مبارک تبدیلی دیکھ کر، فیروز اتنا خوش ہوُا کہ بیان سے باہر ہے، ماہ طلعت کو وہ بہت کچھ سمجھتا تھا، لیکن اتنا زیادہ نہیں، یہ آج معلوم ہوُا کہ وہ عمل اور کردار کے لحاظ سے کتنے گہرے پانی میں ہے

اور بالکل یہی کیفیت ماہ طلعت کی تھی، آج بہت دنوں کے بعد فیروز سے اس کی باتیں ہوُئی تھیں۔ یہ دیکھ کر اُسے بہت زیادہ مسرّت ہوُئی کہ وہ اس

کی سیرت اور کردار کی تعمیر سے گہری دلچسپی لیتا ہے، حضرت شاہ صاحب کی کتابیں بھیجنے کا آخر اور کیا مطلب ہو سکتا ہے؟

اور صنوبر حیرت سے ان دونوں کو دیکھ رہی تھی کہ یہ کیسے لوگ ہیں؟ جنہیں جہاد اور قربانی کے سوا کچھ آتا ہی نہیں، گویا دُنیا میں آنے کا مقصد صرف ایک ہے، جہاد اور قربانی! —————— کیا یہ کائنات اسی لئے پیدا ہوئی ہے؟ کیا ہماری زندگی کا مقصد یہی اور صرف یہی ہے ——

باب (۴)

باغی!

ایک زمانہ تھا کہ دلّی میں نواب دبیر الملک کا ڈنکا بجتا تھا۔ اس کلّے ٹھسّے اور دبدبہ کا آدمی ان کے ہم عصروں میں کوئی نہ تھا، وہ بہت خوبیوں کے آدمی تھے، بڑے رقیق القلب، لیکن اتنے ہی زیادہ بہادر، مصیبت زدہ آدمی کو دیکھ کر اُن کی آنکھیں پُرنم ہو جاتی تھیں، لیکن شیر کا شکار ہمیشہ تلوار سے کرتے تھے بلکہ لٹّھ بھی تھے، جتنے بڑے جاگیردار، اُس سے زیادہ دریا دل، اُن کی حویلی سے کبھی کوئی سوالی ناکام واپس نہ گیا۔ جو اُن کے سامنے ہاتھ پھیلاتا، اُس کی جھولی سیم و زر سے بھر دی جاتی، جو اُن سے فریاد کرتا اُس کی داد رسی اُسی وقت ہوتی، جو اُن کی مدد کا طالب ہوتا اُس کے لئے سر دھڑ کی بازی لگا دیتے، جو اُن کے مُنہ آتا، مُنہ کی کھاتا، کسی سے دبنا، اور کسی کے سامنے لچکنا جانتے ہی نہیں تھے۔ جس سے ملے اکڑ کر، جس کے سامنے گئے سینہ تان کر، جس نے ٹکّر لی اسی کا سر پھُوٹا۔

لیکن آج نہ جانے کیوں اُن کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں، بڑھاپے میں بھی اُن کا چہرہ پھول سے زیادہ تر و تازہ نظر آتا تھا، لیکن آج اُس پر مُردنی چھائی ہُوئی

تھی، وہ کہیں باہر جانے کی تیاریاں کر رہے تھے، لیکن پاؤں لڑکھڑا رہے تھے، آواز کانپ رہی تھی، ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے کوئی زندہ آدمی قبر میں زبردستی دفن کرنے کے لئے لے جایا جا رہا ہو۔ ہاتھ بار بار جیب کی طرف جاتا تھا، بار بار آنسو پونچھتے تھے لیکن آنسو تھے کہ ٹپکے جا رہے تھے، جیسے موسلا دھار بارش میں کسی غریب کی جھونپڑی ٹپکتی ہو، ایک مصاحب نے آگے بڑھ کر عرض کیا: "حضور ہمّت سے کام لیجئے حوصلہ نہ ہاریئے، آپ کی نیکیاں کام آئیں گی!"

دبیر الملک نے سُنی کی اَن سُنی کر دی، اور ایک دُوسرے مصاحب سے کہا۔ "دربار کا وقت ہو گیا؟"

وہ ادب سے بولا: "یہی وقت مقرر تھا، ——— بلکہ ہمیں کچھ پہلے ہی پہنچنا چاہئے تھا!"

دبیر الملک اپنی شاندار حویلی سے باہر نکلے، سواری میں بیٹھ کر لال قلعہ کی طرف چلے۔ اِس سے قبل وہ بارہا لال قلعہ گئے تھے، جب کبھی بھی گئے، مسکراتے گئے، اور ہنستے آئے، روپیہ لُٹاتے گئے اور مرتبوں سے دامن بھر کر آئے، لیکن آج وہ اس طرح جا رہے تھے جیسے قتل کا مجرم عدالت کے کٹہرے کی طرف بڑھتا ہے، راستہ بھر دعاؤں اور وظیفوں کا سلسلہ جاری رہا۔ آخر اللہ اللہ کر کے گرتے پڑتے ایوانِ شاہی یعنی دیوانِ خاص میں پہنچے جس دربار میں ہمیشہ سربلند ہو کر جاتے تھے، آج وہاں سرنگوں پہنچے، آئے اور چپکے سے اپنی جگہ پر بیٹھ گئے، ان کے پاس کی نشست نجم الدولہ کی تھی، اُن کے چہرے کا بھی ایک رنگ آتا تھا، ایک جاتا تھا، نہ تبسّم نہ مسرّت، ایک عجیب قسم کا اضمحلال، ایک عجیب طرح کی سوگواری، نجم الدولہ نے دبیر الملک کو، اور دبیر الملک نے نجم الدولہ کو دیکھا

اور ساتھ ہی ساتھ دونوں نے نظریں نیچی کرلیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا، دونوں ایک دوسرے سے کنایت کچھ چاہتے ہیں، لیکن کہنے کا یارا نہیں پاتے، دوسرے منصب دار، عہدیدار وزرار، امرار فوج کے افسر بھی مرعوب اور نگاہ نیچی کئے۔ اپنی اپنی جگہ بیٹھے تھے، سارے دربار پر ایک مہیب سناٹا چھایا تھا، بادشاہ سلامت ابھی تک برآمد نہیں ہوئے تھے لیکن شہ نشین کے عین نیچے، وزیر اعظم کی نشست کے بالکل سامنے، ایک خوب رُو اور خوش اندام، تنومند اور وجیہ نوجوان پابجولاں ایک مجرم اور قیدی کی حیثیت سے کھڑا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں ذرا بھی ہراس نہ تھا، اس کے چہرے پر خوف اور دہشت کی کوئی علامت نہ تھی، اُس کے انداز و اطوار سے دلیری اور بے باکی ٹپکتی تھی۔ وہ خاموش کھڑا تھا، لیکن اُس کی خاموشی اتنی پر وقار تھی کہ سامنے بیٹھے ہوئے رؤسا اور امرار حقیر و ذلیل بندے معلوم ہوتے تھے ——— یہ فیروز بخت تھا! ———

تھوڑی دیر کے بعد نقیب کی آواز بلند ہوئی۔

"نگاہ رُو برو، بادشاہ سلامت کی سواری بادِ بہاری رونق افروز ہوتی ہے!"

نقیب کے ان الفاظ میں کچھ ایسا جادو تھا کہ دفعتاً تمام حاضرین سرو قد کھڑے ہو گئے۔ اتنے میں بادشاہ سلامت شہ نشین پر تشریف لائے، اور مسندِ شہریاری پر رونق افروز ہو گئے، اور ان کے آتے ہی آداب و تسلیمات اور کورنشات کا لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا۔ بادشاہ سلامت کے جلوس فرما ہونے کے بعد، وزیر اعظم نے ملاحظہ شاہی کے لئے کچھ کاغذات پیش کئے اور پھر عرض گزار ہوا۔

"جہاں پناہ کی خدمت میں اب اُس شخص کو پیش کرنا چاہتا ہوں، جو حکومت کا دشمن، وطن کا غدار اور تختِ شہریاری کا باغی ہے!"

ـــــــــــ بادشاہ سلامت نے نظر اٹھاکر نوجوان ملزم کی طرف دیکھا، اور کہا۔ "باغی، غدّار؟"

وزیر نے سر جھکاکر ادب سے کہا۔ "جہاں پناہ!"

بادشاہ سلامت نے ذرا بلند اور کرخت آواز میں پوچھا۔ "کون ہے وہ؟"

وزیرِ اعظم نے سر اُٹھاکر پھر جھکالیا، اور عرض کیا: "وہ جہاں پناہ کے سامنے موجود ہے، میری مُراد، فیروز بخت سے ہے!"

بادشاہ۔ "فیروز بخت؟ ـــــــ خاندانِ شاہی کے قدیم نمک خوار اور ہمارے پُرانے جاں نثار وزیر الملک کا لڑکا؟"

وزیر۔ "جہاں پناہ!"

بادشاہ نے ایک نظر فیروز بخت کے چہرے پر ڈالی، اور للکار کر کہا۔ "ملزم، تم اپنی صفائی میں کیا کہنا چاہتے ہو؟"

فیروز بخت۔ "کچھ نہیں جہاں پناہ ـــــــــــ وزیرِ اعظم صاحب نے سچ فرمایا، میں غدّار ہوں اور مجھے سزا ملنی چاہیئے!"

وزیر۔ "لیکن تمہیں غدّاری کی جرأت کیسے ہُوئی؟ بغاوت کا جذبہ تمہارے اندر کیوں پیدا ہُوا؟ کیا ہماری خسروانہ نوازشیں تم پر مبذول نہیں رہیں؟"

"رہیں ـــــ لیکن وہ نوازشیں میرے درد کا درماں نہیں بن سکتیں، اُن سے میرا دُکھ نہیں دُور ہو سکتا، میرے جذبۂ بغاوت کی تسکین نہیں ہوتی، نہیں ہوسکتی!"

بادشاہ۔ "تم کیا چاہتے ہو فیروز بخت؟ اگر دولت کی ہوس ہے، وہ مِل سکتی ہے جاگیر میں توسیع کے خواہشمند ہو تو یہ بھی ممکن ہے، منصب اور عہدہ کی طلب ہے، تو

یہ راستہ بھی کھلا ہوا ہے۔ وزارت کی حسرت ہے تو ہم تمہیں وزارت کا منصب بھی عطا فرما سکتے ہیں۔ ہمیں معلوم ہے تم کس خاندان کے فرد ہو، تمہارے باپ دادا نے ہمارے خاندان کی کیسی گراں قدر خدمتیں انجام دی ہیں ——— بتاؤ کیا چاہتے ہو؟ ——— جو مانگو گے وہ پاؤ گے!"

دبیر الملک کا چہرہ پھول کی طرح کھل اُٹھا۔ نجم الدولہ کے مردہ چہرے پر رونق آ گئی۔ حاضرینِ دربار کی نظریں فیروز بخت پر جم گئیں۔ سب لوگ ہمہ تن گوش ہو بیٹھے، کہ دیکھیں اب وہ کیا کہتا ہے۔ اور دفعتاً فیروز بخت کی آواز فضا میں گونجی۔

"جہاں پناہ! ——— نہ مجھے جاگیر کی ہوس ہے، نہ مال و زر کی تمنا، نہ وزارت کا منصب میرے تخیل کی معراج ہے، نہ خلعتِ فاخرہ، اور نوازشِ شاہانہ۔"

بادشاہ۔ "پھر آخر تمہیں کیا چاہیئے؟"

ایک جذبہ کے عالم میں فیروز بخت نے جواب دیا۔ "مجھے جو کچھ چاہیئے وہ آپ نہیں دے سکتے ——— میں وہ تلوار چاہتا ہوں جو وزیرِ اعظم جیسے خود غرض اور ہوس کے بندوں کی گردن کاٹ سکے، میں وہ قوت چاہتا ہوں جو جہاں پناہ کو معزول اور مفلوج کر سکے ——— یہ بادشاہت ایک ڈھونگ ہے یہ وزارت ایک فریب ہے، یہ وزارت، یہ خلعت، یہ انعام و اکرام اور تحائف کے انبار، وہ ہڈیاں ہیں جو کتوں کے آگے ڈال دی جاتی ہیں اور وہ بھونکنا چھوڑ کر انہیں چچوڑنے لگتے ہیں!"

بادشاہ نے پُر جلال آواز میں کہا: "ملزم، تم ہمارے رحم و کرم سے ناجائز فائدہ اُٹھا رہے ہو۔ تم نہیں سمجھتے کہ کیا کہہ رہے ہو، تم حد سے بڑھ رہے ہو، تمہیں معلوم ہونا چاہیئے، ہمارے قہر و غضب کی آگ تمہارے خرمنِ ہستی کو جلا کر خاکِ سیاہ

دھبّہ ہے، یہ بادشاہت بابر اور عالمگیر کے خاندان پر کلنک کا ٹیکہ ہے، میرا فرض ہے کہ میں ایسی حکومت کو نیست و نابود کر دوں، ایسی بادشاہت کا چراغ گل کر دوں۔"

شاید فیروز بخت ابھی کچھ اور کہتا، لیکن دبیر الملک سے ضبط نہ ہو سکا۔ وہ تلوار سونت کر کھڑے ہو گئے، انہوں نے چیخ کر کہا۔ "او ناخلف خاموش!"

فیروز بخت مسکرایا اور اُس نے کہا۔ "آپ میری زبان کاٹ سکتے ہیں، لیکن میری آواز نہیں بند کر سکتے، آپ میری گردن قطع کر سکتے ہیں، لیکن جو سودا میرے سر میں سمایا ہے دُور نہیں کر سکتے، آپ میری جان لے سکتے ہیں لیکن میرے عزم و ارادہ کو فنا نہیں کر سکتے!"

دبیر الملک پھر چیخے۔ "میں سب کچھ کر سکتا ہوں، میں تیرا گلا گھونٹ دوں گا، تو ناخلف ہے، تو ننگِ خاندان ہے، تُو نے ہماری بے داغ وفاداری کے دامن پر دھبہ لگایا، تو نے مجھ بُوڑھے کی سفید داڑھی پر کالک لگا دی، تو نے ہمارے خاندان کی پشتہا پُشت کی جاں نثاری اور نمک حلالی کو خاک میں ملا دیا میں تیری گردن کاٹ لوں گا، میں تجھے مار ڈالوں گا، میرے بُوڑھے ہاتھوں میں ابھی اتنا دم ہے، میرے سرد خُون میں ابھی اتنی گرمی ہے۔۔۔!"

اور یہ کہہ کر دبیر الملک تلوار سونتے ہُوئے، قتل کے ارادہ سے اپنے اکلوتے، چہیتے اور جان سے زیادہ پیارے بیٹے فیروز بخت کی طرف بڑھے۔ فیروز بخت نے باپ کو اپنی طرف آتا دیکھ کر خاموشی اختیار کر لی اور گردن جُھکا لی، دبیر الملک جب اور قریب پہنچے تو تلوار کی نوک فیروز بخت کے سینے کی طرف بڑھاتے ہُوئے بولے۔ "تو۔ تو۔ تو۔ تو۔ تو۔!"

اور پھر وہ کچھ نہ کہہ سکے، تلوار ان کے ہاتھ سے چُھوٹ کر گر پڑی۔ اور تلوار کے ساتھ ہی ساتھ وہ بھی زمین پر آ رہے!

دبیر الملک کی وفادار رُوح اس دُنیا سے پرواز کر چکی تھی!

کرسکتی ہے !"

فیروز بخت نے کہا: "جانتا ہوں جہاں پناہ ! پھر بھی جو کچھ کہہ چکا، اُس پر قائم ہوں میں نے ایک ایک لفظ سوچ سمجھ کر کہا ہے ، میں اپنی کسی بات پر پشیمان نہیں !"

بادشاہ: "ہاں ! ——— تو تم ہمارے قہر و غضب سے ٹکر لینا چاہتے ہو !"

فیروز بخت: "میں نے موت سے ٹکر لینے کا فیصلہ کر لیا ہے ، پھر جہاں پناہ کا قہر و غضب کیا چیز ہے ، میں دیکھ رہا ہوں ، مغلیہ عظمت و جلال کا آفتاب اب غروب ہو رہا ہے ۔ میری آنکھیں دیکھ رہی ہیں ۔ مرہٹوں کا تسلط روز بروز بڑھتا جا رہا ہے ۔ وہ چوتھ لیتے لیتے سر ولیش مکھی لینے لگے ، وہ دِلّی تک بھی پہنچے ، اور یہاں پہنچنے کے بعد اُنہوں نے خلقِ خدا کو لُوٹا ، قصرِ شاہی کو پامال کیا ، بابر ، ہمایوں ، اکبر ، جہانگیر ، شاہجہان اور اورنگ زیب کے کمزور اور بُزدِل جانشینوں کو ذلیل کیا ، اور واپس چلے گئے ، آج ہندوستان کے ایک بڑے رقبہ پر اُن کی حکومت ہے ۔ خاندانِ مغلیہ کا کبّۂ جلال مدت ہُوئی رخصت ہو گیا ، اب دِلّی اور آس پاس کے چند اضلاع تک شاہی اقتدار نام نہاد طور پر باقی رہ گیا ہے ، اور اگر یہی لیل و نہار رہے تو وہ دن دُور نہیں جب مغلیہ حکومت سمٹ کر صرف لال قلعہ میں بسیرا لینے پر مجبور ہو گی اور بالآخر یہاں سے بھی کسی دن بیک بینی و دوگوش نکال دی جائے گی ——— کیا میں ایسی حکومت کی اطاعت کروں ، جو دیوالیہ ہو رہی ہے ؟ کیا میں ایسے بادشاہ کا وفادار رہوں ، جو شاہِ شطرنج سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا ؟ ——— نہیں ویسا نہیں ہو سکتا ، ہرگز ایسا نہیں ہو سکتا ، میں اِس حکومت کا تختہ اُلٹ دُوں گا ، میں ایسے بادشاہ کو قتل کر دوں گا ، میں ایسے وزیروں اور امیروں کی گردنیں کاٹ لوں گا ۔ یہ حکومت ہمایوں اور شاہجہاں کے نامِ نیک پر

باب (۵)

آنے والا طوفان

نجم الدولہ اور دبیر الملک آپس میں ہم زلف تھے، دونوں میں بچپن کا یارانہ تھا، اِن دونوں کے اخلاص اور محبت کی مثالیں دی جاتی تھیں، دونوں ایک دوسرے پر جان چھڑکتے تھے۔ ممکن نہ تھا نجم الدولہ کی بات دبیر الملک ٹال دیں، یا دبیر الملک کا کہا نجم الدولہ پورا نہ کریں۔

دبیر الملک کی ناگہانی وفات نے نجم الدولہ کے دِل و دماغ اور اعصاب پر بہت بُرا اثر کیا، وہ چیخ چیخ کر رونا چاہتے تھے لیکن رو نہ سکتے تھے، وہ اپنے دِل کا گھاؤ لوگوں کو دکھانا چاہتے تھے۔ لیکن کوئی نہ تھا، جو اس بہتے ہُوئے زخم اور رِستے ہُوئے ناسور کو دیکھ سکتا، اُنہیں چپ لگ گئی تھی، دوستوں کی محفلیں، نشاط و طرب کی مجلسیں، احباب کی بزم آرائیاں مصاحبوں اور جاں نثاروں کی دلجوئیاں سب بیکار تھیں، اُن کے دِل کی کلی مرجھا چکی تھی۔ اب اُس کا تر و تازہ ہونا، کِھلنا مشکل تھا۔ مشکل نہیں، ناممکن۔

ایک روز وہ محلسرا کے مردانہ حصّہ میں بیٹھے تھے، سامنے پیچوان لگا تھا۔ منہال

منہ میں تھی۔ کبھی کبھی ایک زوردار کش لگا لیتے۔ خوشبودار دھوئیں سے سارا ایوان معطر ہو رہا تھا، آنکھیں زمین پر لگی تھیں، وہ کسی گہری سوچ میں مستغرق تھے۔

نجم الدولہ کے بالکل سامنے کی نشست پر نواب اعتبار الملک بیٹھے تھے، یہ بھی دِلّی کے بلند پایہ رئیسوں میں تھے، دبیر الملک اور نجم الدولہ کے بچپن کے دوست اور لنگوٹیا یار۔ کچھ دیر تک وہ نجم الدولہ کی کیفیت دیکھتے رہے، پھر انہوں نے قفلِ سکوت توڑا۔ کہنے لگے۔ "کیا سوچ رہے ہیں آپ؟"

نجم الدولہ نے سر اٹھا کر اعتبار الملک کو دیکھا اور کہا۔ "کچھ نہیں بھائی صاحب... سوچ رہا ہوں، یہ دُنیا بھی کیسی جگہ ہے؟ کہیں شادی ہے کہیں ماتم، کبھی خوشی ہے کبھی غم، کل کیا تھا، آج کیا ہو گیا؟"

یہ کہتے کہتے اُن کی آنکھیں پُرآب ہو گئیں، گریہ گلوگیر ہو گیا، کھنکھار کر گلا صاف کیا اور کہا۔ "دبیر الملک اپنے ساتھ مجھے بھی مار گئے، وہ جنّت کے مزے لُوٹ رہے ہوں گے، میں جہنّم کی سزا بھگت رہا ہوں۔ وہ قبر میں چین کی نیند سو رہے ہیں، میں زندہ درگور ہوں ——— خیال آتا ہے، یہ آن کی آن میں کیا ہو گیا، تو دِل ڈوبنے لگتا ہے۔ آنکھوں کے نیچے اندھیرا آ جاتا ہے!"

اعتبار الملک نے کہا۔ "بھائی صاحب، آپ سچ کہتے ہیں، دبیر الملک جو داغ دے گئے، وہ زندگی کا ساتھی ہے، وہ اب نہیں مٹ سکتا!"

کچھ دیر رُک کر پھر انہوں نے کہا۔ "لیکن دبیر الملک کے سوگ اور ماتم میں وقف ہو جانا، نہ اُن کی رُوح کو پسند آئے گا نہ خدا خوش ہو گا!"

نجم الدولہ: "یہ کیوں بھائی صاحب؟"

اعتبار الملک ۔" اس لئے کہ زندگی خدا کی امانت ہے، انسان اسی وقت تک زندہ رہتا ہے۔ جب تک خدا ضروری سمجھتا ہے کہ وہ زندہ رہے۔ جب قدرت کی نظر میں انسان کی زندگی غیر ضروری ہو جاتی ہے، موت آجاتی ہے!"

نجم الدّولہ ۔" میں نہیں سمجھا، آپ نے کچھ عجیب سی بات کہہ دی!"

اعتبار الملک ۔" بہت سادہ بات ہے، ذرا غور کیجئے، سمجھ میں آجائے گی۔ ہاں تو میرا مطلب یہ ہے کہ زندگی جب خدا کی امانت ٹھہری، تو اُسے ضائع نہیں جانا چاہئے۔ ورنہ آپ کی نظر میں مجرم ٹھہریں گے!"

نجم الدّولہ ۔" مجرم ٹھہروں گا؟"

اعتبار الملک ۔" ہاں ——— غلام اگر آقا کی نافرمانی کرے تو وہ انعام کا نہیں سزا کا مستحق ہوتا ہے!" پھر کچھ دیر خاموش رہ کر انھوں نے کہا۔

اعتبار الملک ۔" اور اگر ناساعد حالات میں کمزوری، علالت اور پریشانی کے باوجود اپنے فرائض انجام دیتا رہے۔ تو آقا کی نظر میں اُس کی وقعت بڑھ جاتی ہے اور وہ انعام و اکرام کا سزاوار ٹھہرتا ہے!"

نجم الدّولہ ۔" ہاں یہ بھی ٹھیک ہے!"

اعتبار الملک ۔" لہٰذا اپنے آقا کے نافرمان بندے نہ بنئے، اطاعت گزار اور وفاشعار خادم بنئے!"

نجم الدّولہ ۔" لیکن بھائی صاحب، میں نہیں سمجھتا میری زندگی کا مصرف کیا ہے؟ قدرت نے مجھ پر کیا ذمّہ داریاں عاید کی ہیں؟ میں تو یہ محسوس کر رہا ہوں کہ ——— موت آتی ہے پر نہیں آتی!"

اعتبار الملک۔ "یہی آپ کی غلطی ہے، قدرت کی نظر میں جب آپ موت کے مستحق ہوں گے۔ وہ فوراً آجائے گی، وہ کسی کے روکے نہیں رُک سکتی۔ لہٰذا جب تک زندگی ہے مستعدی سے اپنے فرائض انجام دیجئے!"

نجم الدولہ۔ "وہی تو پوچھتا ہوں، آخر وہ فرائض کیا ہیں؟"

اعتبار الملک۔ "ارے آپ یہ بھی نہیں جانتے؟"

نجم الدولہ۔ "واقعی نہیں جانتا، آپ بتائیے!"

اعتبار الملک۔ "تو سُنئے، ماہ طلعت کی زندگی کا بنانا اور سنوارنا آپ کا سب سے بڑا اہم فریضہ ہے!"

نجم الدولہ۔ "ہاں ہے ——— لیکن میں تو یہ سمجھتا ہوں، دبیر الملک کے ساتھ اس کی زندگی بھی غارت ہوگئی!"

اعتبار الملک۔ "یہ کیوں جناب؟ وہ ماشاء اللہ جوان ہے، صحیح و تندرست ہے، علوم و فنون میں ماہر ہے، اُس کی زندگی کیوں غارت ہوگئی؟ ——— یہ دن اس کے ہنسنے اور خوش رہنے کے ہیں یا رونے اور کڑھنے کے؟"

نجم الدولہ۔ "آپ کو معلوم ہے دبیر الملک اسے کتنا چاہتے تھے، اُن کی بیوی مریم زمانی اس کی سگی خالہ ہیں، وہ بھی دل و جان سے اِس پر صدقے واری ہوتی رہتی ہیں۔"

اعتبار الملک۔ "ہاں جانتا ہوں، پھر؟"

نجم الدولہ۔ "آپ یہ بھی جانتے ہوں گے کہ ماہ طلعت اور فیروز بخت کی نسبت بچپن ہی میں ہوچکی تھی، اگرچہ اس کا اعلان مناسب نہیں سمجھا گیا تھا۔"

اعتبار الملک۔ "ہاں بھئی سب کچھ جانتا ہوں، مگر ان باتوں کا مقصد؟"

نجم الدولہ۔ "اب مشکل یہ آن پڑی ہے کہ نسبت ٹوٹ نہیں سکتی۔ شادی نہیں ہو سکتی!"

اعتبار الملک۔ "نکاح تک ٹوٹ سکتا ہے۔ نسبت کیوں نہیں ٹوٹ سکتی؟ اور ہاں آپ نے یہ کیا کہا کہ شادی نہیں ہو سکتی؟ کیوں نہیں ہو سکتی۔ آج تو آپ کچھ عجیب سی باتیں کر رہے ہیں!"

نجم الدولہ۔ "بالکل ٹھیک کہہ رہا ہوں بھائی صاحب، نسبت کا ٹوٹنا اس لیے مشکل ہے کہ یہ خبر سنتے ہی میری اہلیہ بلقیس زمانی کی اور ان کے ساتھ مریم زمانی کی حرکتِ قلب بند ہو جائے گی، اُن کا دل بہت دکھا ہوا ہے۔ میں ہرگز اپنی طرف سے انہیں کوئی صدمہ نہیں پہنچانا چاہتا!"

اعتبار الملک۔ "جزاک اللہ، آپ کو یہی کرنا اور یہی کہنا چاہیئے تھا۔ میں آپ کے لفظ لفظ سے متفق ہوں، لیکن ——!"

نجم الدولہ۔ "لیکن سنئے تو!"

اعتبار الملک۔ "فرمائیے!"

نجم الدولہ۔ "شادی بھی تو نہیں ہو سکتی!"

اعتبار الملک۔ "وہی تو پوچھتا ہوں کیوں؟"

نجم الدولہ۔ "کیا آپ کو نہیں معلوم، فیروز بخت پر بغاوت کا الزام ہے؟"

اعتبار الملک۔ "ہاں معلوم ہے، لیکن کیا وہ واقعی باغی ہے؟"

نجم الدولہ۔ "ہاں باغی، بدنصیب کشتنی، گردن زدنی، سب کچھ، نہ جانے کیا کیا اونہہ

اِعتبار الملک۔ "اچھا یہی سہی، پھر؟"

نجم الدّولہ۔ "کیا آپ سمجھتے ہیں، حکومت کا باغی میرا خویش بن سکتا ہے؟ حکومت کا غدّار باجے، تاشے اور دھوم دھڑکے کے ساتھ میرا داماد بن کر اس حویلی میں آئے؟ بادشاہِ وقت کے باغی سے رشتہ و پیوند کے تعلّقات قائم ہوں؟ —— بخدا یہ نہیں ہو سکتا —— میں بادشاہ کا وفادار ہوں؛ اور مجھے وفاداری کی میراث اپنے اجداد سے ملی ہے، اور جب تک میں زندہ ہوں اِس میراث پر آنچ نہیں آ سکتی، میرا کام بادشاہ کے دشمن کا سر کاٹنا ہے۔ میں بادشاہ کے دشمن کو لختِ جگر کیسے بنا لوں؟ دبیر الملک نے اسی غیرت میں جان دی!"

اِعتبار الملک۔ "آپ نے ایک ہی سانس میں بہت کچھ کہہ ڈالا، لیکن اگر کچھ اور بھی کہنا چاہتے ہوں تو کہہ ڈالئے، میں اِسی صبر و سکون سے سنوں گا جس سے اب تک آپ کی تقریر سنتا رہا!"

نجم الدّولہ۔ "اب مجھے کچھ کہنا نہیں، اور اس کے بعد کہا بھی کیا جا سکتا ہے؟"

اِعتبار الملک۔ "بہت کچھ کہا جا سکتا ہے، سنئے گا؟"

نجم الدّولہ۔ "فرمائیے، گوشِ ہوش سے سنوں گا!"

اعتبار الملک۔ "میں آپ کو اتنا ظالم اور سفاک نہیں سمجھتا تھا! آپ نے ظلم کی انتہا کر دی" —— فیروز بخت کا بدترین دشمن بھی اتنا کچھ نہیں کہہ سکتا تھا جتنا آپ نے کہہ ڈالا

نجم الدّولہ۔ "بھائی صاحب یہ آپ کہہ رہے ہیں؟"

اعتبار الملک۔ "ہاں میں ہی کہہ رہا ہوں؛ میں اُس روز دربار میں موجود تھا جب

فیروز بخت ایک باغی اور غدّار کی حیثیت سے جہاں پناہ کے حضور میں پیش کیا گیا تھا۔"

نجم الدّولہ۔ "پھر بھی آپ اُسے بے گناہ سمجھتے ہیں؟"

اعتبار الملک۔ "بے گناہ؟ ـــــ نہیں معصوم ـــــ میں اُسے معصوم سمجھتا ہوں!"

نجم الدولہ نے حیرت سے اعتبار الملک کو دیکھا اور کہا۔ "یہ کیونکر؟"

اعتبار الملک نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا۔ "میری نظر میں وہ وطن کا سب سے دلیر سپاہی ہے! وہ مجھ سے، آپ سے، کہیں زیادہ بہادر، کہیں زیادہ وطن دوست اور کہیں زیادہ سچّا مسلمان ہے!"

نجم الدولہ حیرت سے اعتبار الملک کا منہ دیکھ رہے تھے اور خاموش تھے اور اعتبار الملک کہہ رہے تھے:۔

"میرا جی چاہتا تھا کہ میں اُٹھوں اور اُسے گلے سے لگا لوں، بتایئے، اُس نے کون سی بات ایسی کہی جو ناروا یا غلط تھی؟ ـــــ جناب میں کہتا ہوں، اُس نے جو کچھ کہا سچ کہا، اور اگر وہ جیل سے کسی طرح رہا ہو کر، میدانِ عمل میں اُترے تو سب سے پہلے جو شخص اُس کا ساتھ دے گا، وہ اعتبار الملک ہو گا!"

حیرت سے نجم الدولہ کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں، انہوں نے زور سے زانو پر ہاتھ مارا اور کہا۔ "یا اللہ، یہ میں کیا سُن رہا ہوں!"

اعتبار الملک نے جواب دیا۔ "اگر یہ باتیں ناگوار ہوں تو اُٹھ کر چلا جاؤں؟"

نجم الدّولہ: "نہیں بھائی صاحب آپ نہیں جا سکتے۔ آپ نے عجیب سی باتیں کہہ ڈالی ہیں، لیکن میں کچھ اور بھی سُننا چاہتا ہوں، کہیے، آپ اور کیا کہہ سکتے ہیں؟"

اعتبار الملک:۔ مجھے اب کچھ نہیں کہنا، سوا اس کے کہ فیروز بخت پر فخر کیجیے اُس سے نفرت نہ کیجیے۔

"فیروز بخت سے نفرت نہ کروں؟ اس پر فخر کروں؟"

"ہاں! ——— وہ مردِ غازی ہے! مردِ مجاہد ہے!

نجم الدولہ نے بڑے کرب اور تکلیف کے ساتھ کہا: "آہ! ——— جب آپ جیسے لوگ ایسی باتیں کہہ سکتے ہیں، تو ہمیں اپنے مستقبل سے مایوس ہو جانا چاہیے اور یقین کر لینا چاہئے، ہمارے اقتدار اور حکومت کا ٹمٹماتا ہوا چراغ بادِ مخالف کے کسی بھی جھونکے سے بجھ سکتا ہے!"

اعتبار الملک: "کاش آپ کا یہ یقین لازوال ہو ——— میرے بھائی آنکھیں کھولو، طوفان کو دیکھ کر تم آنکھیں بند کر سکتے ہو، لیکن اُسے ٹال نہیں سکتے، اُسے روکنے کی صورت صرف یہی ہے کہ لنگر لنگوٹ کس کر میدان میں اُترو، پسینہ خون بن کر ٹپکنے لگے، پرواہ نہ کرو۔ زخم سہو اور چوٹ پر چوٹ کھاؤ۔ مگر اُف نہ کرو، خون کا آخری قطرہ بھی بہادو، لیکن میدانِ جنگ سے منہ نہ پھیرو، تب ہی تم طوفان پر غالب آ سکتے ہو تب ہی تم مشکلات پر فتح حاصل کر سکتے ہو، زندہ رہنے کا حق اسے ملتا ہے جو موت کا پنجہ مروڑ سکے!"

نجم الدولہ:۔ "لیکن وہ طوفان کہاں ہے جس کا ذکر آپ فرما رہے ہیں؟"

اعتبار الملک:۔ "وہ طوفان میرے اور تمہارے سر پہ نہیں، سارے ہندوستان کے سر پہ مغلیہ حکومت کے سر پہ منڈلا رہا ہے اور اگر جلد خبر نہ لی گئی تو وہ آ جائے گا اور اس شان سے آئے گا کہ نہ ہم ہوں نہ تم ہو گے، نہ مغلیہ حکومت کا نام باقی رہ جائے گا۔ نو سو برس تک اس دیس پر ہم نے ٹھاٹھ سے حکومت کی تھی، اور اب

اس سے زیادہ ٹھاٹھ کے ساتھ غلامی کریں گے؟"

نجم الدولہ، اعتبار الملک، وزیرِ اعظم، اور خاقانِ ابنِ خاقانِ سلطان ابنِ سلطان، ہمارے جہاں پناہ تک سب؟"

نجم الدولہ: "بھائی صاحب خدا کے لئے ایسی باتیں نہ کیجئے۔ جی گھبراتا ہے؟"

اعتبار الملک: "تمہارا اختلاجِ قلب اس زبردست سیلاب کو نہیں روک سکتا، جو دکن سے مرہٹوں کے لشکر گراں کی صورت میں دلّی کی طرف بڑھ رہا ہے اور یقین رکھو اگر وہ آگیا، تو تمہاری عظمت وسطوت کو خس و خاشاک کی طرح بہالے جائے گا۔ مجھے معتبر ذریعہ سے معلوم ہوا ہے، پیشواؔ کی حسبِ ہدایت سندھیا گائیکواڑ، ہلکر، اور ان کے دوسرے ساتھی اس مرتبہ فیصلہ کن اقدام کے لئے دلّی کی طرف بڑھ رہے ہیں؟"

"واقعی؟ ——— کیا یہ سچ ہے؟ کیا مرہٹے آرہے ہیں؟"

"میں غلط نہیں کہتا، جھوٹ نہیں بولتا، افواہوں پر اعتبار کرنا میرا شعار نہیں اور میں آپ کو ایک اور بات بتاؤں؟"

"فرمائیے، فرمائیے؟"

"سن لیں گے آپ؟ سن سکیں گے آپ؟"

"کہئے، سنوں گا؟"

ل تاریخ ہند از ذکاء اللہ

۔ تو سنیئے اور کان کھول کر سُنئیے، مرہٹے یہ فیصلہ کر کے آ رہے ہیں کہ اس مرتبہ لال قلعہ خالی کرالیں گے، بادشاہ کو معزول کر دیں گے، وہ حکومت جس کی داغ بیل بابر نے ڈالی تھی اور جس کے آفتاب اقبال کو نصف النہار تک عالمگیر نے پہنچایا تھا۔ ہمیشہ کے لئے ختم کر دی جائے گی۔ مرہٹہ حکومت کا دَور شروع ہوگا اور خاندانِ پیشوا کا گل نو دمیدہ بسواس راؤ تختِ حکومت پر متمکن کر دیا جائے گا۔"

یہ سُن کر نجم الدولہ کے ہوش پراں ہو گئے، اُن کے چہرے پر دہشت اور سراسیمگی کی کیفیت طاری ہوگئی۔ انہوں نے نہایت اضطراب کے ساتھ پہلو بدلا۔ اور بڑی غمگین آواز میں کہا:

"پھر! ——————— پھر کیا ہوگا؟ ——————— کیا ہم کچھ نہیں کر سکتے؟ کیا ہم اس طوفان کو نہیں روک سکتے، کیا ہماری زندگی میں یہ سب کچھ ہو جائے گا، اور ہم ایک خاموش تماشائی کی طرح یہ تماشا دیکھتے رہیں گے؟"

اعتبار الملک: "سب کچھ ہو سکتا ہے۔ سب کچھ ممکن ہے، لیکن ہمیں فیروز بخت کے راستے پر چلنا پڑے گا۔ اُس کی رہنمائی قبول کرنی پڑے گی؟ کیا آپ اِس کے لئے آمادہ ہیں؟"

کچھ دیر تک نجم الدولہ سوچتے رہے۔ پھر انہوں نے نظر اُٹھائی اور اعتبار الملک کو دیکھا، دیکھتے رہے، پھر ایک عزم کے ساتھ گویا ہُوئے۔

"ہاں ——————— میں فیروز بخت کی رہنمائی قبول کر لوں گا۔ میں اس کے نقشِ قدم پر چلوں گا، آپ نے میری آنکھیں کھول دیں، واقعی وہ معصوم ہے، وہ غازی ہے، وہ مجاہد ہے۔ ہم نے اِس دیس پر نوسو برس تک دبدبہ اور طنطنہ جاہ و

جلال اور عظمت و شوکت کے ساتھ حکومت کی ہے۔ ہم اس سے دست بردار نہیں ہو سکتے۔ اسلامی حکومت کا پرچم لال قلعہ پر لہراتا رہے گا۔ خواہ ہمارے خون کی ندیاں کیوں نہ بہہ جائیں!"

جوش اور افتخار کے ملے جلے جذبہ کے ساتھ اعتبار الملک نے اُٹھ کر نجم الدولہ کو گلے سے لگا لیا، اور بے ساختہ اُن کے مُنہ سے نکل گیا:

"اللہ اکبر!"

نجم الدولہ نے بھی آواز میں آواز لگائی، اور پُرزور الفاظ میں اس روح پرور اور ایمان آفریں نعرہ کو دُہرایا۔

ایوان کے دُوسرے حصّوں میں نجم الدولہ کے مصاحب اور ندیم، ملول و غمگین بیٹھے تھے۔ نجم الدولہ کی افسردگی نے سب ہی کو افسردہ کر رکھا تھا، لیکن نعرہ کی گُونج نے سب کے دِل ہلا دیئے، اور سب بے ساختہ ایوان کی طرف لپکے، کہ یہ کیا ہو رہا ہے اور وہاں پہنچکر انہوں نے عجیب و غریب منظر دیکھا۔ دو بوڑھے ایک دُوسرے کے سینہ سے چمٹے ہُوئے تھے اور وفورِ مسرت سے بیتاب نظر آ رہے تھے۔ سب کو یہ دیکھ کر حیرت بھی ہُوئی اور خُوشی بھی کہ اعتبار الملک نے کیسا جادو کر دیا کہ نجم الدولہ کا رونا مُرجھا چہرہ پھول کی طرح کھل اُٹھا؛ جب سے وزیر الملک کا انتقال ہُوا تھا، نجم الدولہ کے لب مسکرانا بھُول گئے تھے اور آج تبسّم اُن کے لبوں پر، پھر ایک مُدّت کے بعد کھیل رہا تھا۔

سب لوگ مؤدّب کھڑے ہو گئے۔ نجم الدولہ نے اپنی نشست پر بیٹھتے ہُوئے اعتبار الملک سے کہا:-

"آپ نے آج مجھے ایک نئی زندگی بخشی ہے، صرف زندگی ہی نہیں ایک نیا ولولہ بھی، ایک نیا حوصلہ بھی۔"

ایک مصاحب نے دوسرے مصاحب کے کان میں چپکے سے کہا:۔

"کہیں بڑے میاں شادی پر تو آمادہ نہیں ہو گئے؟"

وہ مسکرا دیا۔ جس کا مطلب تھا۔ "شاید!"

اور یہ کوئی نئی بات تو نہ تھی۔ امرا نے کبھی بڑھاپے کے آگے سپر نہیں ڈالی۔

باب (۶)

انقلاب

فیروز بخت اب تک قید تھا!

نجم الدولہ اور اعتبار الملک بہت کچھ کرنا چاہتے تھے لیکن کچھ نہ کر سکتے تھے!

اور صرف نجم الدولہ اور اعتبار الملک کا کیا ذکر، ساری دِلّی کا، سارے ہندوستان کا یہی حال تھا!

عالمگیر کی آنکھ بند ہوتے ہی مغلیہ خاندان کے ادبار اور زوال کا دَور شروع ہو گیا تھا، اور اب حالت یہ تھی کہ متعدد طاقتور حکومتیں قائم ہو چکی تھیں، جو بظاہر تختِ دلّی کی ماتحت تھیں، لیکن عملاً آزاد اور خود مختار تھیں، فرخ آباد، بریلی، فیض آباد حیدر آباد، اور متعدد دُوسرے راجواڑے۔ لیکن اب ایک نئی طاقت اُبھر چکی تھی، یہ طاقت تھی مرہٹوں کی، شیوا جی کا منتہائے نظر صرف یہ تھا کہ پُونہ کو اپنی راجدھانی بنا کر ایک چھوٹی سی حکومت قائم کر لے۔ اسے اس پر بھی کچھ زیادہ اعتراض نہیں تھا کہ تخت دلّی کی

لہ تاریخ مرہٹہ از گرانٹ ڈوف

بالادستی قائم رہے۔ لیکن اب حالات بدل چکے تھے اور تیزی سے بدل رہے تھے سیواجی کے جانشین صرف پونہ، کولہاپور، ناگپور، اندور، گوالیار وغیرہ پر قناعت نہیں کرنا چاہتے تھے۔ وہ چاہتے تھے اپنا پرچم ظفر دلی پر لہرائیں اور سارے ہندوستان کو اپنا تابع اور محکوم بنالیں۔ وہ اب "مرہٹہ امپائر" کا خواب دیکھ رہے تھے مسلمانوں نے اپنے دورِ حکومت میں عدل و انصاف کا سررشتہ کبھی ہاتھ سے نہیں جانے دیا، وہ باغیوں اور سرکشوں کے ساتھ بھی نرمی اور احسان کا برتاؤ کرتے تھے، سیواجی کو پہلی مرتبہ خود عالمگیر نے معافی دی، اور عزت افزائی کے لئے اپنے مخصوص درباریوں میں اُسے شریک کرلیا[1]۔ لیکن سیواجی کے اخلاف ظلم، جور، سفاکی ہر حربہ کو کام میں لاکر، منزل مقصود تک پہنچنا چاہتے تھے۔ وہ کھیتیاں لوٹ لیتے تھے، آبادیاں ویران کردیتے تھے اُن کی تلوار جس تیزی سے گناہ گار پر چلتی، اُسی روانی سے بے گناہ پر چلتی تھی، وہ کئی مرتبہ یلغار کرتے ہوئے دہلی تک پہنچے تھے، انہوں نے لال قلعہ کو لوٹا، وہاں کا سونا چاندی ہتیایا، وہاں کے ہیرے جواہرات قبضہ میں کئے، شاہی قلعہ کی دیواروں پر، بادشاہ کے جھروکے میں، حمام میں، باغ میں، بارہ دری میں، سونے چاندی اور ہیرے جواہرات کے جو آنکھوں میں چکاچوند کردینے والے کام تھے انہیں غارت کیا محض لالچ میں کہ اس طرح تھوڑا بہت سونا چاندی اور قبضہ میں آجائے گا انہوں نے شہریوں اور دیہاتیوں، امیروں اور غریبوں، شریفوں اور رذیلوں پر پوری مساوات کے ساتھ ظلم توڑے اور ذرا اس کی پروا نہ کی کہ ان حرکتوں کا اثر خود ان کے مستقبل پر کیا پڑے گا۔

---

[1] تاریخ ہند از سمتھ [2] تاریخ ہند از ذکاءاللہ

اور تبدیلیوں کو دیکھتے دیکھتے وہ ذہنی طور پر اس کے لئے بھی تیار ہو گئے تھے کہ مغل امپائر کے بجائے مرہٹہ امپائر قائم ہو جائے تو کیا قباحت ہے؛

مرہٹوں کی آمد آمد نے دِلّی والوں پر کسی حد تک سراسیمگی تو ضرور طاری کر دی تھی لیکن اُن کے اطمینان اور بے فکری میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ وہی محمد شاہ رنگیلے والی بات:۔

اب تو آرام سے گذرتی ہے
عاقبت کی خبر خدا جانے

خدا عاقبت کی خبر جانتا تھا، اور وہ چاہتا تھا کہ یہ بھی جان لیں، لیکن دِلّی والے اپنے حال میں مگن تھے۔ انہوں نے ذرا بھی اس طرف توجہ نہ کی۔ وہ جس حال میں تھے خوش تھے اور ان کا خیال تھا، بڑے سے بڑا انقلاب بھی اُن کی خُوشی اور بے فکری کی نعمت کو نہیں چھین سکتا

دِلّی کی چہل پہل بدستور قائم تھی۔ لیکن نجم الدّولہ کی محل سرا پہ اب تک سوگ چھایا ہُوا تھا۔۔۔۔ "اللہ رے سنّاٹا، آواز نہیں آتی!"

ماہ طلعت غمگین و ملول بیٹھی کچھ سوچ رہی تھی کہ گلشن نے قفلِ سکوت توڑا۔ "حضور! کچھ خبر ہے ہمارے سرکار فیروز بخت جیل سے کب چھٹیں گے؟"

ماہ طلعت بولی۔ "میں نہیں جانتی۔"

پھر وہ مسکرائی اور کہنے لگی۔ "رموزِ مملکتِ خویش خسرواں دانند!"

صنوبر: "آپ ہنس رہی ہیں، اللہ جانتا ہے ہماری تو جان پر بنی ہُوئی ہے!"

گلشن: "ایسے ہے یہ کیوں؟ یہ تو وہی مثل ہُوئی، ماں سے زیادہ چاہے پھاپھا کٹنی کہلائے"

دِلّی والوں کو یہ سُن گُن مل چکی تھی کہ مرہٹوں کا لشکر پھر لال قلعہ کی طرف بڑھ رہا ہے۔ وہ اس سے بھی بے خبر نہ تھے کہ مرہٹے آکر کیا کریں گے اور سارے شہر کی کیا گت بنادیں گے۔ لیکن وہ عیش و نشاط کے خوگر ہو چکے تھے۔ خود انہی کے ایک بادشاہ محمد شاہ نے جب نادر شاہ کے آنے کی خبر سُنی تھی تو کہا تھا۔

اب تو آرام سے گذرتی ہے
عاقبت کی خبر خدا جانے

اور جب شہر پناہ میں نادری فوجوں کے آنے کی خبر سُنی تو جھلا کر ارشاد فرمایا تھا

ایں دفتر بے معنی غرق مے ناب اولٰے

اور یہ کہہ کر شراب کا جام زمردیں ہونٹوں سے لگا لیا تھا۔ آج بھی دِلّی والوں کی افتادِ طبع میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ آج بھی وہ اتنے ہی بے فکر تھے جتنے نادر شاہ کی یلغار کے وقت، اُن کی عیش و نشاط کی مجلسیں اسی طرح قائم تھیں، اُن کے راگ رنگ کی سبھائیں بدستور اپنا کام کر رہی تھیں، اُن کی سرمستیوں اور خود فراموشیوں کا وہی عالم تھا۔ وہ موت کی طرح مرہٹوں کے آنے کو برحق سمجھتے تھے لیکن موت سے پہلے مرنے کے لئے تیار نہ تھے، وہ چاہتے تھے جب تک موت نہیں آتی عیش کرتے رہیں، اور جب موت آ ہی جائے تو با دلِ نخواستہ اُسے لبیک کہیں۔ مستقبل کی تیاریوں کے وہ قائل نہیں تھے۔ اُسے وقت کا ضائع کرنا سمجھتے تھے۔ بادشاہتیں ہر روز اُن کی آنکھوں کے سامنے بدلتی رہتی تھیں، کبھی بادشاہ مار ڈالا جاتا تھا، کبھی قید کر لیا جاتا تھا، کبھی معزول کر دیا جاتا تھا۔ ان خبروں کو سُنتے سُنتے وہ عادی ہو گئے تھے۔ بادشاہت کی تبدیلی اب اُن کے نزدیک روزمرہ کا واقعہ تھا۔ اس میں کوئی ندرت نہیں رہ گئی تھی۔ ان آئے دن کے انقلابو

گلشن کی باتیں سُن کر صنوبر ہنس پڑی۔ ماہ طلعت کے غمگین ہونٹوں پر بھی تبسّم کھیلنے لگا۔

صنوبر نے کہا: "سرکار کچھ اور بھی سُنا؟"

ماہ طلعت نے بے پروائی سے پوچھا: "کیا؟"

وہ بولی: "خدا کرے جھوٹ ہو!"

ماہ طلعت نے کہا: "ارے بھی کیا سُنا؟ کچھ کہو بھی تو، تم تو پہیلیاں بجھوا رہی ہو!"

"سُنا ہے بڑے سرکار، فیروز بخت سے بہت خفا ہیں۔"

گلشن: "ہم نے تو خدا جھوٹ نہ بلوائے کچھ اور بھی سُنا ہے!"

ماہ طلعت: "وہ کیا؟ تم بھی کہہ ڈالو!"

"سُنا ہے بڑے سرکار، شادی کے قول سے بھی پھر گئے ہیں۔"

ماہ طلعت نے یہ باتیں بڑے صبر و تحمّل سے سُنیں، پھر کہا:

"ایک بات میں نے بھی سُنی ہے، نہ جانے جھوٹ ہے یا سچ؟

"وہ کیا میری سرکار؟

"سُنا ہے خدا کسی پر ظلم نہیں کرتا!"

"ہاں ٹھیک ہے حضور!"

"یہ بھی سُنا ہے سچائی کا بول بالا ہو کر رہتا ہے!"

"یہ بھی سچ ہے سرکار!"

"اور یہ بھی سُنا ہے، خدا اپنے نیک بندوں کو آزمانے کے لئے مصیبت کے بھنور میں ڈالتا رہتا ہے!"

"درست! ٹھیک!

"اور میں نے کتابوں میں یہ بھی پڑھا ہے، نیک عمل کبھی ضائع نہیں ہوتا، وہ اپنا پھل ضرور لاتا ہے!"

"ہاں میری مالک یہ بھی ہوتا ہے!"

"پھر اگر ابا حضور آج کسی نیک اور اچھے آدمی سے غلط فہمی کے باعث خفا ہیں تو کل خوش بھی ہو جائیں گے۔"

گلشن۔ "ضرور ایسا ہوگا، اور پھر —————— اور پھر ہماری شہزادی ملکہ بنے گی گھوڑے پر سوار ہو کر نوشہ آئے گا، باجے بجیں گے، گانے کی محفل رچے گی، ناچ ہوگا قوالی ہوگی۔ بڑے مزے آئیں گے، ہاں!"

یکایک صنوبر سنجیدہ ہو گئی، اُس نے فکرمند آواز میں کہا: "لیکن کچھ معلوم بھی ہے الزام کیا لگایا گیا ہے؟ اور اس جرم کی سزا کیا ہے؟"

گلشن۔ "میں نہیں جانتی بتاؤ!"

صنوبر۔ "فیروز بخت پر بغاوت کا الزام لگایا گیا ہے، اور دُنیا جانتی ہے۔ باغی کی سزا موت ہے!"

گلشن اپنی جگہ سے ایک بالشت اُچھل پڑی اور سہم کر اُس نے پوچھا، "اوئی میرے اللہ موت؟"

ماہ طلعت۔ "تم ڈر کیوں گئیں گلشن؟"

گلشن۔ "موت سے کون نہیں ڈرتا حضور! اور وہ بھی جوانی کی!"

ایک اور سہیلی بولی: "تیرے مُنہ میں خاک، مریں اُن کے دشمن!"

ماہ طلعت۔ "تم لوگ بے وقوف ہو، موت کا نام سُن کر کانپ جاتی ہو۔ اور جس کے سر پر موت منڈلا رہی ہے، وہ ہنس رہا ہے، مسکرا رہا ہے!"

گلشن سہم کر بولی۔ "سچ؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے بھلا؟"

ماہ طلعت۔ "تو کیا میں جھوٹ بول رہی ہوں؟ تم نہیں جانتیں، بہادر موت سے کھیلتا ہے وہ اس سے ڈرتا نہیں، اس پر جان دیتا ہے، اری پگلی، مرنا تو ایک دن سب کو ہے لیکن موت موت میں فرق ہوتا ہے!"

صنوبر: "مرنے کے بعد ہر فرق مٹ جاتا ہے!"

ماہ طلعت۔ "تم بھول رہی ہو، میں پھر کہتی ہوں، موت موت میں فرق ہوتا ہے، اور یہ فرق ہمیشہ قائم رہتا ہے..... ! ہر گھنٹے میں نہ جانے کتنے کیڑے مکوڑے مر جاتے ہیں، لیکن کوئی پروا بھی نہیں کرتا۔ ہر روز نہ جانے کتنے جنازے نکلتے رہتے ہیں لیکن کوئی پوچھتا بھی نہیں، کون مرا کون جیا؟ خود ہمارے دوست عزیز اور رشتے دار، مرتے رہتے ہیں، بہت غم ہوا، دو آنسو بہا لئے اور چپ ہو رہے پھر کہاں کا غم اور کس کی یاد؟"

صنوبر۔ "ہاں جانتی ہوں، ہر روز یہی کھیل ہوتا رہتا ہے!"

ماہ طلعت۔ "لیکن جو آدمی سچائی کے لئے جان دیتا ہے، وطن کی عزّت اور ناموس پر اپنا سر کٹاتا ہے، اپنی کسی ذاتی غرض کے لئے نہیں بلکہ محض خدا کی خوشنودی اور رضا جوئی کے لئے موت کو لبیک کہتا ہے، اس کی موت روزمرہ کا واقعہ نہیں ہوتی تاریخ بن جاتی ہے، ملک الموت عزّت کے ساتھ اس کی جان قبض کرتا ہے اور فرشتے احترام کے ساتھ اپنے بازوؤں پر اس کی روح کو جنّت

کے دروازے تک لے جاتے ہیں، ایسی موت پر فخر کرنا چاہیئے۔ فکر کیسی سوگ کیوں؟"

اور یہ کہتے کہتے ماہ طلعت کی آنکھوں میں آنسو ڈھلک آئے۔ لیکن اس نے بہت جلد اپنی کیفیت پر قابو پالیا، اسی اثنا میں نجم الدولہ مردانہ سے زنان خانے میں آئے اور سیدھے بیٹی کے پاس پہنچے، انہوں نے کہا۔

"بیٹی مجھے باہر جانا ہے، ذرا جھپک کے اچھا سا انگرکھا تو نکال لا توشہ خانہ سے!"

صنوبر پوچھ بیٹھی: "کہاں جائیں گے حضور؟"

وہ تن کر بولے،

"اپنے بیٹے کے پاس، اپنے لخت جگر کے پاس!"

صنوبر حیرت سے نجم الدولہ کی طرف دیکھنے لگی، انہوں نے کہا: "تو جانتی نہیں خدا نے مجھے ایک ہی تو بیٹا دیا ہے، اور بیٹا بھی کیسا، مجاہد بھی اور غازی بھی۔ میں وزیر اعظم سے اجازت لے کر اسی سے ملنے جا رہا ہوں!"

صنوبر نے پوچھا۔ "میں نے تو سُنا ہے وہ باغی ہیں!"

نجم الدولہ نے گرجتی ہوئی آواز میں کہا۔ "نہیں وہ مجاہد فی سبیل اللہ ہے وہ سچا مسلمان ہے۔"

صنوبر۔ "آپ۔ ہاں جا کر کیا کریں گے؟

نجم الدولہ۔ "میں اُسے مبارک باد دوں گا۔ اُسے نذر عقیدت پیش کروں گا اُسے اپنے سینہ سے لگا لوں گا۔ اُس کی پیشانی کو بوسہ دوں گا، اور خدا

سے دعا کروں گا کہ مجھے بھی، نہ صرف مجھے بلکہ ہر مسلمان کو اُس کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔"

پھر وہ ماہ طلعت سے مخاطب ہوئے۔

"بیٹی تو کھڑی کیا کر رہی ہے۔ جا میرا انگرکھا نکال لا جلدی سے شاباش!"

اور ماہ طلعت کا چہرہ پھول کی طرح کھِل اُٹھا وہ مسکراتی ہوئی چلی گئی ——!

باب (۷)

مرہٹوں کا عروج

مسلمانوں پر جب کبھی ادبار و زوال کا دَور آیا، خود مسلمانوں کے ہاتھوں، یہ تاریخ کی عجیب و غریب شہادت ہے۔ مسلمان کبھی دُشمن سے نہیں ہارے، انہوں نے کبھی دشمن سے شکست نہیں کھائی، انہوں نے کسی موقع پر بھی اپنے تئیں اتنا کمزور نہیں ہونے دیا کہ وہ لقمۂ تر بن جائیں اور حریف انہیں کھا جائے۔

مسلمانوں پر جب بھی تباہی آئی، اُس کی تہ میں خود مسلمانوں ہی کی سازشیں اور خود غرضیاں کارفرما رہی ہیں، وہ ہمیشہ

سعدی از دستِ خویشتن فریاد

کے شکوہ سنج رہے۔ خود ان کی آنکھوں نے، کانوں نے، ہاتھوں نے، پاؤں نے دل و دماغ نے بغاوت کی، اور اُس کا لازمی نتیجہ تباہی و بربادی اور ہلاکت کی صورت میں رونما ہوا۔

امویوں کا چراغِ سلطنت بجھانے کے لئے خود ایک مسلمان ابومسلم خراسانی[1]

[1] النخری

میدانِ عمل میں اُترا۔ عباسیوں کا دورِ جلال و عظمت، خلافتِ عباسیہ کے وزیر ابن علقمی[1] کی سازشوں سے ختم ہُوا۔ فاطمیوں کا چراغ ایوبیوں کی پھونکوں سے گل ہُوا، ایوبیوں کی قسمت ممالیک کے ہاتھوں پھوٹی، سلجوقیوں کی شوکت و عظمت اور جاہ و جلال کا خاتمہ بھی سلمانوں ہی کے دستِ مبارک سے ہُوا، اندلس میں مسلمانوں کی زبردست اور کامیاب حکومت مسلمانوں کی خانہ جنگیوں اور ہوسِ اقتدار کے باعث ختم ہُوئی۔ ہندوستان میں متعدد خاندانوں نے حکومت کی، یہاں محمد بن قاسم کا پرچم لہرایا، یہاں شہاب الدین غوری نے دادِ رزم آرائی دی۔ یہاں خلجیوں نے کشور کشائی اور جہانبانی کے جھنڈے گاڑے، یہاں خاندانِ غلاماں نے جاہ و جلال کے ساتھ حکومت کی، یہاں محمود غزنوی کا کوکبۂ اقبال پہنچا۔ یہاں مغلوں نے حکومت کی، اور یہ سب باری باری مسلمانوں ہی کے ہاتھوں مارے گئے۔

اب سلطنتِ مغلیہ کا چراغ ٹمٹما رہا تھا، اِس چراغ کو پھونکیں مار کر بجھانے والے مسلمان ہی تھے۔ بابر کی شجاعت، ہمایوں کی حکمت، اکبر کی فراست، جہانگیر کی عظمت، شاہ جہاں کی مذہبیت اور عالمگیر کی صداقت، سیاست، شجاعت اور للہیت نے جس مغلیہ سلطنت کو بامِ عروج پر پہنچایا تھا، وہ اب مسلمانوں کی باہمی آویزش اور ہوسِ اقتدار کی بھینٹ چڑھ رہی تھی۔

اب تک یہ ہوتا آیا تھا کہ مسلمان کی جگہ مسلمان لیتا تھا، ایک مسلمان خاندان گیا دوسرے مسلمان خاندان نے اُس کی جگہ لے لی، بادشاہ بدلتے تھے بادشاہتیں بدلتی تھیں لیکن اسلام کا سکّہ قائم تھا اور اب یہ ہو رہا تھا کہ مسلمانوں کی باہمی رقابتوں

---

[1] فتح الطیب

سازشوں اور خود غرضیوں نے ایک غیر مسلم طاقت کو سہارا دے کر آگے بڑھایا اور کوشش یہ ہونے لگی تھی کہ مسلم حکومت کا نام ہی مٹ جائے اور غیر مسلم حکومت ——— مرہٹہ امپائر ——— قائم ہو جائے۔

دکن میں خاندانِ بہمنیہ کے اختتام کے بعد، تین آزاد اور خود مختار حکومتیں، گولکنڈہ احمد نگر اور بیجاپور کے نام سے دُنیا کے جغرافیہ پر نمودار ہوئیں، اِن تینوں میں نہ اتحاد تھا نہ اتفاق، نہ تعاون نہ خلوص، نہ رفاقت نہ ہمدردی، ان میں کوئی چیز مشترک نہیں تھی، اگر کوئی چیز مشترک تھی تو وہ تھا عناد و اختلاف! ——— مرہٹے ان کے سپاہی تھے مرہٹے اُن کے خزانچی تھے، مرہٹے ان کے اربابِ حل و عقد تھے، سیواجی کو انہی نے پیدا کیا۔ انہی نے پروان چڑھایا، انہی نے اس میں مرہٹہ حکومت قائم کرنے کا ولولہ پیدا کیا۔ اگر کہیں عالمگیر نے ان فتنہ پرور حکومتوں کو کچل نہ دیا ہوتا تو شاید مرہٹہ بہت پہلے سارے ہندوستان کے مالکِ تاج و نگیں ہوتے لیکن اس مردِ مسلمان نے آنے والے خطرہ کو محسوس کیا، اپنی عمر اور صلاحیّت کا بہترین حصّہ دکن میں صَرف کیا، اور اس وقت تک دَم نہ لیا جب تک ان نام نہاد مسلم حکومتوں کو ختم اور رپ دہ نمودپر آنے والی ایک نئی قوت کو مغلوب و مفتوح نہ کر لیا۔

لیکن جیسے ہی عالمگیر کی آنکھیں بند ہوئیں، اس کے بیٹوں اور جانشینوں میں جنگ زرگری شروع ہو گئی[1]۔ یہ اپنی بادشاہت کے لئے مسلمانوں کا نام تک مٹا دینے پر تیار تھے۔ انہیں نہ اسلام سے مطلب تھا، نہ قوم سے نہ ملّت سے، اُن کی للچائی ہوئی نگاہیں تختِ حکومت پر پڑ رہی تھیں، اُن میں سے ہر ایک کی خواہش اور تمنّا یہ تھی کہ

[1] تاریخ ہند از ذکاء اللہ

تاج و تخت پر میرا قبضہ ہو۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ آپس میں لڑتے رہے اور مرہٹے آہستہ آہستہ اپنا راستہ صاف کرتے رہے اور طاقتور ہوتے رہے۔

عالمگیر نے ۹۰ سال کی عمر پائی، اور پچاس سال تک حکومت کی، اور پچاس سال کی مدت میں اُس نے سلطنتِ مغلیہ کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔ اگر اس کے جانشینوں میں ذرا بھی صلاحیت ہوتی، وہ فکر و تدبر سے کام لیتے تو یہ حکومت مزید ۹ سو برس تک اسی شان و آن بان کے ساتھ قائم رہ سکتی تھی، لیکن یہ نااہل اور خود غرض تھے صرف پچاس سال کی مدت میں انہوں نے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس عظیم الشان حکومت کا خاتمہ کر دیا۔۔ ۱۷۰۷ء میں عالمگیر نے وفات پائی اور بکسر کی جنگ میں، یعنی ۱۷۶۴ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی عملاً ہندوستان کی مالک و مختار ہو گئی۔

مرہٹوں کے عروج اور مغلوں کے زوال کی کہانی بڑی دردناک ہے، قدم قدم پر یہ نظر آئے گا کہ مرہٹوں کو آگے بڑھانے والے، ان میں حکومت اور شاہنشاہیت کا ولولہ پیدا کرنے والے، اور ان کو مسلمان حکومت کے استیصال پر آمادہ کرنے والے مسلمان اور صرف مسلمان تھے اور اس مبارک کام کی ابتدا خود عالمگیر اعظم کے نورِ نظر اور لختِ جگر اور جانشین حکومت معظم کے ہاتھوں ہوئی جس نے باپ کی وفات کے صرف چند سال بعد ۱۷۱۲ء میں چند نمائشی شرائط کے ساتھ، مرہٹوں کو ایک مخصوص علاقہ میں چوتھ اور سردیش مکھی کے نام سے ناروا اور ناواجب محاصل وصول کرنے کی اجازت دی۔۔۔۔ پھر جب بادشاہ گر سید خاندان نے وزارت پر قبضہ کر کے عملاً حکومت اپنے ہاتھ میں لی، تو مرہٹے باقاعدہ آلۂ کار کے طور پر استعمال ہونے لگے

ۓ تاریخ ہند از شفاعت احمد خاں   ؎ تاریخ ہند از مارشمین

اس خاندان کے سب سے بڑے حریف اور مخالف اور دشمن نظام الملک کا زور توڑنے کے لئے سید بھائیوں نے مرہٹوں کو دِلّی تک چڑھا لانے میں دریغ نہ کیا۔ دوسری طرف جب بادشاہ نے دیکھا کہ وہ سید خاندان سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا، تو اُس نے بھی درپردہ مرہٹوں سے سازباز شروع کر دی۔ نظام الملک لوہے کو لوہے سے کاٹنے کا فن جانتا تھا، یہ رنگ دیکھ کر اُس نے چاہا کہ دکن پر اپنا تسلّط قائم کرے، اور دربار دہلی سے بالکل بے نیاز ہو کر ایک آزاد اور خود مختار سلطنت کا ہندوستان کے ایک دُور دراز گوشہ میں مالک بن جائے۔ اِس سلسلہ میں اُس نے پہلا قدم جو اٹھایا وہ یہ تھا کہ پُورے دو صوبے گجرات اور مالوہ مرہٹوں کی نذر کر دیئے۔

بخالِ ہندوش بخشم سمرقند و بخارا را

گویا یہ دو صوبے نہیں تھے، ایک بے حقیقت چیز تھی، جس کا موروثی طور پر نظام الملک مالک تھا، اور اُس نے حاتمانہ سخاوت کے ساتھ وہ چیز مرہٹوں کو عطا کر دی، اس طرح مرہٹوں کو پہلی مرتبہ اقتدار اور توسیعِ حکومت کا چسکا پڑا۔ شیر کے منہ کو خون لگ گیا۔ اور اب ان کی نظریں صرف پُونہ تک، صرف دکن تک محدود نہ رہیں، بلکہ سارے ہندوستان پر پڑنے لگیں اور کچھ ہی مدّت کے بعد وہ جھانسی کے شہر پر بھی قابض ہو گئے۔ راجپوت مقاومت نہ کر سکے، اور انہیں آخر کار دست بردار ہونا پڑا، اور کچھ عرصہ بعد بھونسلے کی سرکردگی میں مرہٹہ فوجیں بنگال کی سرسبز اور شاداب سرزمین کو پامال کر رہی تھیں[1]۔

تاریخ بھی اپنے آپ کو کس کس طرح سے دہراتی ہے؛ سعادت خاں ——

---

[1] تاریخِ ہند از ذکاء اللہ کے فیصلہ کن جنگیں

برہان الملک اودھ کا صوبہ دار اور دلّی کا وزیر تھا۔ مرہٹوں کے خون کا پیاسا تھا۔ وہ اس قوم کا نام بھی نہیں سننا چاہتا تھا، وہ اپنی پوری قوت مرہٹوں کے استیصال میں صرف کر دینا چاہتا[1] تھا۔ جو مرہٹوں کا دوست تھا وہ اُس کا دشمن تھا، اور جو مرہٹوں کا دشمن تھا وہ اس کا دوست تھا لیکن جب اُس کا انتقال ہوا تو اودھ کی صوبہ داری اور دلّی کی وزارت اُس کے وارث صفدر جنگ کے ہاتھ میں اور اس کے بعد اس کے سفاک بیٹے شجاع الدولہ کے ہاتھ میں آئی۔ صفدر جنگ افتادِ طبع کے لحاظ سے اپنے پیشرو سے بالکل الگ تھا۔ وہ دوست کو دوست اور دشمن کو دشمن سمجھتا تھا۔ ضرورت اور مصلحت کے پیشِ نظر دوست کو دشمن اور دشمن کو دوست بنانے میں ذرا بھی تامل نہیں کرتا تھا۔ شجاع الدولہ نے فرخ آباد کو تباہ کرنے میں مرہٹوں سے مدد لی، پھر روہیلہ حکومت کا چراغ گل کرنے کے لئے اس نے مرہٹوں سے اور انگریزوں سے مدد لی، اُس نے مرہٹوں سے سمجھوتہ کر لیا اور اپنا کام مرہٹوں کے سپرد کر دیا یعنی وہ روہیلوں کا قلع قمع کریں۔ مرہٹے اس کارِ خیر پر آمادہ ہو گئے۔ انہوں نے ایک تو شمالی ہند میں زمین کا ایک معقول ٹکڑا حسنِ خدمات کے صلہ میں حاصل کیا، دوسری طرف روہیلکھنڈ کے صدہا دیہاتوں کو جلا کر خاکستر کر دیا۔ بے اندازہ مال و دولت حاصل کیا۔ شریفوں کو ذلیل اور ذلیلوں کو معزز کر دیا[2]۔ معصوم اور پاکباز خواتین کی عصمت تک محفوظ نہ رہی۔ ایک عرصہ دراز تک روہیلکھنڈ کا علاقہ ویران و سنسان اور خزاں دیدہ بنا رہا۔

صفدر جنگ مرہٹوں کا یارِ صادق اور محبّ واثق تھا۔ مرہٹوں پر اس درجہ اعتماد کرتا تھا کہ ۱۱۶۴ھ میں جب احمد شاہ ابدالی نے دوبارہ ہندوستان پر حملہ کیا اور شہنشاہ

---

[1] تاریخ اودھ۔ [2] تاریخ ہند از ذکاءاللہ

دہلی نے پنجاب اور ملتان دے کر اُس سے صلح کر لی، تو اُس نے بادشاہ سے اصرار کیا کہ مرہٹوں سے فوجی مدد لی جائے اور ابدالی کو ویسی ہی شکست دی جائے جیسے کہ ۱۷۴۸ء[1] میں سرہند کے قریب مغلیہ فوجوں نے احمد شاہ کے داخلۂ ہند کے موقع پر دی تھی لیکن شہنشاہ نے یہ تجویز نہیں مانی، وہ مرہٹوں پر ابدالی کو ترجیح دیتا تھا۔ وہ نئے نئے علاقے مرہٹوں کی تحویل میں دینے کے بجائے اسے گوارا کرتا تھا کہ ابدالی ان پر قابض اور متصرف ہو جائے۔ اس معاملہ میں جب اختلاف زیادہ بڑھا، تو بادشاہ نے صفدر جنگ کو بے دخل کر دیا۔ نظام الملک مر چکا تھا۔ اس کے پوتے شہاب الدین عرف غازی الدین عماد الملک کو وزارتِ عظمےٰ کا منصب سونپ دیا، اور اُسے سیاہ و سفید کا مالک و مختار بنا دیا۔

تاریخ اپنے آپ کو ایک مرتبہ پھر دہراتی ہے!!

صفدر جنگ کو مرہٹوں کی دوستی پر بڑا گھمنڈ تھا، لیکن مرہٹے اُسے صرف اپنا آلۂ کار سمجھتے تھے۔ جب وہ وزارت سے معزول ہوا، تو اُس نے بادشاہ کا حکم ماننے سے انکار کر دیا اور غازی الدین کے مقابلہ میں تن کر کھڑا ہو گیا۔ کئی ماہ تک دلی کی گلیوں میں، اور سڑکوں پر غازی الدین اور صفدر جنگ کی فوجوں میں خونریزی ہوتی رہی آخر تنگ آ کر غازی الدین نے مرہٹوں سے امداد طلب کی، مرہٹے فوراً صفدر جنگ کے خلاف اور غازی الدین کی حمایت میں اپنی فوجیں لے کر پہنچ گئے۔ اب صفدر جنگ کے مقابلہ میں غازی الدین کا پلّہ بھاری تھا اور صفدر جنگ کے سامنے فرار یا شکست کے سوا کوئی دوسرا راستہ نہ تھا۔ آخر ان نامساعد حالات سے مایوس اور دل برداشتہ

---

[1] تاریخ ہند مؤلفہ ذکاء اللہ

ہو کر وہ اودھ واپس چلا گیا، اور مرہٹوں کی مدد سے غازی الدین کا طوطی بولنے لگا۔
یہ انقلاب بھی کتنا عجیب اور حیرت انگیز تھا۔ اب مرہٹے صفدر جنگ کے طرفدار نہ
تھے۔ عماد الملک غازی الدین کے حامی و ناصر تھے اور غلبہ و تفوق اُسی کو حاصل
ہو سکتا تھا جس کا مرہٹے ساتھ دیں۔

فاعتبروا یا اولی الابصار

لیکن معاملہ یہیں نہیں ختم ہو جاتا!
مرہٹے ایک قدم اور آگے بڑھتے ہیں، اُن کی تائید و حمایت ایک نیا گل
کھلاتی ہے۔
صفدر جنگ کے جانے کے بعد عماد الملک غازی الدین ایک مطلق العنان
فرماں روا تھا، گویا وہ بادشاہ تھا اور بادشاہ غلام، وہ جو چاہتا تھا کرتا تھا۔ بادشاہ کو
خاطر میں بھی نہیں لاتا تھا۔ یہ صورتِ حال بادشاہ سے برداشت نہ ہو سکی۔ غازی الدین
بادشاہ کی سرکشی برداشت نہ کر سکا۔ اُس نے پھر ایک مرتبہ مرہٹوں کی طرف دیکھا اور
مرہٹے اپنے اس یارِ غار کی طرف لبیک کہتے ہوئے بڑھے، عماد الملک غازی الدین
نے بادشاہ کو گرفتار کر لیا، اور اُس کی آنکھیں نکلوا کر اُسے اندھا کر دیا۔ خاندانِ مغلیہ
میں شہزادوں اور تختِ شاہی کے آرزومندوں کی کمی تو تھی نہیں۔ عماد الملک
غازی الدین نے شطرنج کے ایک مہرہ کو پھینک دیا اور ایک دوسرا مہرہ بٹھا دیا۔
کل تک جس بادشاہ کے پھاٹک پر نوبت اور نقارے بجتے تھے، آج وہ بے بس
بے کس اور اندھا تھا، اور اُس کی جگہ پر عالمگیر ثانی کے پُر رعب دہشت انگیز
لیکن کھوکھلے نام سے ——— برعکس نہند نام زنگی کافور ——— ایک

دوسری مورثٹ تخت پر بیٹھ گئی۔

مرہٹوں کے عہد بہ عہد ارتقا پر غور کیجئے۔ عالمگیر اعظم کے وصال کے بعد جب انہوں نے سر اُٹھایا تو وہ صرف چوتھ اور سر دیش مکھی (محاصل) ایک محدود علاقہ میں وصول کرنے مجاز تھے۔ پھر ان سے مدد طلب کی جانے لگی۔ گویا ان میں یہ احساس پیدا کر دیا گیا کہ وہ بہت کچھ ہیں۔ وہ جو چاہیں کر سکتے ہیں، وہ جس کی مدد کریں گے۔ وہی بالا رہے گا، وہ جس سے منہ پھیر لیں گے، اُسے ناکام و نامراد رہنا پڑے گا اب وہ برسر اقتدار پارٹیوں کی مدد کرکے اپنا اقتدار قائم کرنے لگے۔ انہوں نے نظام الملک کی مدد سے مالوہ اور گجرات پر قبضہ کر لیا[۱]۔ انہوں نے صفدر جنگ کی شہ پاکر روہیلوں کو کچلا اور روہیلکھنڈ کو برباد کر دیا، اور شمالی ہند میں ایک علاقہ بھی حاصل کر لیا، انہوں نے غازی الدین کے بلاوے پر دلّی پہنچکر بادشاہِ وقت کو قید کرایا، اور اُس کی آنکھیں نکلوانے کا تماشہ دیکھتے رہے۔ انہیں معلوم ہو گیا کہ وہ اب تک احساس کمتری کی مصیبت میں گرفتار تھے۔ اب وہ احساس برتری کے نشہ میں چور ہو گئے، جو کچھ ان کے پاس تھا، اُس پر وہ قناعت کرنا نہیں چاہتے تھے، اب وہ سارے ہندوستان کو اپنا مقبوضہ بنا لینے کی فکر میں تھے!

اور دِلّی کی شہنشاہیت، دم توڑ رہی تھی! کوئی نہ تھا جو اس مریضِ جاں بلب کو بچا سکتا، کوئی نہ تھا، جو اُس مردِ بیمار میں زندگی کی امنگ اور ترنگ پیدا کر سکتا، کوئی نہ تھا جو اس بے جان لاشہ میں زندگی کی حرارت دوڑا سکتا۔

اُس زمانہ میں دِلّی کی اور دِلّی کی شہنشاہیت کی کیا حالت تھی؟ کیا ـــــــ

---

۱ تاریخ ہند از ذکاء اللہ ۲ تاریخ ہند از کستھ

ایک مورخ کے الفاظ میں یہ نہ تھی ——— ؟

۱۷۰۷ء میں شہنشاہ عالمگیر اورنگ زیب کی وفات کے وقت سلطنت مغلیہ کا پرچم افغانستان سے لے کر بنگالہ تک اور شمال میں ہمالیہ سے لے کر راس کماری تک اپنے پورے جاہ و جلال سے اُڑ رہا تھا لیکن اب پچاس سال بعد بھی وہ سلطنت تھی جو پارہ پارہ ہو چکی تھی پنجاب اور ملتان، ابدالی کے ماتحت تھے۔ بنگال اور بہار پر علی وردی خاں کی حکومت تھی۔ اودھ میں صفدر جنگ خود مختار تھا۔ دکن میں نظام الملک کے فرزند حکرانی کر رہے تھے، گجرات، مالوہ اور مرہٹواڑی پر مرہٹوں کا قبضہ تھا۔ لیکن یہ (مرہٹے) ہر جگہ اور ہر علاقہ میں چوتھ اور سردیش مکھی وصول کر رہے تھے۔ شہنشاہ مغلیہ کی برائے نام سلطنت صرف دہلی اور اس کے نواح تک محدود تھی، یہ مرہٹے ہی تھے جو اس وقت پنجاب اور ملتان کو چھوڑ کر کل ہندوستان کے مالک بنے بیٹھے تھے۔[1]

---

[1] ہندوستان کی فیصلہ کن جنگیں

باب (۸)

سخت مشکل!

عمادالملک غازی الدینؒ نے فیروز بخت کو قید کرلیا تھا، اُس کے مخبروں نے ثبوت فراہم کردیا تھا کہ فیروز حکومت کا تختہ اُلٹنے کے لئے مجاہدین کی ایک فوج تیار کر رہا ہے اور اُس نے جہاں پناہ کو فیروز کے خون کا پیاسا کر دیا تھا۔ وہ اسے اپنا اور اپنی مملکت کا بدترین دشمن سمجھنے لگے تھے۔ جس شخص کے دبدبہ اور طنطنہ کا یہ عالم ہو کہ وہ بادشاہِ وقتؒ کی آنکھیں تک نکلوا دے اُس کے لئے کیا دشوار تھا کہ وہ فیروز بخت کو قتل کر دیتا پھر وہ ایسا کیوں نہیں کر سکا، بات یہ تھی کہ فیروز بخت کا قتل کر دینا تو بہت آسان تھا۔ لیکن اس کا انجام بھگت لینا آسان نہیں تھا۔ فیروز بخت بہت بڑی طاقت تھا، وہ دبیرالملک کا لڑکا تھا، نجم الدولہ کا داماد تھا۔ یہ راز بھی اب راز نہیں

ؒ نظام الملک آصف جاہ (حیدرآباد دکن) کا پوتا تھا۔ نہایت سنگدل، خودغرض، موقعہ شناس نظام الملک کے بعد دلی کی وزارت اسے ملی۔ مرہٹوں کے عروج اور چھوٹی ہمسایہ مسلم حکومتوں کی شکست و ریخت میں اُس نے جو کام کئے وہ تاریخ کا سیاہ ترین صفحہ ہے، جسے فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

ؒ تاریخ ہند از ذکاءاللہ

تھا کہ اعتبار الملک کی تائید و حمایت اُسے حاصل تھی۔ یہ رکاوٹیں اگرچہ بڑی تھیں، لیکن غازی الدین کے لئے ان پر عبور حاصل کر لینا کچھ زیادہ مشکل نہیں تھا۔

پھر کیا بات تھی آخر ——— ؟

اصل بات کچھ اَور تھی، اور یہی بات تھی جس سے غازی الدین عماد الملک حد درجہ خائف تھا، مرہٹوں کے عروج، اور خاندانِ مغلیہ کے زوال نے وقت کے رئیسوں اور دولت مندوں، جاگیرداروں اور زمینداروں، تاجروں اور پیشہ وروں، عامیوں اور عالموں، درویشوں اور صوفیوں پر باستثنا چند ذرا بھی اثر نہیں کیا تھا۔ سب بے فکری اور آسائش کی زندگی گزار رہے تھے، کسی کو یہ فکر نہیں تھی کہ کل کیا ہوگا؟

لیکن ایک قدسی صفت شخصیت تھی جو مغلیہ خاندان نہیں، مسلمانوں کے زوال کو درد اور تکلیف کے ساتھ دیکھ رہی تھی۔ یہ شخصیت حضرت شاہ ولی اللہ[1] صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تھی۔ شاہ صاحب کی فراستِ ایمانی دیکھ رہی تھی کہ آج کیا ہو رہا ہے کل کیا ہونے والا ہے؟ اور وہ آنے والے کل کے لئے لوگوں کو تیار بھی کر رہے تھے۔ انہوں نے مِلّت کے ہر طبقہ کو اپنی درد بھری صدا سے جھنجھوڑا تھا۔ انہوں نے سلاطینِ اسلام کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا تھا:

"تلواریں کھینچ لو، اور اس وقت تک نیام میں داخل نہ کرو، جب تک اہلِ کفر و فسق کے سرگروہ، کمزور نہ ہو جائیں، اور اُن کے قابو میں کوئی ایسی بات نہ رہ جائے جس کی بدولت وہ آئندہ سر اٹھا سکیں"[2]

---

[1] تذکرہ شاہ ولی اللہ [2] تذکرہ شاہ ولی اللہ

امیروں اور ارکانِ دولت کو انھوں نے مخاطب کرتے ہوئے فرمایا تھا:۔

"کیا تم خدا سے نہیں ڈرتے ؛ دُنیا کی فانی لذتوں میں تم ڈوبے جارہے ہو تمہاری ساری ذہنی قوتیں اس پر صَرف ہو رہی ہیں کہ لذیذ کھانے پکواتے ہو، لوگوں نے اونچے اونچے محل اس لئے کھڑے کئے ہیں کہ ان میں زناکاری کی جائے اور شرابیں ڈھالی جائیں، جوا کھیلا جائے، مگر تم دخل نہیں دیتے!

فوجیوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:۔

"تمہیں خدا نے جہاد کے لئے پیدا فرمایا تھا، لیکن تم شرابیں پیتے ہو زیادتیاں اور ظلم کرتے ہو، تم عنقریب اللہ کی طرف واپس جاؤ گے۔ پھر وہ تمہیں بتائے گا جو کچھ تم کیا کرتے تھے!

پھر علماء مشائخ، واعظ، زاہد، صنعت کار، اور دوسرے طبقوں کو مخاطب کرنے کے بعد اُمّتِ مسلمہ سے خطاب فرمایا اور کہا:۔

"آدم کے بچّو!

تمہارے اخلاق سو چکے ہیں، تم پر شیطان نے قابو پا لیا ہے حرام کو تم نے خوشگوار بنا لیا ہے۔ حلال تمہارے لئے بدمزہ ہو چکا ہے۔[1]

یہ دردبھری پکار کسی کے کانوں تک پہنچی، کوئی بہرہ بنا رہا۔ لیکن فیروز بخت نے دل کے کانوں سے اس پکار کو سُنا، وہ نوجوان تھا، دولت کا انبار اُس کے قدموں سے

---

[1] تذکرہ شاہ ولی اللہ

لگا رہتا تھا، عیاشی کے لئے وقت بھی تھا، روپیہ بھی، اور فرصت بھی۔ اگر وہ خانقاہ ولی اللّٰہی تک نہ پہنچتا، تو وقت کے دُوسرے رئیسوں کی طرح وہ بھی عیش و عشرت میں کھو جاتا، لیکن اُس نے اپنے دَور کے سب سے بڑے صُوفی۔ صوفی، صافی شیخِ وقت اور کیمیاگر کو دیکھ لیا تھا، اور اس خانقاہ کی برکت اور شاہ صاحب کے فیض سے وہ نوجوان صالح بن گیا تھا، وہ نماز پڑھتا تھا، روزے رکھتا تھا، غریبوں کی مدد کیا کرتا تھا۔ حق کا ساتھ دیتا تھا، باطل کے مقابلہ میں ڈٹ جاتا تھا، موت کی دہشت اس کے دِل سے نکل چکی تھی، عروسِ حُرّیت نے اپنا جلوہ صد رنگ دکھایا تھا، وہ تنہا نہ تھا، اُس کے پاس دوستوں اور جاں نثاروں کا ایک گروہ تھا، اُس کے پاس سرفروش سپاہیوں کا ایک دستہ تھا، وہ تنہا دِلّی میں خوں ریزی کرسکتا تھا، لیکن وہ اپنی قوت صحیح حریف کے مقابلہ میں صَرف کرنا چاہتا تھا۔ اِس انقلاب سے خود فائدہ نہیں اُٹھانا چاہتا تھا، نہ اُسے بادشاہت کا سَودا تھا، نہ وزارت کی ہوس۔ وہ انقلاب چاہتا تھا۔ اپنے لئے نہیں، اپنی قوم کے لئے، اپنے ملک کے لئے!

غازی الدین عماد الملک نے پہلے کوشش کی کہ فیروز بخت کو اپنے ساتھ ملائے لیکن وہ غازی الدین کی رشت سے واقف تھا، اُس نے آلۂ کار بننے سے انکار کر دیا۔ غازی الدین اپنی یہ توہین نہ سہہ سکا۔ اُس نے بغاوت کے الزام میں ایک روز اُسے گرفتار کرلیا اور پھر شاہ شطرنج عالمگیر ثانی کے سامنے پیش کر کے اُسے غیر معیّن مدت کے لئے اسیرِ زنداں کر دیا۔

لیکن اب حالات تیزی سے بدل رہے تھے۔ غازی الدین کو طاقتور ساتھیوں اور رفیقوں کی ضرورت تھی۔ وہ فیروز بخت کو قتل نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ہر قیمت پر، ہر شرط پر

اسے اپنا ساتھی بنالینا چاہتا تھا، اسی مقصد کے پیش نظر اُس نے پہلے دوسرے ذرائع سے فیروز بخت کو ہمرنگ اور ہمنوا بنانے کی کوشش کی، جب اِس طرح کامیابی نہیں ہوئی تو اُس نے اعتبار الملک کو بلایا اور کہا۔

"فیروز بخت راہِ راست پر نہیں آتا، نجم الدولہ بھی اُسے راہِ راست پر نہ لاسکے"

اعتبار الملک نے جواب دیا۔ "آپ صحیح فرماتے ہیں، وہ بڑا ضدی اور خود سر ہے کسی کو نہیں مانتا!"

غازی الدین۔ "میری یہ تلوار آن کی آن میں اس کی ضد اور خود سری کا خاتمہ کر سکتی ہے لیکن ——!"

اعتبار الملک، غازی الدین کی کمزور رگ سے واقف تھے۔ انہوں نے پوچھا۔ "پھر آپ اسے کام میں کیوں نہیں لاتے؟"

غازی الدین۔ "مجھے اس کی جوانی پر رحم آتا ہے، اس کے وفادار باپ کی رُوح سے شرم آتی ہے!"

اعتبار الملک نے چھیڑتے ہوئے کہا۔ "اور واقعی وہ ہے بھی بڑا نالائق!"

غازی الدین۔ "میں اُسے سرفراز کرنا چاہتا ہوں، اس سے سلوک کرنا چاہتا ہوں، میں چاہتا ہوں وہ ترقی کرے!"

اعتبار الملک۔ "بڑا مبارک خیال ہے، لیکن ایک بات عرض کروں؟"

غازی الدین۔ "فرمائیے۔"

اعتبار الملک۔ "کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ آپ خود اس سے گفتگو کریں؟ ممکن ہے وہ راہِ راست پر آجائے!"

یہ نیا مشورہ سُن کر غازی الدین سوچ میں پڑ گیا، رائے صاحب نظر آئی، آمادہ ہو گیا لیکن احتیاط کے ساتھ،

غازی الدین۔ "آپ کی رائے قابلِ غور ضرور ہے، لیکن اس پر عمل کرتے ہوئے جھجکتا ہوں"

اعتبار الملک نے پوچھا۔ "یہ کیوں؟" غازی الدین نے ماتھے پر شکن ڈال کر کہا۔ "اس نے مجھ سے بھی ویسی ہی باتیں کیں، جیسی وہ دربار میں جہاں پناہ کے سامنے کر چکا ہے تو بہت بُرا ہوگا   پھر وہ اپنی جان سلامت نہ لے جا سکے گا"

اعتبار الملک: "تو یہ بہت اچھا ہوگا۔ آخر قصّہ تو ختم ہو کسی طرح!"

غازی الدین: "لیکن میں نے آپ سے کہا تو میں اسے ابھی قتل کرنا نہیں چاہتا۔ اگر وہ میرا ساتھ نہیں دینا چاہتا نہ دے، قید ہی میں سڑتا رہے!"

اعتبار الملک کو غازی الدین کی اس بے بسی پر لطف آ گیا۔ انھوں نے کہا: "میں آپ کی جگہ ہوتا تو اب تک کب کا قتل کر چکا ہوتا اُسے، وہ اسی قابل ہے"

غازی الدین۔ "یہ تو میں بھی جانتا ہوں، لیکن مصلحت بھی تو کوئی چیز ہوتی ہے؟"

اعتبار الملک: "مصلحت؟ یہ کیا فرمایا آپ نے؟"

غازی الدین۔ "آپ کو معلوم ہے، خانقاہ کا عوام پر کتنا اثر ہے، آپ یہ بھی جانتے ہوں گے۔ فیروز بخت شاہ ولی اللہ صاحب کے خاص مسترشدین میں ہے، شاہ صاحب اُس کا بہت لحاظ اور خیال کرتے ہیں۔ اس کی ہلاکت ایک نئے ہنگامہ کا پیش خیمہ ہو سکتی ہے۔ شاہ صاحب اب تک کھُل کر میدان میں نہیں آئے ہیں، پھر آ جائیں گے اور قیامت برپا ہو جائے گی!"

اعتبار الملک کو دل ہی دل میں ہنسی آگئی، لیکن وہ پوری طرح سنجیدہ بنے بیٹھے رہے۔ انہوں نے کہا: "معاف کیجئے گا، مجھے آپ کی رائے سے اتفاق نہیں ہے!"

غازی الدین۔ "کیوں؟ کیا آپ سمجھتے ہیں اس کے قتل پر کوئی ہنگامہ نہیں اٹھ کھڑا ہوگا؟"

اعتبار الملک۔ "جی ہاں میرا یہی خیال ہے، جب اس کی گرفتاری اور سزایابی پر کوئی ہنگامہ نہیں ہوا، تو قتل پہ کیوں ہوگا؟"

یہ کہتے کہتے اعتبار الملک مسکرا دیئے، اپنے تبسم پر وہ قابو نہ رکھ سکے۔ لیکن خیریت یہ گذری کہ غازی الدین نہیں دیکھ پایا۔

غازی الدین نے کہا: "آپ تو حالات سے بالکل ناواقف معلوم ہوتے ہیں ——— کچھ خبر بھی ہے آپ کو؟"

اعتبار الملک۔ "جی بالکل نہیں، فرمائیے، کوئی خاص بات ہے؟"

غازی الدین۔ "جی ہاں ——— طوفان سے پہلے سمندر کی سطح ہمیشہ ساکن رہی ہے۔"

فیروز بخت کی گرفتاری نے خانقاہ (دلی اللّٰہی) میں جو اضطراب اور عوام میں جو ہیجان پیدا کر دیا ہے وہ کوئی گل کھلائے بغیر نہیں رہے گا۔ میرا تو یہ خیال ہے کہ زیادہ مدت تک اُسے قید بھی نہیں رکھا جا سکتا۔"

اعتبار الملک۔ "کیا فرمایا قید بھی نہیں رکھا جا سکتا؟"

غازی الدین۔ "جی ہاں، حالات ایسے ہی ہیں۔"

اعتبار الملک۔ "پھر کیا کیا جائے؟ عجیب مصیبت ہے۔"

غازی الدین۔ "آپ ہی بتائیے کچھ؟ آپ کی کیا رائے ہے؟"

اعتبار الملک۔ "کچھ نہ کچھ تو آپ نے بھی ضرور سوچا ہوگا؟"

غازی الدین۔ "میرا خیال ہے آپ کی رائے صائب ہے ——— مجھے خود
نیروز بخت سے گفتگو کرنی چاہیے!"
اعتبار الملک۔ "بہت مناسب خیال ہے!"
غازی الدین: "اگر وہ راہِ راست پر آگیا، تو خیر، نہ آیا تو بھی آپ سفارش کر دیجئے
گا۔ میں رہائی کے احکام جاری کر دوں گا!"
اعتبار الملک اب اپنی ہنسی نہ ضبط کر سکے، وضع اور آداب مجلس کے بالکل
برخلاف انہیں ہنسی آگئی، غازی الدین چونک پڑا۔
غازی الدین۔ "آپ کو ہنسی کیوں آئی؟"
اعتبار الملک: "ہنسی یوں آئی کہ آپ نے از راہِ ذرہ نوازی مجھے یاد فرمایا تھا، کہ
اس کانٹے کو راستہ سے ہٹانے کی کوئی ترکیب بتاؤں؟ اتنی دیر تک
دماغ چاٹتا رہا، آپ کا۔ لیکن خاک سمجھ میں نہ آیا۔ آخر بات سوجھی تو آپ ہی
کو، سچ ہے ——— جائے استاد خالی است!"
غازی الدین بھی مسکرا دیے: انہوں نے کہا۔ "تو یہ رائے آپ کو پسند آگئی؟"
اعتبار الملک۔ "بہت زیادہ! اس سے بڑھ کر صائب رائے کوئی اور ہو ہی نہیں
سکتی حضورِ والا!"
غازی الدین۔ بس تو پھر یہی طے ہے، اب آپ اتنا کیجئے، کل اسی وقت میں اسے
جیل سے یہاں بلواؤں گا۔ آپ بھی تشریف لے آئیے گا!"
اعتبار الملک۔ "مجھے کوئی عذر نہیں حاضر ہو جاؤں گا ——— لیکن ایسا کبھی
نہ کیجئے کہ مجھے جیل بھیج دیجئے!"

غازی الدین اس وقت بہت بدحواس تھا، چونک پڑا۔ "آپ کو جیل بھیج دوں؟ کیا مطلب؟"

اعتبار الملک مسکرا دیئے۔ انہوں نے کہا۔ "نہیں یہ مطلب نہیں، میرا مقصد یہ تھا کہ جیل جاکر اسے اپنے ہمراہ دربدولت تک لاؤں، شاید اس طرح حالات زیادہ مناسب رہیں!"

غازی الدین اچھل پڑا، خوش ہو کر بولا۔ "بہت خوب، بہت خوب، یہی مناسب ہے!"

پھر یہ راز کی مجلس برخاست ہوگئی، دونوں نے ایک دوسرے سے مصافحہ کیا اور رخصت ہوگئے، ان میں سے ایک کے چہرے پر تبسم کھیل رہا تھا۔

باب (۹)

نئی بات

ماہ طلعت کا چہرہ ہنستا تھا، دِل روتا تھا، وہ اپنی رفتار و گفتار سے کبھی طرح یہ ثابت نہیں ہونے دیتی تھی کہ ملول و غمگین ہے، اس کے دِل پہ آرے چل رہے ہیں، اُس کی رات کی نیند اور دِن کا چین حرام ہے، وہ باتیں کرتی تھی۔ لیکن اُس کا دماغ کہیں اور ہوتا تھا۔ وہ باتیں سنتی تھی، لیکن نہ جانے کیا سوچا کرتی تھی، وہ محل سرا کی چہل پہل میں، ہنگامہ آرائیوں اور نشاط انگیزیوں میں حصّہ لیتی تھی۔ لیکن سچی مسرت اور سچّی خوشی اس سے کوسوں دُور تھی۔ اسے فیروز بخت کی اسیری کا غم کھائے جا رہا تھا وہ خُدا سے دُعا مانگا کرتی تھی۔ "اے دلوں کی فریاد سننے والے، تو میری یہ راحت آسائش چھین لے، اور مجھے بھی ویسی تکلیفیں اور مصیبتیں عطا فرما جو فیروز کے مقدر میں لکھ چُکا ہے۔"

وہ سوچا کرتی تھی، میں یہاں اچھے سے اچھا کھاتی ہوں، لیکن اُس بدبخت کے حصّہ میں سوکھی روٹیاں آتی ہوں گی۔ مجھے برف سے زیادہ ٹھنڈا پانی ملتا ہے لیکن وہ نیم گرم پانی پر گذر کرتا ہوگا۔ میرا جی بہلانے کے لئے ہمجولیں سہیلیوں، لونڈیوں،

اور باندیوں کے پرے کے پرے ہیں، وہ مجھے کہانیاں سُناتی ہیں، لطیفے سُناتی ہیں، لیکن وہ؟ ـــــ اُس کے ندیموں اور رفیقوں میں ہتکڑی اور بیڑی کی جھنکار کے سوا کون ہوگا؟ میرے سَر میں ذرا سا درد بھی ہوتا ہے تو ایک سے ایک بڑھ کر حکیم موجود، نصیب دشمناں اُس کی طبیعت خراب ہوتی ہوگی تو علاج کون کرتا ہوگا؟ موئے دشمنوں کو کیا پڑی ہے کہ اُس کی تیمارداری اور دوا دارو کریں، وہ تو دل سے چاہتے ہیں وہ اس دُنیا سے کنارہ کر جائے۔ مجھے کبھی اعضاشکنی کی شکایت محسوس ہوتی ہے تو ہاتھ پاؤں دبانے کے لئے لونڈیاں اور باندیاں رات رات بھر موجود رہتی ہیں۔ لیکن اس بیچارے کی بات پوچھنے والا کوئی بھی نہیں!

یہ سوچتے سوچتے اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آتے، وہ رونے لگتی، اور پھر جلدی سے آنسو دامن سے پونچھتی اور دل ہی دل میں کہتی۔ "یہ مجھے کیا ہوگیا ہے؟ میں رو کیوں رہی ہوں؟ وہ لٹیرا اور ڈاکو نہیں ہے، وہ قاتل اور چور نہیں ہے۔ وہ اپنے دین کا سرفروش سپاہی ہے، وہ اپنی قوم کا دِلاور سورما ہے، وہ اپنے وطن کا بانکا جوان ہے، یہ ساری تکلیفیں وہ اپنے آرام و آسائش کے لئے نہیں اپنی قوم کی سربلندی کے لئے جھیل رہا ہے، وہ اپنے لئے کچھ نہیں چاہتا۔ صرف یہ چاہتا ہے کہ اس کی قوم کا بیڑا پار ہو جائے اس کی قوم کو جن ذلتوں اور مصیبتوں سے سابقہ پڑ رہا ہے۔ اُن سے نجات مِل جائے۔ مجھے فخر کرنا چاہئے کہ وہ اتنا بڑا آدمی ہے، وہ قید میں ہے۔ لیکن اُس کے دبدبے سے جہاں پناہ اور وزیرِ اعظم دونوں ہراساں ہیں، وہ بے بس ہے۔ لیکن اُس کی طاقت سے مرہٹے تک لرزتے ہیں، وہ جیل کی تنگ و تاریک کوٹھڑی میں رسن بستہ پڑا ہے لیکن اس کا ذکر عزت اور احترام کے ساتھ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کی خانقاہ تک میں

ہوتا ہے۔ مجھے اس پر فخر ہے، میرے لئے اِس سے بڑھ کر خوش قسمتی کی بات کیا ہو سکتی ہے کہ میں اس سے منسوب ہوں، وہ میرا ہے، میں اُس کی ہوں دُنیا کی کوئی طاقت مجھے اس سے یا اُس کو مجھ سے جُدا نہیں کر سکتی۔

پھر وہ سوچنے لگی، کیا میں اس کی کوئی خدمت نہیں کر سکتی؟ دِل سے جواب ملا "تو ایک بے بس عورت ہے، دُعا کے سوا کچھ نہیں کر سکتی!"

اور یہ جواب سنتے ہی وہ مصلّے پر بیٹھ گئی، اور بڑی دیر تک اپنے قادر و توانا معبود سے نہ جانے کیا کیا دُعائیں مانگتی رہی، اُس کے مُنہ سے نکلے ہوئے بول، خدا کے سوا کوئی اور نہیں سن سکتا تھا۔ مصلّے سے جب وہ اُٹھی تو اس کا مرجھایا ہوا چہرہ پھر تر و تازہ نظر آرہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا، جیسے سکون کی چھینی ہوئی دولت پھر مل گئی، ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اُس کے رب نے اُس کے دِل کی مراد پوری کر دی، اب وہ بہت خوش تھی، بہت خوش!

تھوڑی دیر میں کھانے کا وقت آیا، خادمہ آئی، اور اُس نے کہا۔ "سرکار خاصہ تیار ہے! ــــــ اب تو کھا لیجئے، کئی وقت ہو گئے۔ آپ کے مُنہ تک کھیل کا ایک دانہ بھی اُڑ کر نہیں گیا!"

ماہ طلعت مسکرائی "تم نہیں مانتیں، تو کھا لوں گی، لے آؤ، اب؟"

وفادار خادمہ خوش ہو گئی، اُس نے چٹ پٹ بلائیں لیں، اور کہا۔ "بیٹی جُگ جُگ جیو، دودھوں نہاؤ، پوتوں پھلو۔ تم ہی سے ہماری خوشی ہے، تمہی سے ہماری زندگی ہے!"

ماہ طلعت نے کہا "بڑی بی، ایسی باتیں نہ کرو، خوشی، زندگی، رنج، موت سب

کچھ خدا کی طرف سے ہے۔ ہم تم سب بندے ہیں، اصل مالک وہی ہے ساری دُنیا کا!"

یہ باتیں سُن کر خمادمر خوش ہوئی، یہ باتیں اُسے اچھی بہت لگیں۔ ایسی باتیں وہ اپنے دل میں کبھی کبھی سوچا بھی کرتی تھی۔ لیکن ایک امیر کبیر گھرانے کی ناز و نعم، اور عیش و عشرت میں پڑی ہوئی الھڑ لڑکی کے منہ سے یہ باتیں اُسے کچھ عجیب سی لگیں، اُس نے کہا: "یہ کیسی باتیں کر رہی ہو بیٹی؟"

ماہ طلعت نے پوچھا۔ "کیوں کیا ہوا؟ کچھ غلط تو نہیں کہا میں نے؟"

وہ بولی۔ "خدا کے بندے تو بے شک ہم سب ہیں، لیکن ایک سے کیونکر ہو گئے؟ ایسا بھی کہیں ہو سکتا ہے؟"

ماہ طلعت نے جواب دیا۔ "کیوں نہیں ہو سکتا؟ ہے یہی، خدا کے نزدیک تو سب برابر ہیں، چاہے جہاں پناہ ہوں یا نجم الدولہ، یا ہماری بڑی بی ——— اور یہ فرق جو نظر آتا ہے، یہ مصنوعی ہے۔ خود ہمارا بنایا ہوا، اُس کی کوئی اصل و حقیقت نہیں! اسلام کی یہی تعلیم ہے، اسی فرق کو مٹانے کے لئے اسلام آیا تھا!"

بڑی بی نے پوچھا۔ "لیکن یہ قائم کیسے ہو گیا؟"

ماہ طلعت بولی۔ "یوں کہ کچھ لوگوں نے اپنے دوسرے بھائیوں کی کمزوری سے فائدہ اٹھایا، خود بڑے بن گئے، دوسروں کو نیچا کر دیا۔ لیکن یہ دَور ہمیشہ رہنے والا نہیں، ایک نہ ایک دن ختم ہو کر رہے گا!"

بڑی حیرت ہوئی بڑی بی کو، اُن کی آنکھوں میں چمک آگئی، انہوں نے پوچھا "کب ختم ہو گا بی بی؟"

ماہ طلعت ہنسنے لگی۔ "بڑی جلد باز ہو تم بھی ——— جیسے جیسے لوگ حقیقت

سمجھتے جائیں گے، بیدار ہوتے جائیں گے، اور جیسے جیسے بیدار ہوں گے۔ ایک نیا زمانہ اُبھرتا آئے گا!"

بڑی بی کی آنکھیں چکا چوند ہو گئیں۔ جیسے وہ روشن زمانہ اُن کے سامنے آگیا پوچھا: "کتنے دن لگیں گے اس کے ابھرنے میں؟"

ماہ طلعت کو پھر ہنسی آگئی۔ "دِن؟ —— دِن نہیں بڑی بی صدیاں!"

یہ آنا دور دراز کا فاصلہ تھا کہ بڑی بی کی دلچسپی ختم ہو گئی، انہوں نے گفتگو کا رخ بدل دیا، پوچھا: "تو پھر دستر خوان بچھاؤں؟"

ماہ طلعت نے کہا "ہاں!"

تھوڑی دیر میں دستر خوان بچھ گیا، خاصہ چُن دیا گیا، ماہ طلعت کی سہیلیاں اور ہمجولیاں بھی حاضر ہو گئیں۔ دستر خوان پہ الوان نعمت موجود تھے، ہر قسم کے کھانے طرح طرح کی شیرینیاں، رنگ رنگ کی مٹھائیاں، ماہ طلعت نے بیٹھتے ہوئے دستر خوان پر ایک نظر ڈالی، اور بڑی بی سے جو باورچی خانہ کی انچارج تھیں، تیوری پر بل ڈال کر کہا: "میرا کھانا کہاں ہے؟"

بڑی بی کو پسینہ آگیا، انہوں نے کہا۔ "بیٹی خاصہ تو موجود ہے، کسی اور چیز کا جی چاہتا ہو تو ابھی دم کے دم میں حاضر کر دی جائے گی۔ صرف حکم کی دیر ہے!"

ماہ طلعت بولی۔ "میں نے بتا دیا تھا، گوشت نہیں کھاؤں گی۔ یہ باقر خانیاں اور پراٹھے بھی مجھے مرغوب نہیں: نہ یہ شیر برنج اور شاہی ٹکڑے، یہ کچھ نہیں ——"

"پھر کیا میری سرکار!"

"میں سادہ کھانا پسند کرتی ہوں۔ بس وہی معمولی دال چاول، روٹی اور بھاجی

گلشن اور صنوبر کے ہاتھ سے مرغن لقمہ چھوٹ گیا، وہ دونوں ایک دوسرے کو حیرت سے دیکھنے لگیں۔ گلشن نے جرأت کر کے پوچھا۔ "یہ کیا؟ یہ کیوں؟ دشمنوں کو کچھ ہو تو نہیں گیا؟"

ماہ طلعت نے کہا۔ "بھئی اللہ ہمیں پریشان نہ کرو، جو جس کا جی چاہے وہ کھائے کچھ زبردستی تو ہے نہیں!"

یہ کہہ کر وہ اُٹھ کھڑی ہوئی، اور اپنے کمرہ کی طرف چلی، بڑی بی بھی اُس کے پیچھے پیچھے پہنچیں۔

"تو حضور یہاں لے آؤں؟" وہ بولی

"لے آؤ.... لیکن وہی جو میں نے کہا ہے!"

ماہ طلعت چُپ چاپ بیٹھ گئی، تھوڑی دیر میں بڑی بی لونڈی کے سر پر ایک خوان لئے ہُوئے آموجود ہوئیں، وہی سادہ کھانا تھا، جس کی فرمائش ماہ طلعت نے کی تھی۔ یہ کھانا دیکھ کر ماہ طلعت خوش ہو گئی اور اُس نے اُسے ڈٹ کر کے کھالیا، جو اُس کی لونڈیاں اور باندیاں بھی نہیں کھاتی تھیں۔ بڑی بی حیرت اور تعجب سے ماہ طلعت کا یہ انقلاب دیکھتی رہیں۔

تھوڑی دیر کے بعد دبے پاؤں گلشن آئی۔ اُس نے شرارت بھرے لہجے میں پوچھا۔ "کیا میں حاضر ہو سکتی ہوں؟"

ماہ طلعت نے نظر اُٹھائی۔ گلشن کو دیکھ کر پھر جھکالی اور مسکراتے ہوئے کہا۔ "ہرگز نہیں!"

گلشن اندر آگئی، اُس نے کہا۔ "سرکار ایک بات آج پوچھ کر رہوں گی۔ چاہے میری گردن کیوں نہ اُڑا دی جائے!"

ماہ طلعت بدستور مسکراتی رہی۔ پھر بولی۔

"پوچھو!" کیا بات پوچھنی ہے؟

گلشن نے کہا۔ "یہ انقلاب کیوں؟ یہ تبدیلی کیسی؟"

ماہ طلعت نے کہا۔ "کیسا انقلاب، کیسی تبدیلی، کچھ ہوش میں ہو؟"

"سرکار اب تک تو ہوش میں تھی، لیکن اگر یہی لیل ونہار رہے تو واقعی ہوش وحواس کا قائم رکھنا مشکل ہو جائے گا!"

"آخر کیوں؟"

"آپ نے نماز پڑھنا پابندی سے شروع کر دی ہم نے کوئی اعتراض نہیں کیا تہجد کو بھی اُٹھنے لگیں، ہم خوش ہوئے، دعا اور وظیفہ کا سلسلہ شروع کیا۔ طبیعت چڑھی تو بہت مگر کلیجہ پر پتھر کی سل رکھ کر اُسے بھی برداشت کر لیا، حالانکہ یہ سب بڑی بوڑھیوں کی باتیں ہیں۔ لڑکیوں کی نہیں، مگر اب جو آخری تیر آپ نے پھینکا ہے، وہ سینہ پر نہیں پیٹ پر آکر لگا ہے، اسے ہم برداشت نہیں کر سکتے سرکار!"

ماہ طلعت گلشن کی باتیں سن رہی تھی، اور برابر مسکرائے جا رہی تھی، اُس نے کہا "تمہارا مطلب آج کے واقعے سے ہے؟"

"جی!"

"بات یہ ہے گلشن کہ اب مجھے اچھا کھانا کھاتے، اور ٹھنڈا پانی پیتے، شرم آتی"

"کس سے؟"

"خود اپنے آپ سے!"

"کیوں آخر؟"

آتی ہے ـــــ سوچو نا، آنی چاہئے یا نہیں؟ ـــــ دُوسرے سوکھی روٹی کھائیں، اور میں قورمہ اور روغن جوش کے بغیر لُقمہ نہ توڑوں، یہ نہیں ہوسکتا۔ اِس معاملہ پر تم مجھ سے کبھی گفتگو نہ کرنا!"

یہ کہتے کہتے ماہ طلعت کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں، لیکن فوراً اُس نے اپنے اوپر قابو پالیا، آنسو کے قطرے، پلکوں کے بادل سے ٹپکنے نہیں پائے، لیکن گلشن بڑی زیرک تھی، وہ پہلے ہی سے سب کچھ سمجھ رہی تھی۔ آج اشارہ اشارہ میں ماہ طلعت نے اس کے خیال کی تصدیق کر دی، اُس کا خیال یقین سے بدل گیا، اُس نے کہا۔ "لیکن اِس طرح کمزور جو ہو جائیں گی آپ!"

ماہ طلعت بگڑ گئی۔

"میری کمزوری اور شہ زوری سے نہ کسی کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے نہ نقصان، لیکن یہ تو سوچو، جہاد کے لئے بڑھنے والے قدم، خُدا کے لئے تلوار اٹھانے والے ہاتھ وطن کے لئے سر کٹانے کا جذبہ رکھنے والا حوصلہ جب سوکھی روٹیوں اور کال کوٹھڑی کی سختیوں سے کمزور ہونے کی بجائے اور زیادہ مضبوط و مستحکم ہوتا ہے، تو میں گیہوں کی روٹی اور بگھری ہُوئی دال کھا کر کیوں کمزور ہو جاؤں گی؟ سچ کہتی ہوں میرا جی تو جَو اور جوار کی روٹی کھانے کو چاہتا ہے، گیہوں بھی اچھا نہیں لگتا!"

گلشن لاجواب ہو گئی، پھر بھی چُپ نہ ہُوئی۔ "لیکن سرکار، اس جہاد سے آپ کو کیا ثواب ملے گا؟"

ماہ طلعت نے کہا۔ "تم پگلی ہو گلشن، سب سے بڑا ثواب دِل کی خوشی ہے جس کام کے کرنے سے دِل کو سچّی خوشی ہو، وہ ثواب ہے، جس کام کے کرنے سے دِل دھڑکے

ضمیر دو کے وہ گناہ ہے ـــــ آیا کچھ سمجھ میں!"

ماہ طلعت یہ کہتے کہتے پھر مسکرا دی، گلشن کو بھی مسکرانا پڑا، لیکن وہ دل ہی دل میں ماہ طلعت کی عظمت پر غور کر رہی تھی۔

وہ سوچ رہی تھی، جس لڑکی کی زندگی کا لمحہ لمحہ عیش وتنعم کی گود میں بسر ہوا، جو سونے چاندی کے کھلونوں سے کھیلی، جو ہمیشہ مسرت اور نشاط کی زندگی بسر کرتی رہی جس کے ایک اشارہ پر دُنیا کی ہر نعمت آن کی آن میں موجود ہو سکتی ہے، وہ بھی محبت کا تیر کھا سکتی ہے، محبت کے راستہ میں اتنی آگے بڑھ سکتی ہے؟ ہر راحت اور ہر آسائش کو تج دے سکتی ہے؟

اور پھر وہ سوچنے لگی کیا اتنی پاک اور پاکباز محبت بھی ہوتی ہے دُنیا میں؟

گلشن نے محبت کے بہت سے کرشمے محلسرا کے اندر اور محلسرا کے باہر دیکھے تھے، اس نے امیروں کو محبت کرتے دیکھا تھا، اور غریبوں کو بھی، مردوں کو بھی اور عورتوں کو بھی، اب تک وہ محبت اور ہوس میں عشق اور جنس (SEX) میں فرق نہ کر سکی تھی۔ لیکن اس کے دیکھتے دیکھتے اس کمزور اور نوجوان اور بے انتہا حسین وجمیل چھوکری نے بلندی میں آسمان سے باتیں کرنے والی دیوار کھڑی کر دی تھی، اب صاف دکھائی دے رہا تھا یہاں ہوس کی سرحد ختم ہوتی ہے، یہاں سے محبت کی منزل شروع ہوتی ہے۔ اُسے حیرت ہونے لگی، اب تک وہ جسے محبت سمجھا کرتی تھی وہ نری ہوس نکلی، اور جس چیز کا نام اُس نے بارہا سُنا تھا لیکن دیکھا کبھی نہ تھا۔ آج اُسے اپنی آنکھوں سے اسی شاندار محلسرا کے اندر دیکھ لیا۔ یہ سوچتے ہوئے اُس کے زرد سے ہوئے چہرے پر رونق آگئی۔ اور وہ پھر سوچنے لگی، کیا سچی محبت بے زبان بھی ہوتی ہے؟

اب تک اُس نے محبت کے جو چلتے پھرتے ڈرامے اپنے گھر میں، بڑی بڑی حویلیوں میں، شاندار محلوں اور محلسراؤں میں دیکھے تھے، اِن میں تو یہ دیکھا تھا، کہ محبت کی زبان نہیں، ہوس کی زبان تھی، محبت کی زبان تو گونگی ہوتی ہے۔ یا ماہ طلعت مجھے کتنا چاہتی تھی، کتنا اعتبار کرتی تھی میرا؟ لیکن اس نے دل کی بات مجھ سے بھی کبھی کھل کر نہیں کہی، میں خود سمجھ سکتی ہوں تو سمجھ لوں بس، آگے حدِّ ادب۔

گلشن نے نظر اُٹھا کر دیکھا۔ تو ماہِ طلعت وقار کا مجسمہ نظر آ رہی تھی، اس کا جی چاہ رہا تھا، اس کے مجسمہ کے سامنے جھک کر اپنی دلی اور گہری عقیدت کا اظہار کرے لیکن عظمت کے ساتھ ہیبت بھی تو شامل ہوتی ہے، وہ یہ کچھ نہ کر سکی۔ چپ چاپ اُٹھی؛ اور چلی گئی، اور جب تک وہ آنکھوں سے اوجھل نہ ہو گئی ماہِ طلعت اُسے ٹکٹکی لگائے دیکھتی رہی اور پھر وہ مُسکرا کر اپنے کام میں لگ گئی۔ جیسے وہ بھی سمجھ گئی تھی کہ حجاب کے پردے آج گلشن کی آنکھ سے اُٹھ گئے ہیں۔ اب تک حقیقت کے دیکھنے اور پرکھنے کی اس میں صلاحیت نہیں تھی۔ اب آگئی اور یوں بیٹھے بیٹھے دفعتاً وہ عالمِ خیال میں فیروز بخت کی کال کوٹھڑی تک پہنچ گئی، جہاں وہ سَر جھکائے ایک معمولی قیدی کی طرح بیٹھا تھا۔ لیکن غور سے دیکھا تو معلوم ہُوا اُس کا سَر جھکا نہیں تھا، سینہ تنا ہُوا تھا جیسے ایک سرفروش، اور جانباز مجاہد کا سینہ، اور وہ مسکرا رہا تھا، اُسے مسکراتے دیکھ کر ماہِ طلعت کیسے نہ مسکراتی؟ ——— وہ بھی مُسکرانے لگی!!

باب (۱۰)

رہائی

عماد الملک غازی الدین فیروز جنگ اپنے شاندار وزارت کدہ میں جلال و رعونت کی تصویر بنا بیٹھا ہے، اس کا چہرہ تمتمایا ہوا ہے، آنکھیں سُرخ ہو رہی ہیں ہیبت کا یہ عالم ہے کہ چپ و راست جو خدّام بارگاہ دست بستہ کھڑے ہیں اُن کا چہرہ دہشت کے باعث سفید پڑ گیا ہے، اعتبار الملک اور نجم الدولہ جو اتنے کلّے ٹھلّے کے آدمی تھے، اپنی سراسیمگی، لاکھ لاکھ چھپاتے تھے مگر چہرہ کا اتار چڑھاؤ، اضطراب قلب کی غمّازی کر رہا تھا، صرف ایک شخص تھا، جس کے چہرہ پہ نہ ہراس تھا، نہ اضطراب جو بالکل یکسوئی اور اطمینان کے ساتھ غازی الدین کے بالکل سامنے، تبسّم کناں، لیکن خاموش کھڑا تھا ——— یہ تھا دِلّی کا منچلا، اور جیالا نوجوان فیروز بخت

کچھ دیر تک ایوان پر مرگ آسا سنّاٹا چھایا رہا، پھر غازی الدین نے چڑھی ہوئی تیوریوں کے ساتھ، فیروز بخت کو مخاطب کیا، اُس نے کہا: "مجھے یقین ہے جیل کی تنہائی میں تم نے اپنی روش پر غور کر لیا ہو گا کہ ہاتھی سے گنّے کھانا آسان نہیں ہے۔ تم نے جس سرکشی کا مظاہرہ جہاں پناہ کی موجودگی میں کیا، جس لب و لہجہ میں مجھے

مخاطب کیا، صرف یہی جرم ایسا تھا کہ تمہارا سر قلم کر دیا جاتا، لیکن وبیر الملک اور نجم الدولہ کی خدمات آڑے آئیں۔ میرا ہاتھ بار بار تلوار تک گیا، لیکن رُک گیا۔

شاید غازی الدین ابھی کچھ اور کہتا، لیکن بڑے سکون اور اطمینان کے ساتھ فیروز بخت نے اس کا سلسلۂ کلام منقطع کرتے ہوئے کہا: "میں جانتا ہوں، آپ امیر الامراء ہیں، سلطنتِ مغلیہ کے وزیرِ اعظم ہیں، آپ کے ہاتھ میں ہندوستان کی حکومت ہے فوج پر آپ کا قبضہ ہے، خزانہ آپ کی مٹھی میں ہے، خود جہاں پناہ تک آپ کے پنجہ میں اسیر ہیں۔ لیکن میں یہ ماننے کے لئے ہرگز تیار نہیں کہ آپ خُدا ہیں۔"

غازی نے گرجدار آواز میں کہا: "فیروز بخت تم پھر بہکنے لگے، عقل کے ناخن لو، ہوش کی باتیں کرو، میں نے خُدائی کا دعوےٰ کب کیا؟"

فیروز بخت نے جواب دیا: "کسی کو مارنا یا زندہ رکھنا، صرف خدا کا کام ہے۔ جب میرا وقت آجائے گا۔ دُنیا کی کوئی طاقت مجھے موت کے پنجے سے نہیں چھڑا سکے گی، اور جب تک وقت نہیں آتا، دو ہزار غازی الدین بھی میری جان نہیں لے سکتے حضرت علی علیہ السلام کا ارشاد ہے: "موت میری حافظ ہے!" اس ارشاد پر میرا ایمان ہے۔ میرا عقیدہ ہے، جب تک زندگی باقی ہے، موت خود انسان کی حفاظت کرتی ہے!"

غازی الدین نے پہلو بدل کر کہا: "تم عجیب قسم کی باتیں کر رہے ہو، میرے پاس اتنا بیکار وقت نہیں ہے۔ میں تم سے صاف اور دوٹوک باتیں کرنا چاہتا ہوں!"

فیروز بخت نے کہا: "فرمایئے، ارشاد!"

"کیا تم اپنی روش بدلنے پر تیار ہو؟"

"یعنی؟" ——— میں آپ کا مطلب نہیں سمجھ سکا۔

"میں صرف ایک سوال کا جواب چاہتا ہوں!"

"جواب ضرور عرض کروں گا۔ لیکن سوال بھی تو معلوم ہو!"

"میرا سوال یہ ہے کہ تم حکومت کے وفادار بن کر رہنا چاہتے ہو یا باغی؟ اور قبل اس کے کہ تم جواب دو، میں یہ کہہ دینا چاہتا ہوں، کہ جہاں وفاداروں کی دلدہی، حوصلہ افزائی، اور قدردانی کا فن مجھے آتا ہے، وہاں باغیوں اور سرکشوں کی سرکوبی کے فن میں بھی طاق ہوں۔"

فیروز بخت نے بغیر کسی ہراس کے جواب دیا۔ "اپنے دبدبہ کا اظہار بار بار نہ کیجئے، آپ جو کچھ ہیں میں جانتا ہوں۔ صرف میں ہی نہیں ساری دُنیا جانتی ہے لیکن چھوڑئیے اس بحث کو، میرا مختصر جواب یہ ہے کہ میں خدا کا وفادار ہوں، وہ خدا جس نے مجھے بھی پیدا کیا ہے، اور آپ کو بھی، صرف ہم دونوں کو نہیں ساری دُنیا کو، جو خدا کا وفادار ہے میں اس کا جاں نثار اور خدمتگار ہوں، جو خدا کا باغی ہے، میں اُس کا دشمن ہوں!"

جل کر غازی الدین نے کہا۔ "تم نے پھر مذہبی تقریر شروع کر دی، میں تمہارا وعظ سننا نہیں چاہتا، اپنے سوال کا جواب چاہتا ہوں!"

فیروز بخت نے کہا: "جواب تو میں دے چکا!"

غازی الدین۔ "میں اسے پھر سُننا چاہتا ہوں۔"

فیروز بخت۔ "میں صرف خدا کا وفادار ہوں!"

غازی الدین۔ "پھر وہی مُہمل بات ——— یہ مسجد نہیں ایوانِ وزارت ہے!"

فیروز بخت: جانتا ہوں، لیکن سچّی بات کا اعلان مسجد سے زیادہ، ایوانِ وزارت میں ضروری ہے۔ مسجد میں وہ لوگ آتے ہیں، جو خُدا سے ڈرتے ہیں، خدا کو پہچانتے ہیں خدا کا حکم مانتے ہیں' اور وزارت کدوں میں ان لوگوں کی ریل پیل ہوتی ہے، جو دُنیائے دُوں کے لئے خدا کو بھُول چکے ہوتے ہیں، جو ایمان کا سودا کرتے ہیں، ضمیر کو فروخت کر دیتے ہیں، اور صرف دُنیا وی سربلندی اپنے پیشِ نظر رکھتے ہیں دوا بیمار کو دی جاتی ہے، تندرست کو نہیں' مسجد صحت مندوں کا مسکن ہے، اور یہ وزارت کدے، بیمارستان ہیں' دوا کی یہاں ضرورت ہے وہاں نہیں!"

جلال کے عالم میں غازی الدین نے کہا۔ "تم مجھے کافر سمجھتے ہو؟"

سنجیدگی کے ساتھ فیروز بخت نے جواب دیا۔ "کافر نہیں، گمراہ!"

غازی الدین کا غصّہ قابو سے باہر ہو گیا، سامنے تلوار رکھی تھی، اُس نے قبضہ پر ہاتھ رکھا اور کہا۔ "کیا کہا؟"

فیروز بخت نے اسی اطمینانِ قلب سے اپنے الفاظ پھر دوہرا دیئے۔ "کافر نہیں گمراہ!"

غازی الدین۔ "میں گمراہ ہوں؟"

فیروز بخت۔ "گمراہ بھی اور خطا کار بھی!"

غازی الدین کو اور زیادہ غصّہ آگیا، اُس نے ہاتھی کی طرح چنگھاڑتے ہوئے کہا۔ "تم اب یہاں سے زندہ نہیں واپس جا سکتے، ہرگز نہیں جا سکتے!"

فیروز بخت نے جواب دیا۔ "زندگی کی تمنّا انہیں ہوتی ہے جو زندگی ہی کو سب کچھ سمجھتے ہیں۔ لیکن جن کی نظر میں زندگی موت کی منزل تک پہنچنے کا ایک پڑاؤ

ہے، وہ ہرگز زندگی کی تمنا نہیں کرتے، اصل زندگی تو مرت کے بعد شروع ہوتی ہے۔ اعلیٰحضرت!"

غازی الدین خاموش ہوگیا، اُٹھ کر ٹہلنے لگا۔ ٹہلتے ٹہلتے وہ پھر اپنی نشست پر آکر بیٹھ گیا۔ اس نے کہا: "میاں صاحبزادے تمہیں ابھی زندہ رہنا چاہئے۔ میں چاہتا ہوں تم زندہ رہو۔ پھلو پھولو، پروان چڑھو، ترقی کرو۔ میں تمہارا دشمن نہیں ہمدرد ہوں، بلکہ اگر مانو تو دوست سمجھو مجھے اپنا۔ مجھے نہیں معلوم تمہیں مجھ سے کیا شکایت ہے؟ اگر کوئی شکایت ہے تو بیان کرو۔ میں اُسے رفع کر دوں گا۔ بولو، بتاؤ، ہے کوئی شکایت؟"

فیروز بخت زیرِ لب تبسم کے ساتھ غازی الدین کی باتیں سنتا رہا، پھر اس نے کہا۔ "جی مجھے صرف ایک شکایت ہے اور اگر اسے آپ رفع کر دیں تو میں آپ کے پسینہ پر خون بہانے کو تیار ہوں۔"

یہ الفاظ سن کر غازی الدین کا تمتمایا ہوا چہرہ پھول کی طرح کھل اُٹھا، اُس نے کہا: "کہو کہو، میں تمہاری ہر شکایت رفع کرنے کے لئے بسروچشم تیار ہوں!"

فیروز بخت نے پوچھا۔ "آپ وعدہ کرتے ہیں؟"

غازی الدین۔ "ہاں وعدہ کرتا ہوں۔ قول دیتا ہوں —— قولِ مرداں جان دارد، تم جیسے اولوالعزم نوجوانوں کو اپنا رفیق بنانے کے لئے میں سب کچھ کرگزرنے کو تیار ہوں، ہر شرط مان لوں گا، ہر شکایت رفع کر دوں گا، مگر تم کچھ کہو بھی تو!"

فیروز بخت۔ "آپ وعدہ کیجئے، حصولِ اقتدار کے لئے مرہٹوں سے کبھی سازباز نہ کریں گے۔ وہ اسلام کے دشمن ہیں، مسلمانوں کے دشمن ہیں، مغلیہ سلطنت کو تباہ و برباد کرکے ہندو حکومت قائم کرنے کے خواب دیکھ رہے ہیں!"

غازی الدین ۔ "غلط، بالکل غلط، تم ابھی بچے ہو، تم کیا جانو حادث و واقعات کیا ہیں؟ تم سیاست نہیں جانتے، حکمتِ عملی نہیں جانتے، اندازِ جہاں بانی سے نا واقف ہو۔"

فیروز بخت ۔ "میری نالائقی کے بارے میں آپ جو کچھ کہیں اسے مان لوں گا، لیکن مرہٹوں کے بارے میں، جو کچھ میں نے عرض کیا ہے، اس کا ایک ایک حرف صحیح ہے، اسے آپ مان لیجئے!"

غازی الدین ۔ "کیسے مان لوں میاں صاحبزادے، مرہٹے ہمارے ہمدرد اور دوست ہیں، ان کی فوج میں مسلمان سپاہی بھی موجود ہیں، کیا تم نہیں جانتے بالاجی راؤ پیشوا کی مسلمان بیوی مستانی بیگم کے بطن سے نیم مسلمان اولاد تک[1] موجود ہے، پھر علاوہ

---

[1] تاریخ مرہٹہ از گرانٹ ڈف

یہ اولاد بعد میں ہندوؤں کے تعصب کے باعث مسلمان ہوگئی، چنانچہ نوابان باندہ اسی خاندان سے ہیں۔ مستانی بیگم کے بطن سے پیشوا کی جو اولاد ہوئی وہ بعد میں مسلمان ہوگئی، یہ خاندان اب تک موجود ہے اور اس خاندان کے ایک معزز فرد نواب احسان علی اب تک موجود ہیں جو شعر و سخن سے کافی دلچسپی رکھتے ہیں۔ پنڈت رام گوپال صاحب ڈپٹی کلکٹر بلیا نے سنہ [illegible] میں ایک کتاب "سخنستان" کے نام سے شائع کی تھی، اس کے صفحہ ۳ پر وہ رقمطراز ہیں:۔

"نواب احسان علی عرف نواب لاڈلے آپ قدیم حکمران خاندان باندہ میں سے ہیں، آپ کے مورث نواب علی بہادر اول حکمران باندہ و فاتح بندیل کھنڈ، پیشوا باجی راؤ اول کے پوتے تھے یعنی ان کے والد شمشیر بہادر پیشوا اور مستانی بیگم کی اولاد تھے، ان کے خلف نواب ذوالفقار بہادر اور اُن کے صاحبزادے اشرف الامراء ہز ہائی نس نواب علی بہادر حکمران باندہ تھے۔ آپ کے زمانۂ حکومت میں غدر ۱۸۵۷ء ہوا۔ آپ حکومت سے علیحدہ کر کے اندور بھیج دیئے گئے، وہیں آپ کی اولاد سکونت پذیر ہے اور ہر فرد خاندان کو اب تک پولیٹیکل پنشن ملتی ہے"
(سخنستان۔ از پنڈت رام گوپال ڈپٹی کلکٹر بلیا۔ یو۔پی، صفحہ نمبر ۳۔)

مسلمانوں کے دشمن کیسے ہو سکتے ہیں؟"

فیروز بخت: "وہ مسلمانوں کے دشمن ہیں۔ وہ آپ کے دشمن ہیں، وہ مرہٹہ امپائر قائم کرنے کا فیصلہ کر چکے ہیں اور آپ اُن کی مدد کر رہے ہیں۔"

غازی الدین نے برہم ہو کر کہا۔ "بالکل غلط ـــــ مرہٹوں کو میں نے آلۂ کار بنایا ہے، میں ان کی مدد نہیں کرتا، وہ میری مدد کرتے ہیں، وہ میرے ایک اشارہ پر اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور وہی کرتے ہیں جو میں کہتا ہوں!"

فیروز بخت۔ "آپ نے صحیح فرمایا، واقعی وہ آپ کے ایک اشارہ پر اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور مہاراشٹر سے کوچ کرتے ہوئے دِلی کی فصیل تک پہنچ جاتے ہیں، اس لئے کہ آپ کی شہ پاکر وہ مسلمانوں کو لُوٹتے ہیں، اُن کے کھیت ویران کر دیتے ہیں اُن کے گھر ڈھا دیتے ہیں، اُن کی عورتیں پکڑ لیتے ہیں، اور انہیں بے آبرو کرتے ہیں، مسلمانوں کی طاقت ٹکڑے ٹکڑے کر دیتے ہیں، انہیں آپ سے بڑھ کر اور بہتر دوست نہیں مل سکتا، لیکن اسلام آپ سے پناہ مانگتا ہے، آپ اپنے اقتدار کے لئے مسلمانوں کی قوت پارہ پارہ کر رہے ہیں، آپ اپنی قوت کے لئے مغلیہ حکومت کو تباہ کئے دے رہے ہیں، مرہٹوں کی ہرگز یہ ہمت نہیں تھی۔ وہ دہلی کا رُخ بھی کرتے لیکن آپ نے انہیں بلایا اور وہ آگئے۔ آپ انہیں پھر بلانا چاہتے ہیں، اور وہ پھر آئیں گے۔"

غازی الدین۔ "ہاں میں انہیں بلانا چاہتا ہوں، اور وہ ضرور آئیں گے، اگر وہ نہ آتے

لہ تذکرہ شاہ ولی اللہ

تو میں ابدالی سے پنجاب نہیں چھین سکوں گا، اگر وہ نہ آئے تو میں نجیب الدولہ کی سرکوبی نہیں کر سکوں گا۔ بغیر مرہٹوں کی امداد و اعانت کے مغلیہ حکومت کا دبدبہ قائم نہیں رہ سکتا، میں یہ کام کروں گا، اور میں چاہتا ہوں کہ تم میرے رفیق بن جاؤ۔ میرا ساتھ دو، پھر تم دیکھو گے کہ میں تمہاری کتنی قدر کرتا ہوں اور میں چاہتا ہوں کہ تمہارا ستارہ چمکے بہت زیادہ چمکے، اتنا زیادہ کہ تمہارے دشمنوں کی آنکھیں چکا چوند ہو جائیں اور تمہارے دوستوں کے دل باغ باغ ہو جائیں، میری دُوربین آنکھیں دیکھ رہی ہیں، تمہارا مستقبل کتنا روشن اور تابناک ہے۔ لیکن میرے عزیز تمہارے مستقبل کا معمار میں ہوں، مجھے موقع دو کہ میں اپنا کام کروں!"

یہ کہہ کر فیروز بخت کی طرف غازی الدین مڑا، اور اُس نے بڑے تپاک اور گرمجوشی سے اُسے مخاطب کرتے ہوئے کہا: "امید ہے تم میرا مطلب سمجھ گئے ہو گے!"

فیروز بخت۔ "جی بالکل اچھی طرح سمجھ گیا۔"

۱؎ دوسرے حملہ میں احمد شاہ ابدالی نے پنجاب پر قبضہ کر لیا تھا، اور وہاں اپنا عمل دخل قائم کر کے واپس چلا گیا تھا۔

۲؎ جاتے وقت احمد شاہ نے نجیب الدولہ کو امیرالامرا کے منصب پر فائز کر دیا تھا اور بادشاہ کو اس کی تحویل میں دے گیا تھا۔ عماد الملک غازی الدین اس بنا پر نجیب الدولہ کی جان اور آبرو کا گاہک ہو گیا۔ وہ امیرالامرائی کے منصب کا صرف اپنے تئیں مستحق سمجھتا تھا۔ اب کہ احمد شاہ ابدالی واپس جا چکا تھا وہ اس فکر میں تھا کہ مرہٹوں کی مدد سے ایک طرف تو نجیب الدولہ کا قلع قمع کر دے، دوسری طرف تخت دہلی کا عملاً حکمران بن جائے اور تیسری طرف فرخ آباد، اودھ اور روہیل کھنڈ کی مسلمان حکومتوں کا خاتمہ کر دے۔

غازی الدین: شاباش، مجھے تم سے یہی امید تھی!"

فیروز بخت خاموش رہا، غازی الدین نے اُسے خاموش دیکھ کر کہا۔ "تم بولتے کیوں نہیں؟ تم ہنستے کیوں نہیں؟ تمہارے چہرے پر خوشی کے آثار کیوں نہیں نظر آتے۔ تم نہیں جانتے، غازی الدین سے جہاں پناہ التجائیں کرتے ہیں اور غازی الدین تم سے اشتراکِ عمل اور دوستی کی التجا کر رہا ہے، وہ غازی الدین سے تعاون اور اشتراکِ عمل کے جویا رہتے ہیں، اور غازی الدین تم سے اشتراک و تعاون طلب کر رہا ہے' غازی الدین کسی سے سیدھے منہ بات نہیں کرتا۔ لیکن تمہیں جیل سے بلا کر پیمانِ محبت باندھ رہا ہے' غازی الدین بہت بڑی طاقت ہے، اسے اپنی قوت کا پورا پورا اندازہ ہے۔ پھر بھی وہ محسوس کرتا ہے کہ تم اس کے لئے ضروری ہو، تم اس کے دوست و بازو بن سکتے ہو، ناسمجھی سے کام نہ لو، اپنی قدر و قیمت پہچانو، اور وہ بنو جو تمہیں بننا چاہئے، وہ نہ بنو جو تم پر زیب نہیں دیتا مذہب، قیامت، خدا، تصوّف، یہ باتیں تم جیسے رئیس ابن رئیس تم جیسے دلاور اور بہادر، تم جیسے سپاہی' اور جیالے کی زبان سے زیب نہیں دیتیں' ان باتوں کو مُلّایانِ مسجد کے لئے اُٹھا رکھو، مسجدیں اور خانقاہیں دِلّی میں بہت ہیں، مسجدوں اور خانقاہوں کو آباد کرنے والوں کی بھی کمی نہیں میرے عزیز دوست، تمہارا مقام مسجد اور خانقاہ نہیں ایوانِ حکومت اور بارگاہِ شاہی ہے۔ تم اس لئے نہیں ہو کہ نمازیں پڑھو، داڑھی بڑھاؤ، روزے رکھو اور مر جاؤ، تم اس لئے ہو کہ زندگی کا لُطف اُٹھاؤ، تمہارا حُسن مردانہ حورانِ ارضی کے لئے مقناطیس ہے، خانقاہ اور مسجد کو چھوڑ دو، میرے ساتھ آؤ، میرے ساتھ رہو میں تمہیں روپیہ دوں گا، میں تمہیں جاگیر دوں گا، میں تمہیں حکومت اور سطوت دُوں گا، میں تمہیں قوّت اور شوکت دُوں گا، میں تمہیں اقتدار اور اختیار دوں گا، میں تمہیں

وہ سب کچھ دوں گا جس کے تم مستحق ہو، لیکن تم میرے بنو تو سہی، تم مجھ پر اعتبار کر کے تو دیکھو!"

پھر غازی الدین اعتبار الملک، او رنجم الدولہ کی طرف مخاطب ہوا اور کہا۔ "کہئے میں غلط تو نہیں کہتا؟"

اور پھر جواب کا انتظار کئے بغیر اُس نے فیروز بخت سے کہا۔ "میں آج تم سے جواب باصواب لے کر رہوں گا، اور مجھے یقین ہے تم مجھے مایوس نہ کرو گے!"

بڑی پُر اُمید نظروں سے غازی الدین نے فیروز بخت کی طرف دیکھا۔

فیروز بخت نے کہا۔ "آپ نے جس جوش وخروش سے یہ تقریر فرمائی ہے۔ اُس سے میں بہت متاثر ہوا، لیکن میں اپنی ایک راہِ عمل متعین کر چکا ہوں۔ اِس سے انحراف نہیں کر سکتا۔ غلط یا صحیح کا فیصلہ نہیں کر سکتا ہوں، نہ آپ، اسے احکم الحاکمین پر چھوڑ دیجئے، وہی نیتوں کا جاننے والا، اور دِل کے کھوٹ کا پرکھنے والا ہے۔ مجھے خانقاہ و مسجد میں جبیں سائی کرتے ہوئے جو لطف آتا ہے، یقین کیجئے، آپ کو مسندِ وزارت پر وہ لطف نہیں آتا، آ ہی نہیں سکتا، آپ کو ہر طرح کی نعمتیں حاصل ہیں، خدامِ ادب دست بستہ موجود ہیں سیم و زر سے خزانہ بھرپور ہے۔ لباس ہائے فاخرہ کی کوئی گنتی نہیں، عیش و عشرت کے لیے بادۂ گلگوں اور ساقیٔ پُر فن، سب ہی کچھ موجود ہے، یہ آپ کو مبارک، میں اتنے دنوں جیل میں رہا اور اب پھر غالباً وہیں واپس جاؤں گا۔ آپ کے حکم سے میرے ساتھ جو سلوک ہوا، وہ مجھ سے زیادہ آپ جانتے ہیں، رُوکھا سُوکھا کھانا، پھٹا بستر، طرح طرح کی تکلیفیں اور اذیتیں، تپتی ہوئی گرمی میں دھوپ، اور کٹکٹاتے ہوئے جاڑے میں چاندنی کا لُطف دن دن بھر اور رات رات بھر میں نے اُٹھایا ہے۔ لیکن کبھی

ایک لمحہ کے لئے بھی میرے دل میں یہ خیال نہیں آیا کہ اپنا منتخب کیا ہُوا راستہ چھوڑ دوں آپ مجھے زندگی کی نعمتوں کی دعوت دے رہے ہیں۔ مگر میرے دل میں صرف ایک ہی جذبہ ہے، یہ کہ خدا کے راستہ میں موت سے ہمکنار ہوں۔ جہاد کرتا ہُوا میدانِ جنگ میں مارا جاؤں، اگر مرہٹوں سے آپ ناتہ توڑ لیتے تو بلاشبہ آپ کے ادنیٰ سپاہیوں کی ہمرکابی کا شرف حاصل کرنا میں اپنے لئے باعثِ افتخار سمجھتا، آپ ان مسلم آزار کافروں سے یارانہ قائم کئے ہُوئے ہیں، میری آپ کی نہیں نبھ سکتی، مجھے پھر جیل بھیج دیجئے ورنہ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں۔ رہا ہونے کے بعد، مجھ سے بڑھ کر خطرناک آدمی کوئی نہ ہوگا۔ میں رہائی نہیں چاہتا۔ کسی قیمت پر بھی نہیں۔ مجھے اسیری پسند ہے۔ آہن گر کو بلائیے پھر مجھے ہتکڑی اور بیڑی کے زیور سے آراستہ کر دے، داروغہ جیل کو حکم دیجئے کہ وہ مجھ پر پہلے سے زیادہ سختیاں کرے، میں ہر سختی جھیلنے کے لئے تیار ہوں، مگر ایمان کا سودا نہیں کر سکتا، ضمیر کا گلا نہیں گھونٹ سکتا۔ میں آپ سے 'جہاں پناہ سے' سب سے بغاوت کر سکتا ہوں، لیکن خدا کا باغی نہیں بن سکتا، میں جانتا ہوں یہ زندگی عارضی ہے اور موت کے بعد کی زندگی دائمی ہے۔ عارضی چیز پر مستقل چیز کو قربان کرنے کی نہ مجھ میں صلاحیت ہے، نہ ہمت، میں آپ کے راستہ کا کانٹا ہوں مجھے کچل دیجئے میں آپ کے طرّۂ دستار کا پھول نہیں بن سکتا، مجھے افسوس ہے کہ میرا جواب آپ کے لئے مایوس کن ہے لیکن مجھے فخر ہے کہ میں ڈگمگایا نہیں، حق کے راستہ پر قائم ہوں!"

غازی الدین خاموشی سے فیروز بخت کی باتیں سُنتا رہا، اُس کے چہرہ کا ایک رنگ آ رہا تھا، ایک جا رہا تھا۔ زندگی میں اُسے بہت سے لوگوں سے سابقہ پڑا تھا۔ بہادر دل بھی اور بزدلوں سے بھی، عقلمندوں سے بھی اور دُور اندیشوں سے بھی، لیکن یہ فیر

بخت عجیب شخص تھا، ایسا شخص اُس کی نظر سے کبھی نہیں گذرا تھا، اُس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا اِس دیوانے کا قیمہ قیمہ کس طرح کرے؛ بڑی دیر تک وہ خاموش ٹہلتا رہا پھر اُس نے فیصلہ کُن انداز میں کہا۔ "میں تمہیں رہا کرتا ہوں۔ لیکن ایک شرط پر!"

فیروز بخت: "فرمائیے!"

غازی الدین: "ایک ہفتہ کے اندر اندر تم یہ آتی چھوڑ دو، نکل جاؤ اِس شہر سے میں تمہیں خارج البلد کرتا ہوں!"

فیروز بخت: "مجھے آپ کی یہ شرط منظور ہے!"

غازی الدین نے کوئی جواب نہیں دیا۔ پردہ اُٹھایا، اور دوسرے کمرے میں چلا گیا، داروغہ زنداں وہیں موجود تھا، اُس نے کہا۔ "اب آپ تشریف لے جا سکتے ہیں!"

فیروز بخت مُسکرایا، اور گویا ہُوا۔ "میں جاتا ہوں، لیکن شاید مجھے جلد ہی آپ کا مہمان بننے کی عزّت پھر حاصل ہو!"

جیلر کی نہ جانے کیوں آنکھیں ڈبڈبا آئیں اور وہ جلدی سے باہر نکل گیا۔

باب (۱۱)

ہجرت کا فیصلہ

فیروز بخت کی رہائی سے اُس کے دوستوں اور ہوا خواہوں کو جتنی مسرّت ہُوئی اُتنی ہی کلفت اور اذیت بھی اس خیال سے ہُوئی کہ وہ جلاوطن کیا جارہا ہے، دلّی اس کے وجود سے محروم ہوجائے گی اور اُس کے جاتے ہی ساری امیدیں بھی ختم ہوجائیں گی جو اُس کی ذات سے عوام نے بہت زیادہ اور خواص نے کسی حد تک قائم کرلی تھیں۔

جیسے ہی اُس کی رہائی عمل میں آئی، نجم الدولہ اور دبیر الملک کے اُجڑے ہُوئے چمن میں بہار آگئی، گھر کے چھوٹے اور بڑے سب اس خیال سے پھُولے نہیں سمارہے تھے کہ فیروز بخت پھر آرہا ہے، اس کا آنا کیا تھا، موسم گل کا آنا تھا کہ خزاں کی ویرانیاں دُور ہوگئیں اور بہار کی رعنائیاں جلوہ نما ہوگئیں۔

گھر پر سب ہی لوگ فیروز بخت کے منتظر تھے، اور ماہ طلعت کی حالت تو سب سے جُدا تھی، اُس کا دِل وفورِ مسرت سے دیوانہ ہُوا جارہا تھا۔ اُس نے زندگی میں کبھی اپنے تئیں اتنا مسرور نہیں محسوس کیا تھا، جتنا آج محسوس کررہی تھی۔ اُس کا جی چاہ رہا تھا وہ سب سے پہلے فیروز بخت کا دیدار کرے اور دیکھے جیل کی پُرمحن زندگی بسر کرنے کے بعد

اس کی کیا حالت ہو گئی ہے؟ وہ چاہتی تھی سب سے پہلے، فیروز بخت سے باتیں کرے، اور دیکھے اس کی باتوں کا اب کیا رنگ ہے؟ وہی جو پہلے تھا یا کچھ اور؟ ——— وہ چاہ رہی تھی، آج تمام رسوم و قیود کو توڑ دے، فیروز کے سامنے پہنچے اور اُس سے دل کھول کر باتیں کرے۔ پتہ بھی اگر کھڑکتا تھا تو وہ یہی سمجھتی تھی فیروز آ گیا! ——— لیکن فیروز ابھی دُور تھا،

رہا ہونے کے بعد فیروز بخت نے براہِ راست خانقاہ ولی اللّٰہی کا رُخ کیا، وہ اسے اپنا فرض سمجھتا تھا، کہ سب سے پہلے حضرت شاہ صاحب کا دیدار کرے، دست بوسی کی سعادت حاصل کرے، پھر گھر آئے اور مستقبل کا پروگرام بنائے۔

حضرت شاہ صاحب نے گرم جوشی کے ساتھ مصافحہ اور معانقہ کیا، اور بڑے اثر انگیز لہجہ میں فرمایا۔ "تم آ گئے؟"

فیروز بخت نے سر جھکا کر ادب کے ساتھ جواب دیا۔ "میں حاضر ہو گیا!"

بڑی شفقت کے ساتھ شاہ صاحب نے فرمایا۔ "بہت اچھا ہُوا!"

بے تابی اور اضطراب کے عالم میں فیروز بخت نے عرض کیا۔ "یا حضرت مجھے صرف ایک ہفتہ کی مہلت ملی ہے، پھر مجھے دِلّی کو چھوڑ دینا ہے۔ دِلّی کی وسعت اب میرے لئے تنگ ہو چکی ہے، اس سے تو کہیں اچھا تھا، میں جیل ہی میں رہتا!"

شاہ صاحب نے دریافت فرمایا۔ "کیوں؟ کس لئے؟"

فیروز بخت۔ "کم از کم یہ اطمینان تو تھا کہ میں دِلّی میں ہوں!"

شاہ صاحب۔ "دِلّی سے تمہیں اتنا غیر معمولی اُنس کیوں ہے؟ کیا اس لئے کہ تم یہاں پیدا ہوئے ہو؟ یہ تمہارا وطن ہے؟"

فیروز بخت۔ "یاحضرت یہی بات ہے، جب یہ خیال آتا ہے کہ ایک ہفتے کے بعد مجھے رخت سفر باندھنا پڑے گا، تو میری حالت دگرگوں ہونے لگتی ہے!"

شاہ صاحب! "میرے عزیز یہ تمہاری کمزوری ہے ہمسلمان در و دیوار کا پابند نہیں ہوتا یہ ساری زمین اُس کا وطن ہے، کیا تم نہیں جانتے —— مسلم کا مقام ہر کہیں ہے! دلّی ہو یا آگرہ، کوئی شہر بھی ہمارا وطن نہیں، اور زمین کے ہر ٹکڑے پر ہر گوشہ پر، ہر کونے پر ہمارا حق ہے.... ہماری خود پسند کوئی چیز نہیں ہے، ہم خُدا سے عہد کر چکے ہیں، ہماری نماز، ہماری قربانی ہماری زندگی، ہماری موت صرف خدا کے لئے ہے جو سارے جہانوں کا ربّ ہے، ہم دِلّی کی سلامتی چاہتے ہیں، اِس لئے کہ اسلام کا مفاد اسی میں ہے، اور اگر اسلام کے مفاد کا تقاضا ہو تو ہم دِلّی کی اینٹ سے اینٹ بجا دینے میں تامل نہیں کریں گے۔ ہمیں لال قلعہ سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ ہمیں لال قلعہ کے مکینوں سے بھی کچھ زیادہ سروکار نہیں ہے، ہمیں صرف یہ دیکھنا ہے کہ اسلام کی شوکت و عظمت کی حفاظت ہم کس طرح کر سکتے ہیں: دِلّی اور لال قلعہ فی الحال —— یاد رکھو عارضی طور پر —— حصُولِ مقصد کا صرف ایک ذریعہ ہے اور بس، اِس سے زیادہ کچھ نہیں!"

فیروز بخت غور اور توجہ سے حضرت شاہ صاحب کا یہ پندِ سود مند سُنتا رہا پھر اُس نے، ایک کیفیت کے عالم میں کہا۔ "بجا ارشاد ہُوا، میری آنکھوں پر پردے پڑے تھے، وہ اب ہٹ گئے، یاحضرت، دِلّی مجھے اِس لئے اور زیادہ عزیز ہے کہ یہاں آپ جلوہ نما ہیں۔ آپ کی رُوحانی برکتیں ہم سب کے سر پر سایہ فگن ہیں، اگر

لہ ان صلاتی ونسکی ومحیای ومماتی للہ رب العالمین (القرآن)

میں یہاں سے چلا گیا تو اس نعمتِ بے کراں کو کہاں پاؤں گا؟"

حضرت شاہ صاحب نے تبسم کیا اور فرمایا۔ "تم ابھی نوجوان ہو، جوش میں بہک جاتے ہو، میاں صاحبزادے اگر تمہاری بات سچ بھی مان لی جائے، تو یہ تو سوچو کہ میں آج اور ابھی مر سکتا ہوں، پھر میری برکت تم کہاں پاؤ گے؛ تم اس کی برکت اور رحمت کے جویا کیوں نہیں ہوتے، جسے کبھی موت نہیں آئے گی، اور جس کی رحمت سارے عالم کو محیط ہے؟"

پھر شاہ صاحب نے شفقت سے فیروز کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا، "تمہیں دلّی سے جانا پڑے گا، آج تم مہاجر کی طرح جاؤ گے، کل تم فاتح بن کر آؤ گے!"

خوشی سے فیروز کا چہرہ چمک اُٹھا۔ اُس نے پوچھا۔ "یا حضرت کیا اِس جلاوطنی سے مجھے ہجرت کا ثواب ملے گا؟"

شاہ صاحب نے فرمایا۔ یقیناً —— ثواب بھی اور انعام بھی! —— دُنیا میں بھی اور آخرت میں بھی! —— میری آنکھیں دیکھ رہی ہیں جس بے سروسامانی کے ساتھ تم یہاں سے کوچ کرو گے، اس سے کہیں زیادہ شان و شکوہ کے ساتھ تم واپس آؤ گے، دُنیا اسی طرح بدلتی رہتی ہے، حالات اسی طرح پلٹا کھاتے رہتے ہیں[1]!"

فیروز بخت۔ "میرے لئے اِس سے بڑھ کر فخر اور سعادت کی کیا بات ہو سکتی ہے کہ میری خدمات بارگاہِ الٰہی میں مقبول ہوں، اور مجھے ہجرت کے شرف سے نوازا جائے۔"

شاہ صاحب۔ "انشاء اللہ ایسا ہی ہوگا! —— تم آقائے دو جہاں سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت پر عمل کر رہے ہو، انہیں بھی وطن سے نکالا دیا گیا تھا۔ انہوں نے بھی کفر و شرک

---

[1] تلک الایام نداولہا بین الناس (القرآن)

کے غلبہ سے تنگ آکر اپنے آبائی وطن سے ہجرت کی تھی۔ وہ ایک دوسرے شہر میں تشریف لے گئے، وہاں انہیں انصار کا ایک گروہ ملا، اور پھر آپ فاتحانہ شان کے ساتھ مکہ میں تشریف لائے، تم فخر کائنات کے ایک اُمّتی ہو، اسوۂ رسولؐ تمہاری رہنمائی کرے گا، تم بھی کفر اور فسق کے غلبہ سے تنگ آکر، اپنے وطن کو خیرباد کہہ رہے ہو، اگر چاہو تو اس غلبہ سے مصالحت کر سکتے ہو اور دُنیا کی زندگی چین اور راحت کے ساتھ بسر کر سکتے۔ لیکن تم نے ایمان کا سودا کرنا پسند نہیں کیا، کانٹے چن لئے، اور آبلہ پائی کے باوجود پرخارزار میں رکھ دیا، خدا ضرور تمہاری مدد کرے گا!

فیروز بخت۔ "یاحضرت آپ کی اس تقریر نے میرے ایمان کو تازہ کر دیا، میں اب انشراح قلب اور مسرت کے ساتھ دلّی کو خیرباد کہوں گا، لیکن یہ نہیں سمجھ میں آتا کہاں جاؤں؟"

شاہ صاحب۔ "کیا مطلب؟"

فیروز بخت۔ "یُوں سر چھپانے کی جگہیں ہزاروں ہیں، کہیں بھی جا کر بیٹھ رہوں گا۔ لیکن پھر آگے؟"

شاہ صاحب۔ "اپنی جہاد کس طرح کرو گے؟ غلبۂ کفر کا مقابلہ کیونکر کرو گے؟ مرہٹوں کا زور کیونکر توڑ دو گے؟"

فیروز بخت۔ "یہی سوالات میرے دل میں پیدا ہوتے ہیں، اور دل ان کا جواب نہیں دے پاتا!"

شاہ صاحب۔ "قدم آگے بڑھاؤ، پھر دیکھو گے، خدا کس طرح حصُولِ مقصد کی راہیں ہموار کر دیتا ہے؟"

فیروز بخت: "میرا ارادہ اب اٹل ہے، اس میں کوئی تزلزل نہیں، لیکن سب سے پہلا سوال یہ ہے کہ جاؤں کہاں؟"

شاہ صاحب: "تم اپنے باہمت رفیقوں کو ساتھ لو، اور نجیب آباد چلے جاؤ!"

فیروز بخت: "نجیب آباد!"

شاہ صاحب: "ہاں نجیب آباد، نجیب الدولہ کے پاس! تم وہاں اپنے تئیں اجنبی نہیں محسوس کروگے، نجیب الدولہ سے کہہ دینا، تم میری ہدایت سے اس کے پاس آئے ہو وہ تمہاری مدد کرے گا، تمہارا ساتھ دیگا۔ اس کی رفاقت حصولِ مقصد میں معین و مددگار ہوگی۔"

فیروز بخت: "ضرور ہوگی یا حضرت، میں جانتا ہوں وہ بہادر ہے، اس کے دل میں اسلام کا درد ہے، وہ مرہٹوں سے نبرد آزما ہو چکا ہے۔ اور انہیں شکستیں دے چکا ہے، مرہٹے اگر کسی کا لوہا مانتے ہیں تو صرف نجیب الدولہ کا، یہ وہی شخص تو ہے جس نے عماد الملک کو ناکوں چنے[1] چبوا دیئے۔ آخر اس نے تنگ آکر، کئی لاکھ روپیہ یومیہ اُجرت پر، رگھوناتھ راؤ بالاجی کو مع لشکر گراں بلا کر دہلی پر مرہٹوں سے حملہ کرا دیا، اور نجیب الدولہ بے سروسامان ہونے کے باوجود ۴۵ شبانہ روز ڈٹ کر مقابلہ کرتا رہا، آخر مرہٹوں کو اس سے صلح کرنا پڑی[2]۔"

شاہ صاحب: "ہاں وہی، غازی الدین اس کے خون کا پیاسا تھا، لیکن اس کا کچھ نہ کر سکا!"

---

[1] نجیب التواریخ

[2] نجیب التواریخ و تاریخ اندور، مطبوعہ الناظر پریس

فیروز بخت۔ "میں نجیب آباد جاؤں گا، اور نجیب الدولہ کو سارے واقعات سے مطلع کر دوں گا۔ وہ یقیناً اٹھ کھڑا ہوگا۔"

شاہ صاحب۔ "اور تمہاری توقع سے زیادہ جوش اور ولولہ کے ساتھ جو کچھ کر سکے گا کرے گا۔"

فیروز بخت۔ "لیکن مجھے شبہ ہے کہ مرہٹوں کی دَل بادل فوجوں کا وہ تن تنہا اپنی تھوڑی سی جمعیت کے ساتھ کیونکر مقابلہ کر سکے گا؟"

شاہ صاحب۔ "ہاں مرہٹوں کا لشکر تعداد میں بہت زیادہ ہے اور نجیب الدولہ کے پاس مٹھی بھر سپاہی ہیں لیکن کیا شکست و فتح کا دار و مدار، قلت اور کثرت پر ہوتا ہے؟ خدا کی مدد اگر شاملِ حال ہو، تو چھوٹی جماعت بڑی جماعت پر بھی غالب آسکتی ہے۔ آچکی ہے اور پھر آئے گی، عہدِ رسالتؐ اور عہدِ صحابہؓ کو چھوڑو، ابھی چند سال پہلے، جب ابدالی نے ہندوستان پر حملہ کیا تھا، تو وہ کامیاب گیا تھا یا ناکام؟"

فیروز بخت۔ "کامیاب!"

شاہ صاحب۔ "اس کی فوج افراد کے اعتبار سے زیادہ تھی یا کم؟"

فیروز بخت۔ "کم!"

شاہ صاحب۔ "پھر کیا تاریخ کے اِن واقعات کا اعادہ نہیں ہو سکتا؟ کیا پھر قلت کثرت پر غالب نہیں آسکتی؟"

جوش کے عالم میں فیروز بخت نے کہا: "تاریخ اپنے آپ کو پھر دُہرائے گی

لہ کم من فئۃ قلیلۃ غلبت فئۃ کثیرۃ باذن اللہ

شاہ صاحب۔ "ہاں مجھے یقین ہے۔ ایسا ہوگا اور ضرور ہوگا، اس لئے کہ حق ہمارے ساتھ ہے اور ظلم دوسروں کے ساتھ۔ اور یاد رکھو ؎

ظلم کی ٹہنی کبھی پھلتی نہیں
ناؤ کاغذ کی کبھی چلتی نہیں

اب پانی سر سے اونچا ہو چکا ہے۔ ظلم اور سفاکی اور بربریت کی انتہا ہو چکی ہے۔ قہر الٰہی جوش میں آ رہا ہے، اور میں دیکھ رہا ہوں، بہت جلد وہ وقت آنے والا ہے کہ حق کا بول بالا ہوگا اور کفر اپنے ظاہری ساز و سامان کی فراوانی کے باوجود، خائب و خاسر، ناکام و نامراد، تباہ و برباد ہوگا!"

فیروز بخت۔ "یا حضرت ایک بات میرے دل میں آ رہی ہے؟"

شاہ صاحب۔ "وہ کیا؟"

فیروز بخت۔ "کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ احمد شاہ ابدالی ایک مرتبہ پھر ———؟"

شاہ صاحب۔ "ہاں ——— جو بات تمہارے دل میں کھٹک رہی ہے، وہ رونما ہو کر رہے گی، احمد شاہ ابدالی آئے گا، اور اس کے آتے ہی جنگ کا نقشہ پلٹ جائے گا!"

فیروز بخت۔ "مجھے بھی یقین ہے، ایسا ضرور ہوگا!"

شاہ صاحب۔ "قیاس آرائیوں سے کام نہ لو، مستقبل کو خدا پر چھوڑ دو، اپنی نیت خالص رکھو!"

بڑی دیر تک، فیروز بخت حضرت شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر رہا کچھ عرصے کے بعد حضرت شاہ صاحب نے دریافت فرمایا۔ "تم نے اپنے گھر کو کس

حالت میں پایا؛ تمہارے والد کے انتقال کا مجھے بہت صدمہ ہے!"

فیروز بخت: "والد کا انتقال اتنا بڑا سانحہ ہے، جسے میں کبھی فراموش نہیں کر سکتا، گھر کی مجھے کچھ خبر نہیں کس حالت میں ہے، اب جاؤں گا تو دیکھوں گا!"

شاہ صاحب: "تم ابھی تک گھر نہیں گئے؟"

فیروز بخت: "نہیں یا حضرت، رہا ہوتے ہی سیدھا آپ کی دست بوسی کو حاضر ہوا!"

شاہ صاحب فیروز بخت کی اس عقیدت اور خلوص سے بہت متاثر ہوئے۔

انہوں نے فرمایا۔

"یہ تم نے زیادتی کی، پہلے تمہیں وہاں جانا چاہئے تھا۔ پھر یہاں آنا چاہئے تھا خیر، اب تم جاؤ، اور پوری یکسوئی کے ساتھ وہاں رہو!"

فیروز بخت شاہ صاحب سے رخصت ہو کر اپنی دولت سرا میں پہنچا، نجم الدولہ اور آصف زماں دروازے پر استقبال کے لئے موجود تھے۔ نجم الدولہ کے پاس ہی اعتبار الملک بھی خاموش کھڑے تھے، فیروز ان سب سے ملا، نجم الدولہ نے اُسے گلے سے لگایا اور کہا۔

"زندگی تھی، جو اس موذی غازی الدین کے پنجہ سے تم صحیح سلامت نکل آئے!"

اعتبار الملک نے کہا: "یہ زندہ جاوید ہو چکے، زندگی ادب سے ہاتھ باندھے ان کے پیچھے پیچھے چلتی ہے!"

نجم الدولہ نے ایک قہقہہ لگایا اور کہا: "بھائی صاحب آپ نے بڑے مزے کی بات کہی ——— واقعہ بھی یہی ہے ماشاءاللہ ——— لیکن یہ سوچ کر کلیجہ شق ہو جا

کو سات روز یعنی ایک ہفتہ کے بعد ——————

اعتبار الملک۔ "نہ آپ کو کلیجہ شق کرنے کی ضرورت ہے، نہ گریبان پھاڑنے کی، خدا کا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں ہوتا؛ ضرور اس میں بھی کوئی حکمت ہے —— بھائی صاحب فیروز کو اندر جانے کی اجازت دیجئے، ورنہ بھاوج دفورِ اشتیاق سے مجبور ہو کر خود کہیں اپنے لختِ جگر کو کلیجہ سے لگانے کے لئے یہاں نہ آجائیں۔"

نجم الدولہ۔ "ہاں بیٹا اندر آجاؤ۔"

فیروز مسکراتا ہوا اندر چلا گیا ٭

باب (۱۲)

ماں کا تقاضا

فیروز بخت دو روز تک گھر سے باہر نہ نکل سکا، سب لوگ جانتے تھے چند روز بعد وہ دلی سے کہیں باہر چلا جائے گا، ماں کا حال سب سے زیادہ ابتر تھا۔ وہ چاہتی تھیں قلب کی ٹھنڈک بنا کر اُسے دل میں رکھ لیں، یہ سوچ سوچ کر اُن کا دل خون ہو جاتا تھا کہ یہ وصلِ بہار صرف چند روز کے بعد رخصت ہو جائے گی، لیکن ساتھ ہی ساتھ خوشی بھی تھی کہ اتنے بڑے ظالم کے پنجہ سے اُسے رہائی تو مل گئی، وہ بچ تو گیا۔

تیسرے روز ناشتہ کے بعد ماں نے آکر کہا۔ "بیٹے مجھے تم سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔"

فیروز بخت نے مستعدی کے ساتھ کہا۔ فرمائیے امی جان میں حاضر ہوں۔"

ماں بولیں۔ بیٹا جب تم گرفتار تھے، تو یہ فکر جان لئے لیتی تھی کہ دشمنوں کے قبضہ میں ہو، خُدا جانے تم سے وہ کیا سلوک کرتے ہوں، اب رہا ہو گئے تو یہ خیال دامنگیر ہے کہ دیکھئے یہ جلاوطنی کب ختم ہوتی ہے اور کہاں کہاں کی ٹھوکریں کھاتا پھرتا ہے؟

یہ کہتے کہتے اُن کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں، ماں کو روتا دیکھ کر فیروز بخت کی آنکھیں بھی

آب گوں ہوگئیں، لیکن اُس نے اپنے تئیں سنبھالا، اور مطمئن لہجہ میں کہا۔ "اماں جان آپ فکرمند کیوں ہوتی ہیں؟ میں دُنیا کا ہر حادثہ برداشت کر سکتا ہوں۔ لیکن آپ کو روتا نہیں دیکھ سکتا، آپ کے آنسو میری سب سے بڑی کمزوری ہیں۔ مجھے اپنے ثبات و استقلال پر اعتماد ہے، لیکن آپ کو روتا دیکھ کر وہ اعتماد متزلزل ہو جاتا ہے، اماں جان کیا آپ یہ چاہتی ہیں کہ آپ کا بیٹا، حق کے راستہ پر نہ چلے، کیا آپ کی مرضی یہ ہے کہ جس بیٹے کو آپ جان سے زیادہ چاہتی ہیں وہ دُنیا کو لے لے اور دین کو چھوڑ دے! آپ ہی کی گود میں، میں نے یہ تعلیم پائی ہے کہ خدا کی رضا جوئی سب پر مقدم ہے، پھر اب کیا میں خدا کا راستہ چھوڑ دوں؟"

آنسو پونچھتے ہوئے وہ بولیں۔ "نہیں بیٹا میں یہ نہیں چاہتی، جب میں یہ دیکھتی ہوں کہ خلقت کی زبان پر تمہارا نام کتنی عزّت اور عظمت کے ساتھ آتا ہے تو میرا دل فخر و مسرت سے لبریز ہو جاتا ہے۔ میں محسوس کرتی ہوں واقعی تم نیک کام کر رہے ہو حق پر ہو اور پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ حضرت شاہ صاحب کی دعائیں اور برکتیں جسے حاصل ہوں مجھے یقین ہے وہ گمراہ نہیں ہو سکتا۔"

فیروز بخت۔ "امی جب یہ بات ہے، تو پھر آپ کیوں ہراساں ہوتی ہیں؟ جیل میں بے شک مجھے تکلیفیں برداشت کرنی پڑیں، لیکن یقین کیجئے، ایسے لوگ بھی تھے، جنہیں مجھ سے کہیں زیادہ اذیتیں دی گئیں، بیشک مجھے اپنا وطن چھوڑنا پڑ رہا ہے۔ لیکن ایسے لوگ بھی ہیں جنہیں دُنیا سے رختِ سفر باندھنا پڑتا ہے میرے بارے میں تو آپ کو آس ہے، پھر آ جاؤں گا، لیکن جو لوگ دُنیا سے سفر کرتے ہیں وہ تو واپس نہیں آتے، لیکن اُن کی ماؤں کو بھی صبر کرنا پڑتا ہے، بیشک

کا موقع ہے نہ کہ رونے دھونے کا!"

ماں نے جواب دیا۔ "ہاں بیٹا سچ کہتے ہو۔ تمہاری ان باتوں نے مجھے بڑی تسکین دی، لیکن تم ایک بات بھول جاتے ہو!"

فیروز بخت نے پوچھا۔ "وہ کیا امّی جان؟"

کہنے لگیں۔ "یہ کہ میں ماں ہوں۔ ماں کا دل بڑا نازک ہوتا ہے!"

فیروز بخت نے محبت سے بے تاب ہو کر کہا۔ "میری امّی میں جانتا ہوں جیل میں بھی مجھے جو خیال سب سے زیادہ بیتاب اور پریشان رکھتا تھا وہ آپ ہی کا خیال تھا۔ لیکن میں ایک بات اور بھی جانتا ہوں!"

پوچھنے لگیں، "وہ کون سی بات بیٹا؟"

فیروز نے کہا: "یہ کہ جس طرح آپ کے سینہ میں ماں کا دل دھڑک رہا ہے اسی طرح وہ دل اسلام کے لئے بھی دھڑکتا ہے۔ امّی جان اگر اس دیس میں اسلام کی عزت نہ رہی تو ہم زندہ رہ کر کیا کریں گے؟"

ماں نے جواب دیا۔ "ہاں ٹھیک ہے بیٹا۔ لیکن تم بچّوں کی سی باتیں کرتے ہو!"

"کیوں امّی جان؟"

"اور کیا ——— بھلا اسلام کو کون ذلیل کر سکتا ہے؟ اسلام خدا کا دین ہے وہی اس کا حامی و ناصر ہے!"

"ہاں ہے، لیکن حمایت اور نصرت کا فرض انہی لوگوں پر عائد ہوتا ہے، جو اپنے تئیں مسلمان کہتے ہیں!"

"ہاں بے شک!"

"تو پھر میرا یہ فرض ہے کہ نہیں کہ اسلام کے لئے اپنی گردن تک کٹوا دوں؟"

وہ جوش کے ساتھ بولیں۔ "ہاں ہے، اگر ضرورت ہو!"

فیروز نے کہا: "امی جان، وہ ضرورت رونما ہو چکی ہے، اور اسی لئے میں کفن سر سے لپیٹ کر میدان میں اُترا ہوں، یقین نہ ہو تو شاہ صاحب سے پوچھ لیجئے!"

کہنے لگیں "اس کا مجھے یقین ہے۔ اسی لئے آنکھوں سے تیری یہ سرفروشیاں دیکھ رہی ہوں، اور خاموش ہوں؛ ورنہ میں بھی تیرے باپ کی طرح اس دُنیا سے رخصت ہو چکی ہوتی۔"

یہ کہہ کر وہ پھر رونے لگیں، فیروز نے اپنے ہاتھ سے اُن کے آنسو پونچھے، اور بچّوں کی طرح ٹھنکتے ہُوئے کہا۔ "لیجئے آپ پھر رونے لگیں۔"

انہوں نے آنسو پونچھے اور کہا۔ "نہیں نہیں میں روتی نہیں۔ لیکن تجھے میری ایک بات ماننی پڑے گی!"

وہ اشتیاق کے ساتھ بولا۔ "فرمائیے، ایک نہیں، آپ جتنی باتیں کہیں گی میں سب مان لوں گا!"

"میں چاہتی ہوں تیرا سہرا دیکھ لوں!"

فیروز کچھ سوچنے لگا، پھر فیصلہ کُن لہجہ میں کہا۔ "ابھی نہیں۔"

"یہ کیوں؟"

"حالات کا تقاضا یہی ہے امّی جان!"

"میں بھی تو سنوں حالات کیا ہیں؟ غضب خُدا کا، جوان جہان لڑکی کب تک یونہی بٹھائی رکھی جائے گی؟"

فیروز نے فکرمند لہجہ میں کہا۔ "لیکن امّی جان آپ جانتی ہیں، آج کے پرچے ریز

ایک نامعلوم مدّت کے لئے مجھے یہاں سے چلا جانا ہے۔ کہیں پناہ گزین ہو کر بیٹھنا

نہیں ہے، بلکہ جہاد کی زندگی بسر کرنی ہے۔ کیا معلوم میں زندہ لوٹتا بھی ہوں یا نہیں۔"

وہ چیخ پڑیں۔ "کیا کہا زندہ لوٹتا ہوں یا نہیں؟"

فیروز بخت۔ "امی جان میرا مطلب یہ ہے کہ جنگ دو سرو را ممکن ہے خدا مجھے کامیاب

کرے، لیکن ناکامی کے امکان کو بھی نظر انداز نہ کرنا چاہئے۔ لہٰذا اگر شادی ہوگی

تو میری واپسی کے بعد ابھی نہیں۔"

وہ مایوسی کے لہجہ میں بولیں۔ "تجھے میری خوشی ذرا بھی منظور نہیں؟"

فیروز۔ "ضرور منظور ہے۔ امّی جان۔ لیکن آپ کی خوشی کے لئے دوسرے کی گردن پر

کُند چھری مجھ سے نہیں چلائی جاتی!"

"کیا تو یہ سمجھتا ہے کہ لڑکی تیری سرگرمیوں سے ناواقف ہے؟ ..... وہ خوب

جانتی ہے تو کیا کر رہا ہے؟ کس طرف جا رہا ہے!"

بے پروائی سے فیروز نے کہا: "جانتی ہوگی ..... تو اس سے کیا ہوتا ہے!"

ذرا جوش کے ساتھ بولیں: "ایسی لڑکی چراغ لے کر ڈھونڈھو گے تو نہیں ملے گی!

بیٹے تم نہیں جانتے ماہ طلعت کس قماش کی لڑکی ہے؟"

فیروز مسکرایا: "امّی جان آپ تو رائی کا پربت بناتی ہیں۔ کیا میں نے ماہ طلعت

کو دیکھا نہیں؟"

"تو کیا پایا تو نے اس میں؟"

وہ پھر مسکرایا۔ "کچھ نہیں، ایک معمولی لڑکی ہے، چونکہ آپ کی بھانجی ہے اس

آپ نے خواہ مخواہ زمین آسمان کے قلابے ملا رکھے ہیں!"

وہ سر پکڑ کر بیٹھ گئیں۔ "ہائے یہ تُو کیا کہہ رہا ہے لڑکے! میری ماہ کا جوابِ خوبصورت میں ہے نہ سیرت میں۔ تجھے کچھ خبر بھی ہے؟ اس نے تیرے لئے کیا کیا؟ کیا کچھ نہ کر گزری وہ؟"

اب تو فیروز کے کان کھڑے ہو گئے۔ اُس نے اشتیاق کے لہجہ میں پوچھا "کوئی خاص بات؟"

"ہاں ——— جب سے تو جیل گیا ہے، آج تک وہ مسہری پر نہیں لیٹی ایک مرتبہ بھی کسی نے اسے ہنستے نہیں دیکھا، اچھا کھانا، اُس نے بالکل چھوڑ دیا، بس سادہ دال چاول، روٹی ترکاری، وہ ہے اور نماز، وہ ہے اور قرآن، یہ سب اُس نے کیوں کیا؟"

یہ باتیں سن کر فیروز دنگ رہ گیا، اُس کے منہ سے بے ساختہ نکلا: "واقعی امی جان؟"

"یہ لو تو کیا میں جھوٹ بولوں گی؟ ——— بول اب کیا کہتا ہے؟"

فیروز نے شرارت بھرے لہجہ میں کہا: "اب مجھے اندازہ ہوا کہ وہ بیوقوف بھی ہے؟"

"کون؟ کسے کہہ رہا ہے تُو؟"

فیروز: "امی جان آپ کی بھانجی کو کہہ رہا ہوں، اور کسے کہہ رہا ہوں ——— غور تو کیجئے، بھلا عقلمندی کے اس مظاہرہ کی کیا ضرورت تھی؟ وہ مسہری پر نہیں لیٹیں تو مجھے کیا فائدہ پہنچا، اُنہوں نے اچھے کھانے تج دیئے تو میرے پلے کیا پڑا؟"

ماں نے محبت بھرے لہجہ میں کہا۔ "تو ہے اچھا خاصا پاگل ——— شادی ہو گی اور تیرے جانے سے پہلے ہو گی!"

فیروز۔ "امی جان اِس معاملہ میں زبردستی نہ کیجئے —— اچھا میں ایک بات کہتا
ہوں، اُمید ہے، آپ مان لیں گی؟"

"کہو کیا بات ہے؟"

فیروز: "میں حضرت شاہ صاحب پر اس مسئلہ کا فیصلہ چھوڑتا ہوں، جو وہ کہیں گے میں
وہی کروں گا۔ اُن کا فیصلہ یقیناً آپ کے لئے بھی قابلِ قبول ہوگا!"
کہنے لگیں: "مجھے یقین ہے حضرت شاہ صاحب کا فیصلہ میرے حق میں ہوگا، تو
آج ہی اُن کے پاس جا!"

فیروز: "میں ضرور اُن کے پاس جاؤں گا۔ جب سے آیا ہوں اُن کی خدمت میں
حاضر نہیں ہو سکا۔ ڈر ہے کہیں میری غیر حاضری کو وہ محسوس نہ فرمائیں۔"
ماں اُٹھنے لگیں تو فیروز نے کہا: "سوچتا ہوں آج خالو جان کے ہاں بھی ہو آؤں!"
"یہ تو تُو نے میرے دِل کی بات کہی اور ہاں میں تو بھول ہی گئی، کل سے کئی مرتبہ
نجم الدولہ کا آدمی آیا ہے۔ انہوں نے خود بھی تجھے بلایا ہے، ضرور ہو آؤ!"

فیروز: "بہت خوب!"
ماں سے باتیں کر کے فیروز باہر آیا۔ یہاں بہت سے لوگ انتظارِ ملاقات اور اشتیاقِ
دیدار میں بیٹھے ہوئے تھے، ان لوگوں سے اخلاق و تپاک سے ملاقات اور گفتگو
کے بعد اُس نے آصف زماں سے شکایتہً کہا۔ "تم آج آئے ہو؟ بے مروت کہیں
کے!"

آصف زماں نے کہا: "جان کی اماں پاؤں تو کچھ عرض کر دوں؟"
فیروز بخت نے مسکراتے ہوئے کہا: "تمہیں امان دی جاتی ہے، کہو کیا کہتے

آصف نے دست بستہ ہو کر بڑی سنجیدگی سے کہا۔ "یہ فدوی ہر روز آتا ہے صبح سے شام تک حاضر رہتا ہے، جب آتا ہے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ سرکار ابھی اندر ہیں جب جاتا ہے یہ معلوم ہوتا ہے 'بسترِ استراحت پر دراز ہیں۔ اب بھی اگر اس جاں نثارِ قدیم کی کوئی غلطی ہو تو یہ گردن حاضر ہے...... سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے!"

فیروز ہنسنے لگا!

آصف زماں نے کہا۔ "اگر حکم ہو تو ایک بات اور بھی عرض کر دوں؟"

فیروز۔ "وہ بات بھی کہہ ڈالو!"

پھر شرارت آمیز سنجیدگی کے ساتھ آصف نے کہا: "میں خود آیا نہیں بھیجا گیا ہوں!"

فیروز کی باچھیں کھل گئیں، لیکن تغافل کا اظہار کرتے ہوئے اُس نے پوچھا۔ "میں سمجھا نہیں..... کس نے بھیجا ہے تمہیں؟"

آصف زماں نے کہا۔ "حضور، یہ ڈرامہ زیادہ دیر تک نہیں چلے گا، صاف بات یہ ہے کہ آپ کی طلبی ہوئی ہے!"

"کس نے بلایا ہے مجھے؟"

"یہ وہیں چل کر آپ کو معلوم ہو جائے گا!"

"اچھا تو چلو چلتے ہیں!"

دونوں ساتھ ساتھ نجم الدولہ کے ہاں پہنچے۔ نجم الدولہ مردانے میں موجود تھے انہوں نے جو فیروز کو آتے دیکھا تو کمرہ سے باہر آ کر استقبال کیا، اور اپنے ساتھ اندر لے گئے۔ کہنے لگے۔

"بیٹا تمہاری خالہ جان تمہارے لئے ماہیٔ بے آب کی طرح تڑپ رہی ہیں بیمار نہ ہوتیں تو خود آتیں!"

فیروز نے مؤدب لہجہ میں کہا: "کیا عرض کروں، ہر روز حاضری کا ارادہ کرتا تھا لیکن امی جان کی باتیں ختم ہونے ہی میں نہیں آتی تھیں، آج انہوں نے اجازت دی ہے!"

نجم الدولہ ہنسے اور کہنے لگے۔

"وہ تو ہونا ہی چاہئے تھا۔ کتنے دنوں کے بعد ماں کی گود میں اس کا بچہ پہنچا تھا!"

باب ۱۳

شاہ صاحب کا فیصلہ

فیروز بخت ماہ طلعت کو دل سے چاہتا تھا۔ اس کی محبت خالص تھی، اس میں ہوس کا شائبہ بھی نہیں تھا، اس کی محبت میں نہ افراط تھی نہ تفریط۔ اگرچہ ماہ طلعت سے اُسے بے تابانہ محبت تھی، لیکن یہ محبت، وقتی اور جذباتی نہیں تھی۔ وہ اپنی محبت کا تقاضہ یہ نہیں سمجھتا تھا کہ جلد از جلد اُسے اپنا لے۔ خواہ اس کی زندگی غارت ہو جائے، خواہ اُسے اپنی ساری زندگی رو رو کر اور کُڑھ کُڑھ کر گزارنی پڑے، وہ سوچتا تھا، بھیانک اور غیر یقینی مستقبل میرے سامنے ہے۔ میں خدا کے راستے میں، ایک بڑا مقصد لے کر نکلا ہوں، اس مقصد پر محبت قربان کی جاسکتی ہے۔ لیکن میری محبت اتنی پست نہیں ہونی چاہئے، کہ اُسے نکاح کی زنجیر میں گرفتار کر کے کہیں کا نہ رکھوں، شادی اسی لئے ہوتی ہے کہ میاں بیوی لطف و محبت، سکون و اطمینان یکسوئی اور یک رنگی، اور سب سے بڑھ کر یگانگت کی زندگی بسر کریں، لیکن میں اگر شادی کر لوں تو وہ یگانگت کہاں ملے

نہیں، یہ نہیں ہو سکتا، میں زندگی بھر ماہ سے محبت کرتا رہوں گا۔ لیکن اپنی محبت کی خاطر اُس کی زندگی برباد کر دوں، یہ نہیں ہو سکتا، ہرگز نہیں ہو سکتا۔

یہی سوچتا ہُوا فیروز حضرت شاہ صاحب کے آستانۂ عالیہ پر پہنچا، اتفاق سے شاہ صاحب بالکل تنہا تشریف فرما تھے۔ عقیدتمندوں کا گروہ اُس وقت موجود نہیں تھا۔ بہت دیر تک حضرت شاہ صاحب اور فیروز میں گفتگو ہوتی رہی، مختلف ذاتی اور قومی مسائل پر، فیروز ہر معاملہ میں شاہ صاحب کی ہدایت کا جویا رہتا تھا۔ آخر میں اُس نے اپنی والدہ کے اِصرار کا ذکر کیا کہ وہ شادی پر تُلی ہوئی ہیں۔ شاہ صاحب نے فرمایا:۔

"جہاں تک میں سمجھتا ہوں تمہیں اس شادی پر اعتراض تو ہے نہیں؟ لڑکی تمہارے خاندان کی ہے، تمہاری دیکھی بھالی، بلکہ مجھے تو یہ بھی معلوم ہُوا ہے کہ اُسے تُم سے اور تمہیں اس سے تعلقِ خاطر بھی ہے؟"

فیروز۔ "یا حضرت آپ کے سمع مبارک تک بالکل امرِ واقعہ پہنچا ہے، واقعی مجھے اس سے بہت زیادہ تعلقِ خاطر ہے، میرے ایامِ اسیری میں اُس نے جس ایثار کا ثبوت دیا ہے، اسے تو میں ہرگز فراموش نہیں کر سکتا!"

شاہ صاحب۔ "ہاں مجھے معلوم ہے ——— اور اسی لیے تمہارے تامل اور تذبذب پر مجھے حیرت ہے!"

فیروز۔ "آپ جانتے ہیں، چند روز کے بعد مجھے یہاں سے کُوچ کرنا ہے ایک نامعلوم سمت کی طرف ایک غیر معیّن مدت کے لئے، پھر یہ بھی نہیں معلوم میرا حشر کیا ہو؟"

شاہ صاحب: "تو پھر؟"

فیروز۔ "اس غیر یقینی کیفیت میں زندگی بھر کا پیمان اتحاد باندھتے ہُوئے میرا دل دھڑ

میں نے اپنے ناچیز معروضات پیش کر دیئے ؛ پھر بھی اگر آپ فرمائیں تو مجھے عذر نہیں!

حضرت شاہ صاحب۔ میرا خیال تو یہ ہے کہ شادی بہت مبارک ہوگی۔ تمہیں تامل نہیں کرنا چاہیئے!"

فیروز بخت یہ سُن کر خاموش ہوگیا۔ کچھ دیر کے بعد حضرت شاہ صاحب نے فرمایا! "دیکھو، اس رشتے سے کئی فائدے ہیں، ایک تو یہ کہ تم جب یہاں سے کوچ کر وگے تو تمہاری والدہ کو قدرتی طور پر بہت صدمہ ہوگا، لیکن اگر شادی کر لوگے تو تمہاری دلہن سے ان کا غمگین دل بہت کچھ بہل جائے گا۔ وہ تمہاری ایسی نشانی بن جائے گی جسے دیکھ دیکھ کر وہ جدائی کے دن اطمینان سے کاٹ لیں گی جدائی کا غم بڑی حد تک کم ہو جائے گا ——— مانتے ہو نا یہ بات ؟"

فیروز۔ "جی ہاں یہ بات تو ہے ! ——— اس طرف پہلے میرا ذہن نہیں گیا تھا!"

شاہ صاحب۔ "ایک دوسری بات بھی ہے!"

فیروز۔ "ارشاد؟"

شاہ صاحب۔ "تمہارے یونہی چلے جانے سے لڑکی کو بھی غیر معمولی صدمہ ہوگا لیکن اگر اسے یہ اطمینان ہو جائے کہ تم زندگی بھر کے لئے اس کے ہو گئے تو یہ جدائی کے پہاڑ سے دن بھی بڑی حد تک سکون سے کاٹ لے گی!"

فیروز۔ "بجا ارشاد ہُوا یہ بات بھی ہے!"

شاہ صاحب۔ "اب مجھے تمہارے ایک شبہ کا ذکر کرنا ہے!"

فیروز۔ "میرے غیر یقینی مستقبل کے بارے میں؟"

شاہ صاحب۔ "ہاں ــــــ مجھے تمہارے ان الفاظ سے تکلیف ہوئی!"

فیروز۔ "مجھ سے کوئی غلطی سرزد ہوئی؟"

شاہ صاحب: "ایسی بات ایک مسلمان کی زبان سے نہیں نکلنی چاہیے...... ہمارے رسول کریمؐ کا ارشاد ہے جب تم دُنیا کا کام کرو تو یہ سمجھ لو کہ تمہیں موت کبھی نہیں آئیگی اور جب دین کا کام درپیش ہو تو یہ سمجھو کہ موت سر پر کھڑی ہے ــــــ اس ارشاد میں کیا حکمت ہے سمجھے؟"

فیروز "آپ ارشاد فرمائیں!"

شاہ صاحب۔ "اس ارشادِ نبوی میں حکمت یہ ہے کہ دُنیا کا کام پوری یکسوئی اور بے فکری سے انجام دو، اور دین کے کام کو نہ مؤخر کرو، نہ معلق، فوراً انجام دے ڈالو!"

فیروز۔ "بجا ارشاد ہوا"

شاہ صاحب: "تمہیں اس حدیث کو اپنا راہنما بنانا چاہیے۔ صحابہؓ کرام بھی جہاد کرتے تھے۔ لیکن انھوں نے اپنی ازدواجی زندگی جہاد کے خیال سے کبھی ملتوی نہیں کی۔ پھر تم کیوں ایسا کرتے ہو؟"

فیروز: "واقعی یہ میری کم نظری تھی.... ابھی میں والدہ سے جاکر عرض کئے دیتا ہوں کہ مجھے کوئی عذر نہیں!"

شاہ صاحب: "مجھے تم سے یہی توقع تھی!"

باب (۱۴)

رازونیاز

فیروزبخت اور ماہ طلعت کی شادی ہوگئی، نہ باجہ نہ تاشہ، نہ آتش بازی، نہ راگ رنگ کی محفل، نہ قوالی، نہ رقص و سرود، کامل اسلامی سادگی کے ساتھ یہ رسم انجام پائی۔

لیکن اس شادی نے تین دلوں کی اُجڑی ہوئی دُنیا بسادی تھی، فیروز کی ماں آج اتنی خوش تھیں گویا اُنہیں خزانۂ قارون مل گیا۔ فیروز کا دل بھی خوشی سے بلّیوں اُچھل رہا تھا اور ماہ طلعت اگرچہ خاموش تھی لیکن اُس کی آنکھوں سے لازوال مسرت کی تراوش ہو رہی تھی، ایسا معلوم ہو رہا تھا۔ اُس نے وہ چیز پالی جس کے بعد خواہشوں اور تمناؤں کا کوئی درجہ باقی ہی نہیں رہ جاتا۔

ماہ طلعت اپنے حجلۂ عروسی میں دلہن بنی بیٹھی تھی، اس کی شادی کو دو روز گذر چکے تھے، اس وقت نہ جانے وہ کیوں متفکر سی نظر آرہی تھی۔ اتنے میں فیروز آگیا اُسے دیکھ کر وہ مسکرادی، فیروز نے کہا۔ "تمہاری چوری میں نے پکڑلی!"

ماہ طلعت: "کیسی چوری؟"

فیروز۔ "مسکرا کر" تم مجھے دھوکا دے رہی ہو لیکن ہو فکر مند!"

ماہ طلعت۔ "اب مجھے کوئی فکر نہیں۔ خدا نے آپ کی صورت میں مجھے اتنی بڑی نعمت
بخش دی ہے کہ اسے پا کر سوچتی ہوں، تو شکر کے الفاظ نہیں ملتے!"

فیروز۔ "تم نے میرے الفاظ چرا لئے ...... اگر تم مجھے نہ ملتیں تو میری ساری زندگی
حسرت اور نامرادی کے سوا کیا ہوتی؟"

ماہ طلعت۔ "یہ نہ کہئے۔ خدا نے آپ کو بہت بڑے کاموں کے لئے پیدا کیا ہے!"

فیروز۔ "اور تمہیں؟"

ماہ طلعت۔ "صرف آپ کی خدمت کے لئے!"

فیروز نے محبت سے ماہ کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "ماہ ایسی باتیں نہ کرو
اس دنیا میں تم مجھے بہت زیادہ عزیز ہو، آج پہلی مرتبہ صرف تمہاری وجہ سے میں
نے اپنے اندر ایسی کمزوری محسوس کی ہے کہ خود مجھے اپنے وجود سے شرم آنے لگی ہے!"

ماہ طلعت یہ الفاظ سن کر گھبرا گئی۔ اس نے کہا۔ "کیا ہوا؟ خدا کے لئے
کچھ کہئے تو ——؟"

فیروز نے محبت بھری نظروں سے اپنی نئی نویلی دلہن کو دیکھا اور کہا۔ "میری زندگی کی
کمزوری تم ہو!"

وہ اور زیادہ حیرت زدہ ہو گئی۔ "میں؟"

فیروز۔ "ہاں تم!"

ماہ طلعت۔ "وہ کیونکر؟"

فیروز۔ "آج پہلی مرتبہ میں اپنے اس عزم میں کمزوری محسوس کر رہا ہوں، جس پر میں نے

تاز تھا!"

ماہ طلعت نے سنجیدگی کے ساتھ پوچھا۔ "یعنی وہ کون سا عزم؟"

فیروز: "سرفروشی کا عزم، اسلام کے راستے میں مر مٹنے کا عزم، قوم اور ملت کے لئے جان دینے اور سر کٹانے کا عزم —————— ماہ! اس عزم میں مجھے کمی سی محسوس ہونے لگی ہے۔"

ماہ طلعت۔ "یہی تو پوچھتی ہوں کیسے؟ کیونکر؟"

فیروز۔ "پہلے میں زندگی کو پرکاہ کے برابر وقعت نہیں دیتا تھا، موت سے کھیلتا رہتا تھا۔ اب میرے اندر زندہ رہنے کی امنگ پیدا ہو گئی ہے، اب میں زندہ رہنا چاہتا ہوں۔"

ماہ طلعت۔ "اور اگر میں مر جاؤں؟"

فیروز نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور ایک تأثر کے عالم میں کہا۔ "یہ نہ کہو! موت کا نام نہ لو۔ میں یہ لفظ بھی سننا نہیں چاہتا!"

ماہ طلعت۔ "کیوں آخر؟"

فیروز۔ "تم زندہ رہو گی، تمہیں زندہ رہنا پڑے گا، تم مر نہیں سکتیں، میں تمہیں مرنے نہیں دوں گا۔ تم بھی زندہ رہو گی، اور میں بھی زندہ رہنے کی کوشش کروں گا!"

ماہ طلعت۔ "لیکن مجھے وہ زندگی نہ اپنے لئے مرغوب ہے نہ آپ کے لیے جس میں بڑائی نہ ہو عظمت نہ ہو، تقدس اور پاکیزگی نہ ہو، بہادری اور شجاعت نہ ہو، آن اور شان نہ ہو، مجھے کیڑے مکوڑوں کی زندگی نہیں چاہیے، وہ زندگی چاہیے، جس کے سامنے موت بھی عقیدت سے سر جھکاتی ہے!"

کچھ دیر تک خاموشی رہی، ماہ طلعت نے فیروز بخت پر ایک نظر ڈالی اور کہا: "میں آپ سے اس لئے محبت کرتی تھی کہ آپ میں میں نے وہ جھلک دیکھی تھی، جو بڑوں کی زندگی میں نظر آتی ہے!"

فیروز نے کہا: "تو کیا تم اب مجھ سے محبت نہیں کرو گی؟"

ماہ طلعت۔ "یہ کیسے کہوں کہ محبت نہیں کروں گی، وہ تو میری رگ رگ، اور نس نس میں بسی ہوئی ہے، میں آپ سے نفرت نہیں کر سکتی، لیکن ——"

فیروز۔ "ہاں لیکن کیا؟"

ماہ طلعت۔ "اگر یہ دیکھوں گی کہ میں آپ کے راستہ کا روڑا بن گئی ہوں، تو آپ یقین کیجئے، بڑی آسانی سے میں اپنی زندگی ختم کر ڈالوں گی، خود اپنے ہاتھوں سے!"

فیروز نے پریشان ہو کر پوچھا۔ "خودکشی کر لو گی تم؟"

طلعت نے پروقار لہجہ میں کہا۔ "ہاں!"

فیروز بخت۔ "یہ کیوں آخر؟"

ماہ طلعت۔ "میں آپ کی بلندی کو پستی سے بدلتے نہیں دیکھ سکتی، اُسے دیکھنے سے بہتر یہی ہے کہ میں مر جاؤں، زندگی سے گذر جاؤں!"

فیروز نے پہلو بدل کر پوچھا: "میں اپنے دل کو اتنا مضبوط نہیں پاتا کہ تمہیں مرتے دیکھ لوں، لیکن تمہارا دل اتنا مضبوط ہے؟"

ماہ طلعت۔ "آپ مجھے غلط سمجھنے کی کوشش نہ کیجئے!"

فیروز۔ "اسی لئے تو کرید کرید کر سوال کر رہا ہوں!"

ماہ طلعت۔ "آپ خدانخواستہ، اگر بیمار ہو کر یا کسی حادثہ کا شکار ہو کر میرے سامنے

جان دیں، تو واقعی میرا زندہ رہنا مشکل ہے!"

فیروز: لیکن ——— ؟"

ماہ طلعت: لیکن اگر آپ خدا کے راستہ میں جہاد کرتے ہوئے شہید ہوں، تو میں اس واقعہ کو فخر اور مسرت کے ساتھ برداشت کروں گی، مجھے اپنے کمزور دل پر اتنا بھروسہ ہے!"

فیروز: سچ کہتی ہو؟

ماہ طلعت: میں کبھی جھوٹ نہیں بولتی!"

فیروز: تم چاہتی ہو، میں اپنا کام کرتا رہوں، جہاد کے لئے کمربستہ ہو جاؤں۔ تمہیں یکہ و تنہا چھوڑ کر خارج البلد ہو جاؤں اور خدا کے راستے میں سر کٹانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دوں؟"

ماہ طلعت: ہاں میں صرف یہی چاہتی ہوں، اس کے سوا کچھ نہیں!"

فیروز: تم میری جدائی برداشت کر لوگی؟

ماہ طلعت: کر لوں گی!"

فیروز: اگر میں شہید ہوا تو ساری زندگی میرے سوگ میں گذار دو گی؟"

ماہ طلعت: شہیدوں کا سوگ نہیں منایا جاتا، لیکن یہ عہد کرتی ہوں کہ ساری زندگی اسی کام کے لئے وقف کر دوں گی، جو آپ کو عزیز ہے، جس کے لئے آپ سر ہتھیلی پر رکھے ہوئے ہیں، جس کی خاطر آپ کے سر میں جہاد کا سودا، اور دل میں شہادت کا ولولہ پروان چڑھ رہا ہے!"

فیروز: "میں یقین کر لوں؟"

ماہ طلعت۔ "آپ مجھ سے کیا پوچھتے ہیں، اپنے آپ سے پوچھئے، اپنے دل سے پوچھئے ـــــــ پوچھئے اور بتائیے مجھے وہ کیا کہتا ہے؟"

فیروز۔ "پوچھ کر بتاؤں گا!"

ماہ طلعت۔ "تو پوچھئے نا ابھی!"

فیروز اُٹھ کھڑا ہوا۔ "ابھی نہیں، پھر کسی وقت!"

ماہ طلعت نے فیروز کا دامن پکڑ لیا، اُس کی خوب صورت آنکھوں میں آنسوؤں کے قطرے بھرے ہوئے تھے۔ اس نے کہا۔ "ابھی پوچھئے، ابھی بتائیے!"

فیروز کی آنکھوں میں بھی آنسو بھر آئے۔ اُس نے اُس کا سر اپنے کاندھے سے لگا لیا اور محبت سے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگا، وہ سسکیاں لے لے کر رونے لگی، فیروز نے کہا۔ "ارے پوچھ لیا بھئی ـــــــ وہ کہتا ہے ـــــــ اب تم رونا بند کرو تو کہوں!"

ماہ طلعت کی سسکیاں بدستور جاری تھیں، فیروز نے اُس کا منہ اوپر اٹھایا، اپنے ہاتھ سے اُس کے آنسو پونچھے، اور پھر اپنے کاندھے سے لگا کر بڑے پیار بھرے لہجہ میں کہا۔ "خدا کے لئے سن تو لو اس کا فیصلہ!"

وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ "تو کہئے بھی تو!"

فیروز نے ایک شوخ قہقہہ لگایا اور کہا۔ "میرا دل کہتا ہے تم بچی ہو، تم کبھی جھوٹ نہیں بولتیں، تم مجھ سے محبت کرتی ہو، تم اپنی محبت کو، میری عزت اور عظمت پر قربان کر سکتی ہو۔ زندگی بھر کڑھ کڑھ کر اور رو رو کر بسر کر سکتی ہو، لیکن میری آن اور شان پر حرف آجانے سے اسے کبھی اور کسی قیمت پہ گوارا نہیں کر سکتیں، تم میرے لئے ہر تکلیف

برداشت کر سکتی ہو، اچھے کھانے چھوڑ سکتی ہو، مسہری کا لیٹنا ترک کر سکتی ہو، کھرّی زمین میں اپنا بستر بنا سکتی ہو، غرض جو کچھ بھی اس دُنیا میں محبت کی خاطر کیا جا سکتا ہے، تم وہ سب کر سکتی ہو ——— کیوں میں نے غلط تو نہیں کہا؟"

ماہ کی آنکھوں میں اب تک آنسو بھرے ہوئے تھے، لیکن وہ مسکرا دی، اُس نے بڑے انداز سے کہا:۔

"میں نہیں جانتی!"

فیروز نے پیار بھری نظروں سے اپنے دِل کی ملکہ کو دیکھا اور کہا۔ "ماہ میں تمہیں چھیڑنے کے لئے نہیں، آزمانے کے لئے یہ باتیں کر رہا تھا۔ میں دیکھنا چاہتا تھا، تم میرے راستہ کا پتھر تو نہیں ہوگی؟"

ماہ طلعت: "پھر آپ کس نتیجے پر پہنچے؟"

فیروز۔ "جس پر میں پہنچنا چاہتا تھا!"

ماہ طلعت۔ "صاف صاف کہئے:"

فیروز: "یہی کہ تم صحیح معنوں میں میری شریکِ حیات ہو، فیروز کی محبوبہ اور رفیقۂ زندگی کو جیسا ہونا چاہیے تھا، تم ویسی ہی ہو، بلکہ اس سے بھی کچھ بڑھ چڑھ کر!"

ماہ طلعت۔ "سچ کہتے ہیں آپ؟"

فیروز۔ "ہاں ——— سچ کہتا ہوں، میرا دِل آج جتنا مسرور ہے، میں کہہ نہیں سکتا ——— اب میں مطمئن ہو کر یہاں سے جاؤں گا اور انشاءاللہ تم دیکھو گی، میرا قدم غلط راستہ پر نہیں پڑے گا، تمہاری تمنائیں امّی جان

کی دعائیں حضرت شاہ صاحب کی برکتیں، اور خدائے بزرگ و برتر کی تائید میری رفیق راہ ہوگی!"

ماہ طلعت۔ "انشاء اللہ!"

اور پھر محبت کے یہ متوالے بڑی دیر تک دُنیا ومافیہا سے بے خبر محبت کے نغمے گاتے رہے، وہ نغمہ جسے صرف دل گا سکتا ہے، اور دل سُن سکتا ہے!

باب (۱۵)

کُوچ

دِلّی کی تاریخ میں آج کا دِن بہت اہم تھا، آج فیروز بخت دِلّی سے کُوچ کر رہا تھا ایک نامعلوم منزل کی طرف!

عشا کی نماز اُس نے حضرت شاہ صاحب کی خانقاہ میں پڑھی، نماز کے بعد جب تمام نمازی رخصت ہونے لگے، تو حضرت شاہ صاحب نے فیروز بخت سے ارشاد فرمایا: "تم سے کچھ گفتگو کرنی ہے مجھے!"

وہ ادب سے گردن جھکا کر ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا، جب سب لوگ چلے گئے تو حضرت شاہ صاحب نے دریافت فرمایا: "کیا آج تم کُوچ کر رہے ہو؟"

اُس نے عرض کیا: "سارا سامان مکمل ہو چکا ہے، آج راتوں رات کوچ کرنے کا ارادہ ہے تاکہ آسانی سے پتہ نہ چل سکے۔ ہم کہاں جا رہے ہیں، اور ہماری منزل مقصود کدھر ہے؟"

شاہ صاحب نے تبسم فرمایا اور کہا: "بہت صائب رائے ہے...... اچھا اب تم اپنی منزل کھوٹی نہ کرو جاؤ، رخصت، خدا تمہاری مدد کرے گا۔"

فیروز بخت کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، اُس نے کہا: "یاحضرت آپ کی دُعائیں اگر میری ساتھی ہیں تو مجھے کوئی اندیشہ نہیں!"

شاہ صاحب نے ایک جوش کے عالم میں فرمایا: "ہاں میں اپنے مردِ مجاہد کے لئے دعاگو رہوں گا، مجھے خُدا کے فضل وکرم سے یقین ہے، تم جس بلند مقصد کو لے کر جا رہے ہو، اس میں کامیاب ہو گے!"

پھر شاہ صاحب نے فیروز بخت سے معانقہ کیا، اُس کی پیشانی کو بوسہ دیا اور اُسے رخصت کر کے اس وقت تک اُس کی طرف نگران رہے، جب تک وہ آنکھوں سے اوجھل نہ ہو گیا، اور پھر انہوں نے دونوں ہاتھ دُعا کے لئے اُٹھائے اور خُدائے قادر و توانا سے گڑگڑا کر عرض کیا:

"بار الٰہا! تو رحیم ہے، کریم ہے، تیرے رحم و کرم کا کرشمہ ہے کہ ایک بے کس اور بے بس انسان دُنیا کی سرفرازیوں اور آسائشوں، راحتوں اور نعمتوں کو تج کر، ہر قسم کی رغبت سے منہ موڑ کر، ہر لالچ سے بے نیاز ہو کر، اپنا شاندار محل، اپنی بہت بڑی جاگیر، اپنی محبت کرنے والی ماں، اپنی باوفا اور محبت کرنے والی نئی نویلی دلہن، سب سے بے تعلق ہو کر ایک کٹھن راستہ، اور کٹھن منزل کی طرف رواں دواں جا رہا ہے، تاکہ اس کفرستان میں اسلام کا پرچم سربلند رہے، کفر اور شرک کی قوتیں، اس عَلَم کو سرنگوں کرنے کے لئے ایک دوسرے سے تعاون اور اشتراک کر رہی ہیں، خلقت بے پروا ہے، وزیر خودغرض ہے، بادشاہ شاہِ شطرنج ہے، یہ سب اپنے رنگ میں مست ہیں، اپنی دُھن میں

گمن ہیں، انہیں مستقبل کی فکر ہے ، نہ حال کا اندیشہ، یہ نہیں سوچتے ، کہ آج کیا ہو رہا ہے ، اور کل کیا ہونے والا ہے ، یہ سوچنے کی قوت سے محروم ہو چکے ہیں ، لیکن نیرادہ کمزور ونحیف بندہ یہ سب کچھ سوچتا ہے اور یہاں تک سوچتا ہے کہ تیرے بھیجے ہوئے دین کی سرفرازی ، اور سربلندی کے لئے اپنی گردن تک کٹا دینے کا حوصلہ کر کے گھر سے نکلا ہے۔

اے خالقِ ارض و سما !

اس کی مدد کر ——— !

تیری نصرت فرمائیاں ہی اسے کامیاب کر سکتی ہیں ، اور اُس کی کامیابی ہی سے اِس دیس میں کفر کی قوت ٹوٹ سکتی ہے !

اے پروردگار !

رحم ! رحم ! رحم ———

اور یہ کہتے کہتے حضرت شاہ صاحب کا گریہ گلوگیر ہو گیا ——— اور پھر اُن کا دل شدائے مناجات میں مشغول ہو گیا ، اور زبان خاموش ہو گئی !

حضرت شاہ صاحب سے رخصت ہو کر فیروز بخت اپنی حویلی پہنچا ، دیوان خانہ میں سب سے پہلے آصف زماں سے ملاقات ہوئی۔ اُس نے پوچھا : کہو آصف کیا خبر ہے ؟

آصف زماں : بظاہر کوئی نہیں ؛

فیروز بخت۔ کیا مطلب؟

اور قریب آکر، آہستہ سے آصف زماں نے کہا: "تین سو بہادر سواروں کا ایک دستہ ہمارے ساتھ جائے گا، یہ وہی لوگ ہیں، جو حضرت شاہ صاحب کی تعلیمات سے متاثر ہیں، اور مجاہد فوج میں حصّہ لینے کے لئے عرصے سے بےتاب ہیں، اُن کی تلواریں بےقرار ہیں کہ دشمن کے سر پر بجلی بن کر گریں، اُن کے خنجر میان میں ماہیٔ بےآب کی طرح تڑپ رہے ہیں کہ باہر نکلیں اور اپنی کاٹ دکھائیں، اُن کے نیزے منتظر ہیں کہ انہیں اعدائے اسلام کے قلب و جگر میں ورنیم ہونے کی سعادت حاصل ہو۔ ان نوجوانوں کا جوش، ولولہ، اور ان کا جذبہ دیکھ کر آپ کو مسرت ہو گی، یہ نہ سمجھئے کہ یہ صرف تین سو ہیں، یہ تین ہزار کی گردنیں کاٹ سکتے ہیں، تیس ہزار کا مقابلہ کر سکتے ہیں، تین رکھ کی موج در موج، فوجِ اغیار سے بھی ہراساں نہیں ہو سکتے.... میں نے دلی کے بہادروں اور سرفروشوں کا عطر کھینچ لیا ہے اور آپ کی خدمت میں پیش کر دیا ہے!"

فیروز بخت بڑے غور سے آصف زماں کی باتیں سنتا رہا۔ پھر اس نے اُسے گلے سے لگا لیا اور کہا: "میرے دوست، مجھے تم سے یہی امید تھی، تمہیں میں اپنا دستِ راست سمجھتا ہوں، تم میری قوتِ بازو ہو، شاباش —— اچھا وہ لوگ کہاں ملیں گے؟"

آصف زماں۔ "دیوار ہم گوش دارد، یہاں نہیں بتاؤں گا۔ ہم لوگ ابھی یہاں سے چلتے ہیں اور بہت جلد انہیں جا لیں گے!"

پھر فیروز بخت نے کہا۔ "ٹھیک ہے.... اگر اجازت ہو تو میں ذرا اندر ہو آؤں!"

آصف زماں کے لبوں پر تبسّم کھیلنے لگا، اُس نے ذرا شوخ لب و لہجہ میں کہا۔
ضرور جائیے..... اور اگر اجازت ہو تو یہ خادم بھی؟"
فیروز بخت۔" ہاں ہاں ضرور، لیکن جلد واپس آنا!"
آصف زماں۔" انشاء اللہ آپ مجھے اپنا یہاں منتظر پائیں گے!"
فیروز بخت سیدھا، ماہ طلعت کے کمرہ میں پہنچا، وہ مصلّے پر بیٹھی دعا مانگ کر مُنہ پر ہاتھ پھیر رہی تھی..... اُسے دیکھ کر وہ جلدی سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ فیروز نے مسکراتے ہوئے کہا: تم نے تو اللہ میاں کا پیچھا لے لیا ہے، دعا مانگ مانگ کر!"
ماہ طلعت کا سوگوار اور غمگین چہرہ بھی متبسّم ہوگیا۔ اُس نے بڑی بے ساختگی کی ادا سے کہا۔ تو یہ کیجئے!"
فیروز بخت۔ تو یہ تو کرتا ہوں، کرتا رہوں گا، لیکن آخر یہ کون سی دعائیں ہیں جن کا سلسلہ ختم ہونے ہی میں نہیں آتا؟"
وہ ایک انداز سے بولی۔" ہیں، آپ کو کیا؟"
فیروز بخت۔" آخر کچھ تو معلوم ہو؟"
ماہ طلعت۔" کیوں معلوم ہو؟ ہم جانیں اور ہمارا خُدا جانے، آپ کو کیا؟"
فیروز بخت۔" بہت اچھا جناب۔ اب بندہ رخصت ہو رہا ہے، اور جناب سے کچھ ضروری قول و قرار لینا ہیں!"
ماہ طلعت سنجیدہ ہوگئی۔" فرمائیے!"
فیروز بخت۔" جی یوں نہیں!"
ماہ طلعت۔" پھر کیسے؟"

فیروز بخت۔ "مسکرا کر پوچھئے۔۔۔ مسکراتی جائیے اور جواب دیتی جائیے!
ماہ طلعت کے چہرے پر اس وقت فکر و پریشانی کے بادل چھائے ہوئے
تھے۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونا چاہتی تھی، لیکن اُسے ضبط پر غیر معمولی قدرت تھی اُس
نے اپنی کیفیت نہاں ظاہر نہ ہونے دی، وہ مسکرا دی۔ اُس نے کہا: لیجئے اب!
آپ خوش ہوئے؟"

فیروز۔ "ہاں تمہیں مسکراتے ہوئے دیکھتا ہوں، تو ساری دُنیا مجھے مسکراتی ہوئی
ہنستی ہوئی معلوم ہوتی ہے، تمہیں غمگین اور فکرمند دیکھتا ہوں، تو ایسا معلوم
ہوتا ہے ساری دُنیا غمگین ہے، کہیں خوشی اور مسرّت کا نام و نشان بھی نہیں"

ماہ طلعت: "شکریہ اس ذرہ نوازی کا ———— لیکن آپ کہہ کیا رہے تھے
وہ بھی تو فرمائیے۔؟"

فیروز۔ "میں تم سے ایک عہد لینا چاہتا ہوں!"

ماہ طلعت۔ "تو کہئے نا!"

فیروز۔ "وعدہ کرو، مجھے مسکرا کر رخصت کرو گی!"

ماہ طلعت۔ "وعدہ کرتی ہوں!"

فیروز بخت۔ "عہد کرو، میرے جانے کے بعد نہ روؤ گی، نہ غم کو پاس آنے دو گی
ماہ طلعت۔ "اس کی بھی کوشش کروں گی! ———— مجھے جھوٹ بولنے پر
مجبور نہ کیجئے!"

فیروز بخت نے آنکھ اُٹھا کر، ماہ طلعت کی طرف دیکھا، اُس کے چہرے پر
وقت جلال و جمال کی جو کیفیت نظر آ رہی تھی، اُسے صرف محسوس کیا جا سکتا تھا

عبارت کی مدد سے بیان نہیں کیا جا سکتا، فیروز نے اُسے دیکھا اور کچھ دیر تک دیکھتا رہا پھر کہا۔ "ماہ ——— !

وہ بولی۔ "فرمائیے!"

فیروز۔ "مجھے تمہاری کوشش پر بھی اتنا ہی اعتبار ہے، جتنا تمہارے عہد پر!"

آنسو ماہ طلعت کی پلکوں تک آتے آتے رُک گئے، وہ بڑے استقلال کے ساتھ اپنی کیفیت پر غالب آنے کی کوشش کر رہی تھی، اس نے نہایت وقار کے ساتھ کہا: "میں یہ کوشش بھی کروں گی کہ آپ کے اعتماد کی اہل ثابت ہو سکوں!"

فیروز خاموش ہو گیا، وہ بہت کچھ کہنا چاہتا تھا، نہ جانے کیا کیا، لیکن وقت اس کا ساتھ نہیں دے رہا تھا۔ وہ چشمِ حسرت سے اپنی محبت کرنے والی دلہن کو دیکھنے لگا

ماہ طلعت نے ایک نظر فیروز کے چہرے پر ڈالی اور کہا۔ "کیا آپ مجھے اجازت دیں گے کہ میں بھی آپ سے کچھ قول و قرار لوں؟"

مستعدی اور جذبہ کے ساتھ فیروز نے کہا تھا۔ "ہاں ہاں ضرور!" ——— کہو کیا کہتی ہو

ماہ طلعت۔ "وعدہ کیجئے، آپ کی محبّت، آپ کے ثبات و استقلال میں کبھی بھی لغزش پیدا نہ ہونے دے گی!"

مردانہ تیوروں کے ساتھ فیروز بخت نے جواب دیا: "وعدہ کرتا ہوں ..... قولِ مرداں جان دارد!"

ماہ طلعت۔ "ایک بات اور منوانا چاہتی ہوں!"

فیروز۔ "وہ بھی کہہ ڈالو!"

ماہ طلعت۔ "مجھے اپنے ساتھ لے چلئے!"

فیروز چونک پڑا۔ اُس نے تقریباً چیختے ہوئے کہا: "ماہ یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟"

ماہ طلعت۔ "کیا آپ نے سُنا نہیں؟"

فیروز بخت۔ "سُن لیا . . . لیکن یہ کیسے ممکن ہے؟"

تیوری چڑھا کر اُس نے پوچھا۔ "کیوں، ناممکن کیوں ہے؟"

فیروز بخت نے بڑے جذباتی عالم میں کہا۔ "ماہ . . . . . . میں تمہیں بہت زیادہ چاہتا ہوں۔ اپنی جان سے بھی زیادہ"

وہ قطع کلام کرتی ہوئی بولی۔ "یہ میں آپ کے کہے بغیر جانتی ہوں، معلوم ہے مجھے سب کچھ!"

فیروز۔ "تمہاری جُدائی کا ایک لمحہ میری زندگی کی پوری ایک صدی ہے!"

ماہ طلعت۔ "مجھے اس کا بھی یقین ہے!"

فیروز بخت۔ "پھر بھی تمہیں یہاں چھوڑ جانے اور اپنے ساتھ نہ لے جانے پر مجبور ہوں!"

ماہ طلعت۔ "وہی تو پوچھتی ہوں کیوں؟"

فیروز بخت۔ "وہی . . . میری محبت میرے ثبات و استقلال میں لغزش نہیں پیدا کر سکے گی . . . . اگر تم میرے ساتھ گئیں تو میری بہادری رخصت ہو جائے گی۔ اور بزدلی میرا شعار بن جائے گی! کیا تم اسے پسند کر لو گی؟"

وہ جوش کے ساتھ بولی: "ہرگز نہیں!"

فیروز بخت۔ "پھر اپنا اصرار واپس لے لو!"

ماہ طلعت۔ "آپ مجھے ساتھ لے چلیں تو میں آپ کے راستہ کا پتھر نہیں بنوں گی

آپ کا ہاتھ بٹاؤں گی۔ آپ کے کام آؤں گی، آپ کی مدد کروں گی۔۔۔ آپ مجھے صرف عورت نہ سمجھئے! میں فنونِ سپہ گری بھی جانتی ہوں!"

فیروز بخت۔ "جانتا ہوں، میری ماہ! اور مجھے یقین ہے، تم سب کچھ کرسکتی ہو۔ لیکن تم اگر ساتھ ہوئیں تو میری یکسوئی چھن جائے گی، اب اسی جذبہ کے ساتھ جا رہا ہوں کہ ضرورت ہوئی تو گردن تک کٹا دوں گا، اور پھر یہ حالت ہوگی کہ تمہیں چشم زخم سے بچانے میں میری ساری تدبیریں صرف ہوں گی!"

ماہ طلعت۔ آخر مجھے آپ موم کی گڑیا کیوں سمجھتے ہیں؟ بتائیے؟

وہ مسکراتا ہوا بولا: "میں تمہیں فولاد و آہن سمجھتا ہوں، لیکن اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتا، خدا کے لئے ضد نہ کرو، اس کے علاوہ جو کچھ کہو بغیر سُنے ہوئے میں اسے ماننے کے لئے تیار ہوں!"

پھر فیروز نے ماہ طلعت کی پیشانی کو بوسہ دیا اور کہا۔ "بہت دیر ہوگئی، اب جانے دو، انشاءاللہ جلد آؤں گا، اور خدا کے فضل سے امید ہے کامیاب آؤں گا!"

ماہ طلعت۔ "انشاءاللہ!"

اور یہ کہتے کہتے اُس کی آواز بھرّا گئی، فیروز نے اپنے ہاتھوں سے اُس کی ٹھوڑی اوپر اُٹھائی اور کہا: "یہ ہمارے تمہارے قول و قرار کے خلاف ہے!"

وہ پھر مسکرا دی۔

فیروز بھی مسکرا دیا ——— اور فوراً باہر نکل گیا! ——— کہ کہیں اس کے دل کا چور بھی ظاہر نہ ہو جائے۔

ماہ طلعت کے کمرے سے نکل کر سیدھا وہ اپنی ماں کے کمرہ میں گیا، اور جاتے

ہی ، ماں کی قدمبوسی کے لیے جُھکا ، ماں نے اپنے کمزور ہاتھوں سے اُسے اُوپر اٹھالیا اور ڈبڈبائی آنکھوں اور بھرائی ہوئی آواز سے کہا " تم رخصت ہو رہے ہو بیٹا؟"

فیروز ۔" امی جان آپ دعا کیجیے ، خُدا مجھے میرے مقصد میں کامیاب کرے !"

ماں نے اُسے کلیجے سے لگالیا اور دعائیں دے کر رخصت کیا ، پھر وہ باہر آیا ، آصف زماں اُس کے انتظار میں ٹہل رہا تھا ، دیکھتے ہی کہنے لگا ۔

" شکر ہے آپ تشریف لے آئے ۔"

فیروز : " ورنہ تم سمجھے تھے ، میں نے اپنا قصدِ سفر ملتوی کر دیا !"

آصف زماں : " سمجھ رہے ہوں گے ، آپ پانچ منٹ میں واپس آئے ہیں حالانکہ دو گھنٹے ہو چکے ہیں سرکار !"

فیروز نے کہا ۔ " واقعی ؟ . . . . . اچھا آؤ چلیں ، بہت دیر ہوگئی ۔"

سامنے دو سفید گھوڑے ، ساز و یراق سے آراستہ ، کھڑے ہوئے تھے ، ایک پر فیروز بخت بیٹھا ، اور دُوسرے پر آصف زماں ، دونوں نے ایک ساتھ ایڑ لگائی اور دونوں رہوار ہوا سے باتیں کرتے ہوئے رخصت ہوگئے ۔

رات تاریک تھی ، بہت جلد یہ دونوں سوار نظروں سے اوجھل ہوگئے لیکن ماہ طلعت بڑی دیر تک ٹکٹکی باندھے اس اندھیری منزل کی طرف تکتی رہی ۔ جدھر اس کا عاشق ، اور محبوب ابھی ابھی گیا تھا ، اور اگر کہیں صنوبر نہ آجاتی تو شاید رات بھر یونہی کھڑی اس راستہ کو تکتی رہتی !

صنوبر کو دیکھ کر ماہ طلعت چونک پڑی ۔ اُس نے کہا ۔

" تم اس وقت یہاں ؟"

وہ بولی۔ میں نے سوچا، آپ کی طبیعت گھبرا رہی ہوگی؟

ماہ طلعت۔ اور تمہاری طبیعت؟ ——— وہ بھی تو گھبرا رہی ہوگی ———
اچھا ہوا تم آگئیں ——————— خوب گذرے گی جو مل بیٹھیں گے
دیوانے دو!

اور پھر یہ دونوں پرانی سہیلیاں نہ جانے کیا کیا باتیں بڑی دیر تک کرتی رہیں یہاں تک کہ سفیدۂ سحر نمودار ہوگیا اور مؤذن کی اذان نے دونوں کو چونکا دیا ——— جیسے آج کی رات بہت مختصر تھی، آئی اور چلی گئی!

باب (۱۶)

نئی فکر

فیروز بخت دِلّی سے چلا گیا۔ عماد الملک غازی الدین کے راستہ کا کانٹا ہٹ گیا۔ اب وہ اپنی یکتائی کے خواب دیکھنے لگا۔ غازی الدین اگرچہ خاندانِ مغلیہ کا نمک پروردہ تھا، لیکن وہ اس خاندان کو بیخ و بُن سے اُکھاڑ پھینکنا چاہتا تھا۔ اس کی مرضی تھی، مرہٹوں سے سانباز کر کے اپنے اقتدار کو زیادہ سے زیادہ مستحکم کرے اور ایک طرف پنجاب کے اس علاقہ پر پھر قبضہ کرے۔ دوسری طرف جو چھوٹی چھوٹی لیکن مضبوط مسلم ریاستیں قائم تھیں اُن کا خاتمہ کر دے، نجیب الدّولہ سے وہ خار کھائے بیٹھا تھا، نجیب الدّولہ وہ شخص تھا، جس پر احمد شاہ ابدالی اعتماد کرتا تھا، جسے اپنے دوسرے حملہ کے وقت اُس نے خاص طور پر عالمگیر ثانی کا نگران اور محافظ بنا کر امیر الامرا کا منصب دِلوایا تھا۔ ابدالی تو چلا گیا، لیکن عماد الملک کے لئے ایک مستقل دردِ سر چھوڑ گیا۔ وہ خود امیر الامراء بننا چاہتا تھا۔ اس نے مرہٹوں کی مدد سے نجیب الدّولہ کو دِلّی سے نکل جانے پر مجبور کر دیا، اب نجیب الدّولہ اپنے علاقہ میں تھا۔ لیکن زندہ تھا۔ طاقتور تھا۔ طاقت فراہم کر رہا تھا اور یہ سب باتیں عماد الملک غازی الدین کے مستقل کے

نے تشویش انگیز تھیں۔ لیکن یہ بلا سر سے ٹلتی نظر نہ آتی تھی۔

اور ———

اور ایک روز غازی الدین اپنی محلسرا میں بظاہر خوش اور مطمئن بیٹھا تھا، اور دار باپ نٹ لا کا طائفہ سامنے موجود تھا ——— منی جان بیک وقت اپنے رقص و نغمہ کے کمالات دکھا رہی تھی، غازی الدین اُس سے بہت مانوس تھا، اور یہ بھی اُس کے چشم ابرو کا بہت خیال رکھتی تھی۔ اگرچہ جی لگا کر، وہ گا رہی تھی، اور رقص کر رہی تھی، لیکن صاف محسوس ہو رہا تھا، اِس وقت غازی الدین کچھ کھویا ہوا سا ہے، وہ کسی گہری فکر میں مستغرق تھا، نہ منی جان کی خوش گلوئی اسے اپنی طرف متوجہ کرتی تھی، نہ اُس کا رقص تمثیل اُس کا دامن دل اپنی طرف کھینچتا تھا۔ آخر وہ ناچتے ناچتے اور گاتے گاتے تھک گئی۔ پیشانی سے پسینہ پونچھتی ہوئی بڑے ناز و غمزہ سے آئی، اور مسند کے بائیں بیٹھ گئی، غازی الدین نے اُس کی طرف دیکھا اور کہا۔ "کیوں منی جان تھک گئیں؟"

وہ بولی۔ "سرکار متوجہ ہی نہیں ہوتے ——— معلوم ہوتا ہے، میں ناچنا اور گانا بھول گئی! ——— یا شاید ———"

غازی الدین نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "ہاں ——— یا شاید کیا؟"

اور وہ زیادہ ادائیں دکھاتی ہوئی بولی۔ "یا شاید یہ کنیز حضور کے دل سے اُتر گئی، اور ایسا ہو تو تعجب بھی کیا؟"

غازی الدین نے اور زیادہ توجہ اور شفقت کے ساتھ کہا۔ "کیوں تعجب کیوں نہیں؟ ——— ایسا ہو سکتا ہے بھلا؟"

وہ اپنے چہرہ پر حسرت کی کیفیت طاری کرتی ہوئی بولی، "کیوں نہیں ہو سکتا سرکار ——— شہر میں گانے والیوں اور ناچنے والیوں کی کمی تو ہے نہیں!"

غازی الدین نے محبت پاش نظروں سے اُسے دیکھا اور کہا: "ہاں سچ کہتی ہو۔ شہر میں ایک سے ایک رقاصائیں موجود ہیں، جن کے پاؤں کی ہر جنبش کے ساتھ زمین کا دل دھڑکنے لگتا ہے اور جن کی نغمہ سرائی جھک جھک کر چاند اور ستارے سُنتے ہیں ———"

منّی جان نے کہا۔ "وہی تو میں عرض کر رہی تھی میری سرکار!"

غازی الدین نے ذرا سنجیدگی سے کہا۔ "لیکن تم ایک بات بھول گئیں!"

"وہ کیا؟ وہ بھی فرما دیجئے!"

"وہ یہ کہ ——

ہم جس پہ مرتے ہیں وہ کوئی بات ہی ہے اور
عالم میں تُم سے لاکھ سہی، تم مگر کہاں!

مانتی ہو یا نہیں؟"

منّی جان یہ سُنکر مسکرا دی، اُس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ اُن الفاظ نے اس کے دل کی دُنیا ہلا دی ہے، اور اُسے مسکراتا دیکھ کر غازی الدین کا دِل بھی مسکرا اُٹھا، تھوڑی دیر کے لئے ساری پریشانیاں دُور ہو گئیں۔

غازی الدین نے حاضرین پر ایک نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ "تخلیہ!"

یہ سُنتے ہی جتنے لوگ تھے، سب جانے کے لئے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ منّی جان

جب اُٹھنے لگی تو غازی الدین نے کہا۔ "تم سے کچھ باتیں کرنی ہیں!"

وہ بیٹھ گئی،

جب سب لوگ چلے گئے تو غازی الدین نے کہا: "لال قلعہ میں جاتی رہتی ہو نا؟"

"جی ہاں برابر!"

"شہنشاہ ہارے یا تم ہاریں؟"

"کنیز حضور کے سوا کسی سے نہیں ہارتی، ——— لیکن ایک بات میں نے عجیب سُنی ہے!"

غازی الدین نے توجہ کے ساتھ پوچھا۔ "وہ کیا؟"

وہ اٹھلا کر کہنے لگی۔ "وہ مُوا فیروز بخت ہے نا؟"

"ہاں ہاں آگے کہو، اسے کیا ہوا؟"

"ہوتا کیا، کم بخت مرتا بھی تو نہیں!"

بے تاب ہو کر غازی الدین نے پوچھا۔ "آخر اس کے بارے میں کیا معلوم ہوا ہے؟ کیا کہنا چاہتی ہو؟"

"وہ نجیب آباد پہنچ گیا اور ———۔"

غازی الدین نے اور زیادہ بیتاب و بیقرار ہو کر پوچھا۔ "ہاں اور ——— اور کیا؟"

"نجیب الدولہ سے سازش کر کے حملہ کی تیاریاں کر رہا ہے!"

غازی الدین مسکرایا۔ "بس اتنا ہی؟"

وہ بولی: "سرکار مجھے جو کچھ معلوم ہوا، میں نے عرض کر دیا، اب یہ بات بُری ہے یا بھلی، یہ آپ جانیں!"

کچھ دیر غازی الدین چپ چاپ کچھ سوچتا رہا۔ پھر اُس نے کہا۔ "شہنشاہ کو اِس خبر کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

کہنے لگی۔ "وہ تو بہت خوش ہیں!"

غازی الدین چونک پڑا۔ "خوش ہیں!"

"ہاں میری سرکار بہت خوش!"

"تُم نے کیسے اندازہ لگایا؟"

"اے حضور، وہ اپنے ندیموں سے کہہ رہے تھے، فیروز بخت واقعی فیروز بخت ہے، وہ بڑی اچھی جگہ پہنچا، نجیب الدّولہ اور فیروز بخت مل کر بہت کچھ کر سکتے ہیں، اور مابدولت کو یقین ہے وہ جو کچھ کریں گے، اچھا ہی کریں گے، دونوں ہمارے وفادار ہیں، دونوں پر ہم کو اعتماد ہے!"

غازی الدین نے کچھ سوچتے سوچتے پوچھا۔ "اور کیا کہہ رہے تھے؟"

"اے سرکار بڑی دیر تک یہی باتیں کرتے رہے!"

"پھر کیا ہوا؟"

"بس اس سے زیادہ میں کچھ نہیں جانتی!"

غصّہ اور برہمی کے عالم میں غازی الدین کے مُنہ سے نکلا۔ "ہوں ——— دیکھا جائے گا!"

پھر وہ خاموش ہو گیا۔ مُنّی جان نے جماہی لیتے ہوئے کہا۔

"ہاں سرکار ایک بات اور یاد آئی!"

"وہ کیا؟"

"جہاں پناہ نجیب الدولہ کو خط بھی بھیجنے والے ہیں؟"

"کیوں؟"

"یہ میں کیا جانوں سرکار"

"آخر خط کے بارے میں کیا گفت گو ہو رہی تھی؟"

"وہ کہہ رہے تھے، ہم نجیب الدولہ کو خوشنودیٔ مزاج کا پروانہ بھیجیں گے۔ اور اُسے ترغیب دیں گے کہ احمد شاہ ابدالی کو مطلع کر دے۔ عماد الملک پھر ہم پر مسلط ہو گیا ہے۔ اُس نے نجیب الدولہ کو، دِلّی سے جانے پر مجبور کیا۔ اُس نے بنگش کو امیر الامرا ہماری مرضی کے خلاف بنا دیا۔ وہ پھر مرہٹوں سے سازباز کر رہا ہے۔"

یہ باتیں سن کر غازی الدین اچھل پڑا، اُس نے برہمی کے عالم میں کہا۔ حرامزادی، چبا چبا کے کیوں باتیں کرتی ہے؛ پہلے تُو نے کیوں نہیں بتایا؟"

وہ سہم گئی، اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، بھرّائی ہوئی آواز میں اُس نے کہا: "میں کیا کروں سرکار؛ جو یاد آتا گیا، بتاتی گئی —— آپ تو مجھی پر خفا ہونے لگے —— جاں نثاری کا یہ انعام ہے؟"

یہ کہتے کہتے وہ رونے لگی۔

لہ تاریخ ہند از منشی ذکاء اللہ

غازی الدین نے اپنے رومال سے اُس کے آنسو پونچھے اور محبت بھرے لہجہ میں کہا۔ "ارے تم تو خفا ہوگئیں، رونے لگیں، راہ بھلا کوئی رونا بھی ہے؟"

اور وہ زیادہ رونے لگی۔ "ہم تو جان ہتھیلی پر لئے گھومتے ہیں، ذرا محل میں پتہ چل جائے کہ میں آپ کی جاسوسی کرتی ہوں، تو گردن ماردی جائے، اور سرکار ہیں کہ مجھی پر خفا ہو رہے ہیں!"

غازی الدین نے اس سے اختلاط کرتے ہوئے کہا۔ "نہیں بھئی، تم غلط سمجھتی ہو ہم بھلا تم پر خفا ہو سکتے ہیں۔ غصہ تو اُس کاٹھ کے اُلّو پر ہے۔ جسے میں نے، تخت حکومت پر بٹھایا، وہ میری مخالفت پر تُلا ہُوا ہے!"

"وہ کون سرکار؟"

"یہی تمہارے شہنشاہ، اور جہاں پناہ اور کون؟"

پھر بے پروائی سے غازی الدین نے کہا ..... "یہ میرا بنایا ہُوا بادشاہ ہے، میں نے اس سے پہلے کے بادشاہ کو مرہٹوں ہی کے بل بوتے پر اُن کی تائید و اعانت سے قید کیا۔ اُس کی ماں قدسیہ[1] بیگم کی آنکھوں میں نیل کی سلائی پھروا کر اندھا کیا، اور اس شخص کو شہنشاہ اور جہاں پناہ[2] بنایا، اور اب یہ مجھ سے بغاوت کر رہا ہے، ہاں یہ اِس سے پہلے بھی ایسا کر چکا ہے۔ اب مجھے یقین ہو گیا، اسی کے کہنے سے ابدالی نے نجیب الدولہ کو امیر الامرا کا منصب بخشا تھا اور یہاں اُسے چھوڑ گیا تھا، تب میں اُس کی سازش سے یہ سب کچھ ہُوا تھا، لیکن میں بھی کوئی اور نہیں، غازی الدین ہوں، میں اسے وہ مزا چکھاؤں گا کہ یہ بھی یاد کرے گا، کسی سے پالا پڑا تھا، یہ کم بخت نہیں جانتا اس کی

---

[1] جن کے نام کا قدسیہ گارڈن اب تک دلّی میں موجود ہے۔

[2] پانی پت کی خونی جنگ از سید جالب دہلوی

زندگی اور موت میرے اور صرف میرے ہاتھ میں ہے!..... میں کیا کچھ کر سکتا ہوں
یہ صرف میں جانتا ہوں اور کوئی نہیں جانتا!"

غصّہ سے بے قابو ہو کر غازی الدین ٹہلنے لگا، پھر کچھ دیر بعد وہ منی جان سے مخاطب ہوا۔ "تمہاری جگہ میرے دل میں اور زیادہ ہو گئی، واقعہ یہ ہے کہ تم نے آج جو خبریں پہنچائی ہیں، وہ میرے لئے بڑی قیمتی ہیں..... میں تمہیں انعام دوں گا۔"

منی جان کا چہرہ پھول کی طرح کھل گیا۔ کہنے لگی۔ "کب دیں گے انعام آپ؟"

غازی الدین نے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ اور جگمگاتا ہوا ہیرے کا گلوبند اپنے ہاتھ سے اس کے گلے میں پہناتے ہوئے کہا۔ "یہ ہے تمہارا انعام ——— کہو پسند آیا؟"

وہ ذرا لجاتی ہوئی بولی۔ "ہاں پسند آیا۔ لیکن بہت زیادہ نہیں۔"

"اتنی قیمتی چیز بھی تمہیں پسند نہیں آئی؟"

"میری نظر اس سے بھی زیادہ کہیں قیمتی چیز پر ہے، وہ دیجئے۔ تو شکریہ ادا کروں گی اور سمجھوں گی واقعی میں نے انعام پایا۔"

اس وقت غازی الدین موج میں تھا۔ اُس نے کہا۔ "تم جو چاہو گی ملے گا، بتاؤ اور کیا چاہئے تمہیں؟"

وہ اٹھلاتی ہوئی بولی۔ "آپ جانتے ہیں مجھے کیا چاہئے، اور میں جانتی ہوں وہ آپ دے نہیں سکیں گے مجھے۔"

غازی الدین نے اور زیادہ جوش کے ساتھ کہا ——— "ضرور دوں گا تم مانگو تو، کہو تو، بتاؤ تو؟"

اُس نے غازی الدین کو چھپتی ہُوئی نظر سے دیکھا، پھر نظر جُھکا لی، اور بڑی مدھم آواز میں کہا: "اب بھی آپ نہیں سمجھے؟"

غازی الدین نے لگاوٹ کے لہجہ میں کہا ——— "سمجھ گیا ——— تم مجھے مانگتی ہو؟ کیوں ہے نا یہی بات؟"

اِس مرتبہ اُس نے نظر بھر کر غازی الدین کو دیکھا اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا: "بتائیے، کیا فیصلہ ہے آپ کا؟"

"فیصلہ؟"

"جی ——— میں نے جو کچھ مانگا وہ پاؤں گی یا نہیں؟"

"ضرور پاؤگی، بلکہ وہ تو تمہیں حاصل ہے!"

"نہیں یوں نہیں!"

"پھر کس طرح!"

"دُنیا کی نظروں میں، دُنیا کے سامنے، دُنیا کو گواہ کر کے!"

غازی الدین بیٹھ گیا، اُس نے مُنّی جان کو بھی اپنے پاس بٹھا لیا، اور بڑے پیار بھرے لہجہ میں کہا: "تم میری ہو!"

وہ بولی: "اور آپ؟ آپ کس کس کے ہیں؟"

"صرف تمہارا!"

"تو جو کچھ آپ کہتے ہیں اُسے کر دکھائیے!"

تسکین اور دلدہی کے لہجہ میں غازی الدین نے کہا: "ہاں وہ دن بھی جلد آنے والا ہے۔ لیکن ذرا مجھے مطمئن ہو لینے دو!"

"خدانخواستہ آپ کو بے اطمینانی کیا ہے؟"

"میں بہت زیادہ غیر مطمئن ہوں ——— جب تک، میں فیروز بخت کو ٹھکانے نہ لگادوں، جب تک نجیب الدولہ کا خاتمہ نہ کرلوں، جب تک عالمگیر ثانی اس دُنیا سے رخصت نہ ہو جائے، اور ——— اور جب تک ابدالی کا فتنہ ہمیشہ کے لئے دبا نہ دوں۔ اُس وقت تک خواب و خور حرام ہے۔ میں دُنیا کی کسی دلچسپی میں، کسی لذّت میں حصّہ نہیں لے سکتا!"

"تو آخر وہ وقت کب آئے گا؟"

"بہت جلد! ——— تھوڑا سا انتظار اور کرلو!"

پھر غازی الدین نے تالی بجائی۔ فوراً دو مسلّح غلام سامنے آئے اور دست بستہ کھڑے ہو گئے۔ غازی الدین نے کہا۔ "گلباز خاں کو بلاؤ!"

وہ تعمیل حکم کے لئے مُڑے تو غازی الدین منّی جان کی طرف متوجّہ ہُوا۔ "اب تم جا سکتی ہو!"

وہ جانے کے لئے اٹھ کھڑی ہُوئی۔

"اپنا وعدہ یاد رکھئے گا سرکار!"

"غازی الدین اپنا وعدہ کبھی نہیں بھولتا!"

جاتے جاتے وہ پھر واپس آئی، غازی نے پوچھا ——— "کیوں کوئی خاص بات ہے؟"

"قلعہ پھر جاؤں کسی روز؟"

"ہاں جاؤ، ضرور جاؤ، ہر روز جا سکو تو ہر روز جاؤ، اور جو نئی بات معلوم ہو اُس کی

مجھے فوراً خبر دو!"

"ایسا ہی ہوگا!"

پھر وہ چلی گئی، اور اُس کے رُخصت ہوتے ہی گلباز خاں آگیا۔

یہ بہت گرانڈیل اور بارُعب شخص تھا، غازی الدین کی درپردہ کارروائیوں میں یہ شریک غالب تھا۔ وہ سوچتا تھا، یہ کرتا تھا، وہ دماغ تھا، یہ عمل، گلباز خاں نے کہا۔

حضور نے مجھے یاد فرمایا ہے؟"

"ہاں! تمہاری سخت ضرورت محسوس کر رہے ہیں؟"

"ارشاد فرمائیے، غلام تعمیلِ حکم کے لئے دل و جان سے حاضر ہے؟"

"بیٹھ جاؤ! اطمینان سے سنو!"

وہ مؤدب ہو کر بیٹھ گیا۔

غازی الدین نے کہا "گلباز تم نے ہمیشہ ہر معاملہ میں میرا ساتھ دیا ہے!"

"زندگی کی آخری سانس تک حضور ہی کا جاں نثار رہوں گا!"

"یہ مجھے یقین ہے! اِس لئے جتنا تم پر اعتماد کرتے ہیں کسی پر نہیں!"

"کوئی تازہ حکم ہے؟"

"ہاں! ایک بہت ضروری اور اہم کام کرنا ہے تمہیں؟"

"ارشاد فرمائیے؛ تو میری کارگزاری دیکھئے؟"

"تمہیں یاد ہے آج سے چند روز قبل میرے اور تمہارے مابین کچھ گفتگو ہوئی تھی؟"

"یاد ہے میرے آقا!"

"یہ بھی یاد ہے کس بارے میں؟"

"یاد ہے میرے مالک!"

"وہ —— فیروز شاہ کا کوٹلہ دہلی اسی کے بارے میں!"

"جی ایک ایک لفظ یاد ہے میرے سرکار۔"

"تو اب وہ کام جلد کرنا ہے!"

"جب کہئے! صرف اشارہ کی دیر ہے!"

"بہت جلد —— کیا چند ہفتوں میں تکمیل ہوسکتی ہے؟"

"ضرور ہوسکتی ہے!"

"بس اب تم جاسکتے ہو!"

گلباز خاں رخصت ہو گیا، اس کے جانے کے بعد غازی الدین پھر اُٹھ کھڑا ہوا۔ اور ٹہلنے لگا بے ساختہ اس کے مُنہ سے یہ الفاظ نکلے "میں دیکھ لوں، میں سمجھ لوں گا۔ میرے مقابلہ میں وہی آتا ہے جس کے سر پہ موت کھیل رہی ہو!"

اب رات بہت تھوڑی رہ گئی تھی لیکن غازی الدین کی آنکھوں میں اب بھی نیند کا پتہ نہیں تھا۔ وہ اب بھی جاگ رہا تھا، جیسے کوئی بہت بڑا معرکہ سر کرنا ہے!

اور —— بات بھی یہی تھی، واقعی وہ بڑا خوفناک فیصلہ کر چکا تھا! منی جان سے جو باتیں اسے معلوم ہوئی تھیں، وہ اس کے لئے بڑی خطرناک تھیں، وہ سوچنے لگا۔ اگر فیروز بخت اور نجیب الدولہ کا اتحاد عالمگیر ثانی میں ایک نئی ہمت پیدا کر سکتا ہے تو پھر اگر کہیں ان لوگوں نے اپنے کچھ اور ساتھی پیدا کر لئے؛ اگر ابدالی پھر آگیا! —— پھر میرا حشر کیا ہوگا!

باب ۱۷

تارابائی

تارابائی ایک مرہٹہ عورت تھی۔ حسن و شباب سے بھرپور، گورا رنگ، گداز بدن کشیدہ قامت، بڑی بڑی آنکھیں، لانبے لانبے بال، زندگی کی بائیس بہاریں دیکھ چکی تھی وہ جتنی خوبصورت تھی، اتنی ہی بہادر اور غیور بھی تھی، وہ ایک مرہٹہ سردار کی لڑکی تھی، ماں مر چکی تھی۔ باپ ایک عرصہ سے بستر پر پڑا موت سے کشتی لڑ رہا تھا، دُنیا میں اس بیمار باپ کے سوا، نہ اُس کا کوئی رفیق تھا نہ دمساز —— اور آج وہ بھی زندگی کی آخری سانس لے رہا تھا، رات کاٹے نہیں کٹ رہی تھی، اُس کی ہر آہ پر ایسا معلوم ہوتا تھا دم نکل جائے گا۔ لیکن موت قریب آ آکر دُور ہو جاتی تھی۔

صبح ہوتے ہوتے مادھو راؤ کا انتقال ہو گیا۔ باپ کا غم ایک بے بس اور بیکس تنہا لڑکی کو جتنا ہونا چاہیئے تھا، اُس سے زیادہ تارابائی کو ہُوا اُس کا کلیجہ پھٹا جا رہا تھا۔ آنکھوں سے آنسوؤں کی ندی بہہ رہی تھی۔ اُس کا جی چاہ رہا تھا، خودکشی کرے، اور اس زندگی سے ہمیشہ کے لئے مُنہ موڑ لے۔ لیکن خودکشی کی بات سوچنے میں جتنی آسان ہے کرنے میں اتنی ہی مشکل ہے۔

باپ کے مرنے کے بعد گھر میں اُس کا تنہا رہنا مشکل ہو گیا۔ ہر طرف سے لعن طعن ہو رہی تھی، کہ نوجوان لڑکی اکیلے گھر میں رہتی ہے، اسے شرم نہیں آتی۔ اُسے اپنی لاج عزیز نہیں، حالانکہ اسے شرم بھی آتی تھی، اور لاج بھی بہت عزیز تھی۔ لیکن اس میں اتنی سکت نہیں تھی کہ اپنے عزیزوں، رشتہ داروں اور ہمسایوں کی زبان بند کر سکتی، نہ اُس کے پاس اپنی تنہائی کا کچھ علاج تھا، علاج صرف ایک ہی تھا،

شادی!

لیکن اس غریب اور بے مایہ لڑکی سے شادی کرنے پر کوئی نوجوان راضی نہیں ہو سکتا تھا۔ نہ اُس کے پاس روپیہ تھا، نہ زیور جتنا روپیہ اور زیور تھا وہ باپ کے علاج اور تیمارداری میں صرف ہو گیا، اب اُس کے پاس سوا کچلی ہوئی آرزوؤں اور دبی ہوئی آہوں کے کچھ نہ تھا۔

کچھ دنوں کے بعد ایک بوڑھے آدمی سے زبردستی اُس کی نسبت ٹھہرا دی گئی۔ اور اس بوڑھے آدمی کی طرف سے حفاظت اور نگرانی کے لئے ایک بوڑھی عورت بھیج دی گئی، جو دن رات سایہ کی طرح اُس کے ساتھ رہتی تھی۔

جب تک باپ زندہ تھا، تارابائی کا دل اُمنگوں اور آرزوؤں سے معمور تھا، وہ سوچا کرتی تھی، شادی ہو گی۔ پھر دولہا آئے گا، ایک نکیلا سجیلا جوان، ایسا خوبصورت ایسا خوبصورت کہ دیکھتے دیکھتے آنکھیں پتھرا جائیں گی، لیکن طبیعت نہیں بھرے گی۔ وہ ہنس ہنس کر اور مسکرا مسکرا کر باتیں کیا کرے گا۔ محبت اور پیار کی ایک بالکل نئی دُنیا بنے گی۔ جس کی ہیروئن وہ خود ہو گی، اور ہیرو اُس کا شوہر اس کی سکھیاں سہیلیاں اس کے شوہر کی خوبصورتی اور بانکپن دیکھ کر رشک کیا کریں گی، اُس کی زندگی خوشی اور مسرت

یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ وہ کس طرف جا رہی تھی؟

اور آخر کئی روز کے بعد وہ تھکی ہاری بھرت پور پہنچی، یہاں کا راجہ سُورج مل جاٹ اُس کے باپ کو جانتا تھا، اُس کی عزت کرتا تھا، کئی مرتبہ اُس نے باتوں باتوں میں اُسے ترغیب بھی دی تھی کہ وہ مرہٹوں سے قطع تعلق کر کے اُس کے ہاں آ جائے، لیکن مادھو راؤ، اس قماش کا آدمی نہیں تھا۔ وفاداری اُس کی گھٹی میں پڑی تھی، قوم پرستی اُس کا دین و ایمان تھی، وہ ایک لمحہ کے لئے بھی یہ نہیں سوچ سکتا تھا کہ اپنے قومی فرض سے دست کش ہو کر کسی راجہ کی خواہ وہ کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو۔ ملازمت کرے، اُس کی زندگی کا صرف ایک مقصد تھا، مسلمانوں کو تہ تیغ کرنا، دِلّی کی مسلم حکومت کا تختہ اُلٹنا ہر اُس چیز کو فنا کر دینا، جس کا کچھ بھی اسلام سے یا مسلمانوں سے تعلق ہو، وہ دِل ہی دِل میں اس بات پر جلا کرتا تھا کہ مرہٹوں کے لشکر میں معمولی حیثیت سے سہی لیکن مسلمان سپاہی کیوں ہیں، اور یہ سوچ کر تو اُس پر اعصابی برہمی طاری ہو جاتی تھی کہ مرہٹہ لشکر کا توپ خانہ ایک مسلمان ——— ابراہیم گاردی ——— کے چارج میں ہے، وہ اسے بھول جاتا تھا کہ ابراہیم گاردی کا اور اُس کا مقصد ایک تھا، یہ ہندو ہو کر مسلمانوں کی تباہی کا درپے تھا، اور وہ مسلمان ہو کر مسلمانوں کو مٹانے اور برباد کرنے اور ہلاک کر دینے کا اپنے ہندو آقاؤں سے عہد کر چکا تھا، پھر بھی چونکہ اُس کا نام مسلمانوں کا سا تھا، اس لئے ان وفاداریوں کے باوجود وہ اس سے نفرت کرتا تھا، وہ اپنے دوستوں کو اُکسایا کرتا تھا کہ وہ گاردی سے جو کچھ سیکھ سکتے ہوں سیکھ لیں اور پھر اُسے بے دخل کر دیں۔ وہ پیشوا کے لڑکے شمشیر بہادر سے بھی خار کھاتا تھا۔ اس لئے کہ گو اب تک شمشیر بہادر ہندو تھا۔ لیکن تھا تو ایک مسلمان عورت ——— مستانی بیگم

کی آئینہ دار ہوگی، نہ کوئی غم ہوگا نہ فکر ———

لیکن باپ کی موت نے اُسے خواب سے چونکا دیا۔ اب وہ جس کے پلے باندھی جا رہی تھی، اُس کے پاس روپیہ ضرور تھا، لیکن جوانی نہ تھی، حُسن نہ تھا، مسکراہٹ نہ تھی، محبت نہ تھی، چاہ اور پریم کا طوفان نہ تھا ——— پھر کیا اس کے ساتھ زندگی نبھ سکے گی؟ نہیں ہرگز نہیں، اس کے ساتھ زندگی اجیرن ہو جائے گی، اس کے ساتھ زندگی کا ایک لمحہ بھی نہیں گذارا جا سکتا۔

یہ سوچتے سوچتے اُس نے اپنے کمرہ سے قدم باہر نکالا۔ گھُپ اندھیرا چھایا ہوا تھا ہاتھ کو ہاتھ نہیں سجھائی دیتا تھا، کالے کالے بادلوں کی، اس اندھیری رات پر حکومت تھی ——— گھنگھور گھٹا تُلی کھڑی تھی ——— پر بوند ابھی نہیں پڑی تھی۔

اندھیرے کا جائزہ لے کر وہ اُس بڑھیا کی کوٹھڑی میں گئی، جسے اس کے ہونے والے شوہر نے نگرانی کے لئے بھیجا تھا، کھا نستے کھانستے بیچاری کو نیند آگئی تھی۔ ایک کونے میں چھوٹا سا دیا ٹمٹما رہا تھا، تارا بائی نے پھونک مار کر چراغ گل کر دیا پھر اپنے کمرہ میں آکر، اپنے باپ کے کپڑے پہنے، اُس کے اسلحہ زیب جسم کئے، چپکے سے باہر نکلی، اصطبل میں گھوڑا بندھا تھا، اُسے کھولا، وہ اپنے مالک کو خوب پہچانتا تھا چپ چاپ اُس کے ایک اشارہ پہ باہر نکل آیا۔ وہ اطمینان سے گھوڑے پہ بیٹھی اور اس اندھیری رات میں اس سڑک پہ ہولی، جو دِلّی کی طرف جاتی تھی ——— وہ گھر سے جب نکلی تو ایک پری چہرہ اور نازک اندام لڑکی تھی، اور جب گھوڑے پہ بیٹھی تو ایک بانکا سپاہی تھی۔

گھوڑا سرپٹ بھاگا چلا جا رہا تھا اور وہ نہیں جانتی تھی کہ کہاں جائے؟

کے پیٹ سے شمشیر بہادر کی تمام صلاحیتیں اور ذہانتیں اُسے ایک آنکھ نہیں بھاتی تھیں۔ صرف اس جرم میں کہ اس کی ماں مسلمان تھی، بھلا ایسا شخص، مرہٹوں کا لشکر چھوڑکر، سورج مل کی ملازمت کیسے کر سکتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب بھی سورج مل نے یہ بات مادھو راؤ سے کہی۔ اُس نے صاف الفاظ میں لگی لپٹی رکھے بغیر انکار کر دیا۔

اور آج اُسی مادھو راؤ کی لڑکی ایک سپاہی بنی ہوئی، بھرت پور کی گلیوں کی خاک چھان رہی تھی، اُس نے اپنا نام جسونت راؤ رکھا اور مادھو راؤ کو اپنا چچا بتا کر سورج مل جاٹ سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ لیکن بدقسمتی پُونہ سے بھرت پور تک اُس کے ساتھ ساتھ آئی تھی۔ وہاں آکر معلوم ہوا، راجہ سورج مل شکار کے لئے باہر گیا ہوا ہے۔ دِلّی کے قریب اُس کا کہیں پڑاؤ ہے۔ اگر ملاقات فوراً کرنا ہے، تو آگے بڑھو، ورنہ یہیں انتظار کرو۔

جسونت راؤ (تارابائی) نے انتظار کرنا مناسب نہ جانا صرف ایک دن بھرت پور میں رہ کر، دوسرے دِن اپنے گھوڑے کو دِلّی کے راستہ پر ڈال دیا، باپ کی وہ اکیلی لڑکی تھی، باپ کی محبت کا خزانہ بے دریغ اس پر صرف ہوتا رہا وہ بہترین شہسوار تھی، بہت اچھی تیرانداز تھی، نیزہ بازی اور شمشیر زنی میں بھی اُسے اچھی مہارت تھی، اُسے یقین تھا کہ سورج مل کی فوج میں خواہ ایک سپاہی کی حیثیت سے بھرتی کی جائے لیکن اپنے دست بازو کی مدد سے بہت جلد بام عروج پر پہنچ جائے گی

تارابائی نے جسونت راؤ کا رُوپ اس خوبصورتی اور کمال سے بھرا تھا کہ شبہ بھی نہیں ہوتا تھا یہ لڑکی ہے، جو اُسے دیکھتا تھا اُس کا حسن وجمال دیکھ کر ششدر رہ جاتا تھا، لیکن اس کے حسن میں حسنِ مردانہ، اور جمال میں جمالِ ترکانہ ہی کا جلوہ نظر آتا تھا یہ حسن

نسوانی نزاکت لئے ہوئے ہے۔ اس کا وہم و گمان بھی نہیں ہوتا تھا۔ لیکن تارا کو اپنی کمزوری کا احساس تھا۔ اس لئے وہ لوگوں سے زیادہ بات چیت کرتے ہوئے اور اُن میں اُٹھتے بیٹھتے جھجک محسوس کرتی تھی جلد از جلد سورج مل سے ملاقات ہو، کہ اُسے یکسوئی حاصل ہو، ورنہ اس پریشانی اور مسافرت کے عالم میں اگر بھانڈا کھُل گیا تو اُدھڑ کل پیش آئے گی، وہ گھر کی رہے گی نہ گھاٹ کی۔

چنانچہ دوسرے ہی دن اُس نے اپنے گھوڑے کی باگ دِلّی کی طرف موڑ دی، تاکہ سُورج مل کے دربار میں حاضر ہو کر اپنے مستقبل کا فیصلہ بھی جلد از جلد کر سکے، سورج مل نے اُس سے عزّت اور احترام کا سلوک کیا، اور کہا۔ "مادھو راؤ کی ہمارے دل میں بڑی عزت ہے، اور ہمیں یقین ہے وہ جوہر تم میں بھی ہو گا، جو اس میں تھا۔ ہم تمہیں اپنے خاصے کے سپاہیوں (باڈی گارڈ) میں شامل کرتے ہیں!"

جسونت راؤ نے ادب سے سر جھکا کر عرض کیا۔ "غلام کی رگوں میں مرہٹہ خُون گردش کر رہا ہے، کیا اس کے بعد مجھے کچھ عرض کرنے کی ضرورت نہیں ہے؟"

سُورج مل نے شفقت کے ساتھ کہا۔۔۔ "نہیں بالکل نہیں! ۔۔۔۔ ہمیں تم پر تمہاری وفاداری پر، اور تمہاری بہادری پر پورا پورا اعتماد ہے!"

جسونت راؤ نے پھر ادب سے گردن خم کی اور دو قدم پیچھے ہٹ کر چپ چاپ کھڑا ہو گیا۔

سورج مل کو، اور اس کے تمام درباریوں کو جسونت راؤ کی یہ صاف اور کھری باتیں پسند آئیں، انہیں یقین تھا، اس نوجوان سپاہی کا چہرہ جتنا روشن ہے، دل بھی اتنا ہی روشن ہو گا اور کردار و سیرت بھی! ؛

باب (۱۸)

ٹکّر!

جسونت راؤ کو، سُورج مل کے پڑاؤ میں رہتے ہُوئے کئی دِن ہو گئے تھے۔ اپنے فرائض خوبی اور خُوش اسلوبی کے ساتھ انجام دے رہا تھا۔ اب تک اُسے پڑاؤ کے حدُود سے باہر نکلنے کا اتفاق نہیں ہُوا تھا۔ ایک روز جب صبح اُس نے سوچا، یہاں بیٹھے بیٹھے کیا کروں، لاؤ ذرا اِدھر اُدھر کی سیر کر آؤں، یہ سوچ کر وہ اپنے گھوڑے پر بیٹھا ایک ایڑ لگائی اور ہوا ہو گیا، بڑی دیر تک گھوڑے کو کاوے دیتا اور بھگاتا رہا جب گھوڑا تھک گیا اور خود اُس نے بھی تھکان محسوس کی، تو فیصلہ کیا، اب واپس چلنا چاہئے ورنہ لشکر میں بھی پُوچھ گچھ ہوگی، اور مفت کی جوابدہی کرنی پڑے گی۔

جسونت راؤ واپس جانے کے لئے مڑا ہی تھا کہ سامنے سے گرد وغبار اُٹھتا دِکھائی دیا، وہ ایک بڑے درخت کی آڑ میں کھڑا ہو کر دیکھنے لگا، یہ کون لوگ ہیں: تھوڑی دیر کے بعد اُس نے دیکھا کہ مسلح سپاہیوں کا ایک دستہ جو تقریباً تین افراد پر مشتمل ہوگا۔ اسی طرف آرہا ہے، اُن سپاہیوں کو دیکھ کر اُس نے معلوم کر لیا مسلمان ہیں اور یہ محسوس کرتے ہی کہ یہ مسلمان ہیں، شدّتِ تعصّب اور جوشِ نفرت سے

اس کا خون کھولنے لگا، اُسے مسلمانوں سے نفرت تھی، عداوت تھی، اُس کے پاس اگر اس وقت سو سپاہیوں کا دستہ بھی ہوتا، تو وہ ازخود ان پر حملہ کر دیتا، اور اُن میں سے ایک ایک کو فنا کے گھاٹ اتار دیتا۔

لیکن !

لیکن افسوس وہ اکیلا تھا، وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا، سوا اس کے کہ اپنے ہونٹ چبائے اور دستِ تاسف ملے۔

ان سواروں کے چہروں سے مسرت اور شادمانی ظاہر ہو رہی تھی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا، جیسے یہ کوئی بہت بڑی مہم سر کر کے آئے ہیں، یا کوئی بہت بڑا امور کہ سر کرنے جا رہے ہیں۔ ان کی باچھیں کھلی ہوئی تھیں، ان کے لبوں پر تبسم تھا، ان کی پیشانی سے اقبال اور عروج کے نشانات ظاہر تھے۔ وہ اتنے بے فکر نظر آ رہے تھے جیسے انہیں زندگی کی تمنا ہے، نہ موت کا اندیشہ، نہ دُنیا کی ہوس ہے نہ دنیا والوں کی فکر، وہ سب سے بے نیاز، سب سے بے پرواہ نظر آ رہے تھے۔

ان سواروں کے آگے، دو سواروں کے گھوڑے ساتھ ساتھ چل رہے تھے ان میں سے ایک عاصف زماں تھا، دُوسرا فیروز بخت، یہ مجاہدوں کا لشکر تھا، جو خدا کے واسطے میں ہتھیلیوں پر اپنی جان لے کر نکلے تھے، انہیں نہ کشور کشائی مطلوب تھی، نہ اقتدار و اختیار، نہ یہ بادشاہ بننا چاہتے تھے، نہ وزیر، نہ انہیں جاگیر کی ہوس تھی، نہ انعامِ شاہی کی، نہ یہ خلعت کے جویا تھے، نہ القاب و خطاب کے، اُن کی تمنا صرف ایک تھی، خدا کا نام بلند رہے، خدا کا کلمہ بلند رہے، خدا کا دین سر بلند رہے، خدائی پر صرف خدا کا سکّہ چلے، اس مقصد کے حصول کے لئے اگر ان کی دولت چھنتی ہے

چھن جائے، جاگیر لٹتی ہے، لٹ جائے، ماں باپ، بھائی بہن، بیٹی اور بیوی سے جدائی ہوتی ہے کوئی ہرج نہیں۔ حتےٰ کہ اگر جان تک جاتی ہے چلی جائے، گردن کٹ جائے خون کا ایک ایک قطرہ بہہ جائے، خون کے سمندر میں تیرنا پڑے، ہر آفت، ہر مصیبت ہر تکلیف، خوشی سے، مسرت سے برداشت کی جاسکتی ہے، مگر اسلام کا زوال! کبھی اور کسی صورت سے گوارا نہیں کیا جاسکتا، کسی قیمت پر اور کسی حالت میں بھی نہیں، ——— بس یہ تھا اُن کی زندگی کا مقصد، اسی مقصد کی خاطر یہ گھر سے نکلے تھے اور اپنی منزل کی طرف بڑھے چلے جارہے تھے۔ جیسے بل کھاتی ہوئی پُرشور ندی، جو کسی کے روکے نہیں رُکتی، نہ اُسے چٹان روک سکتی ہے، نہ پہاڑ!

فیروز بخت اور آصف زماں ہنستے ہوئے مسکراتے ہوئے، باتیں کرتے ہوئے جسونت راؤ کے سامنے سے گذر گئے، جسونت راؤ نے ان دونوں نکیلے سواروں کو دیکھا اور دیکھتا رہ گیا، مگر یہ دونوں اُسے نہ دیکھ سکے، پھر اور سپاہی بھی گذرتے رہے جسونت دل ہی دل میں جل رہا تھا، ان کم بخت مسلمانوں کی اکڑ تو دیکھو، کس شان سے جا رہے ہیں؛ جیسے ہندوستان ہمیشہ انہی کا ماتحت رہے گا، انہیں ابھی تک احساس نہیں ہوا کہ مرہٹہ حکومت اب سارے ہندوستان کی حکومت بننے والی ہے، بھگوا کا جھنڈا، بہت جلد لال قلعہ پر بھی لہرائے گا، وہ زمانہ رخصت ہو گیا، جب مسلمان اس دیس پر حکمرانی کرتے تھے،

دورِ مجنوں گزشت نوبت ماست

اب ہمارا دَور شروع ہو رہا ہے۔ ہم یہاں کے اصلی باشندے ہیں، ہم ہی یہاں حکومت کرنے کا حق رکھتے ہیں، مرہٹوں کی تلوار بے نیام ہو چکی ہے، اور اب یہ اسی وقت

نیام میں جائے گی. جب مسلمان یا تو بوریہ بستر باندھ کر یہاں سے رخصت ہو جائیں گے ورنہ ہماری غلامی کریں گے۔ انہیں آزاد رہنے کا حق نہیں۔ یہ اسی لئے پیدا ہوئے ہیں کہ ہماری تابعداری کریں، ہماری چاکری کریں، آج یہ مسکرا رہے ہیں لیکن کل یہ سر پہ ہاتھ رکھ کر رو دیں گے۔ ان کے حال پہ دُنیا روئے گی، پہلے ہندو کمزور تھے۔ اب وہ مضبوط ہیں پہلے ہندو آپس میں ایک دوسرے کے شریک، درد نہیں تھے۔ اب سب متحد اور منظم ہیں، اب ہندوؤں کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا، جو ان کے مُنہ آئے گا، موت کے گھاٹ اُتار دیا جائے گا۔

مسلمان سپاہیوں کا یہ سارا دستہ جسونت رائے کے سامنے سے گذر گیا، کسی سپاہی کی نظر تلی جسونت پر نہیں پڑی۔ ہاں آخری سپاہی نے اُسے دیکھ لیا، وہ جسونت کی طرف پلٹا، اُس نے پوچھا۔

"تم کون ہو؟

جسونت رائے نے یہی سوال دہرایا۔ "تم کون ہو؟"

مسلمان سپاہی نے کہا "ہوش کی باتیں کرو، ورنہ تمہاری لاش ابھی یہیں تڑپتی نظر آئے گی!

جسونت نے کہا۔ "آؤ، دو دو ہاتھ ہو جائیں۔"

اور یہ کہہ کر قبل اس کے کہ مسلمان سپاہی جنگ کے لئے تیار ہو، اس تیزی اور پھرتی سے اس نے پیش قبض سے خنجر نکال کر مسلمان سپاہی کے سینہ میں پیوست کر دیا، کہ وہ الااللہ کہہ کر تیورا کر گرا، اور وہیں لوٹنے لگا۔

الااللہ کی آواز اس کے بعض ساتھیوں کے کانوں تک پہنچی، انہوں نے اپنے

گھوڑوں کی باگیں اسی طرف موڑ دیں، جسونت مسلمان سپاہی کو قتل کر کے اپنا گھوڑا بھگا لے جانے کی فکر میں تھا۔ لیکن وہ اپنے کشتۂ خنجر کے ساتھیوں کے نرغہ میں تھا، خود اُس کی زندگی خطرہ میں تھی، وہ مرنے سے نہیں ڈرتا تھا، بہادری سے مرنے کے لئے تیار تھا، مسلمان سپاہیوں میں سے ایک نے اس سے کہا: "تُم نے ہمارے ساتھی کو کیوں قتل کر دیا؟"

جسونت نے متانت سے جواب دیا: "میں اگر اسے قتل نہ کرتا، تو یہ مجھے قتل کر دیتا!"

دہی مسلمان سپاہی بولا۔ "اُس نے تم پر حملہ کیا تھا؟"

جسونت نے کہا: "اس کے حملہ کا اگر میں انتظار کرتا، تو اس دُنیا میں نہ رہتا!"

مسلمان سپاہی نے غُصّہ سے کہا۔ "ہوں —— تمہاری یہ جراٴت؟"

دوسرا بولا۔ "اسے ابھی قتل کر دو!"

تیسرے نے کہا۔ "دیکھتے کیا ہو نکالو تلوار!"

اور یہ کہہ اُس نے میان سے اپنی تلوار نکال لی، جیسے بجلی چمک گئی۔ جسونت بھی لڑنے مرنے کے لئے تیار ہو گیا۔ اتنے میں شور وغل کی آواز، فیروز بخت کے کانوں تک پہنچی وہ آصف زماں کے ساتھ فوراً موقع واردات پر پہنچا اور یہاں یہ تماشہ دیکھ کر متحیر ہو گیا۔ اُس نے باوقار لہجہ میں سوال کیا: "کیا بات ہے؟"

ایک سپاہی نے سارا ماجرا اُسے سُنایا اور کہا۔ "اس نے بے خطا و بے قصور ہمارے ایک بہادر ساتھی کو شہید کیا ہے۔ ہم اسے ضرور قتل کریں گے!"

فیروز بخت نے کہا۔ "کس کے حکم سے؟ —— کیا تم اپنے سردار کا حکم نے

بغیر بھی کوئی کام کر سکتے ہو؟"

سپاہی کی گردن جھک گئی، اُس نے اپنی تلوار میان میں کر لی، اور خاموش کھڑا ہو گیا،

فیروز نے آصف زماں سے کہا۔ "اُسے گرفتار کر لو!"

آصف زماں جسونت کی طرف بڑھا، اور جسونت پھر لڑنے کے لئے تیار ہو گیا۔

فیروز بخت نے للکار کر کہا: "خبردار ——— اے شخص کیوں اپنی جان گنواتا ہے!"

جسونت نے کہا۔ "بہادر موت سے نہیں ڈرتے!"

فیروز بخت نے کہا۔ "تو بہادر ہوتا تو بےخبری میں اس مسلمان کو شہید نہ کرتا، تو نے بھی کیا جو سیواجی نے افضل خاں سے کیا تھا، تو نے یہ دھوکہ کا فن کہاں سے سیکھا، کیا تو مرہٹہ ہے؟"

جسونت نے کہا۔ "ہاں میں مرہٹہ ہوں!"

فیروز نے اپنے سپاہیوں کی طرف دیکھ کر کہا۔ "اسے زندہ گرفتار کرو، کم سے کم طاقت استعمال کرو۔ کچھ دن اس کا زندہ رہنا ضروری ہے!"

سب لوگ جسونت پر ٹوٹ پڑے، اُس نے فوراً اپنی تلوار پھینک دی اور کہا "میں نے ہتھیار ڈال دیئے، کوئی ایک صاحب آگے بڑھیں اور مجھے گرفتار کر لیں۔"

آصف زماں نے بڑھ کر اُسے گرفتار کر لیا۔

باب (۱۹)

ــــ تُو نے لُوٹا تختؔ و تاجؔ!

مُنّی جان ہزاروں ہزار رعنائیوں اور دلربائیوں کو اپنے دامن میں سمیٹے روزلال قلعہ پہنچتی اور رتّی رتّی کی خبر عماد الملک غازی الدین کو دیتی، بظاہر غازی الدین شہنشاہ کا دعا وار وزیر اعظم تھا، ظاہری ادب و لحاظ میں کوئی کوتاہی نہیں رکھتا تھا، لیکن اُس نے اپنی دہشت ایسی قائم کر لی تھی اور عالمگیر ثانی کو تختِ حکومت پر بٹھانے کے بعد خود سر اور متکبر ایسا ہو گیا تھا کہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتا تھا۔

عالمگیر ثانی بھی، بظاہر اس پر بڑا اعتماد کرتا تھا اس کی ہر بات مانتا تھا، اس کے کہنے سے ہر فرمان پر دستخط کر دیتا تھا، انتہا یہ کہ محض اس کے اشارۂ چشم وابرو پر اُس نے احمد خاں بنگش کو، امیر الامرا کا خطاب تک بخش دیا، لیکن دل ہی دل میں وہ اب عماد الملک غازی الدین سے ہراساں رہنے لگا تھا۔ اس کے دل میں یہ خیال جمتا جاتا تھا کہ رفتہ رفتہ یہ شخص یا تو ساری سلطنتِ مغلیہ کو ختم کر دے گا، یا مرہٹوں کو مسلّط کر کے خود ان کا نائب بن کر حکومت کرے گا۔

ان دونوں کے اختلاف کی سب سے بڑی وجہ ابدالی اور مرہٹوں کا سوال تھا

عماد الملک مرہٹوں کا طرفدار تھا، اُن کے ساتھ زیادہ سے زیادہ مراعات روا رکھتا تھا۔ ہر موقع اور مرحلہ پر اُن کی مدد کرتا تھا، اور اُن سے مدد کا طالب ہوتا تھا، عالمگیر ثانی مرہٹوں کے مقابلہ میں بہرحال ابدالی کو ترجیح دیتا تھا۔ اُس کا خیال تھا اگر مغلیہ سلطنت ختم بھی ہو جائے اور ابدالی خاندان ہندوستان کا حکمران بن جائے تو بھی کم از کم مسلم اقتدار تو قائم رہے گا، مسلمانوں کے دبدبہ اور شوکت میں تو کمی نہیں آئے گی اور اگر کہیں اس کے برعکس ہوا یعنی مغلوں کے مرقد پر مرہٹہ حکومت کا قصر رفیع تیار ہوا تو مسلمانوں کا کیا حشر ہوگا؟ اُن کی آن اور شان، اُن کا جاہ و تجمّل، اُن کا دبدبہ اور طنطنہ بالکل ختم ہو جائے گا۔ عالمگیر ثانی نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ اگر مغل نہیں زندہ رہ سکتے تو انہیں راستہ سے ہٹ جانا چاہئے، اس دیس پر خلجیوں، غوریوں، غلاموں، لودھیوں، سب ہی نے حکومت کی، لیکن خاندان بدلتے رہے، مسلم حکومت کے تسلسل میں فرق نہیں آیا اور اگر غازی الدین کی شرارت کو بار آور ہوتے دیا جائے اور حکمران خاندان کے بجائے حکمران قوم کی تبدیلی گوارا کر لی جائے، یعنی مسلمانوں کے بجائے مرہٹوں کی حکومت قبول کر لی جائے، تو حکومت کا جو ڈھانچہ مسلمانوں نے تعمیر کیا ہے آن کی آن میں زمین پر آ رہے گا اور سارا کیا کرایا خاک میں مل جائے گا۔ حقیقت یہ ہے عالمگیر کی نظر دُور تک دیکھ رہی تھی اور عماد الملک غازی الدین کی نگاہ صرف اپنے قدموں تک دیکھ رہی تھی اس سے آگے نہیں۔

یہ کش مکش تھی، جو دلّی کی اُن دو بہت بڑی شخصیتوں کے مابین جاری تھی، اندر ہی اندر طوفان امڈ رہا تھا اور جب سے غازی الدین کو یہ معلوم ہوا تھا کہ عالمگیر ثانی نہ بیوقوف ہے نہ سادہ لوح، نہ شاہ شطرنج، اس وقت سے تو وہ انگاروں پر لوٹ رہا تھا۔ اور جلد

سے جلد اس سے گلوخلاصی کی تدبیریں سوچ رہا تھا۔

اور ایک روز دونوں کی گفتگو میں بھی یہ بات ظاہر ہوگئی کہ دونوں کا نقطۂ نظر ایک دوسرے سے کتنا مختلف ہے، عالمگیر ثانی دیوانِ خاص میں تختِ شاہی پر متمکن تھا امراؤ رؤسا دربار برخاست ہوجانے کے باعث رخصت ہوچکے تھے، صرف غازی الدین چند ضروری امور پر صلاح و مشورہ کے لئے موجود تھا۔ غازی الدین نے دست بستہ کہا:۔

"جہاں پناہ غلام مرہٹوں سے ایک نیا معاہدہ کرنے کا فیصلہ کرچکا ہے!"

عالمگیر ثانی کی تیوریوں پر بل پڑگیا۔ اس نے ایک نگاہ غازی الدین کے سراپا پر ڈالی اور کہا۔ "کیا مطلب؟"

غازی الدین: "غلام کا مقصد یہ ہے کہ مرہٹوں سے ایک معاہدۂ دوستی ترتیب دیا جائے۔"

عالمگیر ثانی۔ "مقصد کیا ہوگا اس معاہدہ کا؟"

غازی الدین۔ "تاکہ ہم مرہٹوں کی مدد سے پنجاب ابدالی سے خالی کرالیں!"

عالمگیر ثانی۔ "تمہارا خیال ہے، ایسا ہوسکتا ہے؟"

غازی الدین۔ "کیوں نہیں ہوسکتا جہاں پناہ! ضرور ہوگا!"

عالمگیر ثانی۔ "تم مرہٹوں کو مسلمانوں کا دوست سمجھتے ہو؟"

غازی الدین۔ "یقیناً مرہٹے مسلمانوں کے دوست ہیں، انہیں اگر دشمنی یا عداوت جو کچھ ہے پٹھانوں سے ہے!"

عالمگیر ثانی۔ "جانتے ہو، ایسا کیوں ہے؟"

غازی الدین۔ "اِس لئے کہ پٹھان وحشی اور درندے ہیں، وہ کیا جانیں انسانیت کیا ہوتی ہے، تہذیب کسے کہتے ہیں؟ شرافت کیسی ہوتی ہے؟"

طنز سے عالمگیر ثانی نے کہا۔ "خود ہمارے آس پاس تمہارے دعویٰ کی مثالیں موجود ہیں، مثلاً روہیل کھنڈ میں رحمت خاں، نجیب آباد میں نجیب الدولہ، فرخ آباد میں احمد خاں بنگش —— کیوں ہے نا یہی بات؟"

غازی الدین اس لطیف طنز کو محسوس نہیں کر سکا، اُس نے کہا۔ "جہاں پناہ نے بجا ارشاد فرمایا —— یہی بات ہے، اور یہی وجہ ہے کہ میں صرف پنجاب کو ابدالی کے پنجے سے آزاد کرانا نہیں چاہتا بلکہ ——"

عالمگیر ثانی: "یہ بھی چاہتے ہو کہ فرخ آباد، بریلی اور نجیب آباد کی بھی اینٹ سے اینٹ بجا دو، بغیر اس کے پٹھانوں کا مکمل استیصال نہیں ہو سکتا۔"

غازی الدین۔ "جہاں پناہ نے بالکل درست فرمایا، میری یہ تمنا بھی ہے اور ——"

عالمگیر ثانی۔ "اور تم نے اِس مقصد کے لئے، ہلکر اور سندھیا سے استدعا کی ہے، کہ وہ اپنا لشکرِ گراں لے کر آگے بڑھیں۔"

غازی الدین عالمگیر ثانی کے ان الفاظ سے چونک پڑا، اُس نے ملہر راؤ ہلکر، اور دتاجی سندھیا کو ترغیب دی تھی کہ وہ روہیل کھنڈ کا علاقہ فتح کریں، اِس سلسلہ میں دلّی کی طرف سے ہر طرح کی تائید اور حمایت کا یقین دلایا تھا۔ چنانچہ ان دونوں کا لشکر پیش قدمی کی تیاریاں کرنے لگا، لیکن بہت جلد وہ سنبھل گیا، اُس نے اپنے اوپر کوئی کیفیت نہیں ظاہر ہونے دی، اور نہایت ادب سے کہا۔ "جہاں پناہ کی اطلاع صحیح ہے ... لیکن مجھے یہ عرض کرنے کی اجازت دیجئے کہ میں عرض کروں میرے اس اقدام

کی وجہ کیا ہے؟"

عالمگیر ثانی۔ "عرض کرو ——— ہم سنیں گے!"

غازی الدین۔ "جہاں پناہ کو شاید معلوم نہیں، فیروز بخت نجیب الدولہ کے پاس پہنچ چکا ہے!"

عالمگیر ثانی۔ "ہاں پہنچ چکا ہے، مگر ہمیں کیا؟"

غازی الدین۔ "وہ اپنے ساتھ ایک بہت بڑا پروگرام لے کر گیا ہے!"

عالمگیر ثانی۔ "پروگرام کیسا؟"

غازی الدین۔ "جہاں پناہ ——— وہ حضور کی سلطنت کے لئے ایک مستقل خطرہ بن چکا ہے!"

عالمگیر ثانی۔ "کیسا خطرہ؟"

غازی الدین۔ "جہاں پناہ کو علم ہے کہ نجیب الدولہ نمک حرامی پر کمر باندھ چکا ہے اور فیروز بخت اس کی کمک کو پہنچا ہے، وہ اس کوشش میں ہے کہ بریلی اور فرخ آباد سے ساز باز کرکے، دلی پر متحدہ کوششوں سے ایک زبردست حملہ کیا جائے۔

عالمگیر ثانی۔ "یہ بات ہے؟ یہ منصوبہ تیار ہو رہا ہے؟"

غازی الدین۔ "جہاں پناہ یہی بات ہے ——— اور یہ حضور کا نمک پروردہ اسے ہرگز گوارا نہیں کر سکتا کہ ایسا ہو، اگر مقابلہ کی ضرورت پڑے گی، ہم مقابلہ کریں گے۔ ہم لوہے کو لوہے سے کاٹنا جانتے ہیں۔ ہم تلوار کو تلوار سے کاٹیں گے فولاد کے سر پر ہم فولاد ہی سے حملہ کرتے ہیں۔

عالمگیر ثانی۔ "شاباش!"

غازی الدین۔ "مجھے ایک بات اور بھی معلوم ہوئی ہے!"

عالمگیر ثانی۔ "وہ کیا؟

کیا یہ لوگ ابدالی کو پھر بلانا چاہتے ہیں؟"

غازی الدین۔ "جہاں پناہ! یہ بھی امر واقعہ ہے۔"

عالمگیر ثانی۔ "لیکن کیوں؟ یہ بھی تو معلوم ہو!"

غازی الدین۔ "تاکہ دلی کے تخت پر قابض ہو جائیں۔"

عالمگیر ثانی نے جوش کے عالم میں کہا۔ "غازی الدین تم غلط سمجھے!"

غازی الدین۔ "غلام کو مطلع فرمایا جائے!"

عالمگیر ثانی۔ "اگر یہ لوگ ابدالی کو بلانا بھی چاہتے ہیں تو اِس لئے نہیں کہ دلی کا تخت ہم سے چھین لیں۔"

غازی الدین۔ "پھر کیا مقصد ہو سکتا ہے جہاں پناہ؟"

عالمگیر ثانی۔ "یہ کہ مرہٹوں کو دلی کے تخت پر قابض نہ ہونے دیں!"

غازی الدین نے حیرت سے شہنشاہ کو دیکھا اور کہا۔ "مرہٹوں کے بارے میں جہاں پناہ کے یہ خیالات ہیں؟"

عالمگیر ثانی۔ "ہاں ——— اور تم سمجھتے ہو کہ یہ غلط ہیں؟"

غازی الدین نے ادب سے سر جھکا لیا اور عرض کیا۔ "غلام کی اتنی مجال کہاں، کہ ارشادِ ہمایونی کو غلط سمجھے، لیکن ———"

عالمگیر ثانی۔ "سخن سازی سے کام نہ لو، تم حقائق کا انکار کر سکتے ہو۔ لیکن انہیں بدل نہیں سکتے

تم کہہ سکتے ہو کر سورج روشنی سے محروم ہے۔ لیکن کیا تمہارے کہنے سے واقعتاً ایسا ہو سکتا ہے؟

غازی الدین۔ "جہاں پناہ کا ارشاد بجا ہے، درست ہے۔"

عالمگیر ثانی۔ "کیا تم نہیں جانتے کہ مرہٹوں کی ہوس ملک گیری بڑھتی جا رہی ہے؟

غازی الدین۔ "جہاں پناہ۔ غلام انکار کی جرأت نہیں رکھتا۔"

عالمگیر ثانی۔ "کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ مرہٹوں کی حکومت اب صرف پونہ اور مہاراشٹر تک نہیں ہے۔ مالوہ ان کے زیرِ نگیں ہے، گجرات پر وہ متصرف ہیں، بنگال پر ان کی فوجیں چڑھ رہی تھیں، دلّی کا وہ محاصرہ کر چکے ہیں، دکن میں ان کا زور بڑھ رہا ہے ——— کیا یہ جھوٹ ہے؟

غازی الدین۔ "سچ ہے جہاں پناہ"

عالمگیر ثانی۔ "اب مرہٹوں کے مقابلہ میں ابدالی کو دیکھو، وہ دوبار دلّی تک آ چکا ہے اس کی فوجوں کا مقابلہ ہماری فوجیں نہ کر سکیں، وہ چاہتا تو ہمیں برطرف کر کے خود بادشاہ بن بیٹھتا، کس کی مجال تھی کہ اس سے عہدہ برآ ہوتا؟"

غازی الدین۔ "کسی کی نہیں جہاں پناہ"

عالمگیر ثانی۔ "مگر اس نے کیا کیا؟ کیا توسیع مملکت کے پروگرام پر عمل کیا۔"

غازی الدین۔ "واپس چلا گیا، خاموشی کے ساتھ؟"

عالمگیر ثانی۔ "پھر تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ ابدالی اس لئے آ رہا ہے کہ ہم سے بادشاہت لے؟"

غازی الدین۔ "خانہ زاد غلطی پر تھا جہاں پناہ!"

عالمگیر ثانی: "اگر تم ہمارے وفادار تھے، تو تمہارا فرض تھا کہ تم ابدالی کو بلاتے۔"

غازی الدین: "غلام اپنی غلطی کا اعتراف کرتا ہے۔ اگر غلام کی نمک حلالی اور وفاداری پر شبہ ہے، تو یہ شمشیر مرصع حاضر ہے، غلام کی گردن حکم ہو، کہ ابھی اور اسی وقت اُڑا دی جائے!"

عالمگیر ثانی: "نہیں ہم ایسا نہیں کریں گے ——— تمہیں معاف کیا جاتا ہے لیکن... ———"

غازی الدین: "غلام اپنی گفتار و کردار سے اب کبھی ایسا موقع نہیں دے گا کہ اس کی نمک حلالی اور وفاداری پر شک کیا جائے۔"

عالمگیر ثانی: "تمہیں ایسا ہی ہونا چاہئے، تمہیں اپنے دادا اور باپ کے نقش قدم پر چلنا چاہئے!"

غازی الدین: "آج کے ارشاد ہمایونی نے غلام کی آنکھیں کھول دیں، حجاب کے پردے اُٹھ گئے آئندہ انشاء اللہ کبھی ایسا نہیں ہوگا۔"

عالمگیر ثانی: "اب تم جا سکتے ہو!"

غازی الدین ادب سے پیچھے ہٹا، اور جب تک جہاں پناہ کا سامنا رہا وہ اُلٹے پاؤں چلتا رہا، اور پھر تیزی کے ساتھ دیوانِ خاص سے باہر نکل گیا۔

عالمگیر ثانی کی طبیعت غازی الدین کی باتوں سے کافی مکدّر ہو گئی تھی، وہ اپنے خاص کمرہ میں چپ چاپ بیٹھا تھا کہ دبے پاؤں منّی جان حاضر ہوئی۔ پائنتی بیٹھ گئی اور پاؤں دبانے لگی، جہاں پناہ نے ایک نظر دوسری کنیزوں پر ڈالی، وہ فوراً کمرے سے رخصت ہو گئیں۔ اب یہاں صرف جہاں پناہ تھے یا منّی جان۔

منی جان نے کہا۔ "جان کی امان پاؤں تو کچھ عرض کروں!"

جہاں پناہ نے مسکرا کر فرمایا۔ "تم جیسے قاتلوں کی جان کون لے سکتا ہے؟ کہو کیا کہنا چاہتی ہو؟"

مُنّی جان۔ "اے حضور ایک شاہ صاحب کہیں سے آئے ہیں، بڑے پہنچے ہوئے بزرگ ہیں۔ دل کا حال بتا دیتے ہیں۔ دل کی مراد پوری کر دیتے ہیں!"

عالمگیر ثانی بڑا ضعیف الاعتقاد اور پیر پرست تھا، اس نے اشتیاق کے ساتھ سوال کیا۔

"واقعی؟"

منّی جان ادا کے ساتھ بولی۔ "اے حضور بالکل سچ، میں تو کل گئی تھی ایسا نورانی چہرہ ہے کہ بس دیکھتے ہی رہو، یہ بڑی سفید دودھ کی سی داڑھی، بادام کی سی بڑی بڑی آنکھیں حضور ان کی بھنویں تک سفید ہیں، ڈیڑھ سو برس کی عمر ہے، مگر ماشاء اللہ اتنے ہیں کہ بالکل جوان معلوم ہوتے ہیں!"

عالمگیر ثانی نے حیرت کے ساتھ پوچھا۔ "ڈیڑھ سو برس کے ہیں؟"

منّی جان بولی۔ "جی حضور ڈیڑھ سو برس کے، خود لونڈی سے انہوں نے یہ فرمایا۔"

عالمگیر ثانی نے کچھ سوچتے ہوئے فرمایا۔ "ان سے ملنے کا جی چاہتا ہے!"

مُنّی جان۔ "ضرور ملئے، دل کی ساری مرادیں پوری ہو جائیں گی، جو حضور کے دل میں ہوگا، وہ خود سے ان کی زبان پر آجائے گا، اللہ جانتا ہے۔ میرے ساتھ تو ایسا

عالمگیر ثانی۔ "تمہارے ساتھ کیا ہوا بتاؤ؟"

وہ بولی۔ "اے میرے حضور، میں وہاں ڈرتی ڈرتی گئی اور ادب سے جاکر، چپ چاپ ایک کونے میں بیٹھ گئی، بڑی دیر تک وہ اپنے آپ سے باتیں کرتے رہے۔"

عالمگیر ثانی ہنسا۔ "بے وقوف کہیں کی، کوئی اپنے آپ سے بھی باتیں کرتا ہے۔"

مُنّی جان۔ "اے حضور! میں نے خود اپنے ان کانوں سے سُنا، اب تک وہ آواز میرے کانوں میں گونج رہی ہے!"

عالمگیر ثانی۔ "ہاں سُنا ہو گا۔ لیکن وہ مؤکل ہوں گے، جن سے شاہ صاحب باتیں کر رہے تھے!"

مُنّی جان۔ "مؤکل؟"

عالمگیر ثانی۔ "ہاں مؤکل...... جنّات کی ایک قسم ہے، جو بزرگوں کے ساتھ رہتے ہیں اور ان کے تابعدار عمل کے زور سے بن جاتے ہیں۔"

مُنّی جان۔ "تو اے حضور، وہ مؤکل تھے جنّات؟"

عالمگیر ثانی "اور کیا؟"

مُنّی جان۔ "اوئی میرے اللہ، میرے تو رونگٹے کھڑے ہو گئے، اب تو یہ نیند کبھی نہیں جائے گی، چاہے ادھر کی دُنیا ادھر آجائے۔"

عالمگیر ثانی۔ "اچھا بھئی نہ جانا، لیکن یہ تو بتاؤ، تم پر گذری کیا؟"

مُنّی جان۔ "تو سرکار یہ لونڈی وہاں پہنچی، بڑی دیر تک تو وہ مؤکلوں سے باتیں کرتے رہے۔"

"ہاں پھر کیا ہُوا؟"

"پھر میری طرف مڑے، کہنے لگے، تُو اب آئی ہے جب پانی سر پر

سے اونچا ہوگیا، جا بھاگ جا!"

"اور تم بھاگ آئیں؟"

"سنئے تو سرکار..... میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ فوراً قدموں پر گر پڑی اور لگی پھوٹ پھوٹ کر رونے۔"

"پھر؟"

"پھر انہوں نے میرا سر اٹھایا اور کہا جو تو چاہتی ہے وہ ہوگیا..... میں حیرت سے اُن کی طرف دیکھنے لگی، اِس لئے کہ میں نے اُن سے کچھ کہا تو تھا نہیں!"

"آگے؟"

"پھر میں گھر چلی آئی، دیکھتی کیا ہوں، میری چھوٹی بہن اللہ رکھی، دوڑی دوڑی پھر رہی ہے گھر میں!"

"اُسے کیا ہوا تھا؟"

"اے حضور، وہ تو — گور کے کنارے پہنچ گئی تھی، وہ ہوگیا تھا موا فالج!"

"فالج ہوگیا تھا؟"

"جی!... تمام مُلّا سیانے اور بڑے بڑے حکیم تعویذ گنڈے اور دوا علاج کرتے کرتے تھک گئے، مگر اُس کی حالت بگڑتی ہی گئی۔"

"اچھا!"

"جی!..... میں نے اُسے کھیلتے اور دوڑتے جو دیکھا تو جھپک کے گود میں اُٹھا لیا اور پوچھا، اری تو اچھی کیسے ہوگئی، کہنے لگی بڑے میاں آئے اچھا کر گئے۔"

"میں نے پوچھا "اری پگلی بڑے میاں کون؟"

"اے سرکار اُس نے بالکل شاہ صاحب کا نقشہ کھینچ دیا کہ وہ آئے، اور کہنے لگے تو پڑی کیوں ہے، اُٹھ چل، یہ کہہ کر میری انگلی پکڑ کر اُٹھایا، بس میں اچھی ہو گئی!"

عالمگیر ثانی کا اعتقاد، اِن باتوں سے اور زیادہ پختہ ہو گیا، اُس نے کہا۔ "میں شاہ صاحب سے ضرور ملوں گا!"

منی جان بولی۔ "ضرور ملئے میرے حضور!"

عالمگیر ثانی نے پوچھا۔ "کہاں رہتے ہیں وہ؟"

وہ بولی۔ "اے حضور، فیروز شاہ کے کوٹلہ میں اور کہاں؟"

عالمگیر ثانی۔ "میں انہیں یہاں بلاؤں گا!"

وہ چمک کر بولی۔ "آ چکے..... پھر ہو چکا دیدار!"

"یہ کیوں؟"

"وہ کہیں جاتے نہیں، ساری خلقت بھی سر ٹیک کر مر جائے تو کہیں نہ جائیں، کہتے ہیں فقیر کہیں نہیں جاتا۔ فقیر کے پاس خود خلقت آتی ہے!"

"یہ بات ہے؟"

"جی سرکار!"

"تو ہم خود وہاں جائیں گے!"

"ہاں یہ ہو سکتا ہے!"

منی جان تو تھوڑی دیر کے بعد چلی گئی لیکن عالمگیر ثانی کے دل میں شاہ صاحب کے ملنے کا اشتیاق کروٹیں لینے لگا۔ وہ غازی الدین سے گلو خلاصی چاہتا تھا۔ وہ مرہٹوں سے نجات حاصل کرنا چاہتا تھا، وہ اپنی سطوت و شوکت کا جھنڈا گاڑنا چاہتا تھا، لیکن

وست و بازو کی قوت سے محروم تھا، شجاعت اور بہادری کی دولت اس کے خزانہ میں نہیں تھی، وہ صرف بزرگوں کی دعاؤں اور تعویذوں سے کام نکالنا چاہتا تھا، اور اس طرح وہ ایک مرتبہ پھر بار بار کا دبدبہ عالمگیر کی سطوت اور شاہجہان کی شوکت کی یاد تازہ کر دینا چاہتا تھا۔

اسی کشش و پیچ میں دن ختم ہو گیا، رات آگئی۔

نمازِ عشا کے بعد اُس نے گلباز خاں کو تخلیہ میں طلب کیا اور کہا "ہم نے سُنا ہے شہر میں ایک بزرگ آئے ہُوئے ہیں؟"

گلباز خاں۔ "آئے ہُوئے ہیں جہاں پناہ!"

عالمگیر ثانی۔ "ہم اُن سے ملنا چاہتے ہیں . . . کیا تم انہیں یہاں لا سکتے ہو؟"

گلباز خاں۔ "جہاں پناہ کا حکم ہو، تو آسمان کے تارے توڑ لاؤں، مگر شاہ صاحب کا یہاں آنا ناممکن ہے!"

عالمگیر ثانی۔ "یہ کیوں؟"

گلباز خاں۔ "وہ کہیں نہیں جاتے، اگر کوئی اُن سے کہیں چلنے کو کہتا ہے تو فرماتے ہیں ؎

ہر کجا بود چشمۂ شیریں
مردم و مُرغ و مور گرد آئند

اور یہ کہہ کر خاموش ہو جاتے ہیں۔ میں نے خود ایک مرتبہ چاہا تھا کہ انہیں جہاں پناہ تک لاؤں۔ مگر انہوں نے یہی جواب دیا اور خاموش ہو گئے۔ اِس واقعہ کا ذکر کرنا میں نے ادب کے خلاف سمجھا!"

عالمگیر ثانی:- "اچھا تو ہمیں لے چلو، رات کا وقت ہے، نہ کوئی آتے دیکھے گا، نہ جاتے تھوڑی دیر میں دیدار کر کے چلے آئیں گے۔"

گلباز خاں:- "جہاں پناہ کا جیسا حکم ہو، غلام ہر بات کے لئے کمر بستہ ہے!"

عالمگیر ثانی:- "در کار خیر ہیچ حاجت استخارہ نیست .... اب دیر کرنا بے کار ہے۔ چلو، چور دروازے سے نکل چلیں!"

عالمگیر ثانی، گلباز خاں کے ساتھ چپ چاپ یکہ و تنہا محل سے نکلا۔ "وہ فقراء پر اعتقاد رکھتا تھا، کشف و کرامت کا معتقد تھا، تنہا فقیر باکرامت کی زیارت کو روانہ ہوا، فیروز شاہ کوٹلے کے جب پہلے دروازہ پر پہنچا تو پردہ اٹھا کر اندر گیا، دروازہ اندر سے بند ہو گیا۔ سامنے موت کے فرشتے کھڑے ہوئے تھے، چار ازبک ننگی تلواریں لے کر اس پر پل پڑے، سر کو تن سے جدا کر دیا اور بے سر دھڑ کو جمنا کی ریت پر پھینک دیا!

اور یہ کار نمایاں انجام دے کر گلباز خاں سیدھا غازی الدین کی محلسرا پہنچا جہاں وہ منی جان کے ساتھ راز و نیاز میں مصروف تھا!

ٹ تاریخ ہند از شمس العلماء منشی ذکاء اللہ جلد نہم ص ۳۰۳

باب (۲۰)

فیصلہ

فیروز بخت نجیب الدولہ کے پاس پہنچا، نجیب الدولہ نے اُس کی بڑی آؤبھگت کی، اس کے قیام وطعام کا بہت پُرتکلف انتظام کیا، جب اسے یہ معلوم ہُوا کہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کا مسترشد ہے تو اُس کے تپاک اور اخلاص میں اور زیادہ اضافہ ہو گیا، نجیب الدولہ کو جب احمد شاہ ابدالی، امیر الامرا بنا کر رخصت ہُوا تھا تو اُسے تاکید کر دی تھی کہ وہ دہلی ہی میں رہے، عماد الملک غازی الدین کے ہتھکنڈوں سے عالمگیر ثانی کو بچائے اور مرہٹوں کا زور توڑنے کی کوشش کرے، دہلی کے دوران قیام میں اُس نے امیروں کو بھی دیکھا، اور رئیسوں کو بھی، دولت مندوں کو بھی اور دریوزہ گروں کو بھی، خانوادۂ شاہی کے متوسلین کو بھی اور عام افراد کو بھی، سپاہیوں کو بھی اور فوجیوں کو بھی، عالموں کو بھی اور صوفیوں کو بھی، لیکن جو اثر اُس پر حضرت شاہ صاحب کے بلند مرتبہ سیرت اور کردار کا ہوا تھا، وہ کسی کا نہیں ہُوا، وہ حضرت شاہ صاحب کی خانقاہ میں اپنے دبدبہ اور صَولت کے باوجود کئی بار، ایک خادم اور عقیدت مند کی حیثیت سے حاضر ہُوا اور ہر مرتبہ ایک نیا اور گہرا نقش لے کر اُٹھا۔

دلّی چھوڑنے سے کچھ عرصہ قبل اُس نے حضرت شاہ صاحب کی خدمت میں عرض کیا کہ وہ خانقاہ اور مدرسہ کے لئے کئی ہزار ماہوار کی ایک جاگیر، حکومت کی طرف سے نذر کرنا چاہتا ہے لیکن حضرت شاہ صاحب نے کمال بے نیازی سے انکار فرما دیا... انہوں نے فرمایا، فقیر کو اپنی ذات کے لئے کچھ نہیں چاہئے اور فقیر خدا کا کچھ کام کرتا ہے تو وہی اُس کا ناصر و مددگار ہے۔ بندوں سے مدد لینا اور بادشاہوں سے نذر لینے وصول کرنا، اور حکومت کی اعانت حاصل کرنا فقیر کے شعار اور مسلک کے خلاف ہے۔ نجیب الدّولہ نے لاکھ لاکھ اصرار کیا، مگر حضرت شاہ صاحب کی نہیں کو ہاں سے نہ بدل سکا۔ شاہ صاحب کی اس بے نیازی اور للہیت کا بہت گہرا اثر اس پر ہوا اس کی عقیدت دوچند ہوگئی۔ اگر اُسے دلّی میں رہنے کا موقعہ ملتا، تو شاید وہ حضرت شاہ صاحب کے حلقۂ مسترشدین میں باقاعدہ شریک ہو جاتا۔ لیکن عماد الملک غازی الدین کی شرارت اور سازش کے باعث بادل نخواستہ اُسے دلّی کا قیام ترک کرنا پڑا اور وہ نجیب آباد میں آکر خاموشی اور یکسوئی، بلکہ خلوت کی زندگی بسر کرنے لگا۔ فیروز بخت کے بارے میں جب یہ معلوم ہوا کہ وہ حضرت شاہ صاحب کے ایماء پر آیا ہے تو اس کے دل میں فیروز کی وقعت اور اہمیت کہیں زیادہ بڑھ گئی اور وہ اس کے لئے وہی اہتمام و انصرام کرتا تھا، جو کسی بہت بڑے شخص کے لئے کیا جا سکتا ہے۔

فیروز بخت نجیب الدّولہ کے اخلاق اور سیر چشمی سے بہت متاثر تھا، لیکن اب تک کوئی گفت گو ان دونوں کے مابین نہیں ہوئی تھی، وہ یہاں سیر و تفریح کے لئے نہیں آیا تھا، ایک خاص مقصد، ایک خاص پیغام لے کر آیا تھا، اسی کشمکش و پیچ میں

ایک مہینہ کی مدت گذر گئی مگر رسمی ملاقات کے سوا نجیب الدولہ سے کوئی بات چیت نہ ہو سکی۔

ایک روز نمازِ عشا کے بعد نجیب الدولہ فیروز بخت کے آراستہ پیراستہ خیمے میں آیا اور بے تکلفی کے ساتھ مسند کے ایک کونہ پر بیٹھ گیا۔ اُس نے فیروز سے کہا "میں آپ کے آرام میں خلل انداز تو نہیں ہُوا؟"

فیروز نے جواب دیا۔ "آپ نے یہاں قدم رنجہ فرما کر میری جو عزت افزائی فرمائی ہے۔ اس کا میں شکر گزار ہوں۔"

نجیبُ الدّولہ - "اُمید ہے سفر کی تکان دُور ہو چکی ہو گی؟"

فیروز - "اگر سفر کے لیے تکان ضروری ہے تو بے شک تکان ہُوئی اور دُور ہو گئی، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ میں نے تو ذرا بھی تکان نہیں محسوس کی۔ ہاں اب ضرور ایک خاص قسم کی ذہنی اور دماغی تکان محسوس کر رہا ہوں!"

نجیب الدّولہ نے پریشان ہو کر پوچھا۔ "فرمایئے، فرمایئے، کیا بات ہے اِس کا تدارک کروں گا!"

فیروز بخت - "میں یہاں ایک خاص مقصد کے ماتحت حاضر ہُوا تھا، اور حضرت شاہ صاحب نے مجھے یقین دلایا تھا، کہ وہ مقصد صرف آپ کے ساتھ رہ کر، آپ ہی کی امداد و اعانت سے حاصل ہو سکتا ہے.... لیکن مجھے اپنی بدقسمتی پر افسوس ہے، کہ آپ کی توجہ اور نظرِ عنایت سے میں اب تک محروم رہا۔"

نجیب الدولہ - "میاں صاحبزادے، اس مختصری مدت میں مَیں نے تمہارے طور طریقے رہن سہن اور اخلاق و عادات کا بہت گہرا مطالعہ تم سے دور رہ کر کیا

ہر وقت تمہیں اپنی نظر میں رکھ کر لیا ہے، میں تمہیں اتنا ہی عزیز رکھتا ہوں، جتنا اپنے بیٹے ضابطہ خاں کو، یہ تو میرا ذاتی تعلق ہُوا اور روحانی تعلق یہ ہے کہ تم حضرت شاہ صاحب کے بھیجے ہُوئے ہو، جنہیں میں ہندوستان کا سب سے بڑا صوفی صافی سمجھتا ہوں، اگر کہو تو اپنی گردن ہاتھ سے کاٹ کر نذر کر دوں، لیکن کچھ مُنہ سے تو کہو:

فیروز بخت نے نجیب الدّولہ کو ساری رام کہانی از اوّل تا آخر سُنا ڈالی اور کہا - غازی الدین مرہٹوں کو اپنا آلۂ کار سمجھتا ہے اور مرہٹے اسے اپنا آلۂ کار بنائے ہُوئے ہیں اور ان دونوں کی سازباز سے ہماری حکومت کمزور تر ہوتی جارہی ہے، اور شاید وہ دن دُور نہیں کہ اگر یہی لیل و نہار ہے تو سرے سے حکومت ہی ختم ہو جائے۔"

نجیب الدولہ نے کچھ سوچتے ہُوئے سر ہلایا اور کہا۔" ہاں ٹھیک کہتے ہو، آثار اچھے نہیں دکھائی دیتے!"

فیروز: "یہ آپ مانتے ہیں، تسلیم کرتے ہیں؟"

نجیب الدّولہ: "کیوں نہیں؟ حقائق سے انکار کرنا حماقت ہے!"

فیروز بخت۔ "تو پھر اُٹھ کھڑے ہو جئے۔"

نجیب الدّولہ۔ "لیکن اُٹھ کر کیا کروں؟"

فیروز بخت۔ "جہاد ...... یا تن رسد بہ جاناں، یا جاں ز تن بر آید!"

نجیب الدّولہ: "لیکن اکیلا چنا بھاڑ نہیں پھوڑ سکتا!"

فیروز بخت۔ "لیکن آپ اکیلے کب ہیں؟"

نجیب الدّولہ ...... "تم نہیں جانتے، کوئی میرا ساتھ نہیں دے گا۔ سب کو اپنی اپنی

نکر ہے ، رحمت خاں اپنی فکروں میں گھرے ہوئے ہیں ، احمد خاں بنگش کو بس اتنا کافی ہے کہ غازی الدین نے انہیں امیر الامرا کا خطاب بادشاہ سے دلوا دیا ، شجاع الدولہ کی نام نہاد وزارت بنی رہے ، وہ نواب وزیر کہلاتے رہیں ، اور لوگوں پر حکومت کرتے رہیں ، بس اسی پر قانع اور مطمئن ہیں ۔ ان سوتوں کو میں نہیں جگا سکتا ۔ ان میں سے ایک بھی میرا ساتھ نہیں دے گا ، اور میں اکیلا اتنی بڑی مہم سر نہیں کر سکتا ۔"

فیروز بخت : "لیکن آپ اپنے تئیں اکیلا ، تنہا ، اور بے یار و مددگار کیوں سمجھتے ہیں ؟"

نجیب الدولہ : کون ہے میرا ساتھی ؟ کون ہے میرا رفیق ؟ کون ہے میرا یاور اور مددگار ؟ بتاؤ ، نام لو ؟"

فیروز بخت نے بڑے عزم اور سنجیدگی سے کہا ۔ "خدا . . . . !"

نجیب الدولہ یہ نام سن کر کانپ گیا ، اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا : "خدا ——— !"

فیروز : "ہاں ——— خدا ضرور ہماری مدد کرے گا ، ہم جو کچھ کرنا چاہتے ہیں اپنے لئے ، اپنے خاندان والوں کے لئے ، اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں کے لئے ، اپنے دوستوں اور نیاز مندوں کے نہیں ، ہم نہ حکومت چاہتے ہیں نہ وزارت ؟"

نجیب الدولہ : "پھر کیا چاہتے ہو ؟"

فیروز : "صرف یہ کہ مسلمانوں کا نام نہ مٹنے پائے ۔ اسلام کا سکہ چلتا رہے مسلمانوں کی حکومت قائم رہے . . . . خواہ بادشاہت اور وزارت کسی مقصد میں آئے یا

نجیب الدّولہ۔ "سچ کہتے ہو؟"

فیروز۔ "بالکل سچ!"

نجیبُ الدّولہ۔ "آخر وقت تک اپنے اس عزم پر قائم رہو گے؟"

فیروز۔ "مجھے اس عہد پر زندگی کی آخری سانس تک قائم رہنا پڑے گا۔ میں مجبور ہوں
اس کے چاہنے پر!"

نجیب الدّولہ۔ "کیوں، مجبور کس لئے ہو؟"

فیروز بخت۔ "حضرت شاہ صاحب مجھ سے عہد لے چکے ہیں؟"

نجیب الدّولہ۔ "کون سا عہد؟ کیسا عہد؟"

فیروز بخت۔ "یہ کہ اس جہاد کے سلسلہ میں، کوئی ذاتی غرض، کوئی خاص مقصد اپنے سامنے
نہیں آنے دوں گا!"

نجیب الدّولہ۔ "یہ بات ہے؟"

فیروز بخت۔ "جی جناب یہ بات ہے۔ رات کے سناٹے میں خانقاہ کے اندر جب
صرف میں تھا، حضرت شاہ صاحب تھے اور ہم دونوں کی سننے والی ذات باری
تعالیٰ موجود تھی، تہجد کی نماز پڑھ کر میں نے یہ عہد کیا تھا۔ بلکہ کامیاب ہونے کے
کے بعد بھی کوئی منصب قبول نہیں کروں گا۔ اسراد و التجا کے بعد بھی نہیں!"

نجیب الدّولہ۔ "کامیاب ہونے کے بعد اور اسراد و التجا کے بعد کیوں نہیں؟"

فیروز بخت۔ "تاکہ میرا اخلاص بے داغ رہے، میرا دامن لوٹ اغراض سے پاک رہے۔"

نجیب الدّولہ: "تمہیں یقین ہے، تم اپنے عہد پر قائم رہ سکو گے؟"

فیروز بخت۔ "کامل یقین!"

نجیب الدّولہ۔ "تم نہیں جانتے، ترغیبات کا اثر کیا ہوتا ہے، تم نہیں جانتے، اقتدار و اختیار میں کیسی کشش ہوتی ہے! تمہیں نہیں معلوم حکومت کرنے، حکومت جانے اور حکومت سنبھالنے میں کیسی لذّت ہوتی ہے ..... ایسی لذّت، ایسی قوت ایسی کشش جسے روکنا انسان کے بس سے باہر ہے!"

فیروز بخت نے عجیب وارفتگی اور جوش کے عالم میں کہا۔ "میں نوجوان ہوں، اور جانتا ہوں، ایک نوجوان، خوبصورت اور سراپا وفا بیوی میں کیسی کشش ہوتی ہے، لیکن اس کشش سے میں دامن جھٹک کر اٹھ کھڑا ہوا۔ ہم میاں بیوی کی حیثیت سے صرف چند روز رہے اور میں اس سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو کر اپنی دنیا سے منہ موڑ کر چلا آیا۔ نہ میرے قدموں میں لغزش تھی نہ میرے دل میں الجھن نہ میرے ارادہ میں تذبذب!"

نجیب الدولہ۔ "واقعی سچ؟"

فیروز بخت نے کوئی جواب نہیں دیا اور کہے چلا گیا۔ "میں دلّی کا سب سے بڑا جاگیردار ہوں، میرے خاندان میں پشتہا پشت سے ہیرے جواہرات کا انبار چلا آ رہا ہے ہیرے جواہرات کا ڈھیر منتقل ہوتا آ رہا ہے۔ روپیہ کی سونے کی چاندی کی ریل پیل ہے، ہر سال اتنی بڑی رقم وصول ہوتی ہے جو دل کھول کر عیّاشی کرنے کے بعد بھی بہت کافی بچ سکتی ہے۔ میری عالی شان اور فلک مرتبت حویلی ہے، جو کسی طرح شاہی محل سے کم نہیں ہے لیکن یہ سب کچھ یونہی چھوڑ کر چلا آیا ہوں تاکہ ....."

نجیب الدولہ۔ "ہاں تاکہ ....."

فیروز بخت۔ "تاکہ حویلی ڈھا دی جائے، وہ زر و جواہر لوٹ لیا جائے، وہ نقرئی اور طلائی ظروف چھین لئے جائیں، میں نے زادِ راہ کے طور پر ایک جنبل

مال و دولت میں سے نہیں لیا؟"

نجیب الدولہ۔ "لیکن میرے عزیز کیوں؟ آخر ایسا تم نے کیوں کیا؟"

فیروز بخت۔ "اس لئے کہ ہم اس جاگیر اور دولت کے مالک اس لئے بنائے گئے تھے کہ ہندوستان میں اسلامی حکومت قائم رکھیں، اسلام کو زوال نہ آنے دیں، مسلمانوں کی شوکت اور عظمت پر حرف نہ آنے دیں۔ پھر اگر یہ فرض ہم نہیں انجام دے سکتے، تو ہمیں کیا حق ہے کہ ایسی جاگیر پر، مال و دولت پر، شاندار عمارتوں اور حویلیوں پر اپنا قبضہ قائم رکھیں، جو دولت پہلے ہم پر حلال تھی، اب ہم پر حرام ہے!"

نجیب الدولہ۔ "کیا یہی بات نجیب پر بھی صادق نہیں آتی؟"

بغیر کسی جھجک کے فیروز بخت نے کہا۔ "ضرور صادق آتی ہے!"

نجیب الدولہ۔ "تم کیا کہہ رہے ہو؟ کس سے کہہ رہے ہو؟ اس کا تمہیں اندازہ ہے؟"

فیروز بخت۔ "ہے اور اچھی طرح ہے!"

غصے سے نجیب الدولہ کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اس نے قبضہ پر ہاتھ ڈال کر کہا:۔

"تمہارا مطلب یہ ہے کہ جس مال و دولت سے میں فائدہ اٹھا رہا ہوں، اگر تمہارا ساتھ نہ دوں تو مجھ پر حرام ہے!"

فیروز بخت نے جواب دیا۔ "میرا جواب ہے ہاں!"

نجیب الدولہ نے خنجر نکال لیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ فیروز بخت بھی کھڑا ہو گیا، اگرچہ وہ بالکل نہتا تھا، وفعتہً بجلی کی سی تیزی سے جسونت راؤ شمشیر برہنہ ہاتھ میں لئے ہوئے بیچ میں آ گیا، وہ فیروز بخت کو سامنے سے اپنی پیٹھ کی آڑ میں لے کر کھڑا ہو

گیا۔ نجیب الدولہ ہکا بکا اُسے دیکھنے لگا۔ اُس نے فیروز بخت سے پوچھا۔

"یہ کون ہے؟"

فیروز بخت نے جسونت راؤ کو پیچھے ہٹا دیا، خود سامنے آگیا اور کہا۔ "میرا وفادار اور جاں نثار ملازم!"

نجیب الدولہ۔ "اس کا نام؟"

فیروز بخت۔ "جسونت راؤ!"

نجیب الدولہ۔ "یہ ہندو ہے؟۔۔۔۔ مرہٹی؟ پرتے پر ہندوؤں سے لڑنے نکلے ہو؟"

فیروز بخت۔ "میں ہندوؤں سے لڑنے نہیں نکلا ہوں، آپ بالکل غلط سمجھے ہیں، ہندو تو ہمارے ساتھ ہیں۔ ہمارے مطیع اور وفادار ہیں، ان میں ایک ایسا مستقل فرقہ پیدا ہو گیا ہے جو اس وقت تک کچھ کھاتا پیتا نہیں جب تک بادشاہ کے درشن نہ کرے۔ اسی بنیاد پر اس کا نام ہی درشنیہ[1] پڑ گیا ہے۔"

نجیب الدولہ۔ "اگر تم ہندوؤں سے لڑنا نہیں چاہتے تو پھر کس سے لڑنا چاہتے ہو؟"

فیروز بخت۔ "مرہٹوں سے جو مسلم حکومت کا خاتمہ کرنا چاہتے ہیں۔"

نجیب الدولہ۔ "تمہیں جسونت راؤ پر اعتماد ہے؟"

فیروز بخت۔ "بہت زیادہ!"

نجیب الدولہ۔ "میرے خیال میں تو یہ بھی مرہٹہ ہے؟"

فیروز بخت۔ "آپ کا خیال صحیح ہے۔"

نجیب الدولہ۔ "کیا یہ مرہٹوں کے خلاف بھی تمہاری مدد کرے گا؟"

فیروز بخت۔ "کرے گا۔۔۔۔۔ اگرچہ میں اسے مجبور نہ کروں گا۔"

---

[1] تاریخ ہند (ذکاء اللہ)

جسونت راؤ۔ "مرہٹے نہیں، دیوتا بھی، اگر میرے آقا کے خلاف ہوں گے تو میں اُن سے جنگ کروں گا۔"

نجیب الدولہ۔ "تم اپنے آقا کو اتنا مانتے ہو؟"

جسونت راؤ۔ "بہت زیادہ مانتا ہوں، میرا آقا آدمی نہیں اوتار ہے، فرشتہ ہے!"

نجیب الدولہ۔ "اچھا، اب تم جا سکتے ہو۔"

جسونت راؤ۔ "میں جاتا ہوں، لیکن اپنا خنجر مجھے دے دیجئے۔"

نجیب الدولہ۔ "یہ کیوں؟"

جسونت راؤ۔ "جب آپ باہر نکلیں گے، آپ کو واپس کر دوں گا، میرا آقا نہتا ہے، آپ کو یہاں خنجر لے کر آنا ہی نہیں چاہئے تھا!"

نجیب الدولہ۔ "فیروز بخت اس کی باتیں سُن رہے ہو؟"

اور پھر اُس نے مسکراتے ہوئے اپنا خنجر جسونت راؤ کے ہاتھ پر رکھ دیا اور کہا۔ "اچھا اب جاؤ!"

جسونت راؤ نے ادب سے گردن جھکائی اور چپ چاپ خیمہ سے باہر نکل گیا

جسونت راؤ کے جانے کے بعد نجیب الدولہ نے شفقت سے فیروز بخت کے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور کہا۔ "میرے بیٹے..... مجھ سے بدگمان نہ ہونا، خدانہ ہونا میں زندگی کی آخری سانس تک تمہارا ساتھ دوں گا۔ حضرت شاہ صاحب کی دعائیں اور برکتیں جس شخص کے ساتھ ہوں، میں آنکھ بند کر کے اُس کا ساتھ دینا اپنی سعادت سمجھتا ہوں۔ پھر بھی میرا فرض تھا کہ تمہیں اچھی طرح پرکھ لوں تاکہ میرا الیقین حق الیقین کی صورت اختیار کرلے۔ میرا اعتماد غیر متزلزل ہو..... سمجھے؟"

فیروز بخت نے مسکرا کہا: "سمجھ گیا!"

نجیب الدّولہ۔ "اچھا اب تم آرام کرو، رات بہت آ گئی ہے، اب کل انشاء اللہ اسی وقت ہم دونوں بیٹھ کر اپنے اقدام و عمل کا پروگرام بنائیں گے؟"

فیروز بخت۔ "بہت خوب!"

نجیب الدّولہ: "خدا حافظ۔۔۔ شب بخیر۔۔۔ لیکن ایک بات تو بتاؤ؟"

فیروز بخت۔ "فرمایئے۔"

نجیب الدولہ: "جسونت راؤ جاسوس تو نہیں ہے؟"

فیروز بخت۔ "ہرگز نہیں، میں اسے اچھی طرح پرکھ چکا ہوں، سونے کی طرح آگ میں تپا چکا ہوں اس پر مجھے اتنا ہی اعتماد ہے۔ جتنا خود اپنی ذات پر:"

نجیب الدولہ: "پھر ٹھیک ہے آدمی واقعی بڑی شان کا معلوم ہوتا ہے۔۔۔!"

باب (۲۱)

کیونکر ——— ؟

لیکن یہ جسونت راؤ، فیروز بخت کا وفادار اور جاں نثار کیسے بن گیا؛ جو خون کا پیاسا تھا وہ اپنا آخری قطرۂ خون قربان کرنے کے لئے کیونکر تیار ہو گیا؛ جو اسلام کا بدترین دشمن اور مسلم حکومت کا بدترین مخالف تھا، وہ ایک مسلمان اور مسلم حکومت کے پاسبان کا "باڈی گارڈ" کس طرح بن گیا؛

یہ ایک بڑی عجیب اور دلچسپ کہانی ہے۔

ایک مسلمان سپاہی کو قتل کر دینے کے جرم میں، فیروز بخت کے سپاہیوں نے جسونت راؤ کو گرفتار کر لیا۔ جسونت راؤ نہ موت سے ہراساں تھا نہ گرفتاری سے دہشت زدہ، نہ کسی قسم کی تکلیف اور مصیبت کا تصور، اس میں لچک پیدا کر سکتا تھا، اسے اگر ناگوار تو صرف اس کا کہ گرفتاری نے اس کے پروگرام کو تہس نہس کر دیا۔ وہ سوچ کر کیا چلا تھا اور ہو کیا گیا؛ وہ مسلمانوں کو لوٹنے اور قتل کرنے، مسلم حکومت کا تختہ الٹنے اور اسلام کو ہندوستان سے خارج کرنے کی نیت سے، میدان میں کودا تھا، لیکن ہُوا یہ کہ وہ اب مسلمانوں کا اسیر تھا، وہ غصہ کے عالم میں ہونٹ چباتا تھا، اپنی بوٹیاں نوچتا

تھا۔ لیکن بے بس تھا، وہ ایک قیدی تھا۔

فیروز بخت کے مجاہدوں کا قافلہ آہستہ آہستہ اپنی منزل کی طرف بڑھ رہا تھا، اور جسونت راؤ بھی کشاں کشاں اس قافلہ کے ساتھ چلا جا رہا تھا، راستہ میں حسب معمول ایک منزل پر پڑاؤ ہوا، خیمے نصب کر دیے گئے، پھولداریوں کا جال بچھ گیا، جنگل میں منگل کا سماں پیدا ہوگیا۔ موسم بھی بہت خوشگوار تھا، تمام ساتھی بڑے خوش اور مگن نظر آرہے تھے۔ طے یہ پایا کہ یہاں پورا ایک دن اور ایک رات پڑاؤ کیا جائے، تاکہ سفر کی ماندگی دُور ہو جائے اور پھر تازہ دم ہو کر سفر شروع کیا جائے۔

فیروز بخت کے خیمے سے ملی ہوئی ایک چھوٹی سی راؤٹی تھی۔ جسونت راؤ یہیں قید تھا، دو سپاہی اُس کی نگہبانی پر مامور تھے۔ فیروز بخت کچھ ضروری کاغذات بیٹھا ہوا دیکھ رہا تھا، کہ دو ہندو عورتیں اُس کی طرف بڑھتی نظر آئیں۔ محافظوں نے انہیں روکا، وہ

"دہائی ہے سرکار کی!" کہہ کر وہ چیخ چیخ کر رونے لگیں۔

فیروز بخت نے بارعب آواز میں کہا۔ "آنے دو!"

محافظ سامنے سے ہٹ گئے اور وہ دونوں فیروز بخت کے سامنے آکر کھڑی ہوگئیں۔ اُن میں سے ایک بوڑھی عورت تھی، جس کی عمر ساٹھ سال سے متجاوز ہو چکی تھی۔ دوسری بالکل نوجوان تھی۔ ۲۰، ۲۲ سال کی عمر، بے انتہا حسین و جمیل، یکسر شباب و شراب۔ فیروز بخت نے دونوں پر ایک نظر ڈالی، پھر بڑھیا سے پوچھا۔ "کیا بات ہے؟ تم کیا کہنا چاہتی ہو؟"

وہ سینہ پر دو ہتڑ مار کر روتی ہوئی بولی۔ "میں لُٹ گئی میرے مالک!"

"کس نے لوٹا تمہیں؟ کس سے شکایت ہے تمہیں؟"

پھر بڑھیا نے روتے روتے کہا: "یہاں سے دو میل کے فاصلے پر ایک چھوٹا سا گاؤں ہے لچھمی پور، وہیں کی رہنے والی ہوں، کل دس بارہ گھر ہیں، وہاں رات کو ڈاکوؤں نے اور سارے گاؤں کو لوٹ لیا۔ انھوں نے چاندی تو چاندی، تانبے کا چھلا بھی نہ چھوڑا، برتن بھی اٹھا لے گئے، کپڑے بھی، زیور بھی، اور سرکار جوان عورتیں بھی۔ جو مرد گاؤں کا ان کے سامنے آیا، اُسے موت کے گھاٹ اتار دیا، نہ کئے ہوں گے تو پانچ چھ خون تو کر ڈالے ہوں گے انہوں نے...."

فیروز بخت نے پوچھا: "پھر یہ تمہاری لڑکی کیسے بچ گئی؟"

وہ بولی: "ڈاکوؤں کا حملہ سنتے ہی میں اپنی بچی کا ہاتھ پکڑ کر بھاگی، اور ایک کھیت میں چھپ رہی جا کر، رات بھر ہم دونوں وہیں پڑے رہے، جب سویرا ہوا تو پھر ہم گاؤں گئے، اور وہاں یہ حال دیکھا جا کر —————— ہائے میری بچی کا سارا جہیز لوٹ لے گئے ڈاکو!

فیروز بخت۔ "ڈاکہ ڈالنے والے کون تھے؟"

بڑھیا: "میں نہیں جانتی سرکار۔"

فیروز بخت: "ہندو تھے یا مسلمان؟"

بڑھیا: "ہندو تھے میرے مالک!"

فیروز بخت: "جاٹ یا مرہٹے؟"

بڑھیا: "یہی دونوں ڈاکے مارا کرتے ہیں، دن کا چین اور رات کی نیند حرام کر دی ہے ان دونوں نے، سورج مل جاٹ نے جب سے مرہٹوں سے یارانہ گانٹھا ہے

دونوں کے سپاہی مل مل کر ہم وگوں پر حملہ کرتے ہیں، غلہ لوٹ لیتے ہیں، اناج چھین لیتے ہیں، مویشی پکڑے جاتے ہیں، زیور، برتن، کپڑے، کوئی چیز بھی تو نہیں چھوڑتے۔[1]

فیروز بخت: "پھر اب تم کیا چاہتی ہو؟"

بڑھیا: "مجھے بادشاہ سلامت تک پہنچا دو، میں اپنے بادشاہ کا دامن تھام کر دہائی دوں گی، وہی ہماری یہ مصیبت دور کر سکتا ہے۔"

فیروز بخت مسکرایا، "تم بادشاہ کے پاس جاؤگی؟"

بڑھیا: "ہاں وہی ہمارا ان داتا ہے، وہی ہماری فریاد سنے گا، وہی ہمارا دکھ درد دور کر دے گا!"

فیروز بخت: "لیکن یہ جاٹ اور مرہٹے تمہیں بادشاہ تک پہنچنے کب دیں گے؟"

بڑھیا: "یہ کیوں؟" کیا ناکہ بندی کر لی ہے انہوں نے؟

فیروز بخت: "راستے میں کئی جگہوں پر تمہیں، جاٹ اور مرہٹہ سپاہیوں کے دستے ملیں گے۔ اب تمہارے پاس کچھ نہیں رہا ہے صرف یہ لڑکی باقی ہے اسے بھی چھین لے جائیں گے۔"

بڑھیا کانپ گئی۔ "نہیں نہیں ایسا نہیں ہو سکتا، یہ ہرگز نہیں ہو سکتا، میری ایک ہی تو لڑکی ہے۔ دکھ جھیل جھیل کر اسے میں نے پالا پوسا ہے، یہ ان کے ہتھے میری لاش پر ہی چڑھ سکتی ہے، میں اپنی جان دے دوں گی، مگر انہیں اس پر ہاتھ نہ ڈالنے دوں گی، یہ میرے جگر کا ٹکڑا ہے، میری جان ہے، میرا سب کچھ یہی ہے!"

فیروز بخت: "لیکن، تمہاری جان، ان کی نظر میں کون سی قیمت رکھتی ہے، وہ تمہیں

---

[1] تاریخ ہند

مار ڈالیں گے اور پھر جو چاہیں گے کریں گے!"

یا۔"ہائے رام اب میں کیا کروں؟"

فیروز بخت نے دیکھا، بڑھیا کے ساتھ ساتھ اُس لڑکی کی بڑی بڑی آنکھوں سے بھی آنسوؤں کی قطار جاری ہے۔ فیروز بخت نے بڑی دل سوزی کے لہجہ میں کہا۔

"یہ بتاؤ، کسی اور بڑے گاؤں یا شہر میں تمہارا کوئی عزیز نہیں ہے؟"

یا:"ہے۔۔۔۔ یہاں سے کوئی ۱۲ کوس کے فاصلہ پر، ایک قصبہ ہر پور ہے، وہاں میرا چھوٹا بھائی رہتا ہے!"

بخت۔"وہاں جاؤ گی؟"

یا۔"اب تو وہیں جانا چاہتی ہوں، لچھمن پور سے جی اچاٹ ہو گیا ہے۔"

بخت۔"تو وہیں جاؤ، یہی ٹھیک ہے!"

یا:"جاؤں تو لیکن۔۔۔۔۔"

بخت۔"تم ڈرتی ہو، راستہ کیسے کٹے گا؛ کہیں راستہ میں پھر تمہیں کوئی لوٹ نہ لے۔"

یا:"ہاں میرے مالک یہی بات ہے!"

بخت۔"فکر نہ کرو، ہم انتظام کئے دیتے ہیں ———— ہاں یہ تو بتاؤ اس لڑکی کا جہیز کتنی مالیت کا تھا؟"

یا:"ارے سرکار میری عمر بھر کی پونجی وہی تھی، ساری زندگی ایک ایک پیسہ جوڑ جوڑ کر میں نے دو ہزار جمع کیا تھا!"

بخت۔"اسی کا زیور اور جہیز بنوا لیا تھا؟"

بڑھیا۔ "ہاں میرے مالک!"

فیروز بخت۔ "تمہارے دُکھ کو ہم اپنا دُکھ سمجھتے ہیں۔ آج سے تم ہماری ماں اور یہ لڑکی . . . . کیا نام ہے اس کا؟"

بڑھیا۔ "چندرا۔"

فیروز بخت۔ "ہاں یہ چندرا ہماری بہن ہے۔ جب تک ہم زندہ ہیں۔ تم ہر وقت ہمارے پاس آ سکتی ہو۔ ہمارے دروازے ہر وقت تمہارے لئے کھُلے رہیں گے!"

بڑھیا ہاتھ اُٹھا کر دعائیں دینے لگی۔ فیروز بخت نے حکم دیا، بڑھیا کو چار ہزار روپیہ نقد دیا جائے، اور بارہ سپاہی اُسے اپنی حفاظت میں لے کر ہر پور پہنچا آئیں۔ جب یہ خیریت سے وہاں پہنچ جائے گی۔ تب ہمارا قافلہ آگے بڑھے گا۔ فوراً ہی بارہ سپاہیوں کا ایک دستہ آموجود ہُوا اور اس دستہ کی حفاظت میں بڑھیا، اپنی چندرا کو لے کر ہنسی خوشی ہر پور کی طرف روانہ ہو گئی۔ جب یہ دستہ روانہ ہونے لگا، تو فیروز بخت نے اُسے مخاطب کر کے کہا۔

"یہ ایک ہندو عورت ہے، یہ ایک ہندو لڑکی ہے، لیکن ان دونوں کی جان، مال عزت آبرو، اتنی ہی قیمتی اور بے بہا ہے جتنی ایک مسلمان عورت کی، ایک مسلمان لڑکی کی۔ جب تک تم زندہ ہو، اُس کی آبرو پر حرف نہ آئے۔ میں یہ خبر خوشی کے ساتھ سُن سکتا ہوں، کہ تم سب اُس کی لاج کی حفاظت کرتے ہوئے شہید ہو گئے۔ لیکن اسے گوارا نہیں کر سکتا کہ تم صحیح سلامت واپس آ گئے، اور ان کی حفاظت میں ناکام رہے بس میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہنا چاہتا۔ جاؤ اور جلد سے جلد واپس آنے کی کوشش کرو، خدا تمہارا حافظ و ناصر ہو!"

وہ وسنتہ چندر ا اور اُس کی ماں کو لے کر روانہ ہو گیا۔ اور فیروز بخت پھر وہی ضروری کاغذات دیکھنے لگا۔ جن کا مطالعہ وہ بڑھیا کے آنے سے پہلے کر رہا تھا۔

اور . . . . .

اور جسونت راؤ، ایک عجیب و غریب ذہنی خلجان میں مبتلا ہو گیا۔

اب تک وہ مسلمانوں کے بارے میں جتنی بُری رائے رکھتا تھا، انہیں کتنا اخلاق باختہ، سفاک اور شقی سمجھا کرتا تھا، لیکن اگر مسلمان وہی ہیں جن کا وہ قیدی ہے تو پھر سارا ہندوستان، ساری دُنیا مسلمان کیوں نہیں ہو جاتی، وہ اسلام جس کا پَیرو فیروز بخت ہے۔ اس کے ساتھ دشمنی کرنا انسانیت کے ساتھ دشمنی کرنا ہے، جو مذہب دیگر مذاہب کے پیروؤں کے ساتھ اس درجہ روادارانہ برتاؤ کرتا ہو، اس کے بارے میں یہ کون کہہ سکتا ہے کہ وہ غلط ہے؛ اس کے بارے میں کون سلیم العقل یہ باور کر سکتا ہے کہ وہ قوت کا مذہب ہے؛ اگر اسلام یہی ہے تو میرا دل گواہی دیتا ہے۔ دُنیا کا سب سے سچا، پاک اور برتر مذہب صرف یہی ہے!"

اور پھر جسونت راؤ، اپنے اوپر نفریں کرنے لگا جب اُس کی نظر چندر ا اور اس کے حسن و جمال پر پڑی، تو اُس کے حُسن بے مثال کو دیکھ کر وہ مبہوت اور ششدر رہ گیا تھا، اُسے یقین ہو گیا تھا، اب یہ مجسمۂ حُسن بچ کر یہاں سے نہیں جا سکتا، ضرور فیروز بخت اس پر دست تعدی دراز کرے گا اور ہم سے کہیں کا نہ رکھے گا، لیکن فیروز بخت نے نہ بھولی بھٹکی نظر اُس پر ڈالی، نہ اس کے ساتھ بے تکلفی کا برتاؤ کیا، نہ اُسے نگاہ بھر کر دیکھا بلکہ یہاں تک احتیاط کی کہ اس سے براہِ راست بات تک نہ کی۔ اُسے اپنی بہن بنا لیا، چار ہزار روپیہ دے دیا۔ اُس کی حفاظت پر بارہ سپاہیوں کو مامور کر دیا

مسلمان ہو جاؤں؟

اسلام کی ترویج اور مسلم حکومت کی توسیع کے لئے سر بکف ہو کر میدان میں اتر آؤں؟

ہندو مت، ہندو قومیت، اور ہندو سامراج کے تصور سے دست بردار ہو جاؤں جس کی گود میں میں پروان چڑھا، جس نے مجھے ہمت، حوصلہ اور بہادری کی تعلیم دی؟

نہیں!

یہ نہیں ہو سکتا، مجھے فیصلہ میں جلدی نہیں کرنی چاہئے، سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا چاہئے، ابھی مسلمانوں کو اور پرکھنا چاہئے، اسلام کا اور مطالعہ کرنا چاہئے، پھر کوئی صحیح رائے قائم ہو سکے گی، اور وہی رائے آخری اور فیصلہ کن ہو گی۔

Aminia Muslim Girls School

اور یہ فیروز بخت؟

دل میں اس سے اب نفرت نہیں کر سکتا، اس کا جتنا کردار میں نے دیکھ لیا ہے اس کی برتری کے لئے وہی کافی ہے، ہر قسم کے تعصب کو سامنے رکھ کر بھی ماننا پڑے گا کہ اس کا درجہ بحیثیت انسان کے بہت اونچا ہے، اتنا اونچا ہے کہ اس کے آگے سر تسلیم خم کیا جا سکتا ہے، اس سے سرکشی نہیں کی جا سکتی، نفرت نہیں کی جا سکتی اس کے ایک اشارہ پر گردن کٹائی جا سکتی ہے، اس پہ وار نہیں کیا جا سکتا، جسونت راؤ نے پھر نظر اٹھا کر فیروز بخت کو دیکھا، وہ بدستور اپنے مطالعہ میں محو اور منہمک تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد نماز کا وقت آیا۔ مؤذن نے اذان دی، وہیں پہ فرش بچھ گیا، لوگوں نے وضو کیا اور نماز پڑھنے کھڑے ہو گئے، محمود و ایاز ایک صف میں، یہاں نہ کوئی بڑا تھا نہ چھوٹا، نہ افسر نہ محکوم، نہ آقا نہ غلام۔

اور انہیں حکم دے دیا کہ اس کی حفاظت میں مر جانا، مگر ایسا نہ ہو کہ حفاظت نہ کر سکو اور واپس آجاؤ، کتنا پاک اور پاکیزہ انسان ہے یہ، یہ تو اس قابل ہے کہ اسے پوجا جائے اس کی پرستش کی جائے۔

یہ سوچتے سوچتے اُس نے پہلی بار، عقیدت اور محبت کی نظر فیروز بخت پر ڈالی اُس کا جی چاہتا تھا کہ نظر نہ اُٹھائے، بس اُسے دیکھتا ہی رہے۔ لیکن نہیں یہ بے ادبی تھی۔ گستاخی تھی، اُسے گوارا نہ تھا کہ ایسی محترم شخصیّت کے حضور میں وہ بے ادبی اور گستاخی کا مرتکب ہو،

اور پھر ——————

اور پھر اپنی قوم کے وجود پر شرم آنے لگی!

اُس نے سوچا کیا اسی کردار اور اخلاق پر یہ قوم مسلمانوں کو دیس نکالا دے سکتی ہے؟ کیا انہی لچھنوں پر میری قوم اس دیس کی فرمانروائی کی باگ اپنے ہاتھ میں لے گی کیا یہ جاٹ اور مرہٹے مسلمانوں کو لوٹتے لوٹتے خود اپنے ہم مذہبوں اور ہم قوموں پر بھی ہاتھ صاف کرنے لگے؟ اور پھر اُسے بہت دن پہلے کی ایک بات یاد آئی جب ایک مرتبہ اُس کے باپ سے اس کے ایک جگری دوست نے باتوں باتوں میں کہا تھا: ہمارا دھرم تو پیسہ ہے، جس سے ملے گا لے لیں گے، نہیں ملے گا تو چھین لیں گے، چاہے وہ ہندو ہو یا مسلمان، دوسرے تمام معاملات میں ہندو مسلم سوال پیدا ہو سکتا ہے لیکن یہ سوال پیدا نہیں ہو سکتا تو صرف روپیہ پیسہ کے بارے میں .... اور یہ خیال یاد آتے ہی اُسے اپنی قوم سے، اپنی قوم کے کردار سے گھن آنے لگی۔

پھر کیا میں اسلام قبول کر لوں؟

نماز کی یہ سادگی اور اثر آفرینی دیکھ کر جسونت راؤ پر ایک کیفیت سی طاری ہوگئی اس کا جی چاہا کہ کسی طرح اس قیدِ قفس سے رہائی حاصل کرے، اور وضو کر کے جھٹ پٹ نماز میں شریک ہو جائے، اُس خدا کا بندہ بن جائے، جس کا کوئی وطن نہیں ہے، اس مذہب کا پیرو بن جائے جس میں نہ ذات پات ہے نہ اونچ نیچ، جو سب کو ایک نظر سے دیکھتا ہے۔ جس کے دربار میں فقیر، بے نوا، اور شاہ کج کلاہ سب یکساں ہیں جو دُنیا کا پہلا اور آخری مذہب ہے، جس میں نہ برہمنیت ہے نہ پاپائیت، جس میں ہر شخص نماز پڑھ سکتا ہے، جس کے مراسم، فرائض اور واجبات کی بجا آوری کے لئے نہ کسی خاندان کی شرط ہے، نہ پیشہ کی، نہ شخصیت کی، یہ بہت بڑی کشش تھی اور جسونت راؤ کا بے اختیار جی چاہ رہا تھا کہ وہ پاکوں اور نام نہادوں کے اس گروہ میں شریک ہو جائے، لیکن اس کی محتاط طبیعت نے اُسے اس اقدام سے باز رکھا اُس نے یہی فیصلہ کیا۔

"نہیں، ابھی نہیں، ذرا اور سوچ لوں!"

اتنے میں نماز ختم ہو گئی حضرت شاہ صاحب کی تقلید میں فیروز بخت کا بھی یہ معمول تھا کہ جماعت سے فرض پڑھنے کے بعد سُنّتیں اپنی قیام گاہ پر آکر پڑھتا تھا، چنانچہ آج بھی وہ فرض ادا کرنے کے بعد سنتیں پڑھنے اپنے خیمہ میں آگیا جیسے ہی وہ سجدہ میں گیا، بجلی کی سی تیزی سے اپنے نگہبان سپاہیوں کو بھلانگتا ہوا جسونت راؤ، فیروز بخت کی طرف لپکا اور جاتے جاتے اُس نے ایک سپاہی کے پیش قبض سے خنجر نکالا اور فیروز بخت کے قریب پہنچکر ایک جچا تلا ہاتھ جو مارتا رہتے تو ایک زہریلے کالے ناگ کے دو ٹکڑے الگ الگ تڑپ رہے تھے، یہ سب کچھ ایک لمحہ میں ہو گیا اب

کو مار کر جسونت راؤ نے خنجر وہیں پھینک دیا اور پھر اپنی راؤٹی میں آگیا۔ سپاہیوں نے جسونت کا کارنامہ دیکھ لیا تھا، وہ شروع میں اس کے اقدام سے جتنے گھبرا گئے تھے اب اتنے ہی خوش تھے، اس ساری ہنگامہ آرائی میں فیروز کے وقار و سکون میں ذرا بھی فرق نہ آیا۔ جب اس نے سلام پھیرا، تو جسونت راؤ کے محافظ سپاہیوں کی طرف دیکھ کر کہا: "یہ کیسی ہنگامہ آرائی تھی؟"

دونوں سپاہی جسونت راؤ کو سامنے لے آئے، سارا ماجرا بیان کر کے، کٹے ہوئے سانپ کی طرف اشارہ کر کے کہا: "اس نے آپ کی جان بچالی، ورنہ سانپ بالکل آپ کی گردن کے قریب پہنچ چکا تھا۔"

فیروز نے محبت بھری نظروں سے جسونت کو دیکھا اور کہا: "سانپ کو مارنے کے بعد تم مجھے بھی تو مار سکتے تھے، پھر مجھے کیوں چھوڑ دیا؟"

جسونت راؤ نے کہا: "میرا ہاتھ دیوتاؤں پر نہیں اُٹھ سکتا، آپ آدمی نہیں دیوتا ہیں!"

فیروز نے جواب دیا: "نہیں یہ نہ کہو، میں خدا کا ایک حقیر بندہ ہوں۔ ہم صرف ایک خدا کو مانتے ہیں، بہت سے دیوتاؤں کو نہیں ..... بہر حال تم نے جو کارنامہ انجام دیا ہے اس کا میں شکریہ ادا کرتا ہوں، اور ایک ہی انعام دے سکتا ہوں کہ تمہیں رہا کر دوں ...... تم اب آزاد ہو، جہاں چاہو، جتنا چاہو زادِ راہ لے کر جا سکتے ہو۔"

جسونت راؤ: "میں آپ کا تجویز کردہ انعام نہیں چاہتا۔ اگر لوں گا تو منہ مانگا انعام!"

فیروز بخت مسکرایا۔ "مانگو کیا مانگتے ہو؟"

جسونت راؤ: "مجھے رہائی نہیں چاہئے۔ مجھے اپنا خادمِ خاص بنا لیجئے۔ جس کا کام صرف

یہ ہوگا کہ سفر و حضر میں آپ کے ساتھ رہے گا اور شب و روز آپ کی رکھوالی کرے گا!"

فیروز بخت نے جسونت راؤ کو گہری نظر سے دیکھا، جسونت نے شرما کر آنکھ جھکا لی۔ فیروز بخت نے کہا: "منظور ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تم آج سے ہمارے محافظ و باڈی گارڈ مقرر کئے گئے!"

جسونت راؤ کا چہرہ پھول کی طرح کھل اُٹھا، اور جب فیروز نجیب الدولہ کا مہمان بنا، تو یہی جسونت راؤ خیمہ کے باہر کھڑا پہرہ دے رہا تھا!

باب (۲۲)

صلاح و مشورہ

آج پھر نجیب الدولہ، فیروز بخت کے خیمہ میں بیٹھا ہے، باہر جسونت راؤ تلوار ہاتھ میں لئے پہرہ دے رہا ہے۔ خیمہ پر سنّاٹا چھایا ہُوا ہے، فیروز بخت اور نجیب الدّولہ دونوں خاموش ہیں، دونوں گفتگو کا آغاز کرنا چاہتے ہیں، لیکن کوئی بات ہے، جو انہیں اذنِ تکلم نہیں دیتی اور یہ خاموش رہ جاتے ہیں، دونوں کے چہروں پر تشویش اور پریشانی کے آثار ہیں۔ جیسے کوئی غیر معمولی واقعہ رونما ہو چکا ہے یا ہونے والا ہے۔ دفعتہ فیروز بخت کی آواز گونجی۔

"اس طرح ہمیں دبایا نہیں جاسکتا، ہمارے حوصلوں کو پست نہیں کیا جاسکتا۔ ہمارے پائے استقلال میں لغزش پیدا نہیں کی جاسکتی!"

نجیب الدولہ خاموشی سے فیروز بخت کی یہ باتیں سُنتا رہا۔ ذرا بھی نہ بولا، اور فیروز بخت نے پھر کہا۔

"عماد الملک غازی الدین کی یہی وہ شرارت اور خباثت ہے، جس نے مجھے ترکِ وطن پر مجبور کیا، جس نے مجھے نشۂ شہادت سے محروم کیا اور جس نے سلطنتِ مغلیہ کے ہر

بہی خواہ کو ملول و رنجور کیا ہے، یہ کمبخت کوئی قدم نہیں اُٹھاتا، جب تک مرہٹوں سے ساز باز نہ کرے۔ جب تک اسلام کے دشمنوں سے یارانہ نہ گانٹھ لے جب تک مسلمانوں کو تباہ و برباد کرنے کا منصوبہ نہ تیار کر لے!"

اب نجیب الدولہ نے بھی قفلِ خاموشی توڑا اور بڑی متانت کے ساتھ کہا، "میرے بھائی تم سچے ہو، تم سچ کہتے ہو، لیکن یہ تو بتاؤ اب اس شرارت کا مداوا کس طرح کیا جائے؟ .... تم بھی جانتے ہو، اور میں بھی اس حقیقت سے واقف ہوں کہ غازی الدین غدّار ہے، اپنی قوم کا دشمن ہے، اپنے مذہب تک کی پروا نہیں کرتا، لیکن یہ تو مانو گے وہ بہت بڑا شاطر ہے؟"

فیروز بخت۔ "میں یہ بھی نہیں مانتا!"

نجیب الدولہ۔ "کیوں نہیں مانتے؟"

فیروز بخت۔ "وہ شاطر نہیں موقع پرست ہے!"

نجیب الدولہ۔ "ہاں ...... یہی سہی، لیکن کتنا ہوشیار ہے۔ اس نے مرہٹوں کو بلایا اور ان کا سیلِ گراں اِدھر منتقل کر دیا۔"

فیروز بخت۔ "تو اس سے کیا ہوتا ہے؟"

نجیب الدولہ۔ "کیوں نہیں ہوتا میرے بھائی، دیکھو نا تم میرے پاس اپنے سرفروشوں کو لے کر آ گئے۔ کس لئے آئے؟ اسی لئے تاکہ ہم تم مل کر، اور اپنے دوستوں اور اسلام کے فداکاروں کو ساتھ لے کر، دلّی کا محاصرہ کریں؟ .... بولو میں ٹھیک کہہ رہا ہوں؟"

فیروز بخت۔ "ہاں ٹھیک ہے۔"

نجیب الدّولہ۔ "اور ہماری اسکیم یہ بھی تھی کہ ہم دلی کو فتح کرکے غازی الدین کو اس دُنیا سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رخصت کردیں۔

فیروز بخت۔ "ہاں تھی یہ اسکیم "

نجیب الدّولہ۔ اور اس اسکیم کی کامیابی کے بعد ہمارا ارادہ یہ تھا کہ دلی کو قلعہ بند کرکے مرہٹوں سے نپٹ لیں اور اس طرح ان کی سرکوبی کریں کہ پھر وہ کبھی سر نہ اٹھا سکیں؛ پھر کبھی ان میں یہ جرأت نہ ہو کہ وہ ہندوستان کی اسلامی سلطنت کو نظرِ بد سے دیکھ سکیں، ان کی سامراجیت کا ولولہ ختم ہو جائے، شہنشاہیت اور فرمانروائی کا جو خواب وہ دیکھ رہے ہیں، وہ خواب پریشان بن جائے۔۔۔ تھی نہ یہ بات؟"

فیروز بخت۔ "ہاں تھی، ضرور تھی"

نجیب الدّولہ۔ "اور اب؟"

فیروز بخت۔ "اب بھی ہمارا وہی دم خم ہے۔ وہی حوصلہ اور امنگ ہے!"

نجیب الدولہ: جزاک اللہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ لیکن یہ تو بتاؤ، اب ہم دلی جائیں، یا اپنا گھر بچائیں؟

فیروز بخت۔ "اگر ہم دلی کو نہ بچا سکے، تو اپنا گھر بھی کب تک بچا سکیں گے؟"

نجیب الدولہ: بالکل درست کہتے ہو میرے عزیز، لیکن سوال یہ ہے کہ ہم دلی کی طرف بڑھیں کیونکر؟"

فیروز بخت۔ "یہ کیوں؟"

نجیب الدولہ: صورتِ حال تو یہ ہے کہ خود ہمارے دروازے پہ آکر مرہٹے ہیں

روکنے کے لئے کھڑے ہوئے ہیں، ان سے نپٹے بغیر ہم ایک قدم بھی آگے بڑھ سکیں گے؟"

فیروز بخت ۔ "لیکن ان سے نپٹنا کون سا مشکل ہے؟"

نجیب الدولہ ۔ "بہت مشکل ہے ۔ یہ بہت بڑی چال ہے، مرہٹوں کا لشکر جرار یہاں بھیج کر غازی الدین دِلّی میں ، ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ چنگیز اور ہلاکو بن کر حکومت کرنا چاہتا ہے وہ مرہٹوں کو خوش کرنے کے لئے، وہاں کے عوام کو لوٹے گا ۔ امیروں سے ان کی دولت چھینے گا ۔ قصر شاہی پر آفتیں ڈھائے گا اور مرہٹے اُسے خوش کرنے کے لئے ہمارے دیہاتیوں کو لوٹیں گے ۔ ہمارے شہریوں کو برباد کریں گے، ہماری ناکہ بندی کرکے ہمیں مجبور کر دیں گے کہ ہم ہتھیار ڈال دیں، اور سر اطاعت خم کر دیں ۔ اِس طرح وہ ایک تیر میں دو شکار کر رہے ہیں ۔"

فیروز بخت ۔ "لیکن ان کی یہ تمنا کبھی پوری نہ ہوگی ۔"

نجیب الدولہ ۔ "کیونکر؟ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہم انہیں کیسے روک سکیں گے؟"

فیروز بخت ۔ "خون کا دریا اپنے اور اُن کے مابین حائل کرکے!"

نجیب الدولہ ۔ "لیکن وہ خون کس کا ہوگا؟ مرہٹوں کا یا ہمارا؟"

فیروز بخت ۔ "دونوں کا!"

نجیب الدولہ ۔ "یہ تمہاری خوش فہمی ہے، وہ خون صرف مسلمانوں کا ہوگا، مرہٹے ہمارے دیہاتوں کو لوٹتے، دیہاتیوں کو ہلاک کرتے، کھیتوں کو جلاتے، کسانوں کو برباد کرتے تیزی کے ساتھ آگے بڑھ رہے ہیں، اور چند ہی ہفتوں کے اندر ہماری پوزیشن یہ ہوگی کہ نہ ہم دِلّی کی مدد کر سکیں گے، نہ اپنی؟"

فیروز بخت۔ "ابھی وقت ہے ؟"

نجیب الدّولہ۔ "ہے لیکن بہت کم"

فیروز بخت۔ "لیکن اس مختصر وقت میں بھی بہت کچھ ہو سکتا ہے ۔"

نجیب الدولہ۔ "بتاؤ ہم کیا کر سکتے ہیں ؟"

فیروز بخت۔ "اگر ہم آپس میں متحد ہو جائیں تو اس سیل بلا کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ اس کا رُخ پلٹ سکتے ہیں۔ اس کا منہ پھیر سکتے ہیں ۔"

نجیب الدولہ نے زانو پر ہاتھ مار کر کہا۔ "میرے عزیز یہی تو ناممکن ہے ۔"

فیروز بخت۔ "کیوں ناممکن ہے ؟"

نجیب الدّولہ۔ "میں زیادہ سے زیادہ حافظ رحمت خاں[1] کو اقدام وعمل پر راضی کر سکتا ہوں لیکن شجاع الدّولہ ؛ وہ تو مرہٹوں ہی کا ساتھ دے گا، اور جب تک وہ ہمارا ساتھ نہ دے، ہم ہرگز کامیاب نہیں ہو سکتے ۔"

فیروز بخت۔ "آپ حافظ رحمت کے پاس تشریف لے جائیے، میں شجاع الدّولہ کے پاس جاتا ہوں ۔"

نجیب الدّولہ ہنس پڑا ، اُس نے کہا۔ "تم وہاں جا کر کیا کرو گے میرے بیٹے ؟"

فیروز بخت۔ "میں اسے دعوت دوں گا کہ وقت کی پکار پر لبیک کہے ، اپنی قوم کے کام آئے ورنہ........"

نجیبُ الدّولہ۔ "ہاں . . . . ورنہ کیا ہو گا ؟"

فیروز بخت۔ "اس کا بھی وہی حشر ہو گا، جو نجیب الدّولہ اور حافظ رحمت خاں کا ہو گا۔

---

[1] فرمانروائے بریلی

مرہٹے اگر بریلی اور نجیب آباد کی اینٹ سے اینٹ بجانے میں کامیاب ہوگئے تو وہ یقیناً فیض آباد کا قصرِ عظمت و جلال بھی مسمار کر دیں گے۔"

یہ باتیں سُن کر نجیب الدولہ کی آنکھیں چمکنے لگیں، خوشی سے بے قابو ہو کر اس نے فیروز بخت کو گلے سے لگا لیا اور کہا۔ "شاباش، تم جیتے رہا دو۔ ہو اتنے ہی مدبر بھی ہو۔ یہ بات اگر شجاع الدولہ کی سمجھ میں آگئی، تو بلاشبہ وہ ہماری مدد کرے گا، اور مرہٹوں سے منہ موڑ لے گا، تم میرے پیامبر بن کر اور میرا خط لے کر جاؤ، یہی بات میں خط میں لکھتا ہوں، اور تم زبانی اچھی طرح سے سمجھانا۔"

فیروز بخت "بہت خوب۔"

رات کو دو بجے کے قریب یہ مجلس برخاست ہوئی۔ جب نجیب الدولہ چلا گیا تو جسونت راؤ اندر آیا، اور رادب سے ہاتھ باندھ کر کھڑا ہوگیا۔ فیروز بخت نے پوچھا "کچھ کہنا چاہتے ہو؟"

وہ سر جھکا کر بولا۔ "جس مہم کا آپ نے بیڑہ اٹھایا ہے، اس میں یہ خادم بھی آپ کے ساتھ رہے گا۔"

فیروز بخت نے مسکرا کر اسے دیکھا اور شفقت سے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "ضرور، ضرور!"

جسونت راؤ کا چہرہ فخر اور مسرت سے چمک اٹھا اور وہ چپ چاپ باہر چلا گیا۔

باب (۲۴)

سوال وجواب

فیروز بخت صرف جسونت راؤ کو ساتھ لے کر فیض آباد کی طرف چل پڑا۔ دونوں کے گھوڑے ہوا سے باتیں کرتے، منزلِ مقصود کی طرف بڑھ رہے تھے۔ راستہ کی دشواریاں موسم کی سختیاں، اُن کے عزمِ بلند کے سامنے کوئی حیثیت نہ رکھتی تھیں، یہ جنگلوں کو طے کرتے، دریاؤں کو پھلانگتے۔ ٹیلوں پر چڑھتے، وادیوں سے گذرتے دیہاتوں اور شہروں پر طائرانہ نظر ڈالتے اُڑے چلے جا رہے تھے۔

اور جسونت راؤ، سایہ کی طرح فیروز بخت کے ساتھ ساتھ تھا!

ایک پڑاؤ پر، دونوں سواروں نے کمر کھولی، دونوں بہت تھک گئے تھے۔ بستر پر لیٹتے ہی گھوڑے بیچ کر سو گئے، سویرے سب سے پہلے فیروز کی آنکھ کھلی۔ گھنگھور گھٹا چھائی ہوئی تھی اور موسلا دھار بارش کا سلسلہ جاری تھا، شاید یہ بارش رات ہی سے ہو رہی تھی، منظر پر ایک عجیب رومان انگیز کیفیت طاری تھی، فیروز بخت نے حوائج ضروری سے فراغت کر کے وضو کیا، اور خدائے بزرگ و برتر کی عبادت میں مصروف ہو گیا نماز سے جب وہ فارغ ہوا تو جسونت راؤ بیدار ہو چکا تھا۔ اُس نے ندامت کے

لہجہ میں کہا: "مجھے بڑا افسوس ہے میری آنکھ دیر سے کھلی"

فیروز بخت نے کہا: "تو کیا ہوا؟ تھکے ہوئے بھی تو تھے!"

پھر اُس نے برستے ہوئے پانی پر ایک نظر ڈال کر کہا: "یہ تو بتاؤ یہاں سے آگے کس طرح بڑھیں؟ یہ بارش تو ہمارا راستہ روک کر کھڑی ہو گئی!"

جسونت راؤ نے عرض کیا: "جی ہاں بارش بڑی تیز ہو رہی ہے۔ لیکن تھوڑی دیر کے بعد میرا اندازہ یہ ہے کہ رُک جائے گی!"

فیروز بخت: "جسونت راؤ تم کھڑے کیوں ہو؟ بیٹھ کیوں نہیں جاتے؟"

وہ بیٹھ گیا!

فیروز بخت نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا: "مجھے اِس سے بڑی تکلیف ہوتی ہے کہ تم اپنے اور میرے مابین آقا اور خادم کا رشتہ قائم کئے ہوئے ہو!"

جسونت راؤ نے محبت بھری نظروں سے اپنے آقا کو دیکھا اور جواب دیا: "لیکن اس کے سوا ہم دونوں کے مابین اور رشتہ ہو بھی کیا سکتا ہے؟"

فیروز بخت: "ہمارے درمیان سب سے بڑا رشتہ انسانیت کا ہے، تم بھی آدمی ہو، میں بھی انسان ہوں، ہاں اگر کچھ فرق و امتیاز ہو سکتا ہے، تو وہ صرف معرفتِ الٰہی کا ہے جسے اِسلام تقوٰے کہتا ہے!"

جسونت راؤ: "آپ نے بالکل بجا فرمایا۔ اِس رشتے سے بھی میں کم تر ہوں، اور آپ برتر!"

یہ کہہ کر اُس نے مسکراتے ہوئے فیروز بخت کو دیکھا اور پوچھا: "میں نے کچھ غلط تو نہیں عرض کیا؟"

"سچ کہا تم نے، لیکن یہ فرق تو اختیاری ہے، جب چاہو مٹ سکتا ہے!"

ایک ٹھنڈی سانس لے کر جسونت راؤ نے کہا: "میں خود عرصے سے ذہنی اور روحانی کش مکش میں گرفتار ہوں۔ میں مسلمانوں کا بدترین دشمن تھا، میرے دل میں اسلام کی کوئی جگہ نہ تھی، میں مسلمانوں کو سفاک، لٹیرا، اور اخلاق باختہ سمجھا کرتا تھا، لیکن.....

"ہاں ہاں کہو، لیکن کیا؟"

"لیکن، آپ کو دیکھ کر، آپ کے ساتھ رہ کر، آپ کو پا کر، میرے نظریات اور تصورات میں ہلچل پیدا ہو گئی ہے، بار بار جی چاہتا ہے کہ اسلام قبول کر لوں، سادگی اور صداقت کا ہر روز میرے دل پر سکہ بیٹھتا جاتا ہے۔ لیکن صرف ایک بات سوچ کر رک جاتا ہوں۔"

"وہ کیا؟"

"کہیں اسلام سے میرا یہ لگاؤ، اس محبت کا نتیجہ تو نہیں ہے، جو میرے دل میں آپ کے لئے موجود ہے، بڑھ رہی ہے، اور بڑھتی جاتی ہے!"

فیروز بخت ہنس پڑا، اور جسونت راؤ نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "آپ کی وفاداری میرا دین و ایمان بن چکی ہے۔ آپ کے ایک اشارہ پر اپنی گردن کٹا سکتا ہوں، آگ میں کود سکتا ہوں، سمندر میں پھلانگ سکتا ہوں، ساری دنیا سے حتیٰ کہ اپنی قوم اور ملت تک سے جنگ مول لے سکتا ہوں۔ لیکن آپ کی خاطر بھی، اپنا مذہب نہیں بدل سکتا، یہ مذہب مجھے صدیوں کی وراثت سے ملا ہے، اس مذہب سے صرف میری ذات ہی نہیں، میرا تمدن، میری معاشرت میرے رسوم و عادات، اور نہ جانے کیا کیا وابستہ ہے، اسے میں آسانی سے ترک نہیں کر سکتا، انتہا یہ ہے کہ آپ کی خاطر بھی نہیں!"

فیروز بخت نے پہلو بدلتے ہوئے کہا: "میرے عزیز تم غلط سمجھے ہو، میں ہرگز نہیں چاہتا کہ تم اپنا مذہب، میرے یا کسی اور کے اثر سے متاثر ہو کر ترک کردو، میں کیا خدا اسلام بھی یہ نہیں چاہتا، وہ صاف الفاظ میں کہتا ہے۔ "لا اکراہ فی الدین" یعنی دین کے معاملہ میں جبر و جور نا روا ہے، اگر یہ بات نہ ہوتی تو تم خود غور کرو، تقریباً آٹھ سال تک مسلمانوں نے اس دیس پر حکومت کی اور حکومت بھی کیسی مطلق العنان تو کیا وہ یہ نہیں کر سکتے تھے کہ جس تلوار کے زور پر انھوں نے اس دیس کو فتح کیا تھا اسی تلوار کے زور سے وہ یہاں والوں کے مذہب کو بھی فتح کر لیتے!"

"ہاں کر سکتے تھے! طاقت سب کچھ کر سکتی ہے!"

"مگر تم جانتے ہو، انھوں نے ایسا نہیں کیا؟"

"بعض نے کیا بھی، اور بعض نے نہیں بھی کیا!"

"ذرا صاف صاف کہو!"

"میرا مطلب یہ ہے کہ ہندوستان کے مطلق العنان مسلمان بادشاہوں میں سے بعض نے مذہب کے معاملہ میں کوئی زبردستی نہیں کی، جیسے اکبر اور بعض نے کی جیسے ....."

"عالمگیر .... ؟ کیوں تم یہی کہنا چاہتے تھے نا؟"

"جی ہاں میرا مطلب یہی تھا!"

"لیکن میرے دوست تمہارا یہ خیال غلط ہے، ہندوستان کے مسلمان فرمانرواؤں میں سب سے زیادہ صالح اور متقی بادشاہ عالمگیر ہی گذرا ہے!"

"یہ میں مانتا ہوں، وہ بڑا صالح متقی اور مذہبی آدمی تھا!"

"اگر تم یہ مانتے ہو، تو تمہیں یہ ضرور ماننا پڑے گا کہ عالمگیر نے کبھی ہندو پر مذہب کے معاملہ میں کوئی جبر نہیں کیا، ایک ایسا شخص جو مذہبی نہ ہو، خدا کے احکام سے سرتابی کر سکتا ہے، لیکن جس شخص کا اوڑھنا بچھونا مذہب ہو، وہ خدا کے حکم سے کس طرح سرتابی کر سکتا ہے؟ جب خود اسلام یہ کہتا ہے کہ "لا اکراہ فی الدین" یعنی دین کے معاملہ میں زبردستی جائز نہیں، تو پھر عالمگیر اسلام کے اس حکم کی خلاف ورزی کیسے کر سکتا ہے؟"

"بات تو ٹھیک ہے، لیکن کیا عالمگیر نے متھرا میں، بنارس میں، اجودھیا میں مندروں کو ڈھاکر مسجدیں نہیں بنائیں؟"

"ہاں بنائیں، لیکن پھر اس نے یہی فعل سارے ہندوستان میں کیوں نہیں کیا؟ جب وہ متھرا، اجودھیا اور بنارس جیسے ہندوؤں کے متبرک اور مقدس ترین مقامات پر یہ ظلم کر سکتا تھا، تو باقی ہندوستان میں اس کا ہاتھ پکڑنے والا کون تھا؟"

"کوئی نہیں!"

"پھر کیوں اُس نے ایسا نہیں کیا؟"

"آپ ہی بتایئے! میری سمجھ میں تو کوئی بات نہیں آتی!"

"ہاں میں بتاتا ہوں سنو!"

"فرمایئے!"

"عالمگیر نے صرف ان مندروں کو ڈھایا جو عبادت خانے کے بجائے، سازش بغاوت اور غداری کے مرکز بنے ہوئے تھے، جہاں عبادت نہیں ہوتی تھی، عبادت کے

پردہ میں بغاوت کی اسکیمیں تیار کی جاتی تھیں، حکومت کا تختہ اُلٹنے کے منصوبے بنتے تھے اور جہاں حکومت کے بدترین دشمن امن و عافیت سے اپنی شرانگیز کارروائیوں میں منہمک رہتے تھے!"

"آپ سچ کہتے ہیں؟" بے ساختہ یہ سوال جسونت راؤ کے مُنہ سے نکلا، اور پھر اس نے کہا۔ "کیا یہ سچ ہو سکتا ہے؟"

فیروز بخت نے بڑی نرمی سے جواب دیا۔ "اگر یہ سچ نہیں ہے تو میرے سوال کا جواب دو کہ اُس نے متھرا، بنارس اور اجودھیا وغیرہ کے دوسرے بڑے بڑے مندروں کو ہاتھ کیوں نہیں لگایا؟ ..... ماننا پڑے گا ان مندروں کے ساتھ کوئی خاص بات وابستہ تھی اور اس کے سوا اور کیا ہو سکتی تھی؟"

جسونت راؤ نے کوئی جواب نہیں دیا، اور فیروز بخت نے کہا۔ "ایک بات اور بتاؤں؟"

وہ بولا۔ "فرمائیے!"

فیروز بخت نے کہا۔ "تمہیں یہ سُن کر شاید تعجب ہو، لیکن واقعہ یہی ہے کہ بنارس اور دوسرے شہروں کے متعدد مندروں کو عالمگیر نے ہزاروں روپیہ سالانہ کی بڑی بڑی جاگیریں بخشیں[1] کیا مندروں کو ڈھانے والا عالمگیر، مندروں کو جاگیریں بھی دے سکتا تھا؟"

جسونت راؤ کے مُنہ سے بے ساختہ نکلا۔ "کیا یہ بھی سچ ہے؟"

فیروز بخت نے کہا۔ "ہاں سچ، اور بالکل سچ، تم میرے ساتھ دلّی چلو، میں وہاں سے سرکاری کاغذات سے اپنا دعویٰ ثابت کر دوں گا، جب تو مانو گے؟"

---

[1] اورنگ زیب عالمگیر

بڑی عقیدت اور تاثر کے عالم میں اُس نے جواب دیا۔ "اب بھی مانتا ہوں، میں آپ کو جھوٹا نہیں سمجھتا، سمجھ ہی نہیں سکتا!"

فیروز بخت جسونت راؤ کی جذبانیت سے ذرا بھی متاثر نہیں ہوا۔ اُس نے کہا "ایک اور بات سنو!"

"فرمائیے!"

"شجاع الدولہ ہوں، یا نظام الملک، احمد خاں بنگش ہوں، یا حافظ رحمت خان، نجیب الدولہ ہوں یا بادشاہِ دہلی، ان سب کے جاں نثاروں اور فداکاروں میں، ان کے معتمدین اور مقربین میں، ان کے وزیروں اور عہدے داروں میں اچھی خاصی تعداد تمہیں ہندوؤں کی نظر آتی ہے یا نہیں؟"

"ہاں بہت کافی تعداد ہے!"

"تو کیا یہ سب مذہب فروش ہیں؟ غدارِ ملت ہیں؟"

"نہیں یہ بات تو نہیں!"

"اصل بات یہ ہے کہ یہ مسلمان فرمانروا، حکومت اور سیاست کے معاملات میں مذہب کو رکاوٹ نہیں بننے دیتے، اپنی رعایا کے ساتھ یکساں برتاؤ کرتے ہیں، ہندو اور مسلمان کا کوئی سوال نہیں پیدا ہوتا، کم از کم اسلام اسی کی تاکید کرتا ہے!"

"اسی کی تاکید کرتا ہے؟"

"ہاں..... ہمارا اسلام کہتا ہے کہ اگر کوئی مسلمان کسی ہندو کا مال چراتا ہے، تو اس کے ہاتھ کاٹ دو، اگر کوئی مسلمان کسی غیر مسلم عورت کے ساتھ زنا کرتا ہے تو اُسے

سنگسار کر دو، اگر کوئی مسلمان کسی نامسلمان کو بغیر کسی قصور اور جائز سبب کے قتل کرتا ہے تو خواہ وہ کتنا ہی بڑا مسلمان کیوں نہ ہو۔ اُس کی گردن مار دو، غرض عدل و انصاف آئین و دستور اور اصول و ضابطہ کا جہاں تک تعلق ہے، مسلمان اور غیر مسلمان میں کوئی فرق نہیں کوئی امتیاز نہیں!"

جسونت راؤ، حیرت سے فیروز بخت کو دیکھنے لگا۔

فیروز بخت نے کہا۔ "تم حیرت سے مجھے کیوں گھور رہے ہو؟ میں غلط نہیں کہتا!"

"یہ میں کب کہتا ہوں کہ آپ غلط کہتے ہیں، مجھے تو حیرت ہو رہی ہے کہ میں اسلام کو کیا سمجھتا تھا اور وہ کیا نکلا، حیرت بھی ہے اور خوشی بھی!"

"اگر تم فارسی، عربی سے واقف ہوتے اور تاریخ اسلام کا براہ راست مطالعہ کر سکتے، تو تمہیں اس طرح کے سینکڑوں شاندار واقعات ملتے کہ تمہاری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جاتیں!"

"یعنی موجودہ بادشاہوں سے پہلے کے واقعات؟"

"ہاں.... مجھے اس وقت ایک واقعہ یاد آگیا، تم سنو، تمہیں اندازہ ہوگا اسلام کی ہر دلعزیزی اور جاذبیت کا راز کیا ہے؟"

بڑی سرگرمی اور اشتیاق کے ساتھ جسونت راؤ نے کہا۔ "ضرور فرمایئے، شوق سے سنوں گا۔"

فیروز نے پوچھا۔ "تم نے حضرت علیؓ کا نام سُنا ہے؟"

وہ بولا۔ "نہیں میں نہیں جانتا یہ کون تھے!"

"حضرت علیؓ ہمارے رسولؐ کے چچا زاد بھائی تھے، داماد تھے، اور آپؐ کی وفات

کے کچھ عرصہ بعد، خلیفہ منتخب ہوگئے!

"خلیفہ یعنی بادشاہ؟"

"نہیں خلیفہ اور بادشاہ میں فرق ہے، لیکن یہ فرق تم ابھی نہ سمجھ سکو گے، بہر حال خلیفہ کے اختیارات بادشاہ سے کسی طرح کم نہیں ہوتے۔"

"اچھا پھر"

"حضرت علیؓ نے ایک یہودی پر عدالت میں دعویٰ دائر کیا، کہ اس کے پاس میری زرہ ہے، وہ دلوائی جائے!"

قاضی نے عدالت میں، مدعی یعنی حضرت علیؓ اور مدعا علیہ یعنی یہودی کو طلب کیا حضرت علیؓ نے اپنا دعوے دوہرایا، یہودی نے کہا، یہ غلط کہتے ہیں، زرہ میری ہے قاضی نے حضرت علیؓ سے کہا۔

"گواہ پیش کیجئے، جو آپ کے دعوے کی تائید کریں؟"

بڑی حیرت سے جسونت نے پوچھا، قاضی نے یہ خلیفہ سے کہا!"

بڑے فخر سے فیروز بخت نے کہا۔ "ہاں۔۔۔ تو حضرت علی نے گواہوں میں اپنے غلام قنبر اور اپنے صاحبزادے کو پیش کیا، جن کے زہد و تقوے کی دھوم تھی مگر قاضی نے گواہی قبول کرنے سے انکار کر دیا۔"

جسونت اپنی جگہ سے اچھل پڑا۔ "انکار کر دیا۔"

"ہاں انکار کر دیا، اُس نے کہا آپ نے جو گواہ پیش کئے ہیں، اُن کے صالح اور متقی ہونے میں شبہ نہیں لیکن ان میں سے ایک آپ کا غلام ہے، دوسرا بیٹا، اور آقا کے لئے غلام کی یا باپ کے لئے بیٹے کی گواہی قبول کرنا اسلام کے بنائے ہوئے معیار عدل و انصاف

کے خلاف ہے، کوئی اور گواہ ہوں تو لائیے؟

"پھر؟"

"پھر حضرت علیؓ نے کہا، انہی دونوں کے سامنے میں نے یہ زرہ خریدی تھی، ان کے علاوہ کوئی اور گواہ میں پیش نہیں کر سکتا۔"

قاضی نے کہا۔ "تو پھر میں دعوے خارج کرتا ہوں!"

حضرت علی نے فرمایا۔ "شوق سے!"

چنانچہ دعویٰ خارج ہو گیا، ایک مسلمان کے مقابلہ میں ایک کافر، خلیفۂ وقت کے مقابلہ میں ایک معمولی فرد جیت گیا.... اور پھر جانتے ہو کیا ہوا؟"

"نہیں فرمائیے!"

"اس فیصلہ کے فوراً بعد وہ یہودی حضرت علیؓ کے قدموں پر گر پڑا، اس نے اسلام قبول کر لیا اور مسلمان ہو گیا، حضرت علیؓ نے اُسے گلے لگا لیا اور وہ ان تمام حقوق کا اہل ہو گیا، جو ایک مسلمان کو حاصل ہو سکتے ہیں۔"

جسونت نے پوچھا۔ "اور قاضی صاحب کا کیا حشر ہوا؟"

فیروز نے کہا۔ "کچھ نہیں، حضرت علیؓ اُن سے بہت خوش ہوئے کہ انہوں نے حق و انصاف کا بول بالا دکھا اور بڑی سے بڑی شخصیت کی پروا نہیں کی!"

جسونت نے ایک بڑا تلخ سوال کیا، "کیا موجودہ زمانے کے مسلمان بھی ویسے ہیں جیسے پہلے تھے؟"

فیروز کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے، اُس نے کہا۔ "نہیں...... اور اسی لئے آج یہ حالت ہے۔"

جو دین کہ نکلا تھا بڑی شان سے وطن سے

پردیس میں وہ آج غریب الغرباء ہے

مسلمان اسلام سے دُور ہوتے جارہے ہیں، اسلام کا خدا، مسلمانوں کو اپنی رحمت سے محروم کرتا جارہا ہے!"

جسونت رائے نے بڑے پُرجوش انداز میں کہا: "یہ نہ کہئے!"

"کیوں؟"

"جب تک فیروز بخت جیسے مسلمان زندہ ہیں، اس وقت تک اسلام کا جھنڈا اس دیس میں سربلند رہے گا، مسلمانوں کا وجُود، وقار اور عظمت کے ساتھ قائم رہے گا نہ مرہٹے کچھ کر سکیں گے، نہ جاٹ!"

فیروز نے جسونت کے یہ الفاظ سُنے، اور محبت بھرے لہجہ میں کہا: "کیا اب تو اسلام کے بارے میں تمہارے خیالات وہ نہیں ہیں جو پہلے تھے؟ غلط فہمی رفع ہوگئی؟"

وہ مسکرایا: "بالکل رفع ہوگئی!"

اب بارش کا زور کم ہوچکا تھا، جسونت نے کہا: "ہمیں اپنی منزل کھوٹی نہ کرنی چاہیئے گھوڑے کسواؤں؟"

فیروز نے جواب دیا: "ہاں میں تیار ہوں!"

تھوڑی دیر میں دونوں صبار فتار گھوڑے، سامنے آکر کھڑے ہوگئے، پہلے فیروز اُچک کر بیٹھا، پھر جسونت رائے، دونوں نے ایڑ لگائی اور گھوڑے پر ہوا سے باتیں کرتے ہُوئے ایک لمبی اور کٹھن منزل کی طرف روانہ ہوگئے۔

باب (۲۴)

شجاع الدّولہ کے تیور

فیروز بخت نے فیض آباد میں شجاع الدّولہ کا جاہ و جلال دیکھا تو آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ "وزیر الممالک" کا دم خم، دِلّی کے بادشاہ سے کہیں زیادہ تھا۔ دِلّی کی بادشاہت لال قلعہ میں محصور ہو کر رہ گئی تھی اور وزارت کی رعنائیاں بادشاہت سے کہیں زیادہ وسیع تھیں۔ شجاع الدولہ صرف وزیر با تدبیر تھا۔ لیکن اس کا اقتدار، اس کا خزانہ اور عسکرِ سلطانی اس کا دبدبہ، اُس کا طنطنہ صاف بتا رہا تھا، بادشاہت زک کھا گئی اور وزارت بادشاہت سے کہیں آگے بڑھ گئی۔

چند روز کے بعد شجاع الدولہ نے فیروز بخت کو اذنِ باریابی دیا، بہت تپاک سے مِلا لیکن اپنے تئیں لئے دیئے رہا۔ صاف معلوم ہوتا تھا، وہ اپنے آپ کو روہیلہ سرداروں کے مقابلے میں کہیں برتر اور افضل و اعلٰے محسوس کر رہا تھے۔

شجاع الدّولہ نے پوچھا۔ نجیب الدولہ کو تم کس حال میں چھوڑ کر آئے ہو؟

ادب و احترام کے ساتھ فیروز بخت نے کہا۔ "عالمِ نزع میں، عالی جاہ.....!"

شجاع الدولہ چونک پڑا: "کیا کہا عالمِ نزع میں؟ وہ بیمار ہیں کچھ؟"

فیروز بخت نے سنجیدگی کے ساتھ جواب دیا: "تن اچھا ہے، من بیمار ہے۔ صرف نجیب الدولہ نہیں، نجیب الدولہ اور شجاع الدولہ کی قوم پر، عالمِ مرگ طاری ہے، اور اگر قوم مر گئی، تو توانا اور تندرست ہونے کے باوجود نجیب الدولہ اور شجاع الدولہ دونوں کو مرنا پڑیگا"

شجاع الدولہ سنبھل کر بیٹھ گیا۔

"تمہاری باتیں دلچسپ بھی ہیں اور رہوناک بھی، تم کیا کہنا چاہتے ہو؟ میں نے آج سے پہلے ایسی باتیں کبھی نہیں سنیں!"

فیروز بخت نے سوچا، دردِ دل کہنے کا یہی وقت ہے، اس نے بغیر کسی جھجک کے کہا: "بے شک آپ نے ایسی باتیں کبھی نہ سنی ہوں گی۔ لیکن ان باتوں کے سچ ہونے سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ دِلّی کے لال قلعہ میں جہاں پناہ موجود ہیں۔ فرخ آباد میں بنگش خاندان داد حکومت دے رہا ہے، فیض آباد میں شجاع الدولہ کا طوطی بول رہا ہے، بریلی اور نجیب آباد میں روہیلے فرمانروائی کر رہے ہیں، لیکن ان میں سے کوئی یہ نہیں سوچتا، اگر مسلمان نہ رہے اسلام کا نام اس سرزمین سے مٹ گیا تو حکمرانی اور وزارت کی یہ کشتی بھی ڈوب جائے گی!"

شجاع الدولہ نے غضب ناک ہو کر کہا: "مسلمانوں پر کون سا کوہِ الم ٹوٹا ہے، یہ میرا دربار حکومت ہے، خانقاہ کا حجرہ یا مسجد کی محراب نہیں، تمہارے اس وعظ کا مقصد کیا ہے، میں نہیں سمجھا..... تم صاف صاف کیوں نہیں کہتے، نجیب الدولہ نے تمہیں بھیجا ہے، اور اس لئے بھیجا ہے کہ اس نازک مرحلہ پر میں اس کی مدد کروں، نجیب الدولہ اور اسلام دو الگ الگ چیزیں ہیں، اگر تم ان دونوں کو ایک سمجھتے ہو، تو سمجھو میں بھی وہی کھیل کھیلوں جو تمہارے دماغ میں آ رہا ہے؟"

فیروز بخت نے بیچ میں ٹوکنا چاہا۔ "لیکن عالی جاہ....."

مگر شجاع الدولہ کہتا رہا۔ "میں مسجد کا مُلا نہیں، ایک بہت بڑی سلطنت کا وزیر ہوں، میرے اختیارات بادشاہ جم جاہ سے بھی زیادہ ہیں۔ میں سیاست کو، سیاست کے پہلو سے دیکھتا ہوں، میں جانتا ہوں کون مہرہ پٹ رہا ہے۔ کس پر شہ پڑ رہی ہے کون جیت رہا ہے، جیسا میں دیکھتا ہوں، اسی کے مطابق کام کرتا ہوں۔"

"لیکن عالی......"

"پہلے میری باتیں سُن لو..... میں اس لئے نہیں ہوں کہ دوسروں کے کام آؤں اس لئے ہوں کہ دوسرے میرے کام آئیں۔ میں کسی کا آلۂ کار نہیں بن سکتا۔ دوسروں کو میرا آلۂ کار بننا پڑتا ہے۔ میں کسی کے لئے اپنی گردن نہیں کٹا سکتا، وہ دوسرے ہیں، جو گاجر مولی کی طرح اپنی گردنیں میرے لئے کٹاتے ہیں، کسی کے عروج و زوال سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں، مجھے صرف اس سے دلچسپی ہے کہ کسی کا عروج و زوال میرے لئے فیروزمندی اور فرخ حالی کا کون سا پیام لایا ہے؟... سمجھے؟"

بڑی مسکینیت کے ساتھ فیروز نے جواب دیا۔ "سمجھ گیا عالی جاہ!"

شجاع الدولہ نے تن کر کہا۔ "بس جاکر نجیب الدولہ سے کہہ دو، میں کچھ نہیں کرسکتا.....!"

"لیکن میرے آقا....."

"میں نجیب الدولہ کے لئے مرہٹوں سے جنگ نہیں مول لے سکتا!"

"لیکن عالی جاہ..."

شجاع الدولہ نے سُنی ان سُنی کر دی اور کہا۔ "میں غازی الدین کو بھی اپنا دشمن نہیں بنا سکتا"

فیروز بخت کو موقع مل گیا: "میں نے حضور والا کی ایک ایک بات پورے غور اور توجہ سے سن لی اور میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ حضور جو کچھ فرماتے ہیں اُس کا ایک ایک حرف صحیح ہے:"

شجاع الدولہ خوش ہوگیا۔ "مجھے تمہاری دانش مندی سے یہی توقع تھی!"

فیروز بخت نے کہا۔ "آج مجھے معلوم ہُوا کہ سیاست اور تدبّر کس کو کہتے ہیں؟"

شجاع الدولہ اور خوش ہوگیا۔ اُس نے کہا۔ "میاں صاحبزادے، تم نے ابھی دُنیا نہیں دیکھی ہے، تم صرف یہ سمجھتے ہو کہ تلوار چلا لینا ہی صرف بڑا کام ہے، حالانکہ صرف تلوار بیکار ہے۔ اگر اس کے ساتھ کچھ عقل بھی نہ ہو۔"

"بجا ارشاد ہُوا!"

"یہ روہیلے مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتے، اجڈ، گنوار، بے سلیقہ!"

"بجا ارشاد ہُوا۔ ان سے بڑھ کر اُجڈ شاید ہی کوئی ہو!"

"یہ کیا جانیں بادشاہت کس طرح کی جاتی ہے...... لٹیرے اور بادشاہ میں بڑا فرق ہے...!"

"بجا ارشاد! زمین آسمان کا فرق!"

"اگر کوئی ہمارے خاں صاحب (نجیب الدولہ) سے پوچھے، آپ کو غازی الدین سے الجھنے کی کیا ضرورت تھی؟"

"حماقت! صرف حماقت.... حماقت!"

"چلے تھے ہاتھی سے گنّے کھانے!"

"اب منہ کی کھا رہے ہیں!"

شجاع الدولہ ہنس پڑا۔

"نوجوان تم کام کے آدمی معلوم ہوتے ہو۔"

"ذرہ نوازی ہے حضور کی۔"

"ہمارا خیال ہے تم اچھے مصاحب بن سکتے ہو!"

فیروز بخت اٹھ کر تسلیمات اور کورنشات بجالایا۔

"کس مُنہ سے شکر کیجئے اِس لطفِ خاص کا!"

شجاع الدولہ نے پوچھا۔ "تلوار چلانی بھی آتی ہے؟"

فیروز نے جواب دیا۔ "استادوں کا نام تھوڑا بہت بدنام کر لیتا ہوں۔"

شجاع الدولہ کا چہرہ متبسم ہو گیا...... "اگر ہم تمہیں اپنے ساتھ رکھنا چاہیں تو رہو گے۔"

بے ساختہ فیروز نے کہا۔ "بسر و چشم!!"

شجاع الدولہ نے پوچھا۔ "نجیب الدولہ کو چھوڑ دو گے؟"

بے تامل فیروز بولا۔ "چھوڑ دوں گا۔"

شجاع الدولہ کے چہرے سے خُوشی جھلک رہی تھی، اُس نے کہا۔ "تمہارے اس جواب سے ہم خُوش ہوئے!"

"خادم کی اس سے بڑھ کر خُوش قسمتی کیا ہو سکتی ہے!"

"ہم نے تمہیں اپنا مصاحب خاص بنا لیا!"

فیروز نے فوراً جیب سے ایک اشرفی نکال کر نذر پیش کی۔ شجاع الدولہ نے اس پر ہاتھ رکھ کر گویا اسے قبول کر لیا اور شفقت کے لہجہ میں کہا۔ "تم ہمیں نجیب الدولہ سے

اچھا آقا پاؤ گے!"

"مجھے یقین ہے عالی جاہ!"

تھوڑی دیر کے بعد مجلس برخاست ہو گئی ۔ شجاع الدولہ حرم میں چلا گیا اور فیروز بخت اپنے خیمہ میں واپس آگیا ۔ جسونت راؤ اُس کے ساتھ تھا ۔

جسونت نے پوچھا ۔ "کیا جواب دیا شجاع الدولہ نے؟"

فیروز نے کہا :۔

"نہ اقرار ، نہ انکار ، ابھی معاملہ گو مگو میں ہے!"

AMINIA MUSLIM GIRLS SEC. SCHOOL

باب (۲۵)

حمیتِ قومی

حالات بگڑتے ہی جا رہے تھے، ایسا معلوم ہوتا تھا، مسلمانوں پر ادبار و انحطاط کی جو گھٹا چھا رہی ہے، وہ کھل کر برسے گی اور اپنے ساتھ خس و خاشاک کی طرح مسلمانوں کی شوکت و رفعت کو بہالے جائے گی۔

دلی کے تخت پر شاہجہاں ثانی[1] کے نام سے، عالمگیر ثانی کے بعد غازی الدین نے جس نے مہرہ کو بٹھایا تھا، وہ پوری سعادت مندی اور اطاعت شعاری کے ساتھ غازی الدین کے احکام و ہدایات کی تعمیل کر رہا تھا، غازی الدین کے سامنے اُسے مجال دم زدن نہیں تھی، غازی الدین کا ہر لفظ اُس کے لئے فرمان کا حکم رکھتا تھا، عماد الملک غازی الدین اپنی خوش بختی پر نازاں تھا اور جو چاہتا تھا کرتا، کسی میں ہمت نہ تھی کہ اس کے راستہ کو پتھر بن سکے اور اگر کوئی اس کی جرأت کرتا تو جس طرح بارش کی تیز رَو پانی کے ساتھ

---

[1] عالمگیر ثانی کو شہید کرنے کے بعد ۱۷۵۹ء میں غازی الدین عماد الملک نے محی السنۃ پسر کام بخش و اولاد اورنگزیب عالمگیر کو زندان خانہ سلاطین سے برآمد کر کے بلقب شاہجہاں ثانی تخت پر بٹھا دیا۔ نجیب التواریخ

خس وخاشاک بہہ جاتے ہیں، وہ مع اپنے عزائم کے بدقسمتی کی منزل پر بیٹھا ہوا روانہ ہو جاتا تھا۔ [1]

نے ہاتھ باگ پر ہے، نہ پا ہے رکاب میں

مرہٹے غازی الدین کے اس وقت بڑے گہرے" یار وفادار" تھے، انھوں نے اس کا اشارہ پاتے ہی طے کر لیا کہ نجیب الدولہ کو، اور نہ صرف نجیب الدولہ کو بلکہ روہیلوں کو صفحۂ ہستی سے حرفِ غلط کی طرح مٹا دیا جائے۔

رگھوبا نے یہ مہم، دتا سندھیا (گوالیار) کے سپرد کی اور دتا سندھیا نے اپنی طرف سے گوبند راؤ پنڈت [2] کو مکمل اختیارات دے دیئے کہ وہ جتنی بے دردی اور سفاکی کے ساتھ چاہے اس مہم کو اتمام تک پہنچائے، یہ گوبند راؤ، مرہٹوں کی طرف سے "بندیل کھنڈ" کا حاکم تھا۔ قتل و غارت گری اس کا دلچسپ مشغلہ تھا۔ انسانوں کو سفاکی اور شقاوت کے ساتھ ہلاک ہوتے دیکھ کر اس کا غم کافور ہو جاتا تھا، اور وہ فرطِ مسرت سے باچھیں کھل جاتی تھیں گوبند راؤ نے اس مہم کا بیڑہ اٹھایا اور یہ برقی جھنڈہ کی طرح روہیلہ اقتدار کے استیصال کے لئے آگے بڑھنے لگا۔

گوبند راؤ نے ہر اس چیز کو تباہ و برباد کر دیا، جو اس کے راستے میں آئی۔ ہرے بھرے کھیت، بھرے پُرے شہر، عالی شان اور خوبصورت مکان، تندرست اور توانا جوان جو سامنے آیا، ہلاکت کے غار میں گرا اور موت سے ہمکنار ہوا۔

---

[1] تاریخ ہند، از منشی شفاعت احمد خاں

[2] "پانی پت کا خونیں میدان" سید جالب دہلوی

بہت مختصر سی مدت میں گوبند راؤ نے تیرہ سو[۱۳۰۰] دیہات غارت کر دیئے۔ تقریباً آٹھ ہزار کا لشکر جرار روہیل کھنڈ کو پامال اور تباہ کر رہا تھا۔ نجیب الدولہ گنگا کے کنارے شکر گڑھ کے پاس سکرتال میں جو میرٹھ سے مشرقی و شمالی جانب چودہ کوس پرے، پناہ گزیں ہوا۔ ہر چہار طرف سے مرہٹوں کی یورش ہو رہی تھی اور نجیب الدولہ کے لئے تن تنہا اس جم غفیر کا مقابلہ کرنا ناممکن ہوتا جا رہا تھا۔[۱]

نجیب الدولہ نے، شجاع الدولہ کے پاس فیروز بخت کو بھیجا تھا۔ لیکن نہ اب تک اُس کا کوئی خط آیا تھا، نہ وہ خود آسکا تھا، نہ اس کے بارے میں کوئی اطلاع ملی تھی۔ روہیلہ سرداروں نے سعد اللہ خاں اور رحمت خاں نے اس صدا کے درد پر فوراً لبیک کہا نہ موسم کی پرواکی، نہ برسات کو خاطر میں لائے، نہ ندی نالوں سے ڈرے، خدا کے بھروسے پر نجیب الدولہ کی کمک کے لئے بڑھے، لیکن مرہٹوں کی تعداد اتنی زیادہ تھی، اور ان کا دم خم اتنا بڑھا ہوا تھا کہ سارے روہیلہ سردار مل کر بھی اس طوفان کا رُخ نہیں پھیر سکتے تھے سب کی نگاہیں شجاع الدولہ کی توپوں کا راستہ تک رہی تھیں، اور شجاع الدولہ طے کر چکا تھا کہ وہ پٹھانوں کی ہرگز مدد نہیں کرے گا، نہ اُن کے لئے مرہٹوں سے اور غازی الدین سے دشمنی مول لے گا۔

ایک روز شجاع الدولہ اپنی مجلس خاص میں بیٹھا ہوا تھا، اتفاق سے اس وقت

---

[۱] تاریخ اودھ سے نجیب الدولہ کی اس بے بسی اور مرہٹوں کی اس یلغار کی کتنے اچھے اور بلیغ الفاظ میں ایک شاعر نے تاریخ نکالی ہے۔

برے راہ شکار آ ہو کرد!

صرف فیروز بخت موجود تھا۔

شجاع الدولہ نے فیروز بخت سے پوچھا۔ "کچھ روہیل کھنڈ کی خبر ہے؟"

بے پروائی سے فیروز بخت نے کہا: "جب سے میں نے روہیل کھنڈ کو چھوڑا ہے۔۔ وہاں کا خیال بھی نہیں آیا۔۔۔!"

۔ لیکن وہاں کے حالات بہت نازک ہو رہے ہیں، نجیب الدولہ اس طرح گھرا ہے کہ اب نکل نہیں سکتا!

فیروز بخت کو ہر ہر بات کی خبر تھی، لیکن وہ انجان بنا ہوا تھا۔ اُس نے کہا: "مجھے کیا، ۔۔۔۔ میرے آقا!"

شجاع الدولہ نے خوشی کی ترنگ میں کہا۔ "سعد اللہ خاں اور رحمت خاں مدد کو پہنچنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ لیکن ان کے بنائے بھی کچھ نہ بن سکے گا۔۔۔ غازی الدین سے دشمنی مول لینا اور مرہٹوں کا مقابلہ کرنا بچوں کا کھیل نہیں ہے۔"

فیروز بخت نے کوئی جواب نہ دیا۔۔۔!

کچھ دیر خاموش رہ کر شجاع الدولہ نے کہا۔ "گوبند پنڈت نے تقریباً ڈیڑھ ہزار مواضعات تباہ کر دیئے، اب وہ بتائے گا کہ مرہٹے لوہے کے چنے ہیں، موم کے دانے نہیں، ان سے مقابلہ صرف شجاع الدولہ کر سکتا ہے، کوئی اور نہیں!"

فیروز بخت ۔ "بجا ارشاد ہوا، ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ اس مرتبہ روہیلے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائیں گے!"

شجاع الدولہ ۔ "یقیناً۔۔۔ تمہیں شبہ ہے کچھ؟"

فیروز بخت ۔ "بالکل نہیں، حضور والا!"

شجاع الدولہ۔ "اور بھی تمہیں کچھ خبر ہے؟"

فیروز بخت۔ "مجھے نہیں معلوم، حضور کا اشارہ کس طرف ہے؟"

ایک تبسم کے ساتھ شجاع الدولہ نے کہا۔ "تم میرے معتمد ہو، میں تم سے کوئی بات نہیں چھپانا چاہتا۔ ۔ ۔ غازی الدین عماد الملک کا میرے پاس خط آیا ہے!"

اشتیاق کے ساتھ فیروز بخت نے پوچھا۔ "کیا لکھا ہے۔ ۔ ۔؟"

شجاع الدولہ۔ اس نے لکھا ہے۔ "اگر مرہٹوں اور روہیلوں کی اس جنگ میں آپ بھی ہمارے شریک ہوں، تو ہم اور آپ متفق ہو کر اس پٹھان (نجیب الدولہ) کو راستہ سے ہٹا دیں، پھر اس علاقہ کا انتظام اپنی مرضی سے کریں[1]!"

فیروز بخت کے چہرے کا ایک رنگ آرہا تھا، ایک جارہا تھا، لیکن وہ ضبط کئے خاموش بیٹھا تھا، شجاع الدولہ اس وقت خوشی سے اتنا بدمست تھا کہ اس نے فیروز بخت کی اندرونی کیفیت کو جو اس کے چہرے سے ظاہر ہو رہی تھی ذرا بھی محسوس نہیں کیا اور کہا "اس سے بڑھ کر مجھے موقع نہیں مل سکتا، میں اس سے فائدہ اٹھاؤں گا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ایک تیر میں دو شکار!"

فیروز بخت۔ "وہ کیسے؟"

شجاع الدولہ۔ "ایک طرف روہیلوں کا قلع قمع۔ ۔ ۔ ۔ دوسری طرف غازی الدین کی دوستی۔ ۔ ۔ اور کیا چاہیئے؟"

دفعتہً فیروز بخت نے بے تابی کے ساتھ کہا۔ "اب میں ضبط نہیں کر سکتا۔ ۔ ۔!"

---

[1] تاریخ اودھ

شجاع الدولہ نے حیرت سے اُسے دیکھا

فیروزبخت ۔ جلاد کو بلایئے ، وہ میری گردن قلم کر دے ۔ مگر جب تک میں زندہ ہوں آپ کو عماد الملک غازی الدین سے دوستی نہیں کرنے دوں گا ۔ آپ کو اُس کا ساتھ نہیں دینے دوں گا !"

شجاع الدولہ ۔ "کیوں ؟ کس لئے ؟"

فیروزبخت ۔ "یہ دھوکا ، یہ فریب ہے !"

شجاع الدولہ ۔ "کیا ! ۔ ۔ ۔ تم کیا کہہ رہے ہو ؟"

فیروزبخت ۔ غازی الدین آپ کو فریب دے رہا ہے ، وہ آپ کا بدترین دشمن ہے ؟"

شجاع الدّولہ ۔ "میرا دشمن ؟"

فیروزبخت ۔ "ہاں آپ کا !"

شجاع الدولہ تن گیا ۔ "ثبوت ؟ ۔ ۔ ۔ جو کچھ تم کہہ رہے ہو اس کا ثبوت بھی ہے کچھ تمہارے پاس ؟"

فیروزبخت نے بے پروائی سے جواب دیا ۔ "میں کوئی غلط بات کبھی نہیں کہتا ۔ ۔"

شجاع الدّولہ ۔ "کہو کہو ، کیا کہنا چاہتے ہو تم ؟ ۔ ۔ ۔ ۔ ہم سنجیدگی سے سنیں گے ، سنجیدگی سے غور کریں گے ۔ !"

فیروزبخت ۔ "آج سے صرف دو سال[1] پہلے کی بات ہے ۔ یہی غازی الدین عماد الملک شہزادۂ ہدایت بخش اور مرزا بابر کو لے کر فرخ آباد کے راستے اور ۔ ۔ ۔ چڑھ

---

[1] سنہ [illegible]

دوڑا آتا تھا تاکہ آپ کو برباد کردے، آپ سے علاقہ چھین لے[1]...... میرے آقا مجھے بتایئے کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟"

شجاع الدولہ خاموش ہوگیا۔ بڑی دیر تک سوچتا رہا۔ پھر اس نے کہا: "ہاں تم ٹھیک کہتے ہو...... یہ واقعہ ہے، اور میں اسے زندگی کی آخری سانس تک فراموش نہیں کرسکتا۔"

فیروز بخت نے کہا: "ایک بات اور عرض کرنا چاہتا ہوں!"

شجاع الدولہ: "کہو...... تمہیں اجازت ہے!"

فیروز بخت۔ "ان مرہٹوں کی طاقت اگر بڑھ گئی تو اس کا انجام کیا ہوگا۔ یہ بھی آپ نے سوچا ہے؟"

شجاع الدولہ۔ "تمہاری دور رس نگاہ کیا دیکھ رہی ہے؟"

فیروز بخت۔ "مجھے آئینہ کی طرح، روشن اور نمایاں یہ حقیقت نظر آرہی ہے کہ اگر آج مرہٹے روہیل کھنڈ کے مالک بن گئے، تو کل وہ اودھ کو بھی تاراج کریں گے، اور اُسے اپنی ہونے والی مملکت کا ایک جزو بنالیں گے۔"

شجاع الدولہ۔ (بپھر کر) "اور پھر...... پھر کیا ہوگا؟"

فیروز بخت۔ (بلند آواز سے) "پھر دلی کا سر کرلینا معمولی کام رہ جائے گا اور پھر......"

شجاع الدولہ۔ "ہاں ہاں تم کہو، جو کچھ کہنا چاہتے ہو کہہ ڈالو، تمہاری ان باتوں میں ایک خاص اثر ہے، میں پوری توجہ سے سن رہا ہوں۔"

فیروز بخت۔ "اور پھر یہ ہوگا کہ اس دلیس سے اسلام کو خدانخواستہ جلاوطن ہونا پڑے گا۔

---

[1] تاریخ اودھ

میں آپ سے پوچھتا ہوں، کیا آپ اسے گوارا کر لیں گے؟"

شجاع الدولہ۔ "ہرگز نہیں!"

فیروز بخت۔ "پھر آپ غازی الدین کے فریب میں نہ آئیے!.... میرے پاس اُس کے فریب کا ایک اور ثبوت بھی ہے، وہ جتنا دلچسپ ہے، اِس سے کہیں زیادہ ہولناک ہے؟"

شجاع الدولہ۔ "وہ کیا؟"

فیروز بخت۔ "غازی الدین عماد الملک کا اصل مقصد اور منشا کیا ہے، آپ نہیں جانتے۔"

شجاع الدولہ۔ "اور تم جانتے ہو؟"

فیروز بخت۔ "ہاں جانتا ہوں!"

شجاع الدولہ۔ "وہ سب کچھ بتا دو، جو تمہیں معلوم ہو، جو تم کہنا چاہتے ہو؟"

فیروز بخت۔ "آج میں محض یہ سمجھ کر اس مجلس خاص میں حاضر ہوا تھا، میں نے چلتے وقت اپنے آدمی سے کہہ دیا تھا، میں کفن سر سے لپیٹ کر جا رہا ہوں، ممکن ہے، وفاداری کی سزا پاؤں اور قتل کر دیا جاؤں۔"

شجاع الدولہ۔ "کون ملازم؟"

فیروز بخت۔ "میرا وفادار اور جاں نثار ملازم، حسبونت راؤ...... میں چاہتا ہوں، اُسے شرفِ باریابی عطا کیا جائے۔"

شجاع الدولہ۔ "یہ کیوں؟"

فیروز بخت۔ "جو انکشاف ہونا ہے، وہ اسی کی زبان سے ہوگا۔ میں نے جو کچھ سُنا ہے، اسی کی زبان سے سُنا ہے، اُس نے جو کچھ کہا ہے، اپنے کانوں سے سُن کر، اور آنکھوں

سے دیکھ کر!"

شجاع الدولہ نے حکم دیا، جسونت راؤ کو حاضر کیا جائے۔

فوراً جسونت راؤ کو حاضر کیا گیا۔ شجاع الدولہ نے ایک نظر اس پر ڈال اور پوچھا۔

"تمہارا نام؟"

"جسونت رائے!"

"قوم....؟"

"مرہٹہ!"

"پیشہ...؟"

"تیغ زنی!"

شجاع الدولہ برابر ٹکٹکی لگائے، جسونت راؤ کو دیکھتا رہا، پھر اس نے پوچھا۔

"فیروز بخت کے پاس کب سے ملازم ہو؟"

جسونت راؤ: "ایک سال سے زیادہ مدت گذر گئی!"

شجاع الدولہ: "تم نے انہیں کیسا پایا؟"

جسونت راؤ: "شریف آقا، شریف ساتھی.... شریف مسلمان!"

شجاع الدولہ اب تک جسونت راؤ کو دیکھے جا رہا تھا۔ اُس نے یہ سُن کر کہا۔ "بھلا انہوں نے تمہاری بہت تعریف کی ہے.... ایک بات بتاؤ!"

"ارشاد!"

"فیروز بخت نے دوستی کا ثبوت دینے کے لئے تمہیں ہماری ملکیت میں دے دیا ہے کیا تم ہمارے پاس رہو گے؟"

یہ سُن کر جسونت راؤ کا چہرہ سفید پڑ گیا، اُس نے اپنے رنج وغم پر قابو حاصل کیا اور نہایت متانت کے ساتھ کہا۔ "نہیں!"

"کیوں؟"

"وہ مجھے چھوڑ سکتے ہیں، میں انہیں نہیں چھوڑ سکتا!"

شجاع الدولہ نے ایک قہقہہ لگایا، اور کہا۔

"شاباش ..... واقعی تم بڑے اچھے آدمی ہو ..... ہاں فیروز کیا خبر لایا ہے یہ شخص؟"

فیروز بخت۔ "جسونت راؤ، تم نے جو کچھ دلّی میں اپنی آنکھوں سے دیکھا، اور اپنے کانوں سے سنا وہ ..... سب بیان کر دو!"

شجاع الدولہ۔ "ہاں ایک ایک حرف!"

جسونت راؤ۔ "میرے آقا دلّی کے رہنے والے ہیں انہوں نے وہاں کے حالات کا جائزہ لینے کے لئے مجھے بھیجا۔ میں بھیس بدل کر دلّی پہنچا، بہت جلد میں نے وہاں کے حالات معلوم کر لئے۔ میرے آقا نے خاص طور پر ہدایت کی تھی کہ میں غازی الدین کی سرگرمیوں کا حال ضرور معلوم کروں بڑی مشکل اور کوشش سے وہاں ملازمت حاصل کرنے میں مجھے کامیابی حاصل ہوئی، وہاں کا بادشاہ غازی الدین کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بنا ہوا ہے، اور غازی کو مرہٹوں نے یقین دلایا ہے کہ وہ دلّی فتح کرنے کے بعد اُسے مالا مال کر دیں گے۔"

شجاع الدولہ۔ "کیا کہا دلّی فتح کرنے کے بعد؟"

جسونت راؤ۔ "جی عالی جاہ!"

شجاع الدولہ۔ "مرہٹے دلّی فتح کرنا چاہتے ہیں؟"

جسونت راؤ: وہ اس کا فیصلہ کر چکے ہیں اور اس فیصلہ کو عملی جامہ پہنا کر رہیں گے۔"

شجاع الدّولہ نے غضبناک ہو کر کہا: "کیا یہ .... شجاع الدولہ کی زندگی میں ہو سکتا ہے؟"

جسونت راؤ نے اِس سوال کا جواب نہیں دیا۔ سلسلۂ گفت گو جاری رکھتے ہوئے کہا: "جھنکو اور دتا سندھیا نے (غازی الدین سے) یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ روہیلکھنڈ فتح کر کے اودھ پر قبضہ کیا جائے ...... پھر دِلّی کے تخت پر قبضہ کرنا، بادشاہت میں انقلاب کرنا، مرہٹہ ایمپائر قائم کرنا آسان ہو جائے گا، چنانچہ گوبند راؤ پانڈے (پنڈت) سے کہہ دیا گیا ہے کہ وہ تیار رہے ....!"

شجاع الدولہ جوشِ غضب سے بے تاب ہو کر اٹھ کھڑا ہوا، اور اس نے گرجتی ہوئی آواز سے پُرجوش لہجہ میں کہا۔

"یہ نہیں ہو سکتا، ہرگز نہیں ہو سکتا، میں غازی کی سرکوبی کروں گا، میں مرہٹوں کو ناکوں چنے چبوا دوں گا۔ میں روہیلوں کو فنا نہیں ہونے دوں گا، اُن کی مدد کروں گا؟"

پھر وہ فیروز بخت سے مخاطب ہُوا۔ "فیروز بخت !"

"ارشاد !"

"تم آج ہی روانہ ہو جاؤ اور نجیب الدولہ سے کہہ دو۔ میں آرہا ہوں !"

فیروز نے کوئی جواب نہیں دیا۔ شجاع الدولہ نے پوچھا: "تم نے سُن لیا۔ میں نے کیا کہا؟"

ك ملاحظہ ہو، خزانۂ عامرہ از میر غلام علی آزاد بلگرامی

فیروز بخت: "سن لیا.... لیکن اب میں نجیب الدولہ کا ملازم نہیں ہوں۔ اُن کے پاس کسی اور کو اپنا ایلچی بنا کر بھیجیے.... میں تو صرف آپ کے ہمرکاب چلوں گا اور میدان جنگ میں جس صف پر آپ کہیں گے ٹوٹ پڑوں گا....!"

شجاع الدولہ خوش ہو گیا۔ اُس نے کہا۔

"ٹھیک ہے، ایسا ہی ہو گا، تم میرے ساتھ چلو گے.... تیاریاں شروع کر دو۔ صبح پو پھٹنے سے پہلے میرا لشکر روانہ ہو جائے گا!"

باب (۲۶)

کوُچ

شجاع الدولہ اپنا لشکرِ گراں لے کر نجیب الدولہ کی مدد کے لئے روانہ ہوا۔ فیروز بخت اُس کے ساتھ ساتھ تھا اور جسونت راؤ فیروز بخت کا سایہ کی طرح ساتھ دے رہا تھا۔

اِدھر تو یہ حالت تھی اُدھر گوبند راؤ پنڈت نے تہلکہ مچا رکھا تھا، دتا سندھیا نے گوبند کی کمک میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی، اس کے ساتھ تقریباً ۸۰ ہزار فوج تھی نجیب الدولہ ہر چہار طرف سے دشمن کے نرغہ میں گھرا ہوا تھا۔ مرہٹوں نے عماد الملک غازی الدین کی شہ پر یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ پٹھانوں کا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے استیصال کر دیں گے تاکہ یہ کانٹا سدا کے لئے نکل جائے۔ پھر شجاع الدولہ سے سمجھ لیا جائے، اور شجاع الدولہ کے خاتمے کے بعد مرہٹہ حکومت بڑی آسانی سے سارے ہندوستان میں قائم ہو جائے گی جس کا پایۂ تخت دِلّی ہوگا۔

نجیب الدولہ کی مدد کے لئے سعد اللہ خاں اور رحمت خاں پہنچے لیکن... لیکن کثرت مرہٹہ کے سامنے ہیچ تھے۔ مرہٹوں نے امروہہ، چاندپور، نگینہ، شیرکوٹ

لہ نجیب التواریخ

کو خوب اچھی طرح لُوٹا۔ ہزاروں دیہاتوں جلاکر خاکستر کر دیا، لاکھوں آدمیوں کو خانماں برباد کر دیا۔

ہر چار طرف سے محصور ہو جانے کے بعد بھی نجیب الدولہ کے حوصلہ اور حواس میں کوئی فرق نہیں آیا۔ اگرچہ بظاہر اسے کسی طرف سے کمک نہیں پہنچ سکتی تھی۔ اس کے وسائل و ذرائع جواب دے چکے تھے۔ اس کی فوج دشمن کے لشکر کے مقابلے میں بہت کم تھی اس کا ساز و سامانِ جنگ نہ ہونے کے برابر تھا، لیکن اُس نے شکست نہیں قبول کی۔ اُس نے ہتھیار نہیں ڈالے۔ اُس نے مرہٹوں کی بالادستی قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ اُس نے عماد الملک غازی الدین کی اطاعت کرنے پر موت کو ترجیح دی۔ وہ مثلِ شیرِ غرّان اکیلا لڑتا رہا۔[1] دشمن اس کی استقامت کو دیکھ کر اور زیادہ جوش و خروش سے بپھر بپھر کر لڑتا تھا۔ زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچاتا تھا، بے گناہ شہریوں اور دیہاتیوں پر بجلی بن کر گرتا تھا۔ لیکن نجیب الدولہ پر اس کا بس نہیں چلتا تھا۔

راستے میں شجاع الدولہ نے فیروز بخت سے کہا۔ "مرہٹوں کی اس یلغار کو تو میں روک لوں گا۔ لیکن اس کے بعد کیا ہوگا؟"

فیروز بخت نے جواب دیا۔ "اس کے بعد یہ ہوگا کہ مرہٹے کبھی سر نہ اُٹھا سکیں گے۔"
شجاع الدولہ نے حیرت سے فیروز بخت کو دیکھا۔ "یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ ...... کیونکر ممکن ہے؟ مرہٹوں کی قوت و طاقت کا شاید ابھی تک تمہیں اندازہ نہیں ہو سکا۔"

---

[1] تاریخ اودھ [2] نجیب الدولہ

بے پروائی سے فیروز بخت نے کہا۔ "مرہٹوں کی قوت وطاقت کا مجھے خوب اندازہ ہے اگر میں یہ عرض کروں کہ سب سے زیادہ اندازہ ہے تو ذرا بھی خود ستائی نہ ہوگی لیکن مرہٹوں کو ایک بات کا بالکل اندازہ نہیں ہے !"

فیروز یہاں تک کہتے کہتے رک گیا، شجاع الدولہ نے ملاطفت کے ساتھ پوچھا۔ "کرم کیا کہہ رہے تھے !..... مرہٹوں کو کس بات کا اندازہ نہیں ہے ؟"

فیروز بخت نے کہا۔ "خدا کی طاقت اور قدرت کا !"

شجاع الدولہ ہنس پڑا۔ "کیا مطلب ؟"

فیروز نے جواب دیا۔ "مرہٹوں کو اپنی قوت وشوکت پر ناز ہے، اپنی دولت و ثروت پر غرور ہے۔ اپنی سپاہ اور ساز و سامانِ جنگ پر بھروسہ ہے۔ وہ خدا کو بھول چکے ہیں، وہ بے گناہوں پر ظلم کرتے ہیں، وہ بستیوں سے آمادۂ پیکار ہوتے ہیں، وہ فتنہ و فساد پیدا کرنے میں، وہ انسانیت سوز سفاکی کا مظاہرہ کرتے ہیں..... میں اور آپ ان کی ان دست درازیوں کو معاف کر سکتے ہیں لیکن قدرت نہیں معاف کر سکتی، خدا انہیں معاف کر سکتا یہ دنیا دارِ مکافات ہے جو بوؤ گے وہی کاٹو گے، جیسی کرنی ویسی بھرنی....."

شاید فیروز بخت ابھی کچھ اور کہتا لیکن شجاع الدولہ کے فلک شگاف قہقہے نے اس کی آواز گم کردی، وہ حیرت سے شجاع الدولہ کی طرف دیکھنے لگا۔

شجاع الدولہ نے جی بھر کر ہنسنے کے بعد کہا۔

"تم نرے مولوی ہو ———————— آخر ہر معاملہ میں تمہیں خدا کیوں یاد آجاتا ہے ؟"

فیروز بخت ابھی کوئی جواب نہیں دے پایا تھا، شجاع الدولہ کے دو ٹوک

ہمت بہادر، اور امراؤ گیر گوشائیں آئے۔ ان کے ساتھ نواب مرتضےٰ خاں بڑیچ بھی تے۔ شجاع الدولہ نے امراؤ گیر گوشائیں سے کہا: "تم ہمارے ساتھ ساتھ کیوں چل رہے ہو؟"

امراؤ گر: "پھر مالک کا کیا حکم ہے؟"

شجاع الدولہ: "میں چاہتا ہوں تم ہمت بہادر اور نواب مرتضےٰ اپنے اپنے رسالوں کو لے کر ہراول کی طرح آگے بڑھو، تاکہ مرہٹوں کو معلوم ہو جائے کہ ہم آرہے ہیں!"

امراؤ گر: "بس حکم کی دیر تھی۔ میں چلا!"

ہمت بہادر: "میں مرہٹوں کو بتا دوں گا کہ ہمارا آنا کیا معنی رکھتا ہے؟"

شجاع الدولہ نے مسکراتے ہوئے پوچھا: "اور مرتضےٰ تم ... تم کیا ارادہ رکھتے ہو؟"

نواب مرتضےٰ: "اگر مرہٹوں سے میری مڈبھیڑ ہو گئی، تو میں انہیں ایسا سبق دوں گا کہ وہ زندگی بھر یاد کریں گے کہ ہاں کسی سے پالا پڑا تھا!"

شجاع الدولہ: "میں تم لوگوں سے یہی امید رکھتا ہوں۔ بس اب منزل کھوٹی نہ کرو..... جاؤ.....!"

یہ تینوں سردار ادب سے تسلیمات بجا لائے اور اپنے آقا کے فرمان کے مطابق اپنے رسالوں کو ہمرکاب لے کر آگے بڑھ گئے۔

ان لوگوں کے چلے جانے کے بعد، شجاع الدولہ پھر فیروز بخت سے مخاطب ہوا۔ "میرے خیال میں وہ وقت اب قریب آتا جاتا ہے کہ مرہٹوں سے ایک آخری، اور

لہ ہندوستان میں مشرقی تمدن کا آخری نمونہ، از مولانا عبدالحلیم شررؔ مرحوم..... شجاع الدولہ کے یہ گوشائیں سرداراس کے بڑے جاں نثار اور وفادار تھے۔ انہوں نے مرہٹوں کو ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

فیصلہ کُن معرکہ ہو کر رہے گا، خواہ ہم چاہیں یا نہ چاہیں!"

فیروز بخت ۔"آپ نے بہت صحیح ارشاد فرمایا، وہ گھڑی اب بہت قریب آتی جا رہی ہے، اور میرا خیال ہے کہ اس معرکہ کو جلد از جلد بر پا ہو ہی جانا چاہیئے!"

شجاع الدولہ ۔"لیکن بہت کشت و خون ہوگا!"

فیروز بخت ۔"بے شک ہوگا، لیکن یہ معرکہ جتنا مؤخر الذکر ہوتا جائے گا، خون ریزی اتنی ہی بڑھتی جائے گی!"

شجاع الدولہ ۔"یہ بھی تم ٹھیک کہتے ہو..... بہر حال دیکھو خدا کیا کرتا ہے!"

فیروز بخت ۔"وہ جو کچھ کرے گا، اچھا کرے گا!"

دِن اسی طرح گزرتے رہے.....!

شجاع الدولہ کا لشکر سکرتال کی طرف تیزی سے بڑھتا رہا!

AMINIA MUSLIM GIRLS SEC. SCHOOL ★ LIBRARY ★
A. No. 18
Date 1.9.9.

باب (۲۷)

یاس میں آس

نجیب الدولہ پر اب مایوسی کا عالم طاری ہوتا جا رہا تھا۔ اس نے خدا سے گڑگڑا کر دعائیں کیں۔ لیکن وہ اب تک نہ پہنچ سکیں، اُس نے اپنے دوستوں اور رفیقوں سے امداد و اعانت کی التجا کی۔ لیکن دوست اور رفیق بہترین کوششوں اور تمناؤں کے باوجود اس کی مدد نہ کر سکے۔ اُس نے شجاع الدولہ سے بڑی آس لگائی تھی۔ لیکن وہ آس یاس سے بدل گئی۔ اسے فیروز بخت کی وکالت پر بڑا بھروسہ تھا۔ لیکن وہ ایسا غائب ہوا کہ نہ خط آیا، نہ کوئی اطلاع بھیجی۔

نماز فجر کے بعد اس نے اپنے ندیموں اور معتمد سرداروں کی مجلس مشاورت طلب کی۔ یہ لوگ آئے اور چپ چاپ بیٹھ گئے۔ سب کے چہرے فق تھے، رنگ رُخ اڑا ہُوا تھا۔ سب تھکے ہوئے اور مضمحل نظر آ رہے تھے۔

نجیب الدولہ نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر اپنے رفقا پر نظر ڈال کر کہا۔ "آپ جانتے ہیں، میں نے آپ کو کیوں بلایا ہے؟"

ایک سردار۔ "ہمیں علم نہیں۔"

نجیب الدولہ۔ "محاصرہ روز بروز تنگ ہوتا جاتا ہے۔ اب ہمارے پاس اناج اور غلہ بھی نہیں رہ گیا، دشمن کو بار بار تازہ دم کمک پہنچ رہی ہے...... سوال یہ ہے ایسی صورت میں کیا کیا جائے؟"

سردار خاموش بیٹھے رہے، معلوم ہوتا تھا ان کی قوتِ گویائی سلب ہوگئی ہے۔

نجیب الدولہ (ذرا بلند آواز سے) میں اپنے سوال کا جواب چاہتا ہوں!

ایک سردار۔ "ہم جنگ سے نہیں گھبراتے...."

نجیب الدولہ۔ "مگر...."

سردار۔ "بے بسی کی موت سے گھبراتے ہیں، ہم میں اب مقابلہ کرنے کی سکت باقی نہیں ہے۔"

نجیب الدولہ۔ "کیوں.... وہ سکت کس نے چھین لی؟"

سردار۔ "حالات نے.... سپاہی اُسی وقت اطمینان اور دلچسپی سے لڑتا ہے جب وہ بھوکا نہ ہو۔ ہم بھوکے ہیں، ہمارے بال بچے غیر محفوظ ہیں، ہماری طاقت پارہ پارہ ہوچکی ہے!"

نجیب الدولہ۔ "تو کیا راؤ سے صلح کرلوں؟"

سردار۔ "صرف یہی ایک چارۂ کار رہ گیا ہے!"

نجیب الدولہ۔ "لیکن صلح غیر مشروط ہوگی۔ دشمن بھانپ گیا ہے، ہم بے دم ہوچکے ہیں۔ وہ ہرگز کوئی رعایت نہیں کرے گا، لہٰذا باعزت صلح کا کوئی امکان نہیں ہے.... بتاؤ اب کیا کہتے ہو، اس صورت میں بھی صلح کرلوں؟"

سردار۔ "اگر صلح کرنی ہے تو ہر قیمت پر کرنی پڑے گی۔ پس و پیش بیکار ہے!"

نجیب الدولہ نے شیر کی طرح گرج کر کہا:۔

"ٹھیک کہتے ہو۔ اب پس و پیش بیکار ہے۔ فیصلہ کن گھڑی آپہنچی ہے۔ تم میں سے جو زندہ رہنا چاہتا ہے، اُسے میں اجازت دیتا ہوں کہ جہاں جا سکتا ہو چلا جائے۔ تم میں سے جو مرہٹوں سے صلح کرنا چاہتا ہو۔ میری طرف سے پوری اجازت ہے کہ جتنے ذلیل شرائط پر چاہے ان سے صلح کرلے، تم میں سے جو عماد الملک غازی الدین سے پیمان وفا باندھنا چاہتا ہو۔ میں ذرا بھی مزاحم نہ ہوں گا۔ اسے میں ہر طرح کی سہولت دوں گا کہ وہ اپنے نئے آقا ولی نعمت کے پاس دلّی چلا جائے اور وہاں جا کر سر عبودیت اس کے قدموں پر خم کردے۔ ... لیکن نجیب الدولہ مرنا چاہتا ہے، اسے زندگی عزیز نہیں، وہ زندگی سے بے زار ہو چکا ہے، اسے موت پسند ہے۔ ... دوستو! تم اپنی منزل کھوٹی نہ کرو، صلح کر سکتے ہو تو صلح کرلو، جان بچا سکتے ہو تو جان بچا لو، بھاگ سکتے ہو تو بھاگ جاؤ۔ یہ سب کچھ اسی وقت تک ممکن ہے جب تک نجیب الدولہ زندہ ہے وہ دشمن کے وار اپنے سینے پر روکے گا ... پیٹھ پر نہیں ... خدا حافظ ...!"

ایک سردار نے اُٹھ کر دامن پکڑ لیا۔ "میرے آقا! یہ نہیں ہو سکتا۔ ہم آپ کو تنہا نہیں چھوڑ سکتے!"

دوسرا بولا۔ "اگر آپ صلح نہیں چاہتے تو ہم بھی نہیں چاہتے!"

تیسرے نے کہا۔ "ہم آخر وقت تک جنگ کریں گے!"

ایک اور بولا۔ "ہم اپنے خون کا آخری قطرہ اپنے آقا پر نثار کر دیں گے۔ صرف اشارہ کی دیر ہے!"

یہ باتیں سن کر نجیب الدولہ کا چہرہ سرخ ہو گیا، اُس نے کہا: "دوستو! ساتھیو...! زندگی ہمیشہ رہنے والی چیز نہیں، ایک نہ ایک روز موت آئے گی اور ضرور آئے گی

ہم موت سے کیوں ڈریں، اگر عزت کی زندگی ہمارے بس میں نہیں رہی تو کیا عزت کی موت مرنا ہمارے اختیار سے باہر ہے!"

نجیب الدولہ کی تقریر ابھی ختم نہیں ہوئی تھی کہ ایک سپاہی نے آکر عرض کیا۔

"شجاع الدولہ کا ایلچی حاضر ہوا ہے!"

شجاع الدولہ کا نام سنتے ہی حاضرین پر امید و بیم کی ایک عجیب کیفیت طاری ہو گئی، خود نجیب الدولہ کا بھی یہی حال تھا۔ لیکن وہ جلد اپنی حالت پر غالب آگیا۔ اس نے کہا۔

"یہ موقع مراسم کے بجالانے کا نہیں ہے۔ ایلچی کو یہیں بلالاؤ....." پھر حاضرین سے جو اٹھنے لگے تھے کہا۔

"آپ لوگ باہر نہ جائیں، تشریف رکھیں، میں چاہتا ہوں شجاع الدولہ کا پیام آپ سب کے سامنے سنایا جائے۔"

اتنے میں ایلچی آگیا۔ اس نے کہا۔ "میں اپنے آقا، نواب شجاع الدولہ کی طرف سے آپ کی خدمت میں دوستی اور محبت کا تحفہ پیش کرنے حاضر ہوا ہوں میرے آقا نے آپ پر مرہٹوں کی یلغار اور یورش کا حال سنا، اور سنتے ہی بے تاب ہو گئے انہوں نے راستہ کی دشواریوں کا لحاظ نہ کیا، طوفان کی طرح اٹھے، اور آندھی کی طرح چل پڑے، وہ اپنی فوج گراں لے کر آپ کی مدد کو آرہے ہیں انشاء اللہ بہت جلد مرہٹوں کو معلوم ہو جائے گا کہ ان کا انجام کیا ہوتا ہے۔"

یہ سنتے ہی حاضرین پر جوش اور مسرت کی ایسی کیفیت طاری ہوئی جسے بیان نہیں کیا جا سکتا، سب نے بے ساختہ نعرہ لگایا۔

اللہ اکبر!

"شجاع الدولہ زندہ باد!"

اور خود نجیب الدولہ کی یہ کیفیت تھی کہ وہ سجدۂ شکر میں مصروف ہوگیا پھر اُس نے ایلچی سے پوچھا۔

"تمہیں کچھ فیروز بخت کی بھی خبر ہے؟"

ایلچی نے جواب دیا۔ "جی ہاں! میرے آقا کے ساتھ ہیں، اور انہی کے ہمرکاب آرہے ہیں!"

نجیب الدولہ نے شجاع الدولہ کے ایلچی کو بہت اعزاز و اکرام کے ساتھ ٹھہرایا اور رات کو پھر اپنے ندیموں اور ساتھیوں کو بغرض مشورہ طلب کیا۔

اس مجلس میں بڑی دیر تک مختلف حالات و مسائل پر بحث و تمحیص ہوتی رہی۔ آخر میں یہ طے پایا کہ شجاع الدولہ کے انتظار میں وقت نہ ضائع کیا جائے، بلکہ مرہٹوں سے اس کی آمد تک جنگ کا سلسلہ جاری رکھا جائے، اور جب شجاع الدولہ کی فوجیں آجائیں تو ہر چہار جانب سے یلغار کر کے افواج مرہٹہ کا قلع قمع کر دیا جائے!

باب (۲۸)

N(2687)
1-9-90
LIBRARY

صلح

شجاع الدولہ شوال ۱۱۷۲ھ میں لکھنؤ سے برآمد ہوئے، شاہ آباد ضلع ہردوئی میں پہنچکر چند مہینے قیام کیا، کیونکہ گنگا کی طغیانی لشکر تال پہنچنے میں مانع تھی، دتاراے سندھیا کو پتہ لگا۔ گنگا کی طغیانی میں کمی ہوئی تو اُس نے گوبند راے بندیلے کو مع بیس ہزار پیادہ و سوار کے اپنے لشکر سے الگ کرکے روانہ کیا۔ شجاع الدولہ اوائل ربیع الاول ۱۱۷۳ھ میں تیس ہزار سوار کے ساتھ شاہ آباد سے روانہ ہوئے، بڑی بڑی منزلیں طے کرکے چاند پور پہنچ گئے جس دن چاندپور سے کوچ کیا، مرہٹوں کی فوج راہ میں کم نظر آئی، پانچ کوس چل کر جلد وہ پہنچے تو معلوم ہوا کہ مرہٹوں نے اکثر مقامات پر زور باندھ رکھا ہے۔ شجاع الدولہ نے اپنی فوج میں سے انوپ گر گوشائیں کو مرہٹوں کی سرکوبی کے لئے ایک طرف بھیجا اور اپنے خالہ زاد بھائی میر نجف علی خاں کو پانچ ہزار سواروں کے ساتھ اور میر ہیموں کو چار ہزار سواروں کے ساتھ مرہٹوں کے پڑاؤ کی طرف روانہ کیا، ان سرداروں نے مرہٹوں کی خوب گوشمالی کی۔ خاص کر انوپ گر گوشائیں نے کئی سو مرہٹوں کو ہلاک اور گرفتار کیا، ان کا بہت سامان و اسباب اور بیشمار گھوڑے چھین لئے۔ مرہٹے

گوبند پنڈت کی ماتحتی میں تھے، گرتے پڑتے گنگا کو عبور کر گئے۔ اس عبور میں ان کے بہت سے آدمی ڈوب گئے اور جو گنگا میں نہ گھس سکے مارے گئے۔ یہ واقعہ ماہ نومبر ۱۷۵۹ء[1] مطابق جمادی الاوّل ۱۱۷۳ھ کا ہے۔ صبح کو ہلدوہ سے کوچ ہوا، نجیب الدولہ کے پاس (سکرتال) پہنچ گئے۔[2]

نجیب الدولہ نے شجاع الدولہ کا بڑا پرتپاک اور شاہانہ استقبال کیا، ایسی آؤ بھگت کی کہ اس کا دل بالکل صاف ہوگیا۔ راستے میں فیروز بخت نے بھی شجاع الدولہ کو ایسا شیشہ میں اتارا تھا کہ اب وہ مرہٹوں کا نام بھی سننا نہیں چاہتا تھا۔

مرہٹوں کو ہیم اور مسلسل شکستوں نے حواس باختہ کر دیا، آخر ان کی طرف سے صلح کی درخواست پیش ہوئی، اور چونکہ ہلکر (والیٔ اندور) بیچ میں پڑا تھا۔[3] اس لئے یہ درخواست منظور بھی کرلی گئی۔ کیونکہ نجیب الدولہ اور ہلکر بہر حال ایک دوسرے کا لحاظ کرتے تھے۔

صلحنامہ کے بعد مرہٹے دِلی کی طرف لوٹ گئے، شجاع الدولہ چند روز قیام کر کے اور کشتیاں کپڑوں اور جواہر کی، اور ہاتھی گھوڑے اور زر نقد لے کر لکھنئو واپس چلا گیا۔ فیروز بخت کچھ دور اس کے ساتھ گیا، پھر واپس آگیا، شجاع الدولہ نے ساتھ چلنے پر اصرار کیا اس نے کہا۔

"آپ میرے آقا ہیں، جو حکم دیں گے، میں تعمیل کروں گا، لیکن اس وقت جنگی مصالح کا اقتضا یہ ہے کہ کچھ عرصہ کے لئے مجھے واپس جانے کی اجازت دیجئے۔"

شجاع الدولہ نے کہا "جنگی مصالح تو مرہٹوں کی شکست کے بعد ختم ہوگئے؟"

فیروز بخت نے جواب دیا "بظاہر . . . . ورنہ یہ فتنہ ابھی ایک مرتبہ اور سر اٹھائیگا۔

---

[1] تاریخ اودھ جلد دوم [2] منتخب التواریخ [3] تاریخ اودھ حصہ دوم [4] پانی پت کا آخری میدان از سید جاب دہلوی [5] تاریخ اودھ حصہ دوم

جب تک اس کا سر نہ کچل دیا جائے، یہ بار بار سر اٹھاتا رہے گا۔ میں اب ایک ایسا پروگرام بنانا چاہتا ہوں کہ مرہٹہ سلطنت کا خواب ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے۔"

شجاع الدولہ ہنسنے لگا۔ تم بے وقوف ہو۔ مرہٹے اب کچھ نہیں کر سکتے۔ بہرحال اگر تم کچھ دن تک نجیب الدولہ کے پاس رہنا چاہتے ہو تو مجھے کوئی عذر نہیں لیکن تمہیں میرے پاس جلد از جلد پہنچنا چاہئے۔"

فیروز بخت نے ادب کے ساتھ گردن جھکائی اور عرض کیا۔ "ایسا ہی ہوگا۔ آپ مطمئن رہیں۔"

راستے میں جسونت نے فیروز بخت سے کہا۔ "ایک بات بہت دنوں سے میرے دل میں کھٹک رہی ہے۔"

"وہ کیا۔۔۔؟ دل کی بات زبان پر لاؤ۔"

"آپ کی جو ادا مجھے سب سے زیادہ پسند آئی تھی، وہ تھی آپ کی دلاوری بے خوفی بے باکی کسی کے سامنے، خدا کے سوا آپ کو میں نے جھکتے نہیں دیکھا۔ اس لئے میرے دل میں آپ کی محبت۔۔۔ نہیں عزت۔۔۔"

اور یہ کہتے کہتے جسونت کے خوبصورت گالوں پر سرخی دوڑ گئی۔ فیروز بخت نے ہنستے ہوئے کہا۔

"محبت کا نام لب پر آتے ہی تم عورتوں کی طرح شرما کیوں گئے؟۔۔۔ تم صرف میری عزت ہی کرتے ہو۔ محبت نہیں؟"

جسونت کا رنگ رُخ پھر بدل گیا۔ "آپ میں وہ خوبیاں ہیں کہ دشمن بھی آپ سے محبت کرنے پر مجبور رہے۔۔۔ میں ایک دشمن کی حیثیت سے ہی تو آپ کے پاس آیا تھا۔"

فیروز بخت نے بات کا پہلو بدلا "ہاں تو تم کیا کہہ رہے تھے؟"

"میں یہ کہہ رہا تھا کہ آپ شجاع الدولہ سے اِس قدر جھک کر کیوں ملتے ہیں۔ اِس سے آپ کی آن اور شان میں فرق آتا ہے، اور یہ دیکھ کر مجھے بڑی تکلیف ہوتی ہے جیسے میرے سینے پر کسی نے گھونسہ مار دیا ہو...!"

فیروز بخت نے ایک تبسّم کے ساتھ کہا "شجاع الدولہ نہیں، میں ہر ایک کے سامنے جھک سکتا ہوں لیکن اپنی ذات کے لیے نہیں، اپنی قوم کے لئے، اپنے ملک کے لئے، اپنے مذہب کے لئے!"

پھر ایک ٹھنڈی سانس لے کر اس نے کہا "جسونت...... تم نہیں جانتے، میرے دل کی کیا حالت ہے! میں خود ایک امیر گھرانے کا فرد ہوں، عنایاتِ شاہی کا ڈونگرا برس سکتا تھا مجھ پر، میں بڑے سے بڑا منصب حاصل کر سکتا تھا۔ لیکن میں نے بادشاہ کو ٹھکرا دیا میں نے وزیرِ اعظم سے لڑائی مول لی، میں نے اپنے خاندانی روایاتِ وفاداری کو توڑا اور اس غم میں میرے محبت کرنے والے باپ نے جان دی، میں نے جلاوطنی قبول کی۔ ماں کو چھوڑا، جان فدا کرنے والی بیوی کو جس کے سہاگ کو ابھی چند ہی روز ہوئے تھے، یونہی کڑھنے اور فراق کی آگ میں جلنے کو چھوڑ آیا، کیوں! کس لئے؟ اس لئے کہ میں یہ طے کر چکا ہوں کہ اپنی زندگی میں اِسلامی حکومت کا چراغ نہیں گل ہونے دوں گا۔ تم ہندو ہو، شاید تمہیں میری بات بُری لگے، لیکن اگر تم حق پسند اور انصاف دوست ہو، تو تمہیں ماننا پڑے گا، کہ اسلام نے ہندوستان کو بہت کچھ دیا ہے، ایک نئی اور اچھی تہذیب، ایک نیا اور سنہرا معاشرہ، ایک نئی اور خوب تر سوسائٹی، ایک نیا اور نیارا تمدن، ایک نیا اور انوکھا دستورِ حیات۔ اسلام نے اِس دیس میں قدم رکھنے کے بعد یہاں کی ہر چیز کو ابھارا، کھانے پینے کے

اندازکو، رہنے سہنے کے چلن کو، علم کو، صنعت و حرفت کو، فنون کو، ہر چیز کو، پر میں کیسے دیکھ لوں کہ اس کی جگہ وہ لوگ حکومت قائم کرلیں جو اپنے ہم مذہبوں کے ساتھ بھی انصاف اور رواداری نہیں کرسکتے۔ اپنے ہم مذہبوں کے ساتھ بھی ظلم کرتے ہیں ان اگر ان کاکردار اونچا ہوتا، اچھا ہوتا، ہمارے ملی کردار سے برتر ہوتا تو یقیناً میں اُن کا ساتھ دیتا اور اپنے ہم قوموں سے اُن کے لئے لڑتا لیکن یہ لوگ کیسے ہیں؟ اسے تم مجھ سے بہتر جانتے ہو؟

"ہاں خوب جانتا ہوں، اور اسی لئے انہیں چھوڑ کر ہمیشہ کے لئے آپ کے قدموں میں آرہا ہوں!"

"شجاع الدولہ کو بھی میں خوب جانتا ہوں .... اس میں ذاتی برتری کا جذبہ ہے، اس میں بہت سی خرابیاں ہیں لیکن وہ ایک ایسا اہم مہرہ ہے کہ اگر اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے تو وہ خود بھی ڈوبے گا اور ہمیں بھی لے ڈوبے گا، وہ خوشامد پسند ہے۔ اس کی خوشامد کرکے اگر میں اپنی قوم کا بگڑا ہوا کام بناتا ہوں تو برا تو نہیں کرتا!

"ہاں آپ ٹھیک کہتے ہیں!"

پھر کچھ سوچتے ہوئے، جسونت نے کہا۔ "آپ کی شادی ہوچکی ہے؟"

فیروز بخت اپنی دُھن میں مست تھا۔ اس وقت اس نے جسونت کی طرف دیکھا نہیں ورنہ وہ محسوس کرتا کہ یہ سوال کرتے وقت اس کے ہونٹ کپکپارہے تھے، اور اس کے چہرے کا رنگ اڑا ہوا تھا، فیروز بخت نے کہا۔

"ہاں ہوچکی ہے میری شادی ..... اور تمہاری؟"

یہ ایسا خلاف توقع سوال تھا کہ جسونت گھبرا گیا، کچھ جواب نہ دے سکا، فیروز بخت نے پھر اپنا سوال دوہرایا۔ "ارے بھئی، تمہاری شادی بھی ہوئی یا نہیں؟

AMINIA MUSLIM GIRLS SEC. SCHOOL ★ LIBRARY
18
A. No. ....
Date 1.9.96

سچ کہنا!"

اب جسونت کو بولنا پڑا۔ "نہیں ـــــ!"

"کیوں آخر؟ ـــــ تم کب تک یونہی بیٹھے رہوگے؟"

جسونت کے جواب کا انتظار کئے بغیر فیروز بخت نے کہا۔ "اچھا بھئی تمہاری شادی ہمارے ذمہ رہی، ہمیں دلی پہنچنے دو، تمہارے لئے ایک خوبصورت سی دلہن ـــــ بالکل تمہاری طرح ـــــ ہم ڈھونڈھیں گے۔ اس دھوم دھام سے تمہاری بارات اور دلہن کا ڈولا نکالیں گے کہ لوگ یاد کریں گے۔ ہاں ہم نے کوئی بیاہ دیکھا تھا۔"

فیروز بخت نے آنکھ اُٹھا کر جسونت کی طرف دیکھا۔ اُس کی بڑی بڑی آنکھوں میں آنسو جھلک رہے تھے۔

"ایں تم تو رونے لگے، کیا ہوا بھئی، تمہارے دل کو ٹھیس پہنچی، ان باتوں سے؟ ضرور تمہارا دل دکھا ہوا ہے؟"

پھر جیسے یکایک فیروز بخت کو کچھ یاد آگیا۔ اُس نے بے ساختہ پوچھا۔ "تم ضرور محبت کرتے ہو کسی سے؟ ـــــ کیوں کرتے ہو نا؟ ـــــ بولو، بتاؤ؟"

جسونت نے ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے فیروز بخت کو دیکھا اور خاموش رہا۔ فیروز بخت نے کہا۔

"محبت کرنا کوئی بری بات نہیں، مجھ سے کیوں چھپاتے ہو، میں تمہارا دوست ہوں۔ رفیق ہوں، ساتھی ہوں، مجھے اپنا رازدار اور غمگسار سمجھو جو خدمت بھی مجھ سے بن آئی اس سے میں دریغ نہ کروں گا۔ ہراساں نہ ہو، مایوس نہ ہو، صاف صاف بتاؤ کس سے محبت ہے تمہیں! تمہارے لئے میں سب کچھ کر سکتا ہوں جہاں بھی تمہارا محبوب ہوگا وہاں

سے اُسے لاؤں گا اور تمہارے حوالے کر دوں گا!"

جسونت کی خاموشی نے گویائی کی صورت اختیار کرلی۔

"لیکن اگر اسے مجھ سے محبت نہ ہو؟ —— تو آپ کیا کریں گے؟"

"کسے محبت نہ ہو؟ اسے جسے تم چاہتے ہو؟"

"جی ——!"

"کیا یہ ممکن ہے؟ تمہاری دلاوری، تمہارا چھیلاپن، تمہاری بہادری، تمہارا حسن، تمہارا بانکپن، ان میں سے ہر چیز ایسی ہے کہ اُسے چاہا جائے، اُس کی قدر کی جائے۔ میں اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا کہ تمہاری محبت ٹھکرائی جا سکتی ہے؟ نہیں تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے ایسا نہیں ہو سکتا... خیر تم فکر نہ کرو، اسے مجھ پر چھوڑ دو۔ میں یہ کام اگر زندہ رہوں تو انجام دے کر رہوں گا!"

"وعدہ کرتے ہیں آپ؟"

"ہاں!"

"اپنے قول پر قائم رہیں گے آپ؟"

فیروز بخت نے تیوری چڑھا کر کہا "جسونت یہ تم پوچھ رہے ہو؟ —— تم —— تم جانتے نہیں، میں جھوٹ کبھی نہیں بولتا۔ آن پر جان دے سکتا ہوں، قول مرداں جان دارد جو کہوں گا، کر کے رہوں گا.... اب تو یقین آیا تمہیں؟"

جسونت نے مسکرا کر کہا۔ "آگیا ——!"

باب (۲۹)

اچانک!

ماہ طلعت ایک ننھے سے خوبصورت بچے کی ماں تھی۔ بچہ کیا تھا ہو بہو باپ کی تصویر وہی ناک، وہی نقشہ، وہی صورت، ماہ طلعت اسے بہت چاہتی تھی۔ اب وہ تتلا تتلا کر باتیں بھی کرنے لگا تھا۔

اب ماہ طلعت تنہا نہیں تھی!

ایک خوبصورت، تنومند اور چاق و چوبند لڑکے کی ماں تھی۔ اور اس ننھے سے بچے کو وہ جان سے زیادہ عزیز رکھتی تھی۔ ننھیال میں بچہ کا نام غضنفر تجویز ہوا تھا۔ لیکن ماہ طلعت پیار سے فیروز مند کہتی تھی۔

فیروز بخت کی مسلسل جدائی نے ماہ طلعت کی صحت پر برا اثر کیا تھا۔ ادھر بہت دنوں سے فیروز بخت کا کوئی خط بھی نہیں آیا تھا۔ دل کا حال زبان پر لانا اس کی آن کے خلاف تھا گلشن اور صنوبار وغیرہ نے لاکھ لاکھ التجائیں کیں منتیں کیں۔ لیکن نہ وہ منہ سے بولی نہ سر سے کھیلی۔ ہاں بیمار پڑ گئی...... بہار ابھی تو آخر زور چلتا ہے گریبان پر!

جب سے ماہ طلعت بیمار پڑی تھی۔ اس نے خود احتیاطاً بچہ کا کمرہ بدل دیا تھا، اب

وہ ماں کی بجائے نانی کے پاس رہتا تھا۔ اس وقت کھیلتا کھیلتا وہ ماں کے کمرہ کی طرف آنکلا۔ وہ اپنے کھلنڈرے بچّہ کو دیکھ کر ضبط نہ کر سکی۔ گود میں بٹھالیا، اُس کی عمر ابھی صرف دو ڈھائی سال کی تھی، زبان صاف نہیں تھی۔ لیکن ٹوٹی پھوٹی زبان میں اپنا مطلب ادا کر لیتا تھا۔ ماہ نے کہا۔

"کیوں رے بے مروّت، کہاں غائب تھا اتنے دن سے، میں تیری صورت دیکھنے کو ترس گئی اور تو جھانکا تک نہیں۔ اینٹھوں تیرے کان؟"

ننھا سا بچّہ یہ تیکھی باتیں سُن کر گھبرا گیا، آؤ دیکھا نہ تاؤ، ماں کے پھول سے گال پر، ایک بھرپور چانٹا رسید کر دیا، پھر انجام کے نامعلوم خوف سے دہشت کھا کر زور زور سے رونے لگا۔ ماہ نے اسے کلیجہ سے لگالیا، اور خود بھی اُس کے ساتھ رونے لگی۔

اتنے میں کسی کام سے صنوبر آنکلی، اُس نے جو ماں بیٹے کو روتے دیکھا تو پوچھا۔

"کیا ہوا میری سرکار؟"

ماہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ صنوبر بولی۔ "آخر کچھ معلوم تو ہو، کیا بات ہے؟ یہ ماں بیٹے گلے مل مل کر کیوں رو رہے ہیں؟"

ماہ نے کہا: "آنسو دلیل اور منطق کے پابند نہیں ہوتے۔"

صنوبر بولی۔ "وہ مانا، لیکن کوئی وجہ بھی تو ہوگی؟"

ماہ نے بے پروائی سے کہا۔ "کوئی وجہ نہیں ——— اور اگر ہو بھی تو کیا ضروری ہے کہ بیان بھی کر دی جائے؟"

صنوبر روٹھ گئی۔ "اچھا ہوا، آج ہمیں اپنی حقیقت معلوم ہوگئی۔"

اور یہ کہتے کہتے خود صنوبر کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں، پھر اُس نے بھرّائے ہوئے لہجہ میں کہا

بکمبخت دل نہیں مانتا۔ پوچھ بیٹھتے ہیں۔ اس کا انعام یہ ملتا ہے کہ ذلیل کیے جاتے ہیں۔"

ماہ نے ابھی صنوبر کی بات کا جواب نہیں دیا تھا کہ گلشن ہانپتی ہوئی کمرہ میں داخل ہوئی۔

ماہ نے پوچھا۔ "کیا بات ہے گلشن؟"

کہنے لگی۔ "وہ آگئے ——— آگئے وہ!"

ماہ نے پھر سوال کیا۔ "کون آگیا؟ ——— کسے کہہ رہی ہے تو؟"

گلشن نے خوشی کا جھولا جھولتے ہوئے کہا۔ "اے میں قربان ——— چھوٹے سرکار اور کون؟ ——— ان کے آنے کی خبر سنتے ہی گھر پر رونق آگئی۔ کیسا جگ مگ جگ مگ کر رہا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ اُجڑے ہوئے گلشن میں پھر سے بہار آگئی۔ اللہ میاں اس جوڑی کو سلامت رکھیں۔ وہ نہیں تھے تو یہ گھر کاٹنے کو دوڑتا تھا، خدا انہیں جیتا رکھے خدا میری بیگم صاحبہ اور ننھے میاں کو سلامت رکھے۔ دیکھنا۔ میں تو کہوں گی چھوڑو یہ جہاد وہاد کا خیال، گھر بساؤ۔ بیوی بچوں میں رہو، کچھ تمہیں پر جہاد فرض نہیں کیا پاک پروردگار نے ———"

یہ باتیں سن کر ماہ کا چہرہ خوشی سے چمک اُٹھا۔ فیروز بخت کے آنے کی خبر سن کر وفورِ مسرت سے اُس کا دل بلّیوں اچھلنے لگا، وہ آئے ہیں، وہ آئیں گے، اُن سے ملوں گی۔ انہیں دیکھوں گی، اُن کی باتیں سنوں گی، اپنی باتیں کہوں گی۔ وہ شکوے کریں گے۔ میں شکایتیں کروں گی... وہ معذرت کریں گے، میں معذرت قبول کرنے سے انکار کر دوں گی، وہ وعدے کریں، میں اُن کے وعدوں کا یقین نہیں کروں گی، وہ پیار اور دلاسے کی باتیں کریں گے میں تیوریاں چڑھا لوں گی، ایک بات کا بھی جواب نہیں دوں گی۔ گلشن کے طوفانِ تکلم میں وہ یہی سوچ رہی تھی کہ اُس کے کانوں میں یہ آواز گونجی ——— "میں تو کہوں گی چھوڑو یہ جہاد وہاد کا خیال، گھر بساؤ

بیوی بچوں میں رہو، کچھ تمہیں پر جہاد فرض نہیں کیا ہے، پاک پروردگار نے ـــــــ" یہ سُنتے ہی ماہ کا چہرہ فرطِ غضب سے تمتما اُٹھا۔ اُس نے بگڑے ہوئے تیور، اور خفگی کے لہجہ میں کہا: "خاموش گلشن یہ باتیں مجھے پسند نہیں!"

وہ بے چاری سہم گئی: "کیا ہوا ـــــــ میں نے کیا کہا؟"

ماہ طلعت نے جواب دیا: "تم نے یہ کیا کہا کہ تم اُن سے جہاد کا خیال چھوڑ دینے کو کہو گی ـــــــ"

"ہاں مجھ سے یہ سُونا سُونا گھر نہیں دیکھا جاتا۔ آپ کی بیماری بھی میں نہیں دیکھ سکتی جانتی ہوں خوب جانتی ہوں یہ روگ کیوں لگا ہے؟ اس آزار نے کیوں آپ کی جان ہلکان کر رکھی ہے کچھ وہی اکیلے مسلمان نہیں ہیں سارے دیس میں، اور بھی تو بہت سے لاکھوں کروڑوں مسلمان ہیں۔ اسی ہماری دلّی میں مسلمانوں کی کمی ہے؟ عید، بقرعید کے جلوس میں مسلمان نکلتے ہیں تو ہجوم کا یہ عالم ہوتا ہے کہ تھالی پھینکو تو سر ہی سر جائے۔ کھوے سے کھوا چھلتا ہے آخر یہ سب جہاد کیوں نہیں کرتے؟ کیا یہ مسلمان نہیں ہیں؟ ـــــــ بی بی میں تو یہ دیکھتی ہوں کہ کسی کو نہ جہاد کا خیال ہے، نہ اسلام کا، سب مزے کرتے ہیں، ڈٹ کر کھاتے ہیں، پہنتے ہیں، موج اڑاتے ہیں۔ زندگی کے مزے لوٹتے ہیں۔ ان کے گھروں میں آبادی ہے، رونق ہے، گہما گہمی ہے۔ چہل پہل ہے، ہنسی کا زمزمہ اور قہقہے کا شور ہے پھر آخر ہماری حویلی نے کون سی خطا کی ہے کہ یہاں سناٹا طاری ہے۔ کیا ہم انسان نہیں ہیں؟ کیا ہمارے پہلو میں دل نہیں ہے؟ کیا ہمیں زندگی کی رونق نہیں بھاتی؟ پھر آخر کیا بات ہے کہ ہم سب سے الگ ہٹ کر چلیں؟ ـــــــ"

ماہ گلشن کی ان باتوں سے بہت متأثر ہوئی، ان کی صداقت سے نہیں خلوص سے

وہ مسکرا دی۔ اُس نے کہا۔ "تو تو پاگل ہے۔ اچھی خاصی، ان باتوں کو سمجھنا تیرے بس کا روگ نہیں ——— اچھا یہ تو بتا، آصف زماں آئے ہیں یا نہیں؟"

گلشن نے کہا: "وہ تو چھوٹے سرکار کے ساتھ سایہ کی طرح رہتے ہیں، کیسے نہ آتے آئے ہیں۔"

ماہ نے مسکراتے ہوئے کہا: "پھر تو صنوبر کو مبارک باد کیوں نہیں دیتی ؟"

صنوبر کا دل بھی اس خبر کے سنتے ہی زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔ اُس نے مسکراتے ہوئے کہا: "پہلے حضور کو تو مبارک باد مل لے، پھر مجھے بھی مل رہے گی!"

پھر وہ اُٹھ کھڑی ہوئی: "جاؤں ذرا خبر تو لوں ——— ہیں کہاں چھوٹے سرکار، یہاں یا اپنی حویلی میں؟"

گلشن نے بتایا: "نہ یہاں نہ اپنی حویلی میں، حضرت شاہ صاحب کے پاس خانقاہ میں ہیں جیسیں بدل کر آئے ہیں، سوداگر کا، ایک دن رہیں گے، پھر چلے جائیں گے!"

صنوبر نے پوچھا: "یہ تو نے کیسے جانا ؟"

وہ بولی: "اسے پوچھ لو نا جاکے، اپنے ان سے ——— بیٹھے تو ہیں بڑے اطمینان سے ڈیوڑھی میں، جب سے آئے ہیں حقہ کی نے جو منہ سے لگی ہے تو کیا مجال ہے جو ایک منٹ کو چھوڑ دیں، توبہ ہے میرا تو تمباکو کی بو سے جی متلانے لگتا ہے۔ یہ صنوبر نہ جانے کس طرح بیٹھتی ہو گی ان کے پاس!"

ماہ نے کہا۔

"ادی گلی، تو یونہی بک بک کرتی رہے گی، صنوبر غریب کو جانے بھی دے گی آصف کے پاس یا نہیں؟ وہ بے چارہ الگ شکوہ کر رہا ہو گا، انتظار میں، اور یہ الگ جل رہی ہے!"

"تو سرکار، میں کیوں روکنے لگی، جائیں دن دہاڑے باشوق سے جائیں، کس نے منع کیا ہے ان کا دیدہ تو ہمیشہ سے ہوائی ہے، کچھ نئی بات تو نہیں —— جاؤ بی صنوبر جاؤ، اپنی منزل کھوٹی نہ کرو، انہوں نے کہا بھی تھا، ذرا صنوبر کو بھیج دینا، میرے حواس کو نہ جانے کیا ہو گیا ہے۔ ذرا بھی نہ یاد رہا۔ بالکل بھول گئی!"

ماں نے صنوبر سے کہا۔

"یہاں بلوا دوں آصف کو؟"

وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"انہیں تو بس ہر وقت چھیڑ خانیاں ہی سوجھا کرتی ہیں اللہ جانے!"

اور پھر وہ مسکراتی ہوئی، ڈیوڑھی کی طرف چلی گئی، جہاں آصف زماں اُس کا انتظار کر رہا تھا ——!"

باب (۳۰)

بچھڑے ملتے ہیں بعد مدت کے!

رات کے بارہ بج چکے تھے، سارے شہر پر سناٹا چھایا ہوا تھا۔ ہر شخص خواب راحت میں مست تھا، لیکن ماہ اپنے کمرے میں جاگ رہی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں نیند کا کہیں پتہ نہیں تھا، وہ بے تابی کے ساتھ کروٹیں بدل رہی تھی، اُسے فیروز بخت کا انتظار تھا۔ وہ ڈر رہی تھی کہیں خانقاہ ولی اللّٰہی سے یہاں آتے آتے اُسے کوئی حادثہ نہ پیش آگیا ہو؛ کہیں غازی الدین کے کارندوں اور جاسوسوں نے اس کی ٹوہ نہ لگائی ہو۔ کہیں وہ گرفتار۔ نہ ہو گیا ہو؛ یہ سوچتے سوچتے اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا، اتنے میں آہٹ سی محسوس ہوئی دروازہ کھل گیا۔

فیروز بخت سامنے کھڑا تھا!

ماہ نے فیروز بخت کو دیکھا، سکتے میں رہ گئی، نہ کچھ بول سکی، نہ کہہ سکی، نہ اس کی پذیرائی کے لئے اٹھ سکی، صرف ٹکٹکی لگائے اُسے دیکھتی رہی۔

فیروز بخت آگے بڑھا! —— وہ اس کی چارپائی کے پاس پہنچ گیا!

ماہ اسے اپنے قریب آتا دیکھ کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کے پاؤں لرز رہے تھے!

فیروز بخت نے پاس پہنچ کر اس کی پیشانی کو چوما۔ سر پہ ہاتھ رکھا، پھر اپنے ہاتھ سے اس کی ٹھوڑی اُوپر اُٹھائی، محبت بھری نظر اس کے چہرے پر ڈالی، اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

"ماہ —— میں تمہیں کس حال میں دیکھ رہا ہوں؟ تم کیا بیمار ہو؟ اتنی کمزور اتنی زرد، جیسے تمہارا خون کسی نے سونت لیا ہو! —— بیٹھو!"

دونوں ایک ہی چارپائی پر بیٹھ گئے۔ فیروز بخت نے پھر پوچھا۔ "ماہ بولو، تم کب بیمار ہو؟"

وہ مسکراتی ہوئی بولی: "کچھ بھی نہیں، اچھی خاصی تو ہوں، نہ جانے آپ سے کس نے کہہ دیا میں بیمار ہوں!"

"صنوبر نے جب تمہاری بیماری کا ذکر کیا، تو میں نے یقین نہیں کیا تھا۔ میں سمجھا یونہی کچھ نزلہ زکام ہو گیا ہوگا۔ لیکن اپنی آنکھوں کو کس طرح جھٹلاؤں؟ میں دیکھ رہا ہوں یہ پھول سا چہرہ کس طرح کمہلا گیا ہے۔ یہ بڑی بڑی آنکھیں کس طرح گڑھوں میں دھنس گئی ہیں آخر تمہیں کیا ہو گیا ہے ماہ؟ خدارا بتاؤ۔ میں سخت پریشان ہوں!"

وہ بولی: "آپ خواہ مخواہ کی فکر نہ کیجئے، اچھی ہوں، حکیم صاحب کا نسخہ پی رہی ہوں۔ چند روز میں طبیعت بالکل صاف ہو جائے گی، اب آپ آ گئے ہیں۔ انشاءاللہ جلد سنبھل جاؤں گی۔ ہاں آپ اپنی کہئے؟"

آہ سرد بھر کر فیروز نے کہا: "اپنی کیا کہوں، ایک دُھن ہے، جس میں لگا ہوا ہوں۔ ایک مقصد ہے جس کی کامیابی کے لئے جان کی بازی لگا چکا ہوں۔ دعا کرو خدا مجھے اب

"دل سے دعا کرتی ہوں، ہر نماز کے بعد خدا سے بھی ایک التجا ہوتی ہے میری کہ آپ اپنے مقصد بلند میں کامیاب ہوں۔ لیکن معلوم یہ کرنا ہے کہ اب منزلِ مقصود کتنی دُور ہے؟"

فیروز بخت نے کہا: "یہ ساری داستان تمہیں سناؤں گا، لیکن ابھی نہیں، آج کی رات صرف ہماری تمہاری باتیں ہوں گی۔ کتنے دنوں کے بعد تمہیں دیکھا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے، ایک عمر بیت گئی، تمہیں دیکھا ہوں اور دل ہی دل میں کہتا ہوں —— اللہ یہ وہی ہیں جن کو ترس گیا ہوں؟ —— ہاں واقعی تمہیں دیکھنے کو، تمہاری میٹھی اور دلنشین باتیں سننے کو ترس گیا تھا۔ دن کے ہنگاموں میں، رات کے سناٹے میں نجیب الدولہ کی مجلسِ مشورت میں شجاع الدولہ کے دربارِ خاص میں اپنے فرائض پوری مستعدی سے ادا کرتا تھا۔ لیکن خدا جانتا ہے کوئی گھڑی ایسی نہ گذری جب تم یاد نہ آتی ہو۔ زندگی کا کوئی لمحہ ایسا نہیں گذرا جب تمہارا تصور دل اور آنکھوں میں نہ بسا رہتا ہو۔ سوتے میں جاگتے میں، ہر وقت، ہر آن تمہاری یاد میری رفیق اور دمساز تھی۔ دل ہی دل میں تم سے ملا کرتا تھا۔ باتیں کیا کرتا تھا، اپنی کہتا تھا، تمہاری سنتا تھا۔ اسی طرح نامراد دل کو تسلی دیا کرتا تھا۔ اب اتنے دنوں کی جدائی کے بعد تمہیں پایا ہے، تمہارے پاس بیٹھا ہوں، دل کی جو حالت ہو رہی ہے اُسے الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا۔ مجھے اپنی خوش قسمتی پر ناز ہے —— ماہ پیکر کہنا کیا تم بھی اسی طرح بیتابی اور اضطراب کے ساتھ مجھے یاد کیا کرتی تھیں؟"

وہ بولی: "آپ کا دل کیا کہتا ہے؟"

"میرا دل وہی کہتا ہے جو تم کہو گی۔"

"وہ سچا ہے، وہ سچ کہتا ہے!"

"لیکن یہ دل میرا کب ہے؟ یہ تو کب کا تمہارا ہو چکا، اس کا تو یہ حال ہے کہ ہمیشہ ——

اپنی شکست تیری ظفر چاہتا رہا ——— لٰہذا اس کی باتوں کا اعتبار کیسے کروں؟"

مسکرا کر ماہ طلعت نے کہا۔ "نہ کیجئے!"

فیروز بخت نے جواب دیا: "پھر جو تسلی کا ایک ذریعہ رہ گیا ہے وہ بھی ہاتھ سے جاتا رہے گا!"

ماہ نے کہا۔ "تو پھر اس کی مانئے!"

اتنے میں صنوبر گود میں لئے ہوئے غضنفر کو لائی، اور ان دونوں کے بیچ میں لٹا دیا، اور خود اُلٹے پاؤں واپس چلی گئی، بچہ گہری نیند سو رہا تھا۔ اس نے کروٹ بدلی، ماں کے زانو پر ہاتھ رکھا، اور پھر خراٹے لینے لگا۔ فیروز بخت نے ایک محبت بھری نظر بچہ پر ڈالی اور کہا۔

"آپ کون ذات شریف ہیں؟ آپ کی تعریف؟ آپ کا اسم گرامی؟"

ماہ نے مسکرا کر کہا: "صنوبر سے پوچھئے، نہ جانے کہاں سے اُٹھا لائی!"

فیروز بخت نے ایک قہقہہ لگایا: "صنوبر سے کیوں، اسی سے کیوں نہ پوچھیں!"

یہ کہہ کر فیروز نے بچہ کو گود میں لے لیا اور پیار کرنے لگا۔ ماہ نے کہا: "ان صاحبزادے کی زیادہ قدر افزائی نہ کیجئے، اگر کہیں خواب ناز سے بیدار ہو گئے تو وہ نغمہ سرائی فرمائیں گے کہ سارا گھر جاگ پڑے گا، بظاہر جتنے معصوم نظر آتے ہیں حقیقتاً اُتنے ہی شیطان ہیں، اور صرف یہی نہیں ہٹ چھٹ بھی ہیں، جس سے خفا ہوتے ہیں، بغیر اعلانِ جنگ کے دفعتاً اس کے گال پر ایسا کس کے چانٹا لگاتے ہیں کہ وہ بلبلا جاتا ہے بے چارہ!"

لیکن فیروز بخت نے ایک نہ سُنی، وہ اپنے بچہ کو کلیجے سے لگائے پیار کرتا اور اُس کے موٹے موٹے گال پکڑ پکڑ کر کھینچتا رہا۔ بچہ نے انگڑائی لی اور کسمسایا، ماہ نے کہا: "پھر کہے

دیتی ہوں۔ اب بھی باز آجائیے۔ اِس چھوٹے سے فتنے کو سونے دیجئے۔ اس وقت جاگ گیا تو رات بھر بین بجاتا رہے گا۔"

فیروز بخت نے کہا۔ "کچھ بھی ہو۔ میں اسے جگا کر رہوں گا۔ صبح ہوتے ہوتے چلا جاؤں گا۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ ولی عہد بہادر سے شرفِ نیاز نہ حاصل کروں اور چلا جاؤں!"

مچلے ہوئے اضطرابِ قلب کو دباتے ہوئے ماہ طلعت نے پوچھا۔ "کیا واقعی کل آپ واپس چلے جائیں گے؟"

وہ بولا۔ "ہاں آیا اسی نیّت سے تھا، لیکن تمہاری علالت دیکھ کر ارادہ بدل دیا ہے۔ اب آٹھ دس دن کے بعد واپس جاؤں گا۔ دن بھر خانقاہ میں رہا کروں گا، رات کو چوروں کی طرح آجایا کروں گا!"

ماہ نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔ "یہ بھی قسمت کی خوبی ہے، اپنے وطن میں، اپنے شہر میں، اپنے گھر میں آنا بھی ہوا تو چوروں کی طرح، جو لٹیرے اور غاصب ہیں وہ وزارت کر رہے ہیں حکومت کر رہے ہیں، بادشاہت کرتے ہیں، دندناتے پھر رہے ہیں ظلم و جور سے خلق خدا کو پریشان کر رہے ہیں، کوئی نہیں ہے، جو ان کا ہاتھ پکڑے، انہیں راہِ راست پر لائے!"

فیروز بخت نے کہا۔ "ہاں ماہ، تم سچ کہتی ہو، بالکل سچ کہتی ہو، آج ہم بے بس ہیں، اور وہ طاقتور ہیں، لیکن یہ بات ہمیشہ نہیں رہے گی۔ زمانہ کروٹ لے گا۔ حالات بدلیں گے، یاد رکھو —— ظلم کی ٹہنی کبھی پھلتی نہیں —— آج میں اور میرے جیسے دوسرے لوگ، اس حکومت کی نظر میں غدار اور باغی ہیں، لیکن وہ وقت بھی آئے گا، جب حکومت کی باگ ہمارے ہاتھ میں ہوگی اور غدار اور باغی کی حیثیت سے ہمارے سامنے پیش ہوں گے

اور اپنے کیفرِ کردار کو پہنچیں گے؟

"خدا وہ مبارک دن جلد لائے!"

"تم خدا کو مشورہ نہ دو ——— لیکن میں اس کی طرف سے تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ وہ دن ضرور آئے گا، اور جلد آئے گا، یہ حکومت بدلے گی، سفاکوں اور ظالموں کو ان کے کئے کی سزا ملے گی۔ یہ لوگ چند ٹکوں کی خاطر مسلم اقتدار اور بالادستی کو فروخت کر دینا چاہتے ہیں لیکن اس سودے میں یہ کامیاب نہیں ہوں گے؟

یہ کمینے انہیں اس سودے بازی میں کامیاب نہیں ہونے دیا جائے گا۔ انہوں نے دولت کے جو انبار غریبوں اور ناداروں سے چھین چھین کر، لوٹ لوٹ کر جمع کئے ہیں۔ وہ ان کے ہاتھوں سے چھین لئے جائیں گے اور پھر انہیں لوٹا دیئے جائیں گے جن سے چھینے گئے تھے!"

"ہاں انشاء اللہ یہی ہوگا!"

"آپ تو اتنے دن دلی سے باہر رہے، آپ صحیح اندازہ نہیں کر سکتے یہاں کے مسلمانوں کی حوصلہ شکنی کس کس طرح کی جاتی ہے؟ ان کے قومی شعور اور دینی ولولوں کو کس کس طرح دبایا جاتا ہے، ان کے جہاد اور سرفروشی کے جذبہ کو کس کس طرح کچلا جاتا ہے۔ میں گھر کی چار دیواری میں بیٹھی یہ سب تماشے دیکھتی رہتی ہوں، یہ ساری داستانیں سنتی رہتی ہوں۔ میں نے سوچا تھا" ———

بڑی محبت سے فیروز بخت نے پوچھا۔ "کیا سوچا تھا ہماری مادمنے؟"

"میں نے سوچا تھا، اب جب آپ آئیں گے تو میں بھی مردانہ لباس پہن کر آپ کے ساتھ چلوں گی اور جو ثواب آپ لوٹ رہے ہیں۔ اس میں اپنا حصہ لگاؤں گی لیکن ———

"لیکن کیا؟ کہو کہو!"

"لیکن آپ اس وقت آئے، جب میں بسترِ علالت پر دراز ہوں، کاش آپ کچھ دن بعد آتے جب میں اچھی ہو چکتی۔"

"تم تندرست ہونے کی کوشش کرو۔ فکر و غم پریشانی کو اپنی مملکت سے خارج کردو میں وعدہ کرتا ہوں، پھر آؤں گا، ضرور آؤں گا!"

یہ سن کر ماہ خاموش ہوگئی۔ "سچ؟ واقعی آئیں گے آپ؟"

وہ بولا۔ "ہاں ضرور آؤں گا!"

"اور مجھے اپنے ساتھ بھی لے چلیں گے؟"

"اگر تم اصرار کروگی تو یہ بات بھی مان لوں گا، چلنا میرے ساتھ!"

وہ آنکھوں میں آنسو بھر کر بولی۔ "یہ جدائی کے دن کاٹے نہیں کٹتے، میری بیماری کا اصل سبب صرف یہ ہے کہ آپ میری آنکھوں سے میری پہنچ سے دور ہیں، آپ میرے پاس ہوتے تو ہرگز بیمار نہ پڑتی، آپ کے پاس رہوں گی تو کبھی بیمار نہیں پڑوں گی!"

بڑے پیار سے فیروز بخت نے پوچھا۔ "وعدہ کرتی ہو؟"

"ہاں وعدہ کرتی ہوں!"

"اچھی بات تم تندرست ہوجاؤ تو میں تمہیں اپنے ساتھ رکھوں گا، جہاں جاؤں گا تم میرے ساتھ ہوگی، مردانہ لباس میں، ایک بانکے اور سجیلے سپاہی کے روپ میں!"

یہ سن کر ماہ کے پژمردہ چہرے پر رونق آگئی، اور فیروز بخت پھر بچہ کی طرف مخاطب ہو گیا۔ اس کی گدگدی سے وہ جاگ پڑا۔ ماہ نے کہا۔ "لو قیامت آگئی، یہ جاگ پڑا۔"

لیکن بچہ رویا نہیں، حیرت سے اپنے باپ کو دیکھنے لگا۔

شاید وہ سوچ رہا تھا، یہ کون اجنبی ہے، جو مجھے اپنی گود میں لئے بیٹھے ہے، جو مجھے پیار کر رہا ہے، گدگدا رہا ہے، محبت سے میرے سر پر ہاتھ پھیر رہا ہے۔

ماہ نے غضنفر سے مخاطب ہو کر پوچھا۔ "بیٹے یہ کون ہیں؟"

فیروز نے بھی اس سے سوال کیا۔ "مجھے پہچانتے ہو، میاں صاحبزادے؟"

وہ مسکرانے لگا!

فیروز نے کہا۔ "ہمارے سوال کا جواب یہ تبسم!"

ماہ بولی۔ "اپنی خوش قسمتی پر ناز کیجئے کہ ولی عہد بہادر نے آپ کو شرفِ تبسم سے سرفراز فرمایا، ورنہ اُن کی بارگاہِ معلّیٰ سے اکثر و بیشتر ہم نیازمندوں کو جو شرف عطا ہوتا رہتا ہے، وہ گریۂ مسلسل کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔"

بچہ بدستور مسکرا رہا تھا۔

فیروز نے کہا: "لیکن اِس شرف سے محروم رہنا میں بدقسمتی سمجھتا ہوں۔"

یہ کہہ کر اُس نے ذرا زور سے گال پکڑ کر کھینچا، بچہ نے رونے کے لئے اپنے ہونٹوں کو جنبش دی، لیکن ماہ نے جلدی سے اسے اپنی گود میں لے کر پیار کرنا شروع کر دیا اور شکایت کے لہجہ میں فیروز سے کہا۔ "واہ!"

ماہ کی گود میں آ کر وہ چپ ہو گیا، لیکن حیرت سے اپنے باپ کو دیکھے جا رہا تھا، کہ یہ کون بدتمیز اور گستاخ شخص ہے، جس نے پہلے تو خوب سا پیار کیا اور پھر میرے پھول سے گالوں کو کھینچنا شروع کر دیا۔ فیروز بخت نے اسے اپنی طرف متوجہ دیکھ کر گود میں لینے کے لئے ہاتھ بڑھائے۔ لیکن یہ بے تکلفی اُسے پسند نہ آئی۔ اُس نے حقارت کے ساتھ منہ پھیر لیا، اور ماں کے کاندھے پر اپنی گردن رکھ دی، ماہ نے کہا۔

"دیکھ لیا آپ نے، خفا ہو گیا آپ سے!"

فیروز بخت نے پوچھا "لیکن اب نہیں منایا کس طرح جائے؟"

وہ بولی: "یہ دلی عہد بہادر کی خاص ادا ہے کہ ایک ہی مجلس میں خفا ہونے کے بعد نہیں سنتے، اب آپ کو کامل ۲۴ گھنٹے انتظار کرنا پڑے گا، تب جا کر کہیں مزاج راہ پر آئے

اتنے میں کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا، ماہ نے کہا، "کون صنوبر؟ —— آؤ آجاؤ!"

دروازہ بھڑا ہوا تھا، اُسے کھول کر صنوبر اندر آگئی فیروز بخت نے کہا: "میں سمجھ گیا... آصف زماں نے بھیجا ہوگا، آن کی آن میں رات گذر گئی، صبح کا سفیدہ ظاہر ہو رہا ہے..... اچھا، رخصت! انشاء اللہ کل رات کو پھر ملاقات ہوگی۔ لیکن دیکھو اس بارہ گھنٹے میں تندرستی کی طرف تمہارے کم از کم بارہ قدم ضرور اُٹھیں!"

پھر اُس نے غضنفر کو پیار کیا اور رخصت ہو گیا۔ ماہ چپ چاپ بڑی دیر تک اُس راستہ کو دیکھا کی، جدھر سے فیروز آیا تھا، اور جس پر سے وہ واپس چلا گیا تھا!

باب (۳۱)

داستانِ شب

فیروز بخت ایک دن کے لئے دلّی آیا تھا، لیکن ماہ طلعت کی بیماری دیکھ کر اپنے قیام کی مدّت بڑھاتا گیا۔ یہاں تک کہ ایک مہینہ گذر گیا۔ وہ چاہتا تھا، ماہ کو توانا و تندرست حالت میں چھوڑ کر واپس جائے۔ اب اس کا یہ مقصد قریب قریب پورا ہو گیا۔ فیروز کے زمانۂ قیام میں ماہ کی حالت بہت سدھر گئی، چہرے پر سُرخی بھی آگئی، بھوک بھی کھل گئی، کمزوری بھی بڑی حد تک دُور ہو گئی۔ اس دو ڈھائی سال کی مدّت میں ماہ کو ہنستے کسی نے نہیں دیکھا تھا لیکن جب سے فیروز آیا تھا، اُس کی باچھیں کھلی جا رہی تھیں۔ بے بات کی بات پر بھی وہ ہنس دیتی تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا، خوشی اور مسرّت کے گہوارے میں وہ جھول رہی ہے!

فیروز نے بھی اس کی دلدہی میں کوئی کسر نہ اُٹھا رکھی تھی۔ دن کا سارا وقت تو وہ خانقاہ ولی اللّٰہی میں گذارتا تھا، اور عصر کی نماز پڑھ کر وہ اپنے گھر آ جاتا تھا، پھر وہ تھا اور ماہ طلعت اور وہ ننھا سا بچہ غضنفر ـــــ غضنفر اب اس سے بہت مانوس ہو گیا تھا، جیسے ہی باپ کو دیکھتا، ہمک کر اُس کی گود میں جا بیٹھتا، ماہ طلعت کہتی، "یہ آپ سے بہت ہل گیا ہے!"

وہ جواب دیتا۔ "ہاں لیکن بڑی ریاضت کے بعد!"

اور پھر وُہ اُسے پیار کرنے لگتا۔

ماہِ طلعت کہتی۔ "آپ کے جانے کا اس ننھے سے دل کو بہت صدمہ ہوگا۔"

اور فیروز جواب دیتا۔ "جی نہیں ——— اس کا دل بے شک ننھا سا ہے لیکن بہت مضبوط اور توانا ——— وہ جانتا ہے اس کا باپ کس کام پر جا رہا ہے، وہ یہ بھی جانتا ہے کہ خود وہ جب بڑا ہو گا تو اپنے فرائض کس طرح ادا کرے گا، وہ مسلمان باپ اور مسلمان ماں، بہادر باپ، اور بہادر ماں کا بیٹا ہے، وہ بُزدل نہیں ہو سکتا، وہ مسکراتا ہوا مجھے رخصت کرے گا، اور جب میں ایک فاتح کی حیثیت سے دِلّی واپس آؤں گا، تو مسکراتا ہوا اس گھر کی دہلیز پر میرا انتظار کرے گا۔ اس کا نام ہے غضنفر، جانتی ہو غضنفر کسے کہتے ہیں؟ شیر کو! یہ میرا شیر ابھی چھوٹا سا ہے، لیکن بڑا ہو کر جب یہ شیرِ ببر بنے گا۔ تب لوگ اس کے کارناموں سے دہلیں گے، اس کے نام کی دھاک بیٹھ جائے گی، وطن کے دشمنوں اور اسلام کے غداروں پر ———"

شاید فیروز بخت ابھی کچھ اور کہتا، لیکن ماہِ طلعت نے اُس کی بات کاٹتے ہُوئے کہا: "بس کیجئے، اب کہاں تک تعریف کیجئے گا۔ اس شیرِ ببر کی؟"

"کیوں غلط کہتا ہوں کچھ؟"

"یہ تو میں نہیں کہتی، لیکن ایک بات ضرور ہے!"

"وہ کیا؟"

"اپنے دہی کو کون کھٹا کہتا ہے ———!"

یہ کہہ کر وہ ہنس پڑی، اُسے ہنستا دیکھ کر، فیروز بخت بھی ہنسنے لگا، "اب غضنفر صاحب

کیوں کسی سے پیچھے رہتے، انہوں نے بھی ہنسنا اور کلکاریاں بھرنا شروع کر دیا۔ ماہ نے پوچھا: "کب واپس جا رہے ہیں آپ؟ ——— صنوبر کہہ رہی تھی، آج ہی کل میں جانے والے ہیں آپ؟"

فیروز بخت نے ہنستے ہوئے کہا: "یہ آصف زماں بھی عجیب چیز ہے۔ رتی رتی کی خبر دیتا ہے، اپنی بیوی کو!"

ماہ بولی: "اور کیا آپ کی طرح تھوڑے ہیں کہ کچھ بتاتے ہی نہیں!"

فیروز بخت نے کہا: "ماہ میری وہ کون سی بات ہے جو تم سے چھپی ہوئی ہے تم میری زندگی بن چکی ہو، تم سے بھلا کون سی بات چھپاؤں گا؟ خود سوچو کیسے ممکن ہے یہ!"

ماہ نے ایک ادائے دلبری کے ساتھ کہا: "اسی لئے تو رخصت ہونے کی خبر کا ذکر تک نہیں کیا، جیسے میں آپ کو روک ہی تو لیتی، اور آپ میرے روکے رک ہی تو جاتے!"

فیروز بخت۔ "یہ نہ کہو، تم اپنی قدر و قیمت سے ناواقف ہو، تم کہہ کے دیکھو، حکم دے کے دیکھو، پھر دیکھو، میں دل و جان سے تعمیل کرتا ہوں یا نہیں؟"

ماہ طلعت۔ "سب معلوم ہے، زیادہ باتیں نہ بنائیے، اچھا اگر آپ بڑے سچے ہیں تو میں کہتی ہوں، رک جائیے، ابھی چند روز اور نہ جائیے، زیادہ نہیں بس ایک ہفتہ، اس کے بعد شوق سے چلے جائیے گا۔ پھر میں ہرگز نہیں روکوں گی، بتائیے کیا فیصلہ کیا آپ نے؟"

فیروز بخت۔ "میں صرف ایک دن کے لئے آیا تھا، تمہیں بیمار دیکھ کر خود میرے قدموں نے اٹھنے سے انکار کر دیا۔ ایک دن کے بجائے ایک مہینہ رہ گیا اور ابھی

مجھ پر حضرت شاہ صاحب نے اور نجیب الدولہ نے عائد کئے ہیں، وہ بڑے نازک ہیں۔ میرے سوا انہیں کوئی اور انجام نہیں دے سکتا۔ مجھے جلد از جلد نجیب الدولہ کے پاس پہنچنا ہے، اور وہاں سے پھر ایک بہت بڑے سفر پر ایک غیر ملک میں جانا ہے، اور یہ کارِ اہم جس قدر جلد ممکن ہو سکے انجام دینا ہے۔ لیکن تمہارا کہنا بھی میں نہیں ٹال سکتا، بہتر ہے ایک ہفتہ اور ٹھہر جاؤں گا۔ لیکن ایک شرط ہے!

ماہ طلعت۔ بتلائیے وہ شرط کیا ہے!

فیروز بخت۔ جاتے ہوئے تمہارا مسکراتا ہوا چہرہ میرے سامنے آنا چاہیئے، اور میرے رخصت ہونے کے بعد بھی یہ مسکراہٹ قائم رہنی چاہیئے"۔

بڑی آمادگی کے ساتھ ماہ طلعت نے کہا۔ "آپ کی یہ شرط میں منظور کرتی ہوں!"

فیروز بخت نے جواب دیا: "تو حضور کا حکم سر آنکھوں پر ——— لیکن ایک بات تو بتاؤ ؟"

"فرمائیے !"

"ایک ہفتہ اور روک لینے سے تمہیں کیا مل جائے گا؟"

"بہت کچھ، اتنا کچھ کہ الفاظ میرا ساتھ نہیں دیتے کہ اسے بیان کر سکوں!"

بڑے محبت بھرے لہجہ میں فیروز نے کہا، ماہ تم مجھے اتنا زیادہ کیوں چاہتی ہو؟ میں ایک مسافر ہوں، آج یہاں، کل وہاں، میری حیثیت اس قیدی کی ہے جسے پھانسی کا حکم مل چکا ہو اور نہ جانے کس دن اسے سولی پر لٹکا دیا جائے، اپنا سر ہتھیلی پر رکھ کر گھومتا ہوں، اس سر کے بہت سے گاہک ہیں، مرہٹے چاہتے ہیں کہ وہ کاٹ لیں، غازی الدین کی تمنا ہے کہ اس کے حضور میں یہ کٹا ہوا سر تحفہ کے طور پر پیش کیا جائے۔ وطن کے اور بہت سے غدار ہیں جن

کے دن کا چین اور رات کی نیند اس لئے حرام ہے کہ یہ سر انہیں نہیں ملا کر جلد از جلد اسے کاٹ کر وہ انعام سے اپنی جھولیاں بھرلیں' اور پھر ایک اور جگہ بھی ہے جہاں اس سر کی ضرورت ہے، وہ ہے میدانِ جنگ۔ میں بیمار ہو کر مرنا پسند نہیں کرتا میری دلی تمنّا ہے کہ میدانِ جنگ میں مجھے شہادت کا فخر حاصل ہو —————— ہیں تم رونے لگیں، دیکھو ماہ معاہدے کی خلاف ورزی نہ کرو، تم مجھ سے یہ وعدہ کر چکی ہو کہ میرے سامنے ہمیشہ مسکراؤ گی، ہنسو گی۔ میں تمہیں روتا نہیں دیکھ سکتا، تمہاری آنکھ سے آنسو کا ہر وہ قطرہ جو ٹپکتا ہے میرے دل پر تیر کی طرح جا کر لگتا ہے۔ میں دُنیا کی ہر مصیبت تمہیں خوش دیکھنے کے لئے نہیں خوش دیکھنے کے لئے برداشت کر سکتا ہوں۔ خدا کے لئے اپنے آنسو پونچھ ڈالو!"

ماہ طلعت نے فیروز کی ان باتوں کا ابھی کوئی جواب نہیں دیا تھا کہ ماں کو روتا دیکھ کر دفعتہً غضنفر نے اٹک اٹک کر رونا شروع کر دیا، فیروز نے لاکھ لاکھ اسے بھینچا، پیار کیا، بہلایا، گود میں سنبھالنے کی کوشش کی۔ لیکن وہ اس طرح مچلا کہ کسی طرح بھی چپ نہیں ہوا۔ آخر ماہ طلعت نے اُسے گود میں لیا، پیار کیا، تب جا کے اُس کے آنسو تھمے۔ فیروز بخت نے غضنفر کے چُپ ہونے کے بعد کہا۔

"میں تو اپنے ہی آپ کو سمجھ رہا تھا۔ لیکن یہ تو مجھ سے بھی دو قدم آگے ہے۔"

"کس چیز میں ؟"

"محبت میں، نہیں چاہتے ہیں، یہ تو میرا رقیب بنتا چلا جا رہا ہے۔ —— کیسا رہے —— ؟"

ماہ طلعت کے نرم و نازک ہونٹوں پر پھر تبسّم کھیلنے لگا۔ اس نے کہا۔ "توبہ کیجئے

آپ بھی کیسی باتیں کرتے ہیں!"

رات بھر بیت گئی!

صنوبر نے حسبِ معمول دروازے پر دستک دی۔ ماہ طلعت نے اُسے اندر بُلایا

فیروز بخت اُسے دیکھ کر اُٹھ کھڑا ہُوا۔

"آگئیں تم، کباب میں ہڈی بن کر ——— اچھا بھئی چلو چلتے ہیں!"

وہ بولی: "اے خدانہ کرے میں کیوں بنتی کباب میں ہڈی؟ میں تو دِل سے چاہتی ہوں آپ یہیں رہیں، اُس دن میں نے ان سے (ماہ کی طرف اشارہ کرکے) ابھی یہی کہا تھا لیکن یہ تو خفا ہوگئیں کہنے لگیں تو بے وقوف ہے، مجھے کیا معلوم وہ کتنا بڑا کام کررہے ہیں۔ ایسی باتیں نہ کیا کر؛ میں چُپ ہو رہی۔"

فیروز نے مُحبّت بھری نظروں سے ماہ طلعت کو دیکھا اور مسکراتا ہُوا چلا گیا۔

باب (۳۲)

فیروز بخت اور ماہ طلعت آمنے سامنے بیٹھے ہیں، دونوں میں گھل مل کر باتیں ہو رہی ہیں بغضنفر بے خبری کی نیند سو رہا ہے۔ سوتے میں کبھی کبھی مسکرا دیتا ہے شاید کوئی سہانا خواب دیکھ رہا ہے۔ اتنے میں گھڑی نے ٹن سے دو بجائے .... فیروز بخت چونک پڑا۔ اُس نے کہا۔ "دو بج گئے، تھوڑی دیر میں چار بج جائیں گے اور اس کے بعد پھر ایک لامعلوم مدت کے لئے میں تم سے جدا ہو جاؤں گا۔"

افسردہ لہجہ میں ماہ طلعت نے کہا۔ "معلوم ہے لیکن یہ خوش خبری بار بار آپ کیوں سُنا رہے ہیں؟ —— یہ بھی اچھی ستم ظریفی ہے —— دہی نہ جو کبھی کہ ہے وہی لے تو اب اُٹھا۔"

ایک ٹھنڈی سانس بھر کر فیروز بخت نے ماہ طلعت کی طرف دیکھا اور گویا ہوا۔

"ایسی باتیں نہ کرو، ایسا معلوم ہوتا ہے اتم میرے جانے سے خوش نہیں ہو!"

وہ بولی۔ "آپ غلط سمجھے، بات صرف اتنی ہے کہ میں غم کا استقبال کرنا نہیں چاہتی جب وہ آ جائے گا اسے بھگت لینے کے لئے آمادہ رہوں گی، جب تک آپ میری

نگھوں کے سامنے ہیں، جس یہ سوچنا ہی نہیں چاہتی کہ آپ سب چلے جائیں گے۔ میرے اور آپ کے درمیان جُدائی کا پردہ حائل ہو جائے گا۔ ان باتوں کے سوچنے کے لئے بہت وقت پڑا ہے۔ ابھی کیوں سوچوں؟ جب آپ چلے جائیں، تب کیوں نہ سوچوں؟ آپ بار بار اپنے جانے کا ذکر کر کے میری خوشی چھین لیتے ہیں۔ ایسا نہ کیجئے، ابھی آپ کے رخصت ہونے میں دو گھنٹے باقی ہیں۔ آپ کو یہ مدّت تھوڑی معلوم ہوتی ہو گی لیکن میں اسے اس طرح گزارنا چاہتی ہوں، جیسے کوئی دو برس گزارتا ہے۔"

"ٹھیک کہتی ہو، میں نے اپنی غلطی محسوس کر لی، اب یہ ذکر میری زبان پر نہیں آئے گا!"

"آپ نے مجھ سے کچھ وعدے کئے ہیں، اُنہیں یاد رکھئے گا!"

"ضرور یاد رکھوں گا۔ لیکن تم کن وعدوں کی طرف اشارہ کر رہی ہو؟"

"پھر واپس آنے کا وعدہ، مجھے اپنے ساتھ لے جانے کا وعدہ، کہئے یاد آیا کچھ؟"

"ہاں یاد آ گیا، لیکن تم بھی اپنے وعدوں کو یاد رکھنا۔"

ماہ طلعت نے مسکرا کر کہا۔ "میں سمجھ گئی، آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟"

"تمہاری ذہانت کا تو میں ہمیشہ سے قائل ہوں، لیکن اس مرتبہ امتحان لیے بغیر نہیں رہوں گا، بتاؤ کیا سمجھیں تم؟"

"یہی کہ جب آپ جائیں تو مسکراتی ہوئی آپ کو رخصت کر دوں؟"

"شاباش —— اور؟"

"اور؟ —— اور یہ کہ آپ کے جانے کے بعد بھی خوش و خرم رہوں!"

"بہت ٹھیک —— اور؟"

"بس اور کچھ نہیں۔"

"دیکھو تم پاس ہوتے ہوئے بھی فیل ہوئی جا رہی ہو۔ دماغ پر زور ڈالو اور سوچو!"

"ہاں ——— یہ کہ میں تندرست رہوں، بیمار نہ پڑوں!"

پھر ماہ طلعت نے پوچھا: "کیا آصف زماں کو آپ یہاں چھوڑے جا رہے ہیں؟ صنوبر کہہ رہی تھی۔"

"ہاں ٹھیک کہہ رہی تھی، بعض مصلحتوں کے باعث اُسے یہاں چھوڑ جانے پر مجبور ہوں۔ وہ یہاں کے حالات سے مجھے برابر اطلاع دیتا رہے گا۔ انہی اطلاعات پر ہم اپنے اقدام و عمل کا پروگرام بنائیں گے!"

وہ فکرمندی کے لہجہ میں بولی: یوں تو اصل بھروسہ صرف خُدا ہی کا ہے، لیکن آصف آپ کے ساتھ تھا تو دل کو اطمینان سا رہتا تھا۔ وہ اسی گھر کا پروردہ ہے۔ بچپن سے آپ کا جاں نثار ہے۔ سایہ کی طرح آپ کے ساتھ رہتا تھا!"

"ہاں ماہ، لیکن تم فکر نہ کرو، وفاداری اور جاں نثاری میں جسونت آصف سے کچھ کم نہیں!"

جسونت کا نام سُن کر ماہ طلعت کو حیرت ہوئی، اُس نے پُوچھا: "یہ کون شخص ہے؟ کیا نام بتایا آپ نے، جسونت؟ میں نے تو اس کا نام بھی نہیں سُنا۔ نام سے تو ہندو لگتا ہے۔ اس ہندو پر آپ آصف زماں کی طرح بھروسہ کرتے ہیں۔ حالانکہ ہندوؤں ہی سے لڑنے کے لئے نکلے ہیں۔"

"ماہ تم نہیں جانتیں، جسونت بڑا اچھا آدمی ہے۔ اُس کا دل مسلمان ہے۔ دماغ ہی تک ہندو ہے، کسی وقت وہ بھی مسلمان ہو جائے گا اور جسونت ان ہندوؤں میں سے

ہے جو مذہبی اختلاف کے باوجود ہم مذہبوں پر مسلمانوں کو ترجیح دیتے ہیں۔ تاریخ میں اس طرح کی متعدد مثالیں ملتی ہیں۔ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں جب حمص کے عیسائیوں کا جزیہ واپس کر کے مسلمان رومی عیسائیوں سے لڑنے کے لئے باہر نکلے، تو حمص کے عیسائیوں نے خالد بن ولید کو یقین دلایا تھا کہ ہم اپنے شہر میں عیسائیوں کو نہیں داخل ہونے دیں گے اور وہاں کے عیسائیوں نے دعا کی تھی کہ مسلمان فتح مند ہوں۔ اس لئے کہ عیسائی حکمران مذہب کی یگانگت کے باوجود ان پر ظلم کرتے تھے۔ انہیں ستاتے تھے۔ ان کی دولت چھین لیتے تھے اور مسلمان مذہب کے اختلاف کے باوجود ان کے ساتھ مساویانہ برتاؤ کرتے تھے۔ عدل و انصاف کے معاملہ میں کسی قسم کی زیادتی نہیں کرتے تھے۔ ظلم نہیں ہونے دیتے تھے بالکل یہی کیفیت جسونت کی ہے۔ وہ چاہتا ہے مسلمان فتحیاب ہوں تاکہ مرہٹوں کے ظلم و جور سے ہندوستان کے باشندوں کو نجات ملے۔ اس دیس کے لوگ امن و عافیت کی زندگی بسر کر سکیں۔ مرہٹوں کا ظلم یکساں ہے۔ وہ مسلمانوں پر اس لئے ظلم کرتے ہیں کہ وہ مسلمان ہیں اور ہندوؤں کو اس لئے ستاتے ہیں کہ وہ دولت مند ہیں!"

ماہ طلعت ہنس پڑی۔ "عجیب لوگ ہوتے ہیں یہ بھی!"

"واقعی بڑے عجیب لوگ ہیں، بالکل عجائب خانہ میں رکھنے کے قابل!"

ماہ نے پوچھا۔ "لیکن میں نے سنا ہے، مرہٹوں کی فوج میں مسلمان کافی تعداد میں ہیں۔"

"تم نے ٹھیک سنا ہے۔"

"پھر یہ مسلمان مسلمانوں کا ساتھ کیوں نہیں دیتے؟ ہندوؤں کے لئے کیوں اپنا خون بہا رہے ہیں؟"

"میں تمہیں ایک مثال دوں تو مسئلہ بالکل سمجھ میں آجائے گا ——— غازی الدین عماد الملک کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟ وہ مسلمان ہے یا نہیں؟"

"کیوں نہیں ہے!"

"لیکن مرہٹوں کا اس سے بڑھ کر دوست کون ہوگا۔ اگر یہ شخص نہ ہوتا تو مرہٹوں کو دلّی کے قریب بھی آنے کی ہمت نہ پڑتی۔ لیکن یہ انہیں اکساتا رہا۔ ان کی ہمت بندھاتا رہا، انہیں شہ دیتا رہا!"

"وہی تو میں پوچھتی ہوں کیوں؟"

"بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جو اپنی قوم اور اپنے مذہب سے زیادہ اپنا بھلا دیکھنے کے عادی ہوتے ہیں، غازی الدین مسلمانوں سے وہ نہیں حاصل کر سکتا جس کی وہ مرہٹوں سے توقع کر سکتا ہے، پھر وہ مسلمانوں کا کیوں ساتھ دے؟ مرہٹوں سے ساز باز کیوں نہ کرے؟ رہے وہ مسلمان سپاہی جو مرہٹوں کے ساتھ شامل ہیں، بے چارے قابلِ نفرت نہیں قابلِ رحم ہیں۔"

"یہ کیوں؟"

"ان میں سے کچھ وہ ہیں جو مجبور کن حالات کے ماتحت مرہٹوں کے ساتھ شریک ہو گئے ہیں۔ کچھ وہ ہیں جن کا "حقِ نمک" مجبور کرتا ہے کہ وہ مرہٹوں کا ساتھ دیں، کچھ لوگ ایسے ہیں جو بالکل جاہل ہیں نام کے مسلمان ہیں، ورنہ ان کا رہن سہن، طور طریقہ سب ہندوانہ ہے، اور پھر میں اس جنگ کو جو لڑ رہا ہوں۔ ہندو مسلم نزاع کا نام نہیں دیتا!"

"پھر؟ پھر یہ کیسی جنگ ہے؟"

"یہ جنگ ہے حق و باطل کی، ہم عدل کرتے ہیں، وہ ظلم کرتے ہیں، ہم مساوات کے قائل ہیں، وہ ذات پات اور اونچ نیچ کے چکّر میں پھنسے ہیں۔ مختصر یہ کہ ہم مساوات عدل اور انصاف کے علمبردار ہیں، اور وہ تعصب، ناروا داری اور رنگ و نسل کے نمائندے ہیں۔ ہم نے کئی سو برس تک اس دیس پر حکومت کی اور ہندوؤں کو مسلمانوں سے زیادہ رعائتیں دیں، ان کی حکمرانی کا خواب ابھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہوا ہے لیکن انھوں نے مسلمانوں کو کچلنا اور دبانا شروع کر دیا ہے۔ ہم حق ہیں اور وہ باطل ہیں، لہٰذا حکومت ہمارا حق ہے نہ کہ اُن کا۔"

"لیکن آپ کی یہ جنگ کب شروع ہوگی؟ اتنے دن ہو گئے اِس اُمید میں۔"

"بہت جلد شروع ہوگی، مسلمانوں کا بکھرا ہوا شیرازہ ذرا مجتمع ہو لینے دو۔"

"کب ہوگا یہ کام؟"

"ہر کام اپنے وقت پر ہوتا ہے۔ میں صرف اتنا کہہ سکتا ہوں۔ وہ وقت بہت قریب آچکا ہے۔"

اتنے میں دروازے کے پاس آہٹ ہوئی۔ ماہ طلعت نے کہا: "چلی آؤ صنوبر!" وہ آگئی، اُس نے کہا: "صبح ہو رہی ہے چھوٹے سرکار!"

فیروز بخت اُٹھ کھڑا ہوا۔ "ہاں صبح ہو گئی، رات ختم ہو گئی، لیکن کس قدر جلد، یہ زندگی اس صبح و شام کا نام ہے، آؤ چلو صنوبر، صعف زماں جاگ گیا؟"

"وہ تو کب کے جاگ رہے ہیں۔"

فیروز بخت نے کہا: "یہ کیوں نہیں کہتی، وہ سوتا ہی نہیں جاگتا رہتا ہے، جگاتا رہتا ہے ——!"

بہت شرماتے ہوئے ستو ربولی "ہوں !"

اس کی اس ادا پر فیروز بخت اور ماہ طلعت، دونوں کو ہنسی آگئی۔

رخصت ہوتے وقت فیروز بخت نے غضنفر کو خوب سا پیار کیا، پھر ماہ کے سر پر محبت سے ہاتھ رکھا اور بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"الوداع !"

ایک سوگوار تبسم کے ساتھ ماہ نے فیروز کے چہرہ پر ایک نظر ڈالی اور خدا حافظ کہہ کر نظر جھکالی۔

فیروز نے کہا۔ "نہیں، یہ نہیں ہونے کا، تمہیں آنکھیں چار کرنی ہوں گی۔ پھر مسکرانا ہوگا۔"

ماہ نے آنکھیں چار کیں اور مسکرا دی۔

فیروز نے کہا۔ "ہاں اب ٹھیک ہے، اب میں خوش خوش جاؤں گا۔ دیکھو میرے غضنفر کا خیال رکھنا۔"

اتنے میں آصف زماں بھی آگیا۔

"بہت دیر ہوگئی۔ ابھی ہمیں یہاں سے خانقاہ چلنا ہے۔ وہاں نماز پڑھنی ہے پھر اندھیرے ہی اندھیرے آپ کو دلّی کی سرحد سے باہر نکل جانا ہے۔ مجھے معلوم ہوا ہے غازی الدین کو آپ کے دلّی آنے کی سن گن مل گئی ہے۔"

بے پروائی کے ساتھ فیروز نے کہا۔ "مل جانے دو ——— غازی الدین، فیروز بخت کی گرد کو بھی نہیں پاسکتا۔ میں اُس سے ذرا بھی نہیں ڈرتا، مجھے اپنے خدا پر بھروسہ ہے۔"

باہر نکل کر فیروز بخت نے آصف زماں کو ڈانٹا۔

"عجیب بے وقوف آدمی ہو تم!"

"کیا ہُوا؟ کیا خطا ہُوئی مجھ سے؟"

"ماہ طلعت کے سامنے تمہیں یہ کہنے کی کیا ضرورت تھی کہ غازی الدین کو میرے آنے کی سن گن مل گئی ہے؟ تم نے تو ایک بات آمد سُخن میں کہہ دی اور وہ اس وقت تک پریشان رہے گی، جب تک میرے خیریت سے پہنچنے کی اطلاع اُسے نہ مل جائے گی۔ براہِ کرم اب ایک کام کیجئے گا۔"

"فرمائیے، کون سا کام؟"

"آج کے تیسرے دن ماہ کو مطمئن کر دینا کہ میں خیریت سے پہنچ گیا۔"

"ضرور ایسا کروں گا۔ آپ مطمئن رہیئے۔"

انہی باتوں میں راستہ طے ہو گیا، اور یہ لوگ حضرت شاہ صاحب کی خانقاہ تک پہنچ گئے۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب صحنِ مسجد میں ٹہل رہے تھے۔ فیروز بخت کو دیکھ کر فرمایا۔

"تم آ گئے، میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا۔"

فیروز نے ادب اور عقیدت کے ساتھ سر جھکا کر عرض کیا۔

"میں حاضر ہو گیا۔ آج آپ کی اقتدا میں نمازِ فجر پڑھنے کی سعادت حاصل کرنے کے بعد، نہ جانے وہ مبارک وقت پھر کب آئے گا کہ میں اس بارگاہ میں حاضر ہوں گا۔"

"انشاء اللہ وہ وقت بہت جلد آئے گا اور اس مرتبہ جب آؤ گے تو تمہاری حیثیت بھی دوسری ہوگی۔"

فیروز بخت سر جھکائے، حضرت شاہ صاحب کی باتیں سنتا رہا۔ پھر اس نے انہی کی اقتداء میں فجر کی نماز پڑھی اور نماز کے بعد حضرت شاہ صاحب سے دعائے خیر و برکت کا توشہ لے کر اپنی منزل کی طرف روانہ ہوگیا.....!

باب (۳۴)

دوسوار

فیروز بخت کا گھوڑا ہوا سے باتیں کرتا جا رہا تھا۔ جسونت رائے کا اسپ جہار فتار بھی تنا تنایا تھا وہ فیروز بخت کے گھوڑے سے آگے نکلنے کی کوشش کر رہا تھا، ادھر جسونت لگام کھینچ کھینچ کر اس کی رفتار کم کرنے کی جد وجہد کرتا تھا مگر پورے طور پر کامیاب نہیں ہو پاتا تھا۔ فیروز بخت نے کہا۔ "بڑا منہ زور گھوڑا ہے تمہارا!"

وہ بولا۔ "جی منہ زور بھی اور گستاخ بھی ——— آپ کے اسپ باد پا سے آگے بڑھنے کی کوشش میں ہے نالائق!"

فیروز بخت ہنسنے لگا۔ "یہ وقت تادیب کا نہیں، قدم بڑھائے چلے چلو، شام ہو رہی ہے اور میں چاہتا ہوں کہ ہم آج ہی عشا کے وقت تک نجیب الدولہ کے پاس پہنچ جائیں!"

جسونت رائے۔ "انشاء اللہ ایسا ہی ہوگا!"

فیروز بخت چونک پڑا۔ "کیا کہا انشاء اللہ؟ یہ لفظ تمہاری زبان پر کیسے آ گیا؟"

جسونت رائے نے جواب دیا۔ "کیوں؟ کیا میں خدا کو نہیں مانتا؟ کیا وہ صرف آپ ہی کا ہے میرا نہیں؟"

"کیوں نہیں بھئی ، ضرور ہے ، لیکن میرا مطلب تم سمجھے نہیں؟"

"سمجھ گیا ، آپ یہ کہنا چاہتے تھے کہ میں نے ہندو ہو کر انشاء اللہ کیوں کہا مجھے کوئی ہندی یا سنسکرت کا لفظ استعمال کرنا چاہیئے تھا؟"

"ہاں ٹھیک ہے ، اسی بات پر مجھے تعجب ہوا!"

"تعجب کی کوئی ضرورت نہیں میں اب خدا سے بہت قریب ہوتا چلا جا رہا ہوں!"

حیران ہو کر فیروز بخت نے پوچھا "کیا مطلب؟"

جسونت رائے "آدھے سے زیادہ مسلمان ہو چکا ہوں ، بلکہ یوں سمجھئے پورا مسلمان ہو چکا ہوں ، صرف اعلان اور بیعت کی دیر ہے۔"

ان باتوں سے فیروز بخت کو حیرت بھی ہوئی اور مسرت بھی اُس نے کہا "تم مسلمان ہو چکے ہو ؟ —— سچ ؟"

"الحمد للہ!"

"لیکن کب ؟ کیسے ؟"

"سُن لیجئے گا کبھی یہ داستان بھی!"

"کبھی کیوں ؟ آج اور ابھی کیوں نہیں ؟"

اور جسونت نے اپنی داستان شروع کر دی۔

"مسلمانوں کے متعلق میری بہت بُری رائے تھی ، پھر میں نے آپ کو دیکھا اور میری رائے بدل گئی۔ میں مسلمانوں کو اچھا سمجھنے لگا ، آپ کا کردار ، آپ کی بہادری ، آپ کی سچائی اور راست بازی ، آپ کی بے باکی اور بے خوفی ان چیزوں نے —— میرے دل میں گھر کر لیا اب مسلمان میری نظر میں محبوب بن گئے۔ ان کے لئے میں نے سر دھڑ کی بازی لگانے کا

فیصلہ کر لیا. کبھی کبھی آپ سے اسلام پر بھی باتیں ہوئیں اور اُن سے وقتی طور پر متاثر بھی ہوا، لیکن کوئی مستقل رائے نہ قائم کر سکا، آدمی جس فضا، جس ماحول، جس سوسائٹی، اور جس مذہب کے سایہ میں آنکھیں کھولتا ہے، اُس کی بہت سی خرابیاں اور نقائص دیکھنے کے بعد بھی اُسے چھوڑتے ہچکچاتا ہے. دل ہی دل میں خرابیوں کی تاویل کرتا ہے، اور اپنے دل کو بہلا لیتا ہے. یہی حال میرا بھی تھا. میں اپنے مذہب، اپنی سوسائٹی، اپنے ماحول کی خامیوں اور کمزوریوں سے خوب واقف تھا، پھر بھی ان میں کشش تھی، دل آویزی تھی، انہیں چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا تھا. ان سے ترکِ تعلق کرنے پر طبیعت آمادہ نہیں ہوتی تھی، فیصلہ میں تاخیر ہوتی رہی، رائے قائم کرنے میں دیر ہوتی رہی، طبیعت کا تذبذب برابر قائم رہا —"

پھر جسونت رائے خاموش ہو گیا.

فیروز بخت نے پوچھا. "چپ کیوں ہو گئے، جو کچھ کہہ رہے تھے، سب کہہ ڈالو تمہارے اس بے موقعہ سکوت سے مجھے وحشت ہو رہی ہے، جسونت تمہاری یہ خاموشی مجھے کھل رہی ہے، کہے جاؤ!"

جسونت کا گھوڑا کچھ آگے نکل گیا تھا، فیروز بخت نے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگائی، اور چشم زدن میں جسونت کے پاس پہنچ گیا. وہ رومال سے اپنے آنسو پونچھ رہا تھا.

فیروز بخت نے ذرا بلند آواز سے کہا: "جسونت! —— کیا بات ہوئی، تم تمہاری آنکھیں آب گوں کیوں ہو گئیں؟"

"وہ —— کوئی بات نہیں، گھوڑے کی ٹھوکر سے اُڑ کر شاید کوئی چیز آنکھ میں پہنچ گئی، اب ٹھیک ہے!"

فیروز بخت نے اطمینان کا سانس لیا، "اوہ —— میں سمجھا تم رو رہے ہو!"

جسونت رائے: "آپ مجھے روتے دیکھنا پسند نہیں کرتے؟"

"ہرگز نہیں ـــــ میں چاہتا ہوں تم ہمیشہ خوش وخرم رہو۔ تمہارے دل کو کبھی صدمہ نہ پہنچے، کوئی فکر اور پریشانی کبھی تمہارے پاس پھٹکنے بھی نہ پائے!"

"کتنا خیال ہے آپ کو میرا!"

"اور نہیں؟ ـــــ ذرا اپنی طرف بھی تو دیکھو، تم نے تو اپنی محبت اور خلوص سے مجھے خرید لیا ہے! ـــــ لیکن یہ ہم کس قسم کی باتیں کرنے لگے؟ ہاں پھر کیا ہوا؟"

جسونت نے سلسلۂ گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"یہاں تک کہ آپ کے ساتھ میں دلی آیا، اور حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کی خانقاہ میں مقیم ہوا۔ آپ تو صرف دن کا بڑا حصہ وہاں صَرف کرتے تھے، پھر حویلی چلے جاتے تھے مجھے دن رات وہاں رہنے اور حضرت شاہ صاحب کے فضائل وکمالات دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ انہیں میں نے دُور سے بھی دیکھا اور قریب سے بھی۔ دن کو بھی اور رات کو بھی، باتیں کرتے ہوئے بھی اور عبادت کرتے ہوئے بھی، پڑھتے ہوئے بھی اور پڑھاتے ہوئے بھی، دوستوں سے ملتے بھی اور مریدوں کے سامنے بھی۔ کھانا کھاتے، پانی پیتے، وضو کرتے قرآن کی تلاوت کرتے، حدیث پڑھتے، فقہ اور تصوف کے مسائل بیان کرتے، غرض ہر رنگ میں دیکھا اور دیکھ کر متحیر ہوگیا۔ میں نے شاہ صاحب سے پہلے بھی بہت سے مہاتماؤں اور سادھوؤں کو دیکھا ہے ان کی عبادت اور ریاضت کے مناظر بھی دیکھے ہیں ان کی پند ونصیحت کی باتیں بھی سنی ہیں، ان کی دُنیا بیزاری اور دُنیا طلبی کے کرشمے بھی دیکھے ہیں مگر سچ کہتا ہوں میرا دل کبھی کسی پہ نہ ٹکا کبھی کے لئے میرے دل میں شرادہ ـــــ شرادہ کا مطلب آپ سمجھتے ہیں؟ عقیدت ـــــ پیدا نہیں ہوئی لیکن شاہ صاحب کو ایک

نظر دیکھتے ہی میرا دل ان کی طرف کھنچنے لگا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے فولاد مقناطیس کی طرف کھنچ رہا ہے۔ میں نے مزاحمت کی، قدم آگے بڑھنا چاہتے تھے۔ میں پیچھے ہٹنا چاہتا تھا۔ نہ ہو سکتی اپنے تئیں پیچھے دھکیلتا تھا، لیکن اپنے کانوں کو کس طرح بند کر لیتا؛ اُن تک وہ پاک اور شیریں آواز پہنچتی ہی رہتی تھی! اپنی آنکھوں کو کیونکر بند کر لیتا؛ وہ ان کے جمال جہاں آرا سے شاد کام ہوتی ہی رہتی تھیں؛ اپنے ضمیر کو کس طرح کچل دیتا؛ وہ ان کے وعظ و پند سے اثر قبول ہی کرتا رہتا تھا اور آخر ایک روز میں ضبط نہ کر سکا، میں نے بیعت کے لئے ہاتھ بڑھا دیئے!"

فیروز بخت نے بڑی حیرت اور استعجاب کی کیفیت اپنے اوپر طاری کرتے ہوئے کہا: "کیا؛ کیا کہا؛ تم نے بیعت کے لئے ہاتھ بڑھا دیئے؛ تم نے شاہ صاحب سے بیعت کر لی؟"

بہت سکون اور سنجیدگی کے ساتھ جسونت رائے نے جواب دیا۔ "بیعت کے لئے ہاتھ بڑھائے لیکن بیعت نہ کر سکا!"

"لاحول ولاقوۃ، بھئی تم بھی عجیب آدمی ہو۔ کنوئیں تک پہنچ گئے۔ لیکن پیاسے لوٹ آئے، یہ کیوں؛ اس حماقت کا مطلب میں نہیں سمجھا؟"

پھول کی پتی کی طرح نرم اور نازک ہونٹوں پر تبسم کھیلنے لگا۔

جسونت نے کہا۔ "آپ نے پوری رام کہانی تو سُنی نہیں، اور اعتراض کرنے لگے، پہلے پوری بات تو سُن لیجئے!"

"ہاں بھئی غلطی ہوئی، تم اپنا سلسلۂ کلام جاری رکھو، تم نے بیعت کے لئے ہاتھ بڑھائے مگر بیعت نہیں کی، لیکن کیوں؟ ——— میرا مطلب یہ کہ آگے کیا ہُوا۔

"وہی تو میں کہہ رہا ہوں، لیکن آپ کنے بھی تو دیں!"

"اچھا وعدہ کرتا ہوں، اب بالکل نہیں بولوں گا!"

"ہر روز رات کو جب سونے لیٹتا تھا، تو یہی خیالات اپنی محفل سجا کر میرے پاس جمع ہو جاتے تھے۔ میں اُن سے دور رہنا چاہتا تھا، اپنے سے انہیں دور رکھنا چاہتا تھا۔ لیکن کامیاب نہ ہوتا تھا۔ گھنٹہ دو گھنٹہ کی کش مکش کے بعد مجھے نیند آجاتی تھی اور سو جاتا تھا۔ ایک روز اسی کش مکش میں کچھ اس طرح اُلجھا کہ نیند نہ آنا تھی نہ آئی، کروٹوں پر کروٹیں بدلتا تھا ہر کروٹ پر نیند دس قدم اور دور ہو جاتی تھی۔ یہاں تک کہ تہجد کا وقت ہو گیا۔ حضرت شاہ صاحب نے تہجد کی نماز پڑھی، جس انہماک اور استغراق کے ساتھ انہوں نے یہ نماز پڑھی اُس نے میرے دل پر بہت اثر کیا، رات کا وقت، ہُو کا عالم، چاروں طرف سناٹا، نہ آدم نہ آدم زاد و جانور تک نیند کا مزا لے رہے تھے۔ پرندے اپنے گھونسلوں میں مست خواب تھے۔ انسان اپنے گھروں میں چین کی نیند سو رہے تھے۔ مگر اللہ کا یہ بوڑھا بندہ، راحت کی نیند چھوڑ کر، اس موسم میں، آدھی رات گئے، ہر لذت اور آرام سے کنارہ کش ہو کر اپنے خدا سے لو لگائے تھا، نہ اس کی آنکھوں میں نیند تھی، نہ اس کا بوڑھا جسم آرام کا طالب تھا اُس نے نماز پڑھی، طویل سجدے کئے۔ گڑگڑا گڑگڑا کر، اپنے رب سے دعائیں مانگیں، مناجتیں کیں، جب آخری سجدہ سے سر اٹھایا تو آنکھیں پُر آب تھیں، پھر دستِ دعا بلند کیا، اور خُدا سے اپنی غلطیوں اور خامیوں کی معافی مانگنے لگا، اپنی قوم کی اصلاح کی التجائیں کرنے لگا، ظالموں اور سفاکوں کے سدھرنے کی بھیک مانگنے لگا، اس کی آواز بھرّائی ہوئی تھی، اور اُس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے قطرے گر رہے تھے، اتنے تابناک جیسے موتی —

اور یہ کہتے کہتے خود جسونت کی آنکھیں اب گوں ہو گئیں۔ اس کی آواز بھرا گئی۔

پھر اس نے اپنے آپ کو سنبھالا اور کہا۔ "اب میں ضبط نہ کر سکا۔ حضرت شاہ صاحب کی خدمت میں پہنچا اور بیعت کے لئے ہاتھ بڑھا دیئے!"

"پھر انہوں نے کیا فرمایا؟"

جسونت نے جواب دیا۔ "انہوں نے ایک نظر میرے سراپا پر ڈالی، اور کچھ سوچنے کے بعد فرمایا۔ "تم کیا چاہتے ہو؟"

میں نے کہا "دل کی تسکین، روح کا اطمینان، ضمیر کی طہارت!"

ایک تبسم کے ساتھ انہوں نے فرمایا۔ "یہ سب چیزیں تمہیں حاصل ہیں!"

میں نے عرض کیا۔ "مجھے ان چیزوں کا استحکام مطلوب ہے، مجھے مسلمان کر لیجئے میں مسلمان ہونا چاہتا ہوں!"

یہ سن کر ارشاد فرمایا۔ "اسلام قول کا نام نہیں، عمل کا نام ہے، وہ زبان سے نہیں، دل سے قبول کیا جاتا ہے۔ اس کی رسائی صرف دماغ تک نہیں، دل تک ہوتی ہے۔ تمہیں مسلمان کوئی نہیں بنا سکتا، ہاں خود جب چاہو بن سکتے ہو!"

میں نے عرض کیا۔ "آپ میرے اسلام کی تصدیق کر دیجئے، جو باتیں میں نہیں جانتا وہ بتا دیجئے!"

فرمایا۔ "یہ سب ہو جائے گا لیکن تم فیصلہ کرنے میں جلدی نہ کرو!"

میں نے دست بستہ کہا۔ "یہ فیصلہ بہت پرانا ہے۔ زبان پر آج آیا ہے!"

ارشاد ہوا۔ "ہاں ٹھیک کہتے ہو، شاید تم اس خانقاہ میں رہ کر، یہاں کے حالات سے متاثر ہو کر، یہاں کے لوگوں کو دیکھ کر اس نتیجہ پر پہنچے ہو کہ بیعت کر لو!"

میں نے عرض کیا۔ "یہی بات ہے میرے مرشد!"

ایک تبسم کے بعد فرمایا۔

"اسی لئے تو کہتا ہوں کہ یہ فیصلہ عاجلانہ ہے۔ یہاں سے جانے کے بعد ایک مرتبہ پھر تم اپنے دل کو ٹٹولو۔ بار بار اپنی روح، اپنے خیالات، اور اپنے نفس کا جائزہ لو، جب یہ سب کچھ کر چکو، تب میرے پاس آنا، میں بیعت کر لوں گا۔"

میں بیعت پر مصر تھا۔ میں نے کہا۔ "اپنے آقا فیروز بخت کے ساتھ سر دھڑ کی بازی لگا چکا ہوں۔ اگر اس جنگ میں جو رہی ہے میں کام آ گیا تو یہ تمنا میرے ساتھ قبر میں جائے گی۔"

حضرت شاہ صاحب نے تبسم کرتے ہوئے کہا۔ "شہادت ہے مطلوب و مقصود مومن! — ایک مسلمان کے لئے اس سے بڑھ کر خوش بختی اور سعادت کیا ہو سکتی ہے اگر وہ راہِ خدا میں کام آئے۔ خدا کے آخری مذہب کی تائید و حمایت کے لئے اس کی گردن کٹے!"

مجھ سے پھر ضبط نہ ہو سکا۔ اب اپنی اس گستاخی اور جرأت کو سوچتا ہوں تو حیرت ہوتی ہے۔ میں نے بیباکانہ کہا۔ "میں طے کر چکا ہوں۔ بیعت کر کے رہوں گا، خواہ میری جان جائے یا رہے۔"

مسکراتے ہوئے فرمایا۔ "عورتوں کی طرح ضد نہ کرو، سمجھ سے کام لو، انشاء اللہ تم پھر دلّی آؤ گے اور اس مرتبہ جب آؤ گے۔ تو آج جس حیثیت میں ہو اس سے مختلف حیثیت کے ساتھ آؤ گے۔"

میں نے پھر گستاخی سے کام لیا۔ "تو آپ وعدہ فرماتے ہیں کہ اب کی جب میں دلّی آؤں گا تو آپ بیعت کریں گے؟"

فرمایا۔ "ہاں وعدہ کرتا ہوں!"

میں نے نظر اٹھا کر دیکھا تو چہرہ مبارک پر جلال برس رہا تھا۔ میری گھگھی بندھ گئی پھر میں کچھ نہ کہہ سکا، خاموش ہو گیا۔"

فیروز بخت حیرت سے جسونت کی باتیں سن رہا تھا، اتنے میں گھوڑے نے ٹھوکر کھائی اور وہ سنبھل گیا۔ اس نے کہا۔ "بڑے خوش قسمت ہو جسونت، بہرحال بیعت ہو یا نہ ہو، مسلمان تو ہو گئے تم!"

"جی ہاں!"

"پھر تم نے اپنا نام کیا رکھا؟ یعنی آئندہ سے تمہیں کس نام سے پکارا جائے؟"

جسونت نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ "نام تو ابھی میں نے نہیں بدلا، بدلنے کا ارادہ ہے!"

"یہ کیوں؟"

"یہ کام تو اب حضرت شاہ صاحب ہی کریں گے، جو نام وہ رکھیں گے وہی آئندہ سے میرا نام ہوگا!"

"جزاک اللہ بڑا مبارک فیصلہ ہے!"

دور سامنے کچھ روشنی سی نظر آ رہی تھی، جسونت نے کہا۔ "شاید ہم پہنچ گئے!"

فیروز بخت بولا۔ "ہاں یہ نجیب الدولہ کا لشکر ہے۔ بس اب چند منٹوں میں ہم انشاء اللہ وہاں ہوں گے!"

جسونت نے کہا۔ "بڑی نیند آ رہی ہے کہیں میں گھوڑے ہی پر نہ سو جاؤں؟"

"سدھا ہوا گھوڑا ہے سو بھی جاؤ گے تو وہ گرنے نہیں دے گا۔"

"پھر اب کیا کیا جائے! لشکر میں تو سُونا پڑا ہے، وہ کانیں بھی بند ہو چکیں۔"

"اب کیا ہو سکتا ہے۔ سونے کی کوشش کریں گے؟"

"نہیں آپ بھوکے نہیں سوئیں گے، میرا انتظار کیجئے؟"

یہ کہہ کر جسونت راؤ تیزی سے باہر نکلا، اور تھوڑی دیر کے بعد ایک ہاتھ میں پوری کا اور دُوسرے میں مٹھائی کا دونا لئے ہوئے واپس آیا۔

فیروز بخت بستر سے اُٹھ بیٹھا۔ "بھئی کمال کر دیا، کیا کیا لے آئے؟"

اُس نے فخریہ لہجہ میں کہا "پوری، آلو کی ترکاری، گرم گرم جلیبیاں!"

"اوہو، بہت سارا سامان لے آئے، لیکن یہ کیسے مل گیا اس وقت؟"

"لشکر کا ایک چکر لگایا تو بالکل آخری گوشہ پر ایک حلوائی بیٹھا یہ چیزیں تیار کر رہا تھا بات یہ ہے کہ ملایہ کے سپاہی رات بھر گھومتے رہتے ہیں، اِدھر سے اُدھر، وہ بے چارے اگر یہ کھانے پینے کا شغل نہ جاری رکھیں تو رات کیسے کٹے، اسی طرح گذار دیتے ہیں رات؟"

"ٹھیک ہے، آؤ، تم بھی کھاؤ!"

"کھاؤں گا، پہلے آپ کھا لیجئے؟"

"یہ نہیں ہونے کا، تمہیں ہمارے ساتھ کھانا پڑے گا، چلو ہاتھ دھو لو؟"

جسونت نے ہاتھ دھولئے، پھر دونوں کھانے بیٹھ گئے۔ اس وقت کی گرم گرم پوریوں اور جلیبیوں نے بڑا مزا دیا۔

کھانے سے فراغت کے بعد جسونت نے کہا۔ "آپ بہت تھک گئے ہیں۔ لائیے پاؤں دبا دوں؟"

فیروز بخت نے پاؤں سمیٹ لئے۔ "بالکل نہیں، اب تم میرا حال چھوڑو، جاؤ آرام سے

باب (۳۴)

مجلسِ مشاورت

لشکر میں پہنچتے ہی فیروز بخت اپنے خیمہ میں پہنچا۔ رات کے گیارہ بج چکے تھے اہلِ لشکر سو چکے تھے، صرف طلایہ کے سپاہی جاگ رہے تھے.

اور تمام دکانیں بند ہو چکی تھیں، ایک لشکر میں جو گھما گھمی اور رونق ہوتی ہے اس وقت کہیں اس کا نام و نشان بھی نہ تھا۔ نجیب الدولہ کے بارے میں فیروز بخت نے دریافت کیا تو خدامِ ادب بولے ابھی آنکھ لگی ہے!

فیروز بخت نے جبونت سے کہا۔ "تمہیں تو نیند آ رہی ہوگی؟"

وہ بولا۔ "جی بہت —— اور آپ کو؟"

"نیند تو آ رہی ہے تکان بھی بہت زیادہ ہے۔ بڑی لمبی منزل مار کے آ رہے ہیں ہم لوگ۔ لیکن ایک چیز اور بھی بہت —— پریشان کر رہی ہے۔"

"وہ کیا؟ —— مزاج تو اچھا ہے؟"

"ہاں مزاج تو ٹھیک ہے لیکن بھوک نے ایسی ہل چل رکھی ہے کہ شاید نیند کے سامنے نہ ٹھہر سکے!"

سو رہو جاکر۔"

جسونت اپنے خیمہ میں جاکر بستر پہ دراز ہو گیا۔

○

صبح نمازِ فجر کے بعد لشکر کی مسجد میں نجیب الدولہ اور فیروز بخت کا آمنا سامنا ہوا۔ فیروز بخت کو دیکھ کر بہت خوش ہوا، سینہ سے لگا لیا۔

"بڑی دیر لگا دی تم نے، ہم تو تمہارا انتظار کرتے کرتے تھک گئے۔ طرح طرح کے اندیشے آتے تھے۔ کہیں خدانخواستہ کوئی حادثہ تو نہیں پیش آیا، کہیں عماد الملک غازی الدین نے دھوکا تو نہیں کیا تمہارے ساتھ؟ رات میں نے اپنے بیٹے ضابطہ خاں سے کہا کہ وہ کسی آدمی کو تمہاری خیر خبر کے لئے جلدی بھیجے۔"

نیازمندانہ لہجہ میں فیروز نے کہا۔ "یہ بندہ پروری ہے، جو آپ میرا اتنا خیال فرماتے ہیں۔ خدا کے فضل سے کوئی حادثہ نہیں گزرا۔ بعض خانگی وجوہ سے چند روز زیادہ ٹھہرنا پڑا۔ حضرت شاہ صاحب کا بھی یہی حکم تھا کہ ٹھہر جاؤں۔"

"ٹھیک ہے۔ تم نے بہت اچھا کیا ٹھہر گئے۔ شکر ہے اب تو تم آ گئے۔"

اس نے سر جھکا کر کہا۔ "جی ہاں آ گیا، اور آپ کے قدموں کے ساتھ آخری وقت تک وابستہ رہوں گا۔"

نجیب الدولہ نے ایک خاص قسم کا تاثر اپنے اوپر طاری کرتے ہوئے کہا۔ "تمہارا سا جوش اور اخلاص کاش ہم سب کو حاصل ہوتا۔"

پھر کچھ رک کر بولا "آئندہ کے اقدام و عمل کے سلسلہ میں تم سے ضروری صلاح و مشورہ کرنا ہے۔ ابھی تمہاری تھکن دور نہ ہوئی ہوگی۔ اس وقت تو جا کے آرام کرو۔ جب

رفع ہو جائے، تب اطمینان سے باتیں ہوں گی۔"

فیروز بخت نے کہا۔ "ماندگی کا کہیں نام و نشان بھی نہیں، بالکل تازہ دم ہوں، آپ جب فرمائیں حاضر ہو جاؤں!"

انہی باتوں کے اثنا میں فیروز بخت کا خیمہ آگیا۔ نجیب الدولہ نے کہا۔ "آؤ پھر یہیں مجلس مشورت آراستہ ہو!"

"بہت بہتر!"

نجیب الدولہ اور فیروز بخت خیمہ کے — اندر آ کر بیٹھ گئے اور حسبِ معمول جسونت راؤ ننگی تلوار ہاتھ میں لئے دروازہ پر کھڑا ہو گیا۔

فیروز بخت۔ "کوئی خاص مرحلہ درپیش ہے؟"

نجیب الدولہ۔ "مرحلہ تو وہی ایک ہے مرہٹوں کا!"

فیروز بخت۔ "کیا انہوں نے پھر سر اٹھایا ہے؟ کسی تازہ سازش یا شرارت کی اطلاع ملی ہے آپ کو؟"

نجیب الدّولہ۔ "جب تک مرہٹوں کا زور نہ ٹوٹ جائے ان کی قوت پارہ پارہ نہ ہو جائے۔ انہیں ایسی شکست نہ دی جائے کہ وہ پشتہا پشت تک اسے یاد رکھیں، اس وقت تک وہ برابر سازشیں کرتے رہیں گے، شرارتوں پر آمادہ رہیں گے۔ ان کے پاس غریبوں سے لوٹی ہوئی بے اندازہ دولت ہے، ان کے پاس چوروں، ڈاکوؤں بے روزگاروں اور شورہ پشتوں پر مشتمل بہت بڑی فوج ہے، عماد الملک غازی الدین ان کا پشت پناہ ہے، سورج مل جاٹ (والئ بھرت پور) ان کا دست راست ہے سندھیا، ہلکر، گائیکواڑ، سب ان کے ساتھ ہیں ابراہیم گاردی جیسا زبردست

آتش باری کا ماہر ان کے توپ خانے کا انچارج ہے، ان سب چیزوں سے مرہٹے فائدہ اٹھا رہے ہیں، اور اٹھاتے رہیں گے!

فیروز بخت :- "آپ نے بجا فرمایا!"

نجیب الدّولہ :- "شجاع الدّولہ کو میں نے اس خطرہ کی طرف توجہ دلائی تھی لیکن وہ بیوقوف اور بداندیش ہے، وہ اپنے آپ کو بہت بڑا دانا سمجھتا ہے۔ لیکن حقائق سے چشم پوشی اس کی سرشت بن چکی ہے۔ وہ مرہٹوں سے لڑنا نہیں چاہتا، ان سے دوستی کرنا چاہتا ہے، حالانکہ بار بار تجربہ کر چکا ہے کہ مرہٹے کسی کے دوست نہیں بن سکتے!"

فیروز بخت :- "درست ارشاد فرمایا!"

نجیب الدّولہ :- "بس یہی فکر ہے جو مجھے پریشان کئے ہوئے ہے!"

فیروز بخت :- "لیکن اس کا کچھ مداوا بھی سوچا آپ نے؟"

نجیب الدولہ :- "وہی تو سمجھ میں نہیں آتا۔ ہم لوگوں میں اتحاد نہیں، وہ لوگ متفق ہیں۔ ہم آپس میں لڑتے ہیں، وہ متحد ہو کر ہمارا مقابلہ کرتے ہیں۔ اگر ہم متحد ہوتے تو بڑی آسانی سے مرہٹوں کا زور توڑا جا سکتا تھا؟"

فیروز بخت :- "مجھے آپ کے ایک ایک حرف سے اتفاق ہے!"

نجیب الدّولہ :- "میرے عزیز کوئی تدبیر بتاؤ، کچھ مشورہ دو، حضرت شاہ صاحب کی خدمت میں بھی تم نے یہ صورتِ حال پیش کی تھی؟"

فیروز بخت :- "جی ہاں!"

نجیب الدولہ :- "پھر انہوں نے کیا فرمایا؟"

فیروز بخت :- "وہ تو بہت پُر امید ہیں؟"

فیروز بخت۔ "جی بہت زیادہ۔"

نجیب الدولہ۔ "کیا فرماتے ہیں؟"

فیروز بخت۔ "وہ فرماتے ہیں کہ ہم کامیاب ہوں گے اور دشمن تباہ ہوگا۔ ضرورت صرف اس کی ہے کہ ہمارا حوصلہ بلند رہے، ہم خدا کو نہ بھولیں!"

نجیب الدولہ۔ "سچ فرماتے ہیں، ان کی بات غلط نہیں ہو سکتی، وہ خدا رسیدہ بزرگ ہیں۔ ان کی نظر بہت دور تک پہنچتی ہے، مجھے یقین ہے ہم ضرور کامیاب ہوں گے۔"

فیروز بخت۔ "انشاءاللہ۔"

نجیب الدولہ: "حضرت شاہ صاحب نے میرے بارے میں کچھ فرمایا؟"

فیروز بخت۔ "جی ہاں آپ کے نام حضرت کا مکتوب گرامی لایا ہوں!"

نجیب الدولہ۔ "زہے قسمت، کہاں ہے وہ مکتوب؟ لاؤ، دکھاؤ۔"

فیروز بخت نے خرجی سے حضرت کا مکتوب نکال کر نجیب الدولہ کی خدمت میں پیش کیا۔ نجیب الدولہ نے اسے عقیدت کی آنکھوں سے دیکھا، چوما، آنکھوں سے لگایا، پھر بڑے اثر انگیز لہجہ میں کہا: "فیروز یہ خط تم مجھے پڑھ کر سناؤ!"

فیروز نے خط لے لیا، اور سنانا شروع کیا:۔

"امیر الغزاۃ، رئیس المجاہدین کو خدائے عزوجل فتوحات تازہ، اور بزرگی بے اندازہ سے ممتاز فرما کر مسلمانوں پر برکتوں کے دروازے کھول دے۔"

نجیب الدولہ۔ (گلوگیر آواز میں) "آمین!"

فیروز بخت نے خط کا سلسلہ پھر شروع کیا۔

"اکثر خاص اوقات میں دعائے خیر و وظیفہ ادا کیا جاتا ہے۔ بعض اوقات غلبۃ المسلمین کی خوش خبری ہوش کے کان میں پہنچتی ہے، اگرچہ حقیقت بعد انتظار، اور پس از کوشش حاصل ہوگی؟"

نجیب الدولہ۔ "انشاء اللہ یہ حقیقت ضرور حاصل ہوگی — ہاں آگے؟"

فیروز بخت نے پھر ٹوٹا ہوا سلسلہ شروع کیا۔

"پردۂ غیب میں مرہٹہ اور جٹ[۱] کا استیصال مقرر ہو گیا ہے، بس وقت پر موقوف ہے، جونہی اللہ کے بندے کمر باندھیں گے طلسم باطل ٹوٹ جائے گا۔"

نجیب الدولہ نے ایک عجیب وارفتگی اور جوش کے عالم میں بآواز بلند کہا، "شاہ صاحب کی پیشین گوئی، مجھے یقین ہے ضرور پوری ہوگی، وہ خدا کے مقبول بندے ہیں ان کا ارشاد غلط نہیں ہو سکتا ہاں میرے بیٹے! آگے۔"

فیروز بخت نے پڑھنا شروع کیا:۔

"ایک بات اور کہنی ہے، وہ یہ کہ جب افواج کا گذر دہلی میں ہو تو اس وقت اہتمام کلی کرنا کہ دلی سابق کی طرح ظلم سے پامال نہ ہو جائے، دلی والے کئی مرتبہ اپنے مالوں کی لوٹ، اور اپنی عزت کی توہین آنکھ سے دیکھ چکے ہیں، اسی وجہ سے کارہائے مطلوبہ کے حصول میں تاخیر ہو رہی ہے، آخر مظلوموں کی آہ بھی تو اثر رکھتی ہے، پوری تاکید کرنی چاہئے، کہ کوئی فوجی دلی

---

[۱] جاٹ

کے مسلمانوں، اور غیر مسلموں سے جو ڈاکو کی حیثیت رکھتے ہیں، ہرگز تعارض نہ کرے اگر اس بات کا خیال رکھا تو امید ہے کہ فتوحات کے دروازے پے بہ پے کھلتے چلے جائیں گے، اگر اس امر سے تغافل برتا گیا تو میں ڈرتا ہوں کہ آہِ مظلوماں سدِ راہِ مقصود نہ بن جائے![1]"

نجیب الدولہ کی آنکھوں سے یہ کلمات سُن کر آنسو بہنے لگے۔ اس نے ایک آہ بھر کر کہا: "یہ فرمایا حضرت شاہ صاحب نے ہم کافروں کا رونا کیا روئیں؟ خود مسلمانوں نے مسلمانوں پر کون سے کم ظلم ڈھائے ہیں۔ ہم نے دولت لوٹی، مکان ڈھائے، جائدادیں چھینیں، قتل کئے، بے گناہوں کا خون بہایا، معصوم عورتوں پر ستم رانیاں کیں، کیا نہیں کیا؟ بیچارے دِلّی کے مسلمان! میاں فیروز بخت اصل بات یہی ہے جو شاہ صاحب نے فرمائی۔ ہماری کامیابی کا روڑا وہی مظالم ہیں جو ہم نے ایک دوسرے پر کیے!"

نجیب الدولہ کی آنکھیں پُر آب تھیں، اور وہ جوش و خروش کے عالم میں کہہ رہا تھا: "میں عہد کر چکا ہوں کہ اب ایسا نہ ہو سکے گا۔ ہماری فوجیں اس لئے نہیں ہیں، کہ مسلمانوں پر ظلم کریں، اس لئے ہیں کہ ان پر ظلم نہ ہونے دیں، انہیں ظلم سے بچائیں، خدا سے التجا کرتا ہوں کہ اس عہد کو پورا کرنے کی مجھے توفیق عطا فرمائے!"

فیروز بخت: "آپ نے جو عزم کیا ہے، وہ ضرور پورا ہوگا!"

نجیب الدولہ: "شاہ صاحب نے ایسے حوصلہ افزا کلمات ارشاد فرمائے ہیں کہ جی چاہتا ہے ابھی تلوار لے کر اُٹھوں، اور دشمن پر جا پڑوں، اس وقت تک لڑتا رہوں جب

---

[1] شاہ ولی اللہ دہلوی کے سیاسی مکتوبات صفحہ ۷۶، ۷۷، ۷۸ - ۱۸ - ۱۹

[2] مکالمہ بہ عبارت شاہ صاحب کے متعدد خطوط سے اخذ کر کے درج کی گئی ہے!

تک یہ گردن کٹ نہ جائے! ——— یا تن رسد بہ جاناں یا جاں ز تن برآید!

فیروز بخت ۔ "بے شک دشمنوں کی سرکوبی ہمارا فرض ہے جب تک اس کا قلع قمع نہ ہو جائے نہ ہم چین سے بیٹھیں گے، نہ اُسے چین سے بیٹھنے دیں گے۔ ——— تو بھی ٹھنڈا

نہ رہے دل کے جلانے والے!"

نجیب الدولہ ۔ "میرے عزیز! تم سچ کہتے ہو، لیکن دشمن کا لشکرِ گراں تمہاری نظر میں ہے اس کے ساز و سامان سے تم ناواقف نہیں، اس کے وسائل و ذرائع تمہارے علم میں ہیں۔ ایک اکیلا نجیب الدولہ ان سب چیزوں سے کیسے عہدہ برآ ہو سکتا ہے، میرا ساتھ دینے والا، اس وسیع ملک میں کون ہے؟ اور دُور کیوں جاؤ، شجاع الدولہ کو دیکھو، تم اسے گھیر گھار کر کس طرح لائے، چلا آیا، جنگ ختم ہوتے ہی واپس چلا گیا، اور دیکھ لینا ایک دن تم سُن لو گے کہ وہ پھر مرہٹوں سے ساز باز کر رہا ہے!"

فیروز بخت ۔ "آپ درست فرماتے ہیں، یہ ہو سکتا ہے، لیکن حضرت شاہ صاحب نے ایک ایسا مشورہ دیا ہے کہ اگر اس پر آپ عمل کریں تو شجاع الدولہ جیسے دوسرے لوگوں کو با جھک مار کے ہمارے ساتھ آنا پڑے گا۔ ہماری رفاقت کرنا پڑے گی۔ ہمارے دوش بدوش دشمن سے جنگ کرنی پڑے گی، اور اگر انہوں نے ایسا نہ کیا تو یقین کیجئے ان کا بھی وہی حشر ہو گا۔ جو دشمن کا ہو کر رہے گا!"

نجیب الدولہ ۔ "لیکن حضرت شاہ صاحب کا وہ کون سا مشورہ ہے۔ جس کا تم ذکر کر رہے ہو؟ مجھے اب تک تم نے بتایا کیوں نہیں؟ بتاؤ، کہو، انہوں نے کیا فرمایا ہے، ان کے ارشاد کی تعمیل میرا فرض ہے، وہ اگر فرمائیں تو میں سمندر میں کود پڑوں!"

فیروز بخت ۔ "حضرت شاہ صاحب نے فرمایا ہے کہ احمد شاہ ابدالی کو دعوت دی جائے

کہ وہ ایک مرتبہ پھر اپنی فوج لے کر یہاں آئے۔ حضرت کو یقین ہے کہ اس مرتبہ اس کا آنا بارآور ہوگا، اور دشمن کی طاقت ہمیشہ ہمیشہ کے لئے پارہ پارہ ہو جائے گی۔ پھر وہ کبھی سر اٹھانے کا نام نہ لے گا! ——— احمد شاہ ابدالی کے کارناموں کی اور اس کے نام کی دہشت ایسی ہے کہ یہ شجاع الدولہ وغیرہ چوں بھی نہیں کر سکتے!"

نجیب الدولہ یہ باتیں سُن کر سر جھکا کر کچھ سوچنے لگا۔ تھوڑی دیر انتظار کے بعد فیروز بخت نے کہا۔ "آپ نے کیا سوچا؟ ——— کیا رائے ہے آپ کی؟"

نجیب الدولہ - "حضرت شاہ صاحب کے رائے کے سامنے میری رائے کی کیا وقعت ہے؛ حقیقت یہ ہے کہ یہ بوریہ نشیں زاویہ نشیں، بہت بڑا مدبر اور مفکر بھی ہے، وہ جس طرح اقلیم روحانیت کا تاجدار ہے، اسی طرح، امورِ جہانبانی اور فرمانروائی کا کشور کشا بھی ہے ——— فیروز! سچ کہنا، کتنی زبردست تدبیر حضرت کے ذہن میں آئی ہے۔ ہم لوگ مردانِ کار ہیں، صرف اسی ایک مقصد کے حصول کی خاطر اپنے ذہن و دماغ اور جہد و عمل کی ساری قوتیں صَرف کر رہے ہیں، مگر ہمارے ذہن نارسا میں یہ بات نہ آئی اور اس فقیر بوریہ نشین نے اپنی خانقاہ میں بیٹھے بیٹھے، ایسی بات سوچ لی جو اس مسئلہ کا آخری حل ہے!"

فیروز بخت۔ "بے شک! حقیقت یہی ہے۔"

نجیب الدولہ۔ "پھر اب کیا کہتے ہو؟"

فیروز بخت۔ "جو آپ فرمایئے!"

نجیب الدولہ۔ "احمد شاہ ابدالی کے پاس کون جائے گا؟"

فیروز بخت۔ "جسے آپ حکم دیں!"

نجیب الدولہ ۔ اگر تم سے اس کارِ اہم کے بجالانے کے لئے کہوں تو ؟

فیروز بخت ۔ "بہ سر و چشم ارشادِ عالی کی تعمیل کروں گا، اور بلا توقف روانہ ہو جاؤں گا ——— !"

نجیب الدولہ ۔ "جزاک اللہ، تو سامانِ سفر تیار کرو، اور جلد از جلد روانہ ہو جاؤ !"

فیروز بخت ۔ "بہت بہتر ——— کل ہی یہاں سے روانہ ہو جاؤں گا !"

نجیب الدولہ ۔ "نہیں اتنی جلدی کی کیا ضرورت ہے، اتنے بڑے سفر سے آئے ہو، چند روز سستا لو، پھر چلے جانا۔"

فیروز بخت ۔ سستا چکا، مجھے کل جانے دیجئے، اِس کارِ خیر میں تاخیر مناسب نہیں !"

نجیب الدولہ ۔ "اب تم یہ کرو کہ ایک خط میری طرف سے احمد شاہ ابدالی کے نام لکھو اور اس میں تمام ضروری واقعات درج کر دو۔"

فیروز بخت ۔ آپ جو کہیں میں لکھ دوں گا۔ لیکن اس کی چنداں ضرورت تو معلوم نہیں ہوتی، اِس لئے کہ حضرت شاہ صاحب نے احمد شاہ ابدالی کے نام بھی ایک خط مجھے دیا ہے ۔ !"

نجیب الدولہ نے پوچھا ۔

"احمد شاہ ابدالی کے نام ؟"

فیروز بخت نے کہا ۔ "جی ——— اور بہت مفصل لکھا ہے !"

"کیا لکھا ہے اس میں ؟"

"یہ میں نہیں جانتا ۔ میں نے نہ اُسے پڑھا ہے نہ پڑھنے کا ارادہ رکھتا ہوں اِس لئے

کہ حضرت شاہ صاحب نے تاکید فرما دی تھی کہ یہ خط احمد شاہ ابدالی کے ہاتھ میں دیا جائے۔"

"تم میں بھی اشتیاق کے باوجود اصرار نہیں کرنا۔ تم شوق سے یہ سربند لفافہ لے جاؤ۔ مجھے خدائے مقلب القلوب سے امید ہے کہ وہ احمد شاہ کے دل میں نیکی ڈال دے گا، اور وہ ضرور ایک مرتبہ پھر اپنا لشکر لے کر یہاں پہنچ جائے گا۔"

"بس مجھے اب جانے دیجئے!"

"خدا حافظ! ——— صبح ہوتے ہی تم سامانِ سفر تیار کر کے روانہ ہو جاؤ!"

نجیب الدولہ فیروز بخت سے رخصت ہو کر آہستہ آہستہ قدم رکھتا ہوا، اپنے خیمہ کی طرف چلا گیا، وہ کسی گہری فکر میں غرق تھا!

باب ۳۵

پنجاب مرہٹوں کے قبضہ میں

لاہور اور ملتان کا گورنر تیمور شاہ تھا۔ یہ احمد شاہ ابدالی کا بیٹا تھا، چونکہ اس سے قبل احمد شاہ نے عماد الملک غازی الدین کی شرارتوں کو معاف کر دیا تھا، اس لئے خیال تھا اب وہ راہ راست پر آگیا ہے۔ اور وفاداری کے ساتھ اپنے فرائض انجام دے گا، اسی لئے لاہور اور ملتان کے فوجی استحکام کی طرف زیادہ توجہ نہیں کی گئی۔

لیکن عماد الملک اپنی ذات کے علاوہ دنیا میں کسی کا وفادار نہ تھا، وہ نجیب الدولہ کو تباہ و برباد کر دینا چاہتا تھا۔ جب مرہٹوں کی مدد کے باوجود وہ اس مقصد میں کامیاب نہ ہو سکا تو اس نے ایک زبردست چال چلی، اس نے مرہٹوں کو ترغیب دی کہ وہ لاہور اور ملتان پر قبضہ کریں، تیمور شاہ کے پاس کوئی زبردست فوج نہیں ہے، وہ صرف اپنے باپ کی ہیبت کے بل پر وہاں حکومت کر رہا ہے۔ اس کا پھینکا ہوا یہ پانسہ کامیاب ہوا ایک مرتبہ پھر بازی اس کے ہاتھ آگئی!

آدینہ بیگ عماد الملک غازی الدین کا خاص الخاص آدمی تھا، احمد شاہ نے اس کی خطائیں معاف کر کے اُسے تیمور شاہ کا معاون بنا دیا تھا۔ تیمور شاہ بھی اس کی چرب زبانی

سے متاثر ہو کر اس پر بھروسہ کرنے لگا تھا، آج کل آدینہ بیگ دلی آیا ہوا تھا اور غازی الدین کے پاس مقیم تھا۔

دوپہر کا وقت تھا، عماد الملک اپنا دربار برخاست کر چکا تھا، وہ خاموش اور متفکر نظر آرہا تھا۔ آدینہ بیگ بھی چپ چاپ بیٹھا تھا، اس خاموشی کو جب کافی دیر گزر گئی تو آدینہ بیگ سے ضبط نہ ہو سکا، اس نے کہا۔ "کیا بات ہے آج میں آپ کو بہت مغموم دیکھ رہا ہوں؟"

ایک ٹھنڈی سانس لے کر عماد الملک نے کہا۔ "ہاں —— اور میرے اس غم کو تم ہی دور کر سکتے ہو!"

آدینہ بیگ۔ "میں تو حکم کا بندہ ہوں —— لیکن سمجھ میں نہیں آتا، آپ کو کیا فکر ہو سکتی ہے عالمگیر ثانی کو آپ نے قتل کرا دیا، شاہجہان ثانی کے نام سے جس مہرہ کو تختِ سلطنت پر بٹھایا ہے اس کی مجال بھی نہیں کہ آپ سے سرتابی کر سکے، مرہٹے آپ کی پشت پر ہیں، ان کی ساری کامیابیاں اور کامرانیاں آپ کی جودتِ طبع، اور فکرِ رسا کی رہینِ منت ہیں، آپ کی تدبیریں اور حکمتیں نہ ہوتیں تو کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے، آپ بجا طور سے مرہٹوں کے بارے میں کہہ سکتے ہیں۔

منم کردہ ام رستم داستاں

آپ نے اگر مرہٹوں کو مدد نہ پہنچائی ہوتی تو آج بھی کسی ریاست میں یہ سپاہی بن کر ملازمت کر رہے ہوتے، وہ آپ ہیں، جس نے انہیں اتنے عروج پر پہنچایا، کہ اب وہ ایک بڑے حصہ ملک پر فرمانروائی کر رہے ہیں اور سارے ہندوستان پر ان کا سکہ بیٹھا ہوا ہے!"

عماد الملک۔ "ٹھیک کہتے ہو، میرے عزیز! یہ جو کچھ تم نے کہا، جو کچھ تم نے کہا، یہ حرف

تصویر کا ایک رُخ ہے، لیکن ایک دُوسرا رُخ بھی تو ہے، وہ ہے نجیب الدولہ اور اس کا پشت پناہ احمد شاہ ابدالی، جب تک یہ کانٹا نہ نکل جائے۔ میں چین سے نہیں بیٹھ سکتا!

آدینہ بیگ: "آپ نے کوشش تو بہت کی؟"

عماد الملک۔ "ہاں لیکن کامیاب نہ ہو سکا"

آدینہ بیگ۔ "میرا تو یہ خیال تھا کہ اس مرتبہ مرہٹے، نجیب الدولہ اور اس کے ساتھیوں کا نام و نشان بھی باقی نہ رہنے دیں گے۔ شروع میں انھیں کامیابی بھی ہوئی تھی کیونکہ نجیب الدولہ اس طرح محصور ہو گیا تھا کہ ظاہر ہو رہا تھا، اب چند ہی روز میں وہ موت کے گھاٹ اُتر جائے گا!"

عماد الملک۔ "ایسا ہی ہوتا لیکن کمبخت شجاع الدولہ بیچ میں ٹپک پڑا۔ اس کی وجہ سے جیتی ہوئی بازی ہر گئی، ورنہ مرہٹوں نے پالا مار لیا تھا"

آدینہ بیگ۔ "لیکن شجاع الدولہ تو اپنا آدمی تھا، آپ کو بھی بہت مانتا ہے، مرہٹوں سے بھی اُس کا بڑا یارانہ تھا، پھر یہ انقلاب عظیم کیسے رُونما ہو گیا کہ وہ آپ کا اور مرہٹوں کا ساتھ دینے کے بجائے نجیب الدّولہ کی مدد کرنے اپنا لاؤ لشکر لے کر پہنچ گیا، حالانکہ میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ پٹھانوں سے اُسے بڑی نفرت ہے، پٹھانوں کو ہمیشہ وہ گنوار کے الفاظ سے یاد کرتا ہے۔ کہتا ہے ان لوگوں کو آدمی کہنا آدمیت کی توہین ہے، ان میں نہ تہذیب ہے نہ شائستگی، نرے اُجڈ گنوار ہیں!"

عماد الملک۔ "ہاں بھئی ان تمام کے باوجود پہنچ ہی گیا، وہ نجیب الدولہ کی مدد کو"

آدینہ بیگ۔ "کیا راز ہے، کچھ سمجھ میں نہیں آتا!"

عمادالملک ۔ "راز کچھ نہیں ہے، یہ سب شرارت اسی نمک حرام فیروز بخت کی ہے مجھے رتی رتی حال معلوم ہے!"

آدینہ بیگ ۔ "اوہ فیروز بخت!"

عمادالملک ۔ "ہاں وہی ——— وہ سانپ جو میرے ہاتھ سے نکل گیا اور اب میں اس کا کچھ نہیں کر سکتا!"

آدینہ بیگ ۔ "ایک اور ہستی کو آپ بھول ہی گئے۔"

عمادالملک ۔ "وہ کون؟ ——— ہاں میں سمجھا، تمہاری مراد شاہ ولی اللہ سے ہے ——— لیکن میرے دوست اس زہر کا کوئی تریاق میرے پاس نہیں ہے۔ اگر شاہ صاحب پر ہاتھ ڈالتا ہوں، تو ابھی سارے شہر میں غدر برپا ہو جائے گا، دِلّی کے مسلمان بادشاہوں کے قتل کو برداشت کر لیتے ہیں۔ لیکن وہ ایک لمحہ کے لئے بھی اسے گوارا نہیں کریں گے کہ خانقاہ کو کوئی ٹیڑھی آنکھ سے دیکھے، اسی لئے کیجہ پر سِل رکھے چپ چاپ بیٹھا ہوں!"

آدینہ بیگ ۔ بجا فرمایا ——— تو آخر آپ نے کیا سوچا ہے؟ اب کیا ارادے ہیں؟ اونٹ کس کروٹ بیٹھے گا؟

عمادالملک ۔ میری سکیم اگر کامیاب ہو جائے تو پھر نہ شاہ صاحب سے مجھے کوئی اندیشہ رہے گا، نہ فیروز بخت سے، بلکہ میں تو یہ کہتا ہوں کہ نجیب الدولہ کا بھی قلع قمع ہو جائے گا، اور احمد شاہ ابدالی کی بھی پھر کبھی جرأت نہیں ہوگی کہ وہ ہندوستان کا رُخ کر سکے، پھر میں ہوں، اور مرہٹے، اور یہ سارا ہندوستان!"

آدینہ بیگ ۔ "لیکن اسکیم کیا ہے؟ ذرا فرمایئے!"

عماد الملک۔ "یہ کہ پنجاب پر قبضہ کر لیا جائے۔ احمد شاہ کے بیٹے، تیمور شاہ کو وہاں سے بے دخل کر دیا جائے، بلکہ ہو سکے تو مار ڈالا جائے۔"

آدینہ بیگ کچھ دیر خاموش رہا۔ پھر اُس نے کہا: "ترکیب تو واقعی بڑی اچھی ہے۔ لیکن پنجاب پر حملہ کرنا اور اُسے فتح کر لینا آسان تو نہیں ہے، وہاں کی گورنری ابدالی کے بیٹے کے ہاتھ میں ہے اور خود ابدالی بھی حسبِ ضرورت فوراً وہاں پہنچ سکتا ہے۔"

عماد الملک۔ "نہیں ــــــ مجھے تمہاری رائے سے اتفاق نہیں، اگر پنجاب پر قبضہ کر لیا جائے تو ابدالی کا فتنہ ہمیشہ کے لئے دب سکتا ہے، ابدالی ہم پر اِس لئے غالب نہیں آیا تھا کہ وہ بہت طاقتور تھا، اور ہم کمزور تھے، اِس لئے غالب آیا تھا کہ ہم غافل تھے اور وہ برقِ جہندہ بن کر ہمارے سر پر آن گرا تھا!"

آدینہ بیگ۔ "لیکن اب؟"

عماد الملک۔ "اب حالات بدل چکے ہیں، اب ہم غافل نہیں چوکس ہیں، ہم میں اب اتنی سکت ہے کہ دشمن کے چھکے چھڑا دیں۔ اسے پامال کر دیں۔ اس کی قوت و طاقت اور شوکت و حشمت کا خاتمہ کر دیں، اب اگر اس نے ہمیں چھیڑا تو ہم اسے ایسا سبق دیں گے کہ وہ ہمیشہ یاد رکھے گا، ہمارے پاس مرد و ملخ سا لشکر ہے بے اندازہ روپیہ ہے، بہترین قسم کا ساز و سامانِ جنگ ہے، اعلیٰ درجہ کا توپ خانہ ہے، بہادر اور کارآزمودہ فوج ہے۔ ہم ایک ایک انچ زمین کے لئے لڑیں گے اور دشمن کے دانت کھٹے کر دیں گے۔"

آدینہ بیگ۔ "میں نے مانا آپ جو کچھ کہہ رہے ہیں سچ ہے۔ لیکن میں نے ان چیزوں میں سے ایک چیز بھی نہیں دیکھی۔ جن کا ابھی آپ نے ذکر فرمایا۔ یعنی وہ مرد و ملخ

کہاں لشکر، وہ بے انداز روپیہ، وہ بہترین قسم کا ساز و سامانِ جنگ وہ اعلیٰ درجہ کا توپ خانہ وہ بہادر اور کار آزمودہ فوج —— آخر یہ سب چیزیں کہاں ہیں؟"

عماد الملک نے ایک قہقہہ لگایا، اور کہا: "تم نے شاید مرہٹوں کی فوج نہیں دیکھی؟"

آدینہ بیگ۔ "دیکھی ہے —— وہی فوج جس کے نجیب الدولہ اور شجاع الدولہ نے ابھی حال میں چھکے چھڑا دیئے۔"

عماد الملک۔ "نہیں آدینہ بیگ، تم نہیں سمجھے، اِس فوج میں مرہٹوں سے زیادہ ادھر اُدھر کے لوگ بھر گئے تھے۔ تم کو معلوم ہونا چاہیے، سندھیا، ہلکر، گائیکواڑ، بھونسلہ، یہ سب بجائے خود بہت بڑی طاقت ہیں، اور جب یہ سب مل کر ایک جھنڈے تلے جمع ہوں گے۔ اور رگھوناتھ ان کا سردار ہوگا، تو یہ ساری دُنیا کو شکست دے سکیں گے، کوئی ان کے سامنے ٹِک نہیں سکے گا۔ وہ ابدالی، دیکھ لینا دُم دبا کے بھاگے گا، اور ہاں سورج مل جاٹ بھرت پور کا فرمانروا بھی تو ہمارے ساتھ ہے، یہ جاٹ کسی طرح مرہٹوں سے کم نہیں۔"

آدینہ بیگ۔ "لیکن ان ترک تازیوں کا حاصل کیا ہوگا؟"

عماد الملک۔ "اب تم نے ایک معقول بات پوچھی —— حاصل یہ ہوگا کہ ہمارے دشمن ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائیں گے، اور ہم دادِ عیش دیں گے، حکومت کریں گے، دِلّی کے تخت پر ہمارا بادشاہ ہوگا، مرہٹے ہماری فوج ہوں گے، اور یہ خاکسار یعنی غازی الدین عماد الملک، امیر الامرا اور وزیر الوزرا ہوگا!"

آدینہ بیگ نے ہنس کر پوچھا، "اور میری کیا حیثیت ہوگی؟"

عماد الملک۔ "جواب تک رہی ہے —— تم ہمیشہ میرے دستِ راست اور قوّت

باز و رہے ہو، آئندہ بھی رہو گے اب اور کیا اس سے زیادہ کچھ چاہتے ہو؟"

آدینہ بیگ ۔"نہیں، بالکل نہیں ——— صرف یہی چاہتا ہوں، میرے لئے کافی ہے ۔"

عماد الملک ۔"بس اب تم تیار ہو جاؤ!"

آدینہ بیگ ۔"آپ مجھے ہر وقت اور ہمیشہ تیار پائیں گے!"

باب (۳۶)

لاہور پر مرہٹوں کا قبضہ

تیمور شاہ اطمینان و عافیت کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ رعایا شاد تھی، اور دشمن ناشاد، ضروریات زندگی کی ارزانی کا یہ عالم تھا کر جس شخص کی بیس روپیہ مہینہ کی آمدنی تھی، وہ بھی اپنے پورے کنبے سمیت ٹھاٹھ کی زندگی بسر کرتا تھا۔

قلعہ کی بارہ دری میں تیمور شاہ اپنے چند مصاحبین کے ساتھ بیٹھا تھا۔ ادھر ادھر کی باتیں ہو رہی تھیں، اتنے میں تیمور شاہ نے کہا۔ "آدینہ بیگ کو دتی گئے ہوئے بہت دن ہو گئے وہ وہ اب تک نہیں آیا، نہ جانے کیا بات ہے؟"

ایک مصاحب علی مردان نے کہا۔ "بڑا خطرناک آدمی ہے عالی جاہ — کہیں کمبخت کوئی گل نہ کھلائے۔ اس کی یہ مسلسل غیر حاضری، اور خاموشی ضرور کوئی معنی رکھتی ہے۔"

تیمور شاہ "لیکن اب وہ کیا کر سکتا ہے؟ ایک مرتبہ غداری کی تھی، لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔"

علی مردان۔ "عالی جاہ، یہ نہیں — یہ فرمایئے کہ اُس نے غداری کی اور غداری کا انعام اسے یہ ملا کر وہ لاہور اور ملتان کے گورنر تیمور شاہ کا معاون بنا دیا گیا

پہلے وہ غازی الدین کی طرف سے یہاں کا گورنر تھا۔ اب احمد شاہ ابدالی کی طرف سے

یہاں کے گورنر کا معاون ہے۔ جو سہولتیں اُسے پہلے حاصل تھیں، ان سے کہیں زیادہ اب حاصل ہیں۔"

تیمور شاہ۔ "تو تمہارا مقصد یہ ہے کہ وہ وہاں کوئی سازش کر رہا ہے؟ کیا تمہارا خیال ہے کہ وہ ہمیں دھوکا دے گا؟ اس کے ساتھ میرے والد نے اور میں نے جو سلوک کیا ہے اسے وہ فراموش کر دے گا؟"

علی مردان۔ "غلام کا دل یہی کہہ رہا ہے؟"

تیمور شاہ۔ "تم ہمیں اتنا کمزور سمجھتے ہو کہ ہم اُس کی سازشوں کے سامنے بے بس ہو جائیں گے؟"

علی مردان۔ "نہیں میرے آقا۔ میں یہ نہیں سمجھتا۔"

تیمور شاہ۔ (برہمی کے ساتھ) "پھر ان باتوں کا مطلب؟"

علی مردان۔ (کانپ کر) "صرف انتباہ، عالی جاہ، اور کچھ نہیں ——— عاقبت گرگ زادہ گرگ شود، اس سے ہمیں خطرہ ہے وہ ایک مستقل خطرہ ہے، اُسے نظر انداز نہ کرنا چاہئے۔"

تیمور شاہ۔ "ہم تمہارا مطلب سمجھے، تمہارے اخلاص اور وفاداری کی ہمارے دل میں قدر ہے۔"

اتنے میں ایک ہرکارہ ہانپتا کانپتا حاضر ہوا، گرد سے اٹا ہوا، چہرہ اترا ہوا، بدحواس پریشان، مضطرب!

سب نے اس کی یہ کیفیت دیکھی اور حیرت سے اس کی طرف تکنے لگے تیمور شاہ نے پوچھا۔ "کیا بات ہے؟"

ہرکارہ پسینہ میں شرابور ہو رہا تھا۔ دہشت کے باعث اس کی زبان بند تھی۔

تیمور شاہ نے شیر کی طرح گرج کر کہا: "کیا بات ہے؟ تم اتنے بدحواس کیوں ہو رہے ہو؟ ـــــ کیا دشمن چڑھ آیا؟"

ہرکارہ: "عالی جاہ! آپ صحیح فرماتے ہیں۔"

تیمور شاہ: "یعنی؟"

ہرکارہ: "دشمن ہمارے سر پر پہنچ گیا ہے۔"

تیمور شاہ: "دشمن؟ کون دشمن؟"

ہرکارہ: "پیشوا کا بھائی رگھوناتھ، ایک بہت بڑا لشکر لے کر ہمارے سر پر پہنچ چکا ہے!"

تیمور شاہ: "رگھوناتھ!"

ہرکارہ: "عالی جاہ ـــــ رگھوناتھ۔"

تیمور شاہ: "کہاں ہے وہ؟"

ہرکارہ: "شہر کے بالکل قریب پہنچ چکا ہے، چند لمحوں کی دیر ہے کہ وہ شہر میں داخل ہو جائے گا عالی جاہ۔"

تیمور شاہ: "ہوں ـــــ اس کی فوج کتنی ہے، اندازاً؟"

ہرکارہ: "حدِ شمار سے خارج۔"

تیمور شاہ: "اور بھی کوئی خاص بات معلوم ہوئی؟"

ہرکارہ: "عالی جاہ ـــــ اس لشکر کے ساتھ، عالی جاہ، اس لشکر کے ساتھ عالی ـــــ!"

تیمور شاہ: (ڈانٹ کر) "صاف صاف، کیوں نہیں کہتا، اس لشکر کے ساتھ کون سی قیامت آ رہی ہے؟"

ہرکارہ :۔ "آدینہ بیگ!"

تیمور شاہ :۔ "آدینہ بیگ بھی اس لشکر کے ساتھ موجود ہے؟ وہ چڑھا کر لایا ہے ان لوگوں کو؟"

ہرکارہ :۔ "عالی جاہ!"

علی مردان :۔ "آدینہ بیگ اس فوج کو اس لئے چڑھا لایا ہے کہ وہ جانتا ہے ہم جنگ کے لئے تیار نہیں ہیں۔ ہمارے پاس نہ کوئی بڑی فوج ہے، نہ ساز و سامانِ جنگ، آدینہ بیگ اس لئے ساتھ آیا ہے کہ وہ ہماری کمزوریوں سے ہمارے کمزور پہلوؤں سے واقف ہے اس کو ہماری فوج کی صحیح تعداد معلوم ہے؟ اسے ہمارے اسلحہ خانے کا ہر راز معلوم ہے، اسے ہمارے خزانہ کا حال بھی معلوم ہے، وہ ہمارے ہر راز سے واقف ہے گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے!"

تیمور شاہ نے جلال کے عالم میں کہا۔ "ہاں لیکن میں اُس کی گردن کاٹ کر رہوں گا، میں مرہٹوں کو شکست دوں گا۔ میں دشمن کے اس لشکر گراں کا مقابلہ کروں گا۔ تیمور شاہ جب تک زندہ ہے۔ دشمن لاہور کی سرزمین پر قدم نہیں رکھ سکتا۔ میرا حوصلہ قائم ہے۔ میری ہمت بلند ہے، میں زندگی سے زیادہ موت کو عزیز رکھتا ہوں!"

علی مردان :۔ "عالی جاہ نے سچ فرمایا۔ لیکن اس وقت ہم دشمن سے لڑنے کی سکت نہیں رکھتے۔"

تیمور شاہ نے بپھر کر کہا۔ "تو تمہارا مطلب یہ ہے کہ میں سپر انداز ہو جاؤں؟ ہتھیار ڈال دوں؟"

علی مردان :۔ "جنگ میں کبھی ہار ہوتی ہے کبھی جیت، کبھی آگے بڑھنا پڑتا ہے کبھی پیچھے

بٹنا پڑتا ہے۔ کبھی ہتھیار چھیننے پڑتے ہیں، کبھی ڈالنے پڑتے ہیں۔ یہ سب کچھ لڑائی میں جائز ہے!"

تیمور شاہ:۔ "ہاں جائز ہے ــــــ لیکن تیمور شاہ کے لئے نہیں، وہ اس وقت تک لڑتا رہے گا جب تک اس کے بدن کا آخری قطرۂ خون ختم نہ ہو جائے!"

علی مردان:۔ "ہم جاں نثار ہیں اور حضور کے ساتھ ہیں۔"

اتنے میں شور و غل کی آوازیں آنے لگیں۔ ایک ہلچل برپا ہو گئی، اور اس نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ "شاید دشمن آگیا!"

اسی اثنا میں تیمور شاہ کا سپہدار سامنے آیا، اور اس نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ "دشمن نے شہر پر قبضہ کر لیا۔ ہماری مختصر سی فوج نے مدافعت کی، جان لڑا دی، بہت سے قتل ہوئے، باقی گرفتار ہو گئے۔ دشمن کی جتنی فوج شہر میں داخل ہوئی ہے، اس سے کہیں زیادہ ابھی باہر ہے، رعایا پر ظلم ہو رہا ہے، عالی جاہ! کسی کو امان نہیں ملتی، جو سامنے آتا ہے، ہلاک کر دیا جاتا ہے، لوٹ مار کا بازار گرم ہے، دوکانیں لوٹی جا رہی ہیں۔ گھر لٹائے جا رہے ہیں، نہ عورتوں کی عصمت محفوظ ہے نہ ان کا زیور، دشمن اب قلعہ کی طرف بڑھ رہا ہے"

تیمور شاہ:۔ "ہاں اس کے پاؤں کی آہٹ میرے کانوں میں پہنچ رہی ہے ــــ اور تلوار کی جھنکار بھی!"

سپہدار:۔ "صرف چند قیمتی لمحات ہمارے پاس ہیں۔ میں نے سارے انتظامات مکمل کر لئے ہیں، عالی جاہ!"

تیمور شاہ:۔ "تمہارا مطلب؟"

سپہدار۔ "اگر ابھی ہم چور دروازے سے نکل سکیں، تو بچ سکتے ہیں، ورنہ پھر یہ موقع ہاتھ سے
نکل جائے گا!"

تیمور شاہ۔ "تم چاہتے ہو کہ میں بھاگ چلوں؟"

سپہدار۔ "عالی جاہ!"

تیمور شاہ۔ "تم جا سکتے ہو!"

سپہدار۔ "عالی جاہ! اپنی قیمتی جان ضائع نہ کیجئے۔"

تیمور شاہ۔ "تمہیں اجازت ہے تم جا سکتے ہو، تمہارے ساتھ جو جانا چاہے وہ بھی جا
سکتا ہے، میں ہر شخص کو اجازت دیتا ہوں کہ وہ اس نادر موقعے سے فائدہ اُٹھائے چور
دروازہ کھُلا ہے، دشمن کو اس کا راستہ نہیں معلوم جاؤ، جلدی کرو ــــ"

سپہدار۔ "اور عالی جاہ؟"

تیمور شاہ۔ "میں یہیں رہوں گا۔ میرے ہاتھوں میں ابھی سکت ہے، ابھی میں تلوار چلا سکتا
ہوں، جب تک یہ سکت موجود ہے، جب تک تلوار چلانے کی طاقت موجود ہے
تیمور شاہ یہیں رہے گا!"

سپہدار۔ "عالی جاہ! اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں؟"

تیمور شاہ۔ "مزاق کھوٹی نہ کرو، وقت رائیگاں مت کرو، میں اپنے فیصلہ پر قائم ہوں میرا
فیصلہ کوئی نہیں بدل سکتا!"

سپہدار۔ "ہمیں اپنی زندگی آپ کی جان سے زیادہ عزیز نہیں، ہم بھی یہیں رہیں گے
یہیں مریں گے!"

اِتنے میں ایک اور آدمی نے آکر اطلاع دی کہ دشمن قلعہ میں داخل ہو گیا ہے قلعہ

کے مٹھی بھر سپاہیوں نے ڈٹ کر مقابلہ کیا، لیکن اب وہ بھی بے بس ہو چکے ہیں۔" یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ مرہٹہ سپاہیوں کا ایک دستہ اس طرف بڑھتا نظر آیا۔

سپہدار نے کہا: "حضور وہ آگئے!"

تیمور شاہ نے جواب دیا: "میں دیکھ رہا ہوں!"

اور پھر وہ تلوار سونت کر آگے بڑھا اور اس دستہ پر ٹوٹ پڑا۔ اُس کی دیکھا دیکھی اس کے سپاہی تلواریں لے کر بڑھے، اور گتھ گئے۔ قلعہ کے اس حصّہ میں صرف یہی دستہ رہ گیا تھا۔ دوسرے دستے اندرون قلعہ لُوٹ مار کر رہے تھے، تیمور شاہ نے بڑی بے جگری اور بہادری کے ساتھ مقابلہ کیا۔ جب زخموں سے چُور اور نڈھال ہو گیا تو تیورا کر گرا، اُسے گرتا دیکھ کر اس کے سپاہیوں نے نرغہ میں لے لیا، اور کسی نہ کسی طرح دشمن کے وار سے بچاتے چور دروازہ کی طرف پہنچے اور وہاں سے ایک نامعلوم سمت کی طرف چلے گئے۔

اس واقعہ کے چند لمحوں کے بعد آدینہ بیگ کچھ مرہٹہ سپاہیوں کے ساتھ اُدھر آیا۔ جب ساری کیفیت معلوم ہُوئی تو اُس نے سر پیٹ لیا۔

"کم بختو! وہ تیمور شاہ تھا ——— نکل گیا بچکر، نکل جانے دیا تُم نے؟ ——— دیکھو نہیں رگھوناتھ سے کیسی سزا دلواتا ہوں!"

پھر وہ اپنے دستہ کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔

مرہٹہ سپاہیوں نے جی بھر کر لاہور کو لوٹا، کئی روز کے بعد کسی حد تک امن و امان قائم ہُوا۔ قلعہ پر اب رگھوناتھ کا قبضہ تھا، اور وہ یہیں مقیم تھا، چند روز یہاں قیام کرنے کے بعد وہ اپنی تازہ دم، اور فاتح اور حوصلہ مند فوجوں کو لے کر آگے بڑھا۔

تیمور شاہ کی شکست کے بعد کہیں جگہ بھی اُس کا مقابلہ نہیں ہوا، جو تھوڑی فوج تھی وہ لاہور ہی میں تھی، وہ بھی اتنی معمولی تعداد میں کہ چند گھنٹے بھی مقابلہ نہ کر سکی۔ رگھوناتھ کی فوجیں لوٹ کھسوٹ کرتی، آبادیوں کو ویران کرتی، کھیتوں میں آگ لگاتی، مکانوں کو ڈھاتی اور سامنے آنے والے ہر شخص کو قتل کرتی بڑی تیزی کے ساتھ آگے بڑھیں۔

راولپنڈی!

اٹک!

یہ مرہٹوں کے عروج کی انتہا تھی!

عملاً اور حقیقتاً اب سارا ہندوستان انہی کے رحم و کرم پر تھا!

دریائے تنگ بھدرا سے کر شمال میں دریائے اٹک تک مرہٹہ پرچم لہرا رہا تھا۔ مرہٹوں کے عامل، ہندوستان کے عرض میں احمد آباد، گجرات سے لے کر بنگال تک، اور طول میں راولپنڈی سے لے کر، ارکاٹ، مدراس، اٹک چوتھ اور سردیش مکھی وصول کر رہے تھے[1]۔"

ان فتوحات سے شاد کام ہونے کے بعد رگھوناتھ اپنی فوج ظفر موج کے ساتھ پھر لاہور وارد ہوا۔ اُس نے آدینہ بیگ سے کہا۔ "تم عماد الملک کو میرا پیام پہنچا دو کہ ہم نے اپنا کام کر لیا، ابدالی کے لڑکے کو بھگا دیا۔ اب ابدالی کبھی جرأت نہیں کر سکے گا، اس دیس کی مقدس سرزمین پر اپنے ناپاک قدم رکھ سکے۔"

آدینہ بیگ نے زمین ادب کو بوسہ دے کر کہا۔ "حضور کا پیام پہنچا دیا جائے گا۔"

---

[1] پانی پت کا خونیں میدان

عماد الملک غازی الدین کو آپ سے شرفِ نیاز حاصل کرنے کی بڑی تمنّا ہے!"

رگھوناتھ نے مسکرا کر کہا: "ہمیں بھی ہے، اور تم عماد الملک کو لکھ دو کہ ہم جلد دِلّی پہنچیں گے!"

پھر رگھوناتھ نے کہا: "آدینہ بیگ ہم تمہاری وفاداری کی قدر کرتے ہیں، تم نے ہمارا ساتھ دیا، ہماری دشواریاں حل کیں۔ اگر تم ہمارے ساتھ نہ ہوتے، جب بھی ہمارے گھوڑوں کی ٹاپوں سے یہ سرزمین پامال ہوتی اور یہاں کی فضا میں ہمارا پرچم لہراتا، لیکن تُم نے ساتھ دے کر ہمارا کام آسان بنا دیا —— بتاؤ تم کیا انعام چاہتے ہو؟"

آدینہ بیگ نے گڑگڑا کر کہا۔ "صرف حضور کی نظرِ کرم!"

رگھوناتھ ہنسا، پھر اُس نے کہا۔ "عماد الملک غازی الدین واقعی بڑا زیرک آدمی ہے کہ اس نے تمہیں اپنا ندیم بنایا، یا تم بڑے سمجھدار ہو کہ تم نے اسے اپنا آقا بنایا۔ بہرحال ہم دونوں سے خوش ہیں اور دونوں کی قیمت پہچانتے ہیں —— تم ہمیں ناقدرشناس کبھی نہ پاؤ گے!"

آدینہ بیگ نے پھر جھک کر شکریہ ادا کیا۔

رگھوناتھ نے کہا: "عماد الملک نے ہمیں لکھا تھا کہ تمہاری قدر افزائی میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا جائے، پہلے ہم نے صرف اس کی بات پر اعتماد کیا تھا، اب تمہیں دیکھ کر اپنے تجربے کی بنا پر کہہ سکتے ہیں کہ واقعی تم بہت قیمتی آدمی ہو —— ہم نے فیصلہ کر لیا ہے، کہ یہاں کی گورنری تمہیں بخش دیں، لیکن یہ بتاؤ تم ہمیں خراج کیا دو گے؟"

آدینہ بیگ۔ "جو حضور مقرر کر دیں، یہ غلام سال کے سال خدمتِ شاہانہ میں پیش کر دیا کرے گا!"

رگھوناتھ نے کہا۔ "۵۰ لاکھ[1] روپیہ سالانہ خراج ہماری خدمت میں پیش کرنا پڑے گا۔"
اتنی بڑی رقم کا نام سن کر آدینہ بیگ چکرا گیا، اُس نے دبی زبان سے کہا: "پچھتر لاکھ!"
رگھوناتھ نے گرج کر جواب دیا۔ "ہاں پچھتر لاکھ —— یہ تمہارے ساتھ رعایت ہے ورنہ میں یہاں سے ایک کروڑ سالانہ وصول کر سکتا ہوں، اگر تم اس کی ذمہ داری نہیں لے سکتے تو انکار کر دو۔ میں دوسرا انتظام بھی کر سکتا ہوں —— میں تو تمہاری وفاداری کا انعام دینا چاہتا تھا۔!"

آدینہ بیگ نے دست بستہ عرض کیا۔ "یہاں کی رعایا سے ۵۰ لاکھ بڑی آسانی سے وصول ہو سکتا ہے، میں اس کی ذمہ داری لیتا ہوں کہ ہر سال یہ رقم حضور کے خزانہ میں پہنچ جایا کرے گی، کبھی فرق نہ آئے گا!"

رگھوناتھ نے کہا:۔

"پھر سوچ لو آدینہ بیگ —— میں جتنا نرم ہوں، اتنا ہی سخت بھی ہوں جس طرح میرے رحم کی انتہا نہیں، اسی طرح میرے قہر و جلال کا اندازہ بھی آسان نہیں۔ جو مجھ سے سچ بولتا ہے، اُسے نوازتا ہوں، جو جھوٹا ثابت ہوتا ہے اُس کو عبرت انگیز سزا بھی دیتا جانتا ہوں۔ یہ باتیں یاد رکھنا، فراموش نہ کر دینا —— ہاں تو بتاؤ ۵۰ لاکھ سالانہ کی ذمہ داری لیتے ہو؟"

آدینہ بیگ۔ "بسر و چشم!"

رگھوناتھ۔ "اور ہاں سائیں جی[2] پٹیل کو یہاں چھوڑے جاتا ہوں، یہ میرے ایجنٹ کی حیثیت

---

[1] پانی پت کا خونی میدان [2] تاریخ ہند

ے رہے گا۔ تمام معاملات کی دیکھ بھال کرتا رہے گا۔ اور تمام حالات سے مجھے مطلع کرتا رہے گا۔ تم اسے میری جگہ سمجھنا۔ اسے کسی قسم کی شکایت کا موقع نہ دینا۔ اس کی ہر بات ماننا۔ اس کے مشوروں پر کان دھرنا۔ اس کی ہدایتوں کو نظر انداز نہ کردینا۔"

آدینہ بیگ نے سرِ عقیدت خم کرکے کہا۔ "ایسا ہی ہوگا، میرے آقا!"

رگھوناتھ: "تو بس اب تم حکومت کرو۔ تمہاری گورنری اس وقت تک قائم رہے گی جب تک تم اپنے وعدے پر قائم رہوگے میں اب زیادہ قیام نہیں کرسکتا۔ ستارہ (پونا) سے بلاوا آیا ہے مجھے جلد از جلد وہاں پہنچنا ہے!"

آدینہ بیگ: "خدا کے حفظ و امان میں تشریف لے جائیے۔ تمام ہیرے جواہرات اور خزانہ اور دوسری قیمتی چیزیں حضور کے لشکر میں پہنچادی گئی ہیں!"

رگھوناتھ: "مجھے علم ہوچکا ہے۔ کوئی ضروری چیز رہ تو نہیں گئی؟"

آدینہ بیگ: "نہیں!"

باب (۳۷)

رگھوناتھ کا پونا میں شاہانہ داخلہ

سیواجی کی قوم اب عروج و عظمت کے انتہائی نقطہ پر تھی۔ پہلے یہ مرہٹے دکن کی مسلم ریاستوں، بیجاپور وغیرہ میں سپاہی کی حیثیت سے بھرتی ہوتے تھے، اب وہ نہ صرف دکن پر بلکہ سارے ہندوستان پر چھائے ہوئے تھے، مہاراشٹر، دکن، گجرات، مالوہ، ناگپور بلکہ بہار اور بنگال تک ان کی عظمت کا سکہ چل رہا تھا، صرف فیض آباد، بریلی، فرخ آباد، الہ آباد، لکھنؤ کے علاقے، شجاع الدّولہ، حافظ رحمت خاں، نجیب الدولہ اور احمد خاں بنگش کے بل پر آزادی کا پرچم لہرا رہے تھے، پنجاب کے علاقہ کو ابدالی نے اپنے ممالک محروسہ میں شامل کر لیا تھا، لیکن یہ علاقہ بھی اب مرہٹوں کے قبضہ میں تھا۔ ہندوؤں کی قدیم مذہبی کتابوں میں دریائے اٹک کو ہندوستان کی آخری سرحد قرار دیا گیا ہے، اب یہ دریا بھی مرہٹوں کے قبضہ میں تھا، رگھوناتھ کے گھوڑوں نے اس دریا کا پانی پیا، مرہٹے سپاہیوں نے اس مقدس دریا میں اشنان کیا، اور رگھوناتھ نے فخر کا سر اونچا کر کے اپنے سپاہیوں سے کہا۔ ہماری مُراد پُوری ہو گئی!

اور یہ سُن کر سب نے اتنے زور سے جے جے کے نعرے لگائے کہ دشت و جبل

گونج اٹھے۔ پھر رگھوناتھ نے اپنی حوصلہ مند اور ظفر مند فوج سے کہا:۔

"ساتھیو، اور دوستو! یہ ہماری آخری منزل نہیں، ابھی ہمیں بہت کچھ کرنا ہے ہم اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھ سکتے۔ جب تک ہندوستان کی حکومت پر قبضہ نہ کرلیں ہم صرف چوتھ اور سردیش مکھی پر قناعت نہیں کر سکتے، ہمیں تخت حکومت چاہئے۔ صرف گوالیار، اندور، ناگپور، اور ستارہ کا نہیں، سارے ہندوستان کا، پنجاب بھی ہمارا ہے اور بنگال بھی ہمارا، اڑیسہ بھی اور بہار بھی، اودھ بھی اور دکن بھی۔ اب اس دیس میں ایک ہی حکومت ہوگی۔ ویسی ہی حکومت جیسی کبھی اشوک نے بنائی تھی۔ اس دیس کا ایک چپّہ کسی غیر ہندو کے قبضہ میں نہیں رہ سکتا۔ ہم لڑیں گے ہم مریں گے۔ ہم خون کا دریا بہائیں گے مگر اپنے اس مقصد سے دست بردار نہیں ہوں گے۔ یہ مقصد ہمیں حاصل کرنا ہے، ہر قیمت پر ہم اس مقصد کو حاصل کر کے رہیں گے!"

رگھوناتھ کی اس تقریر کے دوران میں، اور اس کے بعد پھر جے جے کے نعروں سے فضا میں ایک ہلچل پیدا ہوگئی۔ معلوم ہوتا تھا، یہ زمین، یہ آسمان، یہ جنگل، یہ دریا، یہ فضا سب ہی رگھوناتھ کی عظمت کے سامنے سر بسجود ہیں۔ کوئی بھی اس کے مقابلہ میں آنے کی جرأت نہیں کرسکتا۔ وہ اپنی یکتائی کا نعرہ لگا رہا تھا اور جھکی ہوئی گردنیں اس کی یکتائی کے آگے عقیدت اور وفاداری کا اعلان کر رہی ہیں۔

○

آج ستارہ (پونا) کے بام و در، دیکھنے کے قابل تھے ؎

پھر اس انداز سے بہار آئی
کہ ہوئے مہر و ماہ تماشائی

شہر کی گلیوں اور کوچوں، دوکانوں اور بازاروں، محلّوں اور جھونپڑیوں، سڑکوں اور چوراہوں پر ایک خاص چہل پہل نظر آرہی تھی۔ تماشائیوں کا ٹھٹھ کا ٹھٹھ لگا ہوا تھا۔ خلقت ٹوٹی پڑتی تھی۔ تھالی پھینکے تو سر ہی سر جائے۔ تماشائیوں کے اس ہجوم میں مرد بھی تھے، عورتیں بھی اور بوڑھے بھی، بیمار بھی اور تندرست بھی، زردار بھی اور نادار بھی، ہر طبقہ اور ہر گروہ ہر جماعت کے لوگ موجود تھے اور خوشی سے پھُولے نہ سماتے تھے!

آج رگھوناتھ اپنے لاؤ لشکر سمیت ہیرے جواہرات اور سونے چاندی کے انبار در انبار، اونٹوں اور چھکڑوں پر لادے، مرہٹہ حکومت کے پایۂ تخت میں فتح و کامرانی کا جھنڈا لہراتا ہُوا آرہا تھا!

اب رگھوناتھ صرف پیشوا کا بھائی نہ تھا!

صرف ایک مرہٹہ سردار نہ تھا!

بلکہ پوری مرہٹہ قوم کا ہیرو تھا!

عوام کی عقیدت اور سرخوشی کا یہ عالم تھا کہ ان کا جی چاہتا تھا، وہ خاکِ راہ بن جائیں اور رگھوناتھ کے قدم اس خاک پر سے گذریں۔ یکایک طبل اور دمامہ کی بلند بانگ آوازیں آنے لگیں۔ ان آوازوں میں ہیبت بھی تھی، جلال بھی، اور نشاطِ رُوح بھی!

ڈنکے کی ہر چوٹ اعلان کر رہی تھی کہ مرہٹہ حکومت سارے ہندوستان پر قائم ہو کر رہے گی!

اور یہ اعلان اس ہجوم کے اندر ایک ہلچل، ایک تموّج، ایک طوفانِ مسرّت پیدا کر رہا تھا۔

اتنے میں سواروں کا پرا نظر آیا۔ سب سے آگے خود رگھوناتھ ایک شاندار اسپ پر

رفتار پر سوار چلا آرہا تھا، وہ ہیرے اور جواہرات میں غرق تھا، اس کے چہرے پر اس وقت ایک خاص قسم کا رعب تھا، وہ مسکرا رہا تھا، اور اس کا یہ تبسم خلقت کو خوشی کے نشہ میں مست کئے دے رہا تھا۔ اس کے پیچھے پیچھے بڑے بڑے مرہٹہ سردار، اپنے رہوار کی باگ سنبھالے وقار کے ساتھ چلے آرہے تھے۔ سرداروں کے پیچھے، مرہٹہ فوج کے ابلہ تازہ افسر تھے، اور ان کے پیچھے پیادہ فوج، اور پیادہ فوج کے درمیان میں وہ مالِ غنیمت جو رگھوناتھ نے پنجاب سے حاصل کیا تھا اور اسیرانِ جنگ یعنی غلاموں کی وہ کھیپ جنھیں اپنی عظمت کا سکہ بٹھانے کے لئے، وہ پابہ جولاں لایا تھا، ان میں مرد بھی تھے، اور عورتیں بھی، سب کے چہروں پر حسرت برس رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا، خوشی کی دولت اُن سے چھین جا چکی ہے، لُوٹی جا چکی ہے، اور یہ اب کبھی انہیں واپس نہیں مل سکے گی!

تماشائیوں نے یہ منظر دیکھا تو دفورِ طرب سے دیوانے ہوگئے۔ نظم و ضبط قائم رکھنا مشکل ہوگیا۔ خوشی کے شور نے ایک عجیب طوفانی کیفیت پیدا کردی۔ جوشِ مسرت سے سب دیوانے ہوئے جا رہے تھے!

رگھوناتھ یہ منظر دیکھ رہا تھا اور مسکرا رہا تھا!

یہ اس کی ظفرمندی اور عروج کا شباب تھا!

پیشوا محل میں اپنے عزیز از جان بھائی سے ملنے کے لئے بیتاب تھا، پھاٹک پر اس کا چچازاد بھائی، سداشیو راؤ (جسے بھاؤ بھی کہتے ہیں)، استقبال کے لئے موجود تھا۔

سداشیو راؤ، خوبصورت، بڑا بہادر اور بڑا ماہرِ آئینِ جہاں بانی تھا۔ رگھوناتھ صرف بہادر تھا، اور سداشیو بہادر بھی تھا اور رموزِ مملکت کا راز داں بھی، رگھوناتھ پیشوا کی چمکتی ہوئی تلوار تھا اور سداشیو، پیشوا کا دل بھی تھا اور دماغ بھی، ہاتھ بھی اور پاؤں بھی، آنکھ بھی

اور کان بھی، وہ اسی کی آنکھ سے دیکھتا تھا۔ اسی کے دماغ سے سوچتا تھا، اسی کی زبان سے بولتا تھا۔ وہ رگھوناتھ کے بغیر بھی اپنا کام چلا سکتا تھا، لیکن شیوراؤ کے بغیر پیشوا ایک مہرے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ رگھوناتھ کو مہمات کے سر کرنے کے لئے ہر جگہ بھیجدیتا تھا۔ لیکن سداشیوراؤ کو ایک لمحہ کے لئے بھی جدا کرنے کو تیار نہیں تھا۔

سداشیوراؤ اپنی قیمت سے بھی واقف تھا اور رگھوناتھ کی بھی!

لیکن آج اُسے قیمت میں اتار چڑھا نظر آرہا تھا!

آج وہ محسوس کر رہا تھا کہ رگھوناتھ کی قیمت بہت زیادہ بڑھ گئی ہے اور اس کی قیمت بہت زیادہ گھٹ گئی ہے۔

وہ اپنی آنکھوں سے رگھوناتھ کا استقبال کرتے ہوئے جوش سے بے قابو عوام کو دیکھ رہا تھا۔ اسے معلوم تھا۔ اتنا شاندار اور یادگار استقبال کبھی نہ اُس کا ہوا، نہ پیشوا کا، پنجاب کو فتح کر کے رگھوناتھ اتنا اونچا ہو گیا کہ اب اس تک پہنچنا آسان نہیں رہ گیا۔ اب وہ مہاراشٹر کا سب سے بڑا آدمی ہے جس کی عظمت کے آگے دشمن بھی سر جھکانے پر مجبور ہیں!

وہ یہی سوچ رہا تھا کہ رگھوناتھ کی اور اُس کی آنکھیں چار ہوئیں۔ وہ فوراً گھوڑے سے اتر پڑا، جوش کے عالم میں سداشیو کو سینہ سے لگا لیا، پوچھا۔

"اچھے تو رہے؟"

سداشیوراؤ نے کہا۔ "پرماتما کا شکر ہے کہ زندہ ہوں ——— میں نے کبھی زندگی کی پروانہ کی۔ لیکن آج اس کی قیمت میرے دل میں بہت زیادہ بڑھ گئی ہے!"

"کیوں آج کیا خاص بات ہے؟"

سداشیو راؤ نے جواب دیا: "اگر آج کا جلوس اپنی آنکھوں سے نہ دیکھتا۔ اس سے بڑی محرومی میرے لئے کوئی نہ ہوتی۔ پرماتما کا شکر ہے کہ میں آج کے دن تک عظیم الشان اپنی عقیدت دیکھنے کے لئے زندہ رہا۔"

رگھوناتھ نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا: "اس طرح کے جلوس تم بہت دیکھو گے۔ یہ تو ابھی صرف ابتدا ہے!"

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ پیشوا کا خاص صاحب جنار دہن آیا اور ادب سے ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔

سداشیو راؤ نے پوچھا: "تم کیوں آئے؟ کوئی خاص بات ہے؟"

وہ ادب سے گردن جھکا کر بولا: "جی —— یاد فرمایا ہے!"

سداشیو نے پوچھا: "دربار سے طلبی ہوئی ہے؟"

کہنے لگا: "جی —— سردار رگھوناتھ سے ملنے کے لئے وہ بہت بے تاب ہو رہے ہیں۔ ممکن ہے ضبط نہ کر سکیں۔ خود یہاں تک آ جائیں!"

رگھوناتھ نے کہا: "نہیں، نہیں ایسا نہیں ہو سکتا، ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ میں چلتا ہوں چلو سداشیو!"

سداشیو نے بے دلی سے کہا: "آپ تشریف لے چلئے۔ میں ابھی آیا۔"

جنار دہن نے کہا: "آپ کو بھی ساتھ ساتھ یاد فرمایا ہے!"

رگھوناتھ ہنسنے لگا۔

"اب کہو؟ وہ تو میں پہلے ہی جانتا تھا۔ تمہارے بغیر انہیں ذرا دیر بھی چین نہیں پڑتا تو چلو اب دیر نہ بناؤ —!"

رگھوناتھ اور سداشیو راؤ پیشوا کے دربار میں پہنچے، سارا ایوان بڑے بڑے سرداروں جاگیرداروں اور فوجی افسروں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔

رگھوناتھ کو دیکھ کر پیشوا ضبط نہ کر سکا، بے تابی کے ساتھ تخت سے اترا اور بھائی سے لپٹ گیا۔

"بہت بڑا کام کیا تم نے رگھو!"

وہ ادب سے اس کے پاؤں چھوتے ہوئے بولا، "اگر آپ کی سرپرستی شامل رہی تو میں اس سے بھی بڑے کارنامے انجام دوں گا!"

پیشوا نے کہا: "ہمیں یقین ہے!"

پھر اس نے سداشیو کو حکم دیا کہ رگھوناتھ کو خلعتِ فاخرہ سے سرفراز کیا جائے سداشیو راؤ نے فوراً حکم کی تعمیل کی، پیشوا محبت بھری نظروں سے اپنے بھائی کا یہ اعزاز و اکرام دیکھتا رہا۔

باب (۳۸)

احمد شاہ کا فیصلہ

بڑی کڑیاں جھیل کر فیروز بخت افغانستان پہنچا۔ جسونت راؤ اُس کے ساتھ تھا۔ یہاں پہنچ کر معلوم ہوا، ابدالی اپنے لاؤ لشکر سمیت بلوچستان میں موجود ہے۔ بلوچیوں نے سر اٹھایا تھا۔ ان کی سرکوبی مقصود ہے!

جسونت راؤ کی ہمت پست ہو گئی۔ اُس نے کہا۔ "اب واپس چلئے!"

فیروز بخت نے پوچھا۔ "کہاں؟ ——— تمہارا مطلب یہ ہے کہ ہم ہندوستان واپس چلیں؟"

"جی، یہاں کی بہ نسبت وہاں ہماری زیادہ ضرورت ہے۔ نجیب الدولہ نے شجاع الدولہ سے مل کر مرہٹوں کا بڑھ روک تو لیا، لیکن آپ کو معلوم ہے۔ شجاع الدولہ واپس جا چکا ہے، اور سندھیا اور ہلکر صلح کر لینے کے باوجود اسی اطراف میں پڑے ہیں، نہ جانے کب نیت بدل جائے اور پھر حملہ کر بیٹھیں، ان لوگوں کی دیانت پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا!"

"ہو سکتا ہو، یہ خطرات واقعی ہیں، ہو سکتا ہے کہ تمہارے اندیشے صحیح ہوں لیکن میں شاہ ابدالی سے ملے بغیر واپس نہیں جا سکتا!"

"لیکن وہ تو یہاں ہیں نہیں۔ بلوچستان کا دشوار گذار راستہ طے کرکے ہم لوگ وہاں پہنچ نہیں سکتے۔ وہ نہ معلوم کب آئیں ——— آخر ہم کب تک انتظار کریں گے؟"

"انتظار بالکل نہیں کریں گے!"

"پھر؛ کیا ارادہ ہے آپ کا؟"

"بلوچستان کا ——— میں نے فیصلہ کرلیا ہے، اگر انتظامات ہو گئے، تو آج ہی روانہ ہوجاؤں گا۔ مطلب یہ کہ میں تو اپنی طرف سے تیار ہوں لیکن حکومت کی طرف سے رہنما کا ملنا شرط ہے۔ وعدہ تو ہوا ہے، خدا کرے آج ہی بندوبست ہوجائے۔ اب یہاں میرا جی ذرہ بھی نہیں لگتا!"

جبونت خاموش ہوگیا۔ اُس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

فیروز بخت نے کہا۔"میں جانتا ہوں جبونت تم نے میری خاطر بڑی تکلیفیں اٹھائی ہیں۔ تمہارا یہ پھول سا چہرہ تکلیفیں اُٹھاتے اُٹھاتے اُٹھاتے کملا گیا ہے، تم نے دوستی وفاداری، اور رفاقت کا حق ادا کردیا۔ بس بہت ہوچکا اب تم واپس جاؤ۔ انشاءاللہ جلد ملاقات ہوگی!"

جبونت کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں تو جبونت کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔

فیروز بخت نے کہا۔"ارے تم رونے لگے!"

وہ بولا۔"آپ نے یہ کیسے جانا کہ میں آپ کا ساتھ چھوڑ کر واپس جانا چاہتا ہوں؟"

"یہ میں نے کب کہا۔ لیکن تمہاری تکلیفیں، اور خواہ مخواہ کی زحمتیں بھی تو نہیں دیکھی جاتی ہیں؟"

"آپ کے ساتھ رہنے میں، آپ کا ساتھ دینے میں، آپ کے ساتھ تکلیفیں اٹھانے میں؟

راحت مجھے ملتی ہے۔ اس کا اندازہ بھی کوئی نہیں کر سکتا۔"

فیروز بخت نے ایک قہقہہ لگایا۔ "او ہو، ہمارے جسونت راؤ، شاعر بھی ہیں، نثر میں شاعری کے جوہر دکھاتے ہیں، واہ بھئی واہ، تم تو چھپے رستم نکلے!"

جسونت نے کہا: "مجھے بنانے کی کوشش نہ کیجئے، میرا دل نہ توڑیئے، ساری دنیا سے منہ موڑ کر ایک آپ کا دامن تھاما ہے، یہ سہارا مجھ سے نہ چھینئے!"

"کیسی باتیں کرتے ہو جسونت ——— میں کوئی ہمیشہ کے لئے تو تم سے جدا نہیں ہو رہا ہوں۔ ہمارا ساتھ زندگی بھر کے لئے تو نہیں چھوٹ رہا ہے، تم لشکر جاؤ۔ میں بلوچستان سے ہو کر واپس آتا ہوں۔"

"یہ نہیں ہو سکتا میرے آقا!"

"یعنی تم میرے ساتھ بلوچستان چلو گے؟"

"جی، ضرور!"

"تو چلو ——— میں تو صرف تمہاری تکلیف کے خیال سے منع کر رہا تھا، وہی لمبا دشوار گزار راستہ ہے، قدم قدم پر ٹھوکریں کھانا ہوں گی!"

"کھاؤں گا ٹھوکریں، آپ میری تکلیفوں کا ذرا بھی خیال نہ کیجئے ——— آپ کے ساتھ رہ کر ہر وہ کانٹا جو پاؤں میں چبھتا ہے، میں اسے پھول سے زیادہ جاں نواز سمجھتا ہوں، اور آپ سے جدا ہو کر زندگی کی ہر لذت اور راحت میرے لئے زہر ہے ——— بہرحال میں آپ کے ساتھ چلوں گا!"

جسونت کی ان مخلصانہ باتوں سے فیروز بخت بہت متاثر ہوا۔ اس نے کہا: "ضرور چلو ——— میرا تمہارا معاملہ تو اب وہ ہوتا جا رہا ہے، جس کے بارے میں مومن نے

کلیے ؎

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

واقعہ یہ ہے کہ تمہارے بے ریا اخلاص اور محبت نے مجھے بندۂ بے دام بنا لیا ہے۔ تم میرا اتنا خیال کرتے ہو کہ تمہارے بغیر میں خود بھی ایک کمی سی محسوس کرتا ہوں اپنے اندر۔"

جسونت کا چہرہ پھول کی طرح، یہ باتیں سن کر کھل اُٹھا، ابھی وہ کچھ کہنے نہ پایا تھا، کہ مہمان خانۂ شاہی کا داروغہ آیا اور اُس نے کہا۔

"آپ آج ہی بلوچستان جانے کے لئے تیار ہیں؟"

فیروز بخت۔ "آج ہی نہیں ابھی فوراً۔"

داروغہ مسکرا دیا: "بس تو تیار ہو جائیے۔ ہمارے سپاہیوں کا ایک دستہ ضروری ڈاک لے کر شاہ کی خدمت میں جا رہا ہے۔ اُسے ہدایت کر دی گئی ہے، وہ آپ کو اور آپ کے ساتھی کو بحفاظت تمام شاہ جم جاہ کی خدمت میں پہنچا دے گا۔"

فیروز بخت۔ "اس نوازش کا بہت بہت شکریہ!"

داروغہ۔ "شکریہ کی ضرورت نہیں، یہ تو ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنے بادشاہ کے دوستوں اور جاں نثاروں کا خیال رکھیں، آپ نے شاید مجھے پہچانا نہیں۔ شاہ کے ہمراہ کبھی میں ہندوستان جا چکا ہوں!"

فیروز بخت۔ "ضرور گئے ہوں گے، افسوس کہ آپ سے نیاز نہ حاصل ہو سکا، اس وقت میں دوسری قسم کی زندگی بسر کر رہا تھا!"

داروغہ۔ "نواب نجیب الدولہ بہادر مجھے خوب پہچانتے ہیں، اُن کی مہمانداری کا لطف

بھی اُٹھا چکا ہوں ——— بس تو آپ تیار رہیے، تھوڑی دیر کے بعد آپ کو یہاں سے کوچ کرنا ہے!"

فیروز بخت۔ "بالکل تیار ہوں، اشارہ پاتے ہی چل کھڑا ہوں گا!"

جسونت۔ "ہمارے گھوڑے ہر وقت زین و لگام سے آراستہ رہتے ہیں، نہ وہ تھکتے ہیں، نہ ہم!"

داروغہ نے ایک قہقہہ لگایا، اور چلا گیا۔

○

ہندوستان سے افغانستان تک آنے میں فیروز بخت اور جسونت رائے کو جتنی تکلیف ہوئی تھی، اس سے کہیں زیادہ افغانستان سے بلوچستان جانے میں ہوئی۔ لیکن ان جیالے اور بانکے سواروں نے ہر تکلیف کا خندہ پیشانی کے ساتھ استقبال کیا، اور بلوچستان پہنچ گئے، جہاں احمد شاہ ابدالی بلوچ باغیوں کا زور توڑنے میں مصروف تھا۔

فیروز بخت کو بڑے اعزاز و احترام کے ساتھ شاہی خیمہ کے قریب ایک خیمہ میں اتارا گیا، لیکن شاہ ابدالی جنگی کار گزاری میں اتنا مصروف و منہمک تھا کہ ایک ہفتہ تک باریابی کا موقع نہ مل سکا، ہر روز یہ امید قائم کرتا تھا کہ آج ضرور شرفِ حضوری حاصل ہو گا لیکن انتظار ہی انتظار میں وہ دن گذر جاتا تھا، اور دوسرا دن شروع ہو جاتا تھا۔

ایک ہفتہ کامل انتظار کرنے کے بعد، ایک روز عشا کی نماز کے بعد طلبی ہوئی فیروز بخت ہمہ تن شوق و اضطراب بن کر شاہی خیمہ میں پہنچا، احمد شاہ ابدالی تنہا اپنی مسند پر بیٹھا تھا باس ساخت سادہ حفاظت کے لیے کوئی سپاہی بھی خیمہ کے اندر موجود نہیں تھا، لیکن رعب و جلال کا یہ عالم تھا کہ فیروز بخت جیسا، نڈر اور بیباک آدمی بھی اُسے دیکھ کر کانپ گیا، آنکھیں

چار کرنے کی ہمت نہ کر سکا، سر جھکائے مؤدب دست بستہ کھڑا رہا۔

احمد شاہ نے شفقت کے ساتھ کہا۔ "بیٹھ جاؤ ——— کیا نام ہے تمہارا؟ فیروز بخت؟"

وہ ادب سے بولا۔ "غلام کو فیروز بخت کہتے ہیں!"

احمد شاہ نے مسکرا کر کہا۔ "تمہارا نام بہت اچھا ہے، تمہاری باتوں میں بھی شیرینی ہے یقیناً تم بھی بہت اچھے آدمی ہو گے ——— ہاں کہو، ہمارے دوست اور بھائی نجیب اللہ ولہ کا کیا حال ہے؟"

فیروز بخت۔ "قسمت تھی کہ بچ گئے، ورنہ مرہٹوں نے تباہ کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی!"

احمد شاہ۔ "ہوں ——— اور غازی الدین عماد الملک کی کیا کیفیت ہے؟"

فیروز بخت۔ "وہی جو پہلے تھی، وہی مرہٹوں سے ساز باز، وہی دشمنوں سے یارانہ وہی حصولِ اقتدار کی ناجائز کوششیں، وہی غداروں پر انعام واکرام کی بارش!"

احمد شاہ۔ "ہوں ——— اور عالمگیر ثانی؟"

فیروز بخت۔ "انہیں بھی غازی الدین نے قتل کرا دیا!"

احمد شاہ۔ "قتل کرا دیا؟"

فیروز بخت۔ "جہاں پناہ، غلام سچ عرض کر رہا ہے!"

احمد شاہ۔ "اب تختِ حکومت پر کون متمکن ہے؟"

فیروز بخت۔ "ایک نیا مہرہ، جسے غازی الدین نے شاہجہاں ثانی کے نام سے بٹھا رکھا ہے۔"

احمد شاہ: "شاہ جہاں ثانی!"

فیروز بخت: "جہاں پناہ ———— کہاں شاہ جہاں جیسا جلیل المرتبت شہنشاہ کہاں یہ شاہِ شطرنج

برعکس نہند نام زنگی کافور!"

احمد شاہ ہنس پڑا، پھر اُس نے کہا: "ٹھیک کہتے ہو!"

کچھ دیر خاموشی رہی، نہ فیروز بخت کی ہمت پڑی کہ قفلِ سکوت کو توڑ دے، نہ احمد شاہ نے سلسلۂ کلام جاری کیا، وہ کسی گہری فکر میں مستغرق تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد اُس نے سر اُٹھایا اور کہا: "تمہیں نجیب الدولہ نے کیوں بھیجا ہے؟"

فیروز بخت: "نجیب الدولہ کی، اور دوسرے مسلمان امراء اور رؤسا، بلکہ صحیح الفاظ میں مسلمانانِ ہند کی تمنا یہ ہے کہ ایک مرتبہ اور آپ تشریف لائیں اور ان تمام عناصر کا قلع قمع فرمائیں جنہوں نے مسلمانوں کو کمزور کر دیا ہے اور دِلّی کی اسلامی حکومت کو بازیچۂ اطفال بنا دیا ہے!"

احمد شاہ نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "ٹھیک کہتے ہو میرے عزیز لیکن سوچو میں اس جھگڑے میں بار بار کیوں حصّہ لوں؟ میں ایک مرتبہ گیا، حالات درست کر دیئے، غازی الدین کی خطائیں معاف کر دیں۔ نجیب الدولہ امیر الامرا بنا دیا۔ پھر بھی یہ لوگ حکومت نہ سنبھال سکے، متحد نہ رہ سکے۔ میرے واپس آنے کے بعد پھر ان کی باہمی کشمکش شروع ہو گئی، شجاع الدولہ اپنے راستہ چلنے لگا، غازی الدین اور نجیب الدولہ پھر آپس میں اُلجھ گئے۔ عالمگیر ثانی بیچارہ قتل کر دیا گیا۔ مرہٹوں کی تاخت و تاراج کا سلسلہ پھر شروع ہو گیا جب بار بار یہی ہوتا ہے تو اس مرتبہ میرے جانے سے کیا ہو گا۔ میں جاؤں گا سب متحد

ہو جائیں گے ۔ واپس آؤں گا، پھر لڑنے لگیں گے ۔مرہٹے پھر موقع سے فائدہ اٹھائیں گے میں فطرت نہیں بدل سکتا۔ ان لوگوں کی فطرت یہی ہے!"

پھر کچھ دیر خاموش رہ کر اُس نے کہا: "نا جائی میں نہیں جاؤں گا، خود میری الجھنیں کیا کم ہیں کہ دوسروں کی ذمہ داری بھی اپنے اوپر لے لوں ——— ہندوستان کی حکومت مسلمان ہے، وہاں کافی تعداد میں مسلمان بستے ہیں۔ میں وہاں سے کوئی ناجائز فائدہ نہیں اُٹھانا چاہتا، نہ حکومت پر قبضہ کرنا چاہتا ہوں، نہ مالِ غنیمت حاصل کرنے کی تمنا ہے، نہ اپنا سفر خرچ لینا چاہتا ہوں۔ اِس کام میں مجھے ذرا بھی فائدہ نہیں ہے۔ نقصان بہت زیادہ ہے۔ مالی نقصان اور ذہنی کوفت۔ میری طرف سے تم نجیب الدولہ سے معذرت کر دینا!"

فیروز بخت نے کہا: "در اصل خدمتِ ہمایونی میں مجھے حضرت شاہ صاحب نے بھیجا تھا!"

احمد شاہ۔ "شاہ صاحب! کون شاہ صاحب؟"

فیروز بخت۔ "حضرت شاہ ولی اللہ صاحب!"

یہ نام سُن کر احمد شاہ کا رنگ متغیّر ہو گیا۔ اُس نے اثر انگیز آواز میں کہا "حضرت شاہ صاحب نے بھیجا ہے؟"

فیروز بخت۔ "جی انھی نے، ان کا خط بھی میرے پاس ہے!"

احمد شاہ۔ "حضرت شاہ صاحب کا خط میرے نام؛ مجھ گناہ گار کے نام! کہاں ہے وہ خط؟"

فیروز بخت نے بڑے ادب و احترام کے ساتھ حضرت شاہ صاحب کا مکتوب

محمد شاہ کی خدمت میں پیش کیا۔ وہ مکتوب کی تعظیم کے لئے سر و قد کھڑا ہو گیا۔ اس نے خط ہاتھ میں لیا، اسے چوما، اور آنکھوں سے لگایا، پھر فیروز بخت کو واپس دیتے ہوئے کہا:
سناؤ!"

فیروز بخت نے خط پڑھنا شروع کیا۔

"یہ چند کلمات ہیں، جن کے لکھے جانے کا باعث حمیّتِ اسلامی ہے، اللہ تعالیٰ ان کلمات کو گوشِ مبارک تک پہنچا دے۔

ملک ہندوستان ایک وسیع ملک ہے، قدیم اسلامی بادشاہوں نے بڑی جدّوجہد کے بعد کئی دفعہ میں جا کر اس ولایت کو فتح کیا......
غیر مسلموں میں ایک قوم مرہٹہ نامی ہے۔ اس قوم نے کچھ عرصہ سے اطرافِ دکن میں سر اٹھا رکھا ہے اور تمام ملک ہندوستان پر اثر انداز ہے۔
شاہانِ مغلیہ میں سے بعد کے بادشاہوں نے عدم دُور اندیشی، غفلت اور اختلافِ فکر کی بنا پر گجراتؔ[1] مرہٹوں کو دے دیا، پھر اسی سستی اور غفلت کی وجہ سے مالوہ[2] بھی ان کے سپرد کر دیا، اور ان کو وہاں کا صوبیدار بنا دیا

---

[1] گجرات کا صوبہ جغرافیائی، اقتصادی، تجارتی، عسکری اور سیاسی اعتبار سے نہایت اہم تھا۔ دکن پر تسلط قائم رکھنے کے لئے اس پر اقتدار ضروری تھا۔ مغلیہ بادشاہوں نے (نظام الملک کی غدارانہ سازش کے باعث) اس علاقہ کو اپنے قبضے سے نکال کر سیاسی بصیرت کے جس فقدان کا ثبوت دیا، اس کی تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو
IRVINE LATER MOGHALS VOL II P. 165, 215

[2] مالوہ کا صوبہ جو لمبے زیادہ تک پھیلا ہوا تھا۔ اس کے مغرب میں راجپوتانہ اور مشرق میں بندیل کھنڈ تھا سلطنت مغلیہ کے لئے اس کی جغرافیائی پوزیشن اور زراعتی اہمیت بہت زیادہ تھی جنوبی اور شمالی ہندوستان

قوی تر ہوگئی، اور اکثر بلادِ اسلام اس کے قبضہ میں آگئے۔ مرہٹوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں سے باج (خراج) لینا شروع کیا، اور اس کا نام چوتھ (یعنی آمدنی کا چوتھائی حصّہ) رکھا۔[2] مختصر یہ کہ دہلی اور دکن کے علاوہ (سارے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۴۳) یہ ایک کڑی کا کام دیتا تھا۔ افیون، گناہ، انگور، چھالیہ وغیرہ کی زبردست کاشت یہاں ہوتی تھی۔ شمالی ہند سے دکن جانے والی فوجوں کو مالوہ ہی سے گذرنا پڑتا تھا۔ اس کے نکل جانے کے بعد مرہٹہ طوفان اُمنڈنے لگا۔ دیکھئے۔

Raghubir Singh : Malwa in Transition per Irvine —

Irvine : Later Mughals Vol II P 242 – 45 –

[1] مرہٹوں نے اپنا اقتدار کس طرح بڑھایا، اس کیلئے ملاحظہ ہو۔

Sarkar Fall of the Mughal Empire Vol I P. 67 – 7 How the Maratha ~~[illegible]~~ Spread — over the Mughal Empire سکیش

[2] چوتھ سے مراد لگان کا وہ چوتھائی حصّہ ہے، جو مرہٹے جبرًا سلطنت مغلیہ کے ان دور افتادہ علاقوں سے وصول کرتے تھے۔ جہاں کے رحم و کرم پر تھے ——— سرجادو ناتھ سرکار کا خیال ہے: "اس ٹیکس کے دینے کے بعد مرہٹوں کے حملوں سے نجات مل جاتی تھی۔ مرہٹوں پر دوسری طاقتوں سے بچانے کی کوئی ذمہ داری عائد نہ ہوتی تھی، یہ تو ڈاکوؤں کو خرید نے کا ایک طریقہ تھا۔" تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو۔

SARKAR : SHIVAJI OR HIS TIMES P 407 – 408

SARKAR : HISTORY OF AURANGZAB VOL IV

SAR : MILATARY SYSTEM OF THE MARHATES

SAR : ADMINISTRATIVE SYSTEM OF THE MARHATAS

ہندوستان پر، مرہٹوں کا تسلط ہے۔ مرہٹہ قوم کا فتنہ بہت بڑا ہے۔ حق تعالیٰ تباہ کرے اس قوم کا جو اس فتنہ کو دبائے، غیر مسلموں کی ایک (دوسری) قوم جاٹ ہے جس کی بود و باش دہلی و آگرہ کے درمیان ہے۔ شہر بیانہ جو کہ اسلام کا قدیم شہر تھا اور جہاں پر علماء اور مشائخ سات سو سال سے اقامت پذیر تھے، اس پر جبراً قہراً قبضہ کر کے مسلمانوں کو ذلت و خواری کے ساتھ وہاں سے نکال دیا، دہلی سے دو کوس کے فاصلہ سے لے کر آگرہ

ؔ مرہٹوں کی ہنگامہ آرائیاں واقعی ایک فتنہ تھیں۔ بنگال کا مشہور شاعر گنگا رام بنگال پر مرہٹوں کے حملوں کا حال لکھتا ہے۔ برگھوں (مرہٹوں) نے دیہاتوں کو لوٹنا شروع کر دیا، کچھ لوگوں کے انھوں نے ہاتھ، ناک اور کان کاٹ لئے، کچھ کو مار ڈالا، خوبصورت عورتوں کو رسیوں میں باندھ لے گئے۔ جب ایک برگی (مرہٹہ) زنا کر چکتا تو دوسرا کرتا تھا، عورتیں چیخیں مار مار کر روتی تھیں، انھوں نے گھروں کو آگ لگا دی اور ہر طرف لوٹ مار کرتے ہوئے گھومے ——— آ سر جادو ناتھ سرکار نے گنگا رام شاعر کی یہ عبارت نقل کی ہے اور لکھا ہے ——— "مرہٹوں کی زنا کاری کے بارے میں بہت بڑی شہرت تھی ملاحظہ ہو۔

Fall of the Mughal Empire vol I

پرتگالی مصنفوں نے بھی مرہٹوں کی ان اخلاق سوز حرکتوں کا سخت الفاظ میں ذکر کیا ہے۔ دیکھئے

Pissurlencar portugueses of Maratha

ملک کے مشہور پنڈت وینیشور ودیا پتی نے ۱۷۴۴ء میں مرہٹوں کے ہنگاموں اور مظالم کا ذکر نہایت مستقل بحث میں کیا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

Fall of the Mughal Empire I P 88

ان بیانات کے پیش نظر شاہ صاحب کے لفظ فتنہ پر غور کیا جائے۔

کے آخر تک لول میں اور میوات کے حدود سے فیروز آباد، اور شکوہ آباد تک عرض میں سورج مل جاٹ تابعض ہوگیا۔ کسی کی طاقت نہیں کہ وہاں اذان و نماز جاری کر سکے، ایک سال ہوا کہ قلعہ اور جو کہ تمام میوات کی نگہداری کے لئے ایک جائے بلند تھی اپنے قبضے میں لے لیا۔ ارکانِ سلطنت میں سے کسی کی مجال نہ ہوئی کہ وہ اس کام سے اس کو روک دیتا۔ جاٹوں نے جو علاقے اپنے قبضے میں کر لئے ہیں وہ ان کے نہیں ہیں بلکہ غصب کئے ہوئے ہیں۔ حاصل کلام یہ کہ ملک ہندوستان میں غیر مسلموں کے غلبہ کی نوعیت یہ ہے جو عرض بیان میں آئی اور مسلمانوں کا ضعف اس حد تک پہنچ گیا ہے جو لکھا گیا، اس زمانہ میں ایسا بادشاہ جو صاحب اقتدار و شوکت ہو، اور لشکرِ مخالف کو شکست دے سکتا ہو، دُور اندیش اور جنگ آزما ہو، سوائے آنجناب کے اور کوئی نہیں ہے، لہٰذا آپ پر فرضِ عین ہے ہندوستان کا قصد کرنا۔ مرہٹوں کا تسلط توڑنا اور ضعفائے مسلمین کو غیر مسلموں کے پنجے سے آزاد کرنا، اگر غلبۂ کفر معاذ اللہ اسی انداز پر رہا تو مسلمان اسلام کو فراموش کر دیں گے اور تھوڑا زمانہ نہ گذرے گا کہ یہ مسلم قوم ایسی قوم بن جائے گی کہ اسلام اور غیر اسلام میں تمیز نہ ہو سکے گی۔ ہم بندگانِ الٰہی حضرت رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو شفیع گردانتے ہیں اور خدائے عزوجل کے نام پر التماس کرتے ہیں کہ ہمت مبارک اس جانب متوجہ فرمائیے۔[1]

لہ شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات۔ خط بہت طویل ہے میں نے مختصر کر دیا ہے۔

فیروز بخت حضرت شاہ صاحب کا مکتوب سُنا رہا تھا! ــــــــــ اور ابدالی نہایت غور سے پوری توجہ اور استغراق کے عالم میں سُن رہا تھا!

جب فیروز بخت شفاعتِ رسول اور واسطۂ خُدا کے الفاظ پر پہنچا، احمد شاہ ابدالی کانپ گیا۔ اُس نے تقریباً چیختے ہوئے کہا:۔

"بس کرو فیروز بخت! بس کرو۔ اب میں اندر ایک لفظ بھی سننے کی تاب و طاقت نہیں رکھتا۔ میں چلوں گا، اپنے آخری سپاہی کا آخری قطرۂ خون بھی اس جہاد فی سبیل اللہ میں خرچ کر دوں گا، اپنے خزانے کی ایک ایک پائی اس کام میں لُٹا دوں گا۔ مجھے مالِ غنیمت نہیں چاہیے، میں اپنے حدودِ مملکت میں توسیع بھی نہیں چاہتا۔ مجھے کسی قسم کا مادی یا دنیا کی نفع درکار نہیں، شاہ صاحب کے الفاظ تیر بن کر میرے دل پر لگے ہیں، میں اب ایک لمحہ یہاں نہیں ٹھہر سکتا۔ جہاد کی پکار شاہ صاحب نے بلند کی ہے۔ میں اس پر لبیک کہتا ہوں!"

اور پھر اُس نے دستِ دعا بلند کر کے کہا:۔

"اے خُدائے بزرگ و برتر! تیرا یہ گناہ گار بندہ، احمد شاہ تجھ سے عہد کرتا ہے اور اس عہد کی ضمانت میں اپنی زندگی پیش کرتا ہے۔ کہ اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھے گا جب تک کفر شکنی کا کام استیصال نہ کر دے۔ جب تک ہندوستان کا تختِ حکومت اس کے جائز وارثوں کے سپرد نہ کر دے، جب تک کُفر کو مغلوب نہ کر دے اور اس دیارِ کفر و طغیان میں اسلام کے پھلنے پھولنے کا سر و سامان مہیا نہ کر دے ــــــــــ اے خدا مجھے توفیق دے کہ میں اپنے اس عہد کو پُورے خلوص اور سچائی کے ساتھ پورا کر سکوں اے خدا مجھے اتنی قوت دے کہ میں کفر کا زور توڑ دوں اور تیرے آخری دین کا بول بالا کر دوں!"

فیروز بخت کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ "آمین یا رب العلمین!"

○

دوسرے روز ابدالی کے شاہی خیمہ میں فیروز بخت کی پھر طلبی ہوئی، وہ جب وہاں پہنچا، تو احمد شاہ وقار اور دبدبہ کی تصویر بنا بیٹھا تھا، سامنے فوج کے بڑے بڑے افسر دست بستہ اور مؤدب کھڑے تھے!

احمد شاہ نے فیروز بخت سے کہا۔ "حضرت شاہ صاحب کا مکتوب بہ آواز بلند سب کو سناؤ!"

فیروز بخت نے ارشاد کی تعمیل کی!

دربار خاص پر سناٹا چھایا ہوا تھا، صرف فیروز بخت کے منہ سے حضرت شاہ صاحب کے الفاظ نکل رہے تھے!

جب فیروز بخت تمام و کمال خط سنا چکا تو احمد شاہ نے رعب دار آواز میں پوچھا۔

"آپ لوگوں نے یہ خط سن لیا؟"

سب نے متفق اللفظ ہو کر عرض کیا: "سن لیا!"

احمد شاہ نے پوچھا۔

"پھر آپ کی کیا رائے ہے؟"

ایک ترجمان نے کہا: "ہماری وہی رائے ہے جو حضور کی رائے ہے، آپ فرمائیں تو ہم سمندر میں کود پڑیں، آپ کا ارشاد ہو تو ہم پہاڑوں سے ٹکرا جائیں، آپ اشارہ کر دیں تو ہم لوگ آگ کے شعلوں سے مقابلہ آرا ہو جائیں، ہم جاں نثار ہیں اور اہل اسلام

لیں و آں کرنا نہیں۔ ہمارا فرض صرف تعمیلِ ارشاد ہے اور بس ——— اس سے زیادہ کچھ نہیں!"

یہ الفاظ سن کر احمد شاہ ابدالی کا چہرہ فرطِ طرب سے چمک اُٹھا۔ بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔ "مرحبا، جزاک اللہ!"

پھر اُس نے قدرے توقف کر کے کہا: "میرے دوستو اور ساتھیو! مجھے تمہاری ذات سے یہی امید تھی۔ الحمدللہ کہ وہ امید پوری ہوئی! ——— لیکن ایک بات صاف الفاظ میں کہہ دینا چاہتا ہوں!"

شاہ پسند خاں نے جو احمد شاہ کا محبوب اور منہ چڑھا جرنیل تھا، کہا: "آپ جو کچھ چاہیں فرمائیے۔ ہمارا جواب تعمیلِ حکم کے سوا کچھ نہ ہوگا!"

احمد شاہ نے بہت سلجھے ہوئے انداز میں کہا: "ہم میں سے ہر ایک کو یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہئے کہ ہم جنگ پر نہیں جہاد پر جا رہے ہیں!"

شاہ پسند خاں: "بجا ارشاد ہوا!"

احمد شاہ: "جنگ پر سب کچھ جائز ہے، جہاد پر بہت سی پابندیاں ہیں، کیا تم عہد کرتے ہو کہ ان پابندیوں کو سچائی اور دیانت کے ساتھ نبا ہو گے؟"

شاہ پسند خاں: "ہم عہد کرتے ہیں!"

احمد شاہ: "تم صرف اس سے لڑو گے جو تم سے لڑنا چاہے!"

شاہ پسند خاں: "بے شک!"

احمد شاہ: "عورتوں، بچوں اور بوڑھوں پر دست درازی کی تمہیں اجازت نہ ہوگی!"

شاہ پسند خاں: "یہ جرأت ہم کبھی نہ کریں گے!"

احمد شاہ۔ "ایک بات اور یاد رکھو!"

شاہ پسند خاں۔ "ارشاد ہو ——— جہاں پناہ کے دہن مبارک سے جو لفظ نکلے گا، بندۂ عاجز اُسے کبھی فراموش نہیں کر سکتے ——— زندگی کی آخری سانس تک!"

احمد شاہ۔ "دلّی میں میرا اور تمہارا داخلہ نادر شاہ اور اس کے اہلِ فوج کی طرح نہ ہوگا۔ ہم وہاں اسی طرح رہیں گے جس طرح ایک بھائی، ایک بھائی کے گھر میں رہتا ہے، دلّی کے کسی باشندے کو تکلیف نہیں پہنچائیں گے۔ کسی قسم کی لوٹ مار کا بازار گرم نہیں کریں گے کسی کے ساتھ سختی اور درشتی کے ساتھ پیش نہیں آئیں گے!"

شاہ پسند خاں۔ "انشاء اللہ ایسا ہی ہوگا!"

احمد شاہ۔ "تو بس اب کوچ کی تیاری کر دو!"

شاہ پسند خاں۔ "صرف حکم کی دیر تھی، ہم ابھی چلنے کو تیار ہیں ——— یہاں ہمارے پاس تھوڑی سی فوج ہے، افغانستان میں ہماری فوج کیل کانٹے سے لیس موجود ہے ایک اشارہ میں وہ تیار ہو جائے گی اور پھر ہمارا لشکرِ گراں ہندوستان کی طرف یلغار کرے گا!"

احمد شاہ نے چیخ کہا۔ "نہیں یہ نہیں ہوگا!"

شاہ پسند خاں لرز کر خاموش ہو گیا۔

احمد شاہ۔ "ہم بلوچستان سے افغانستان جا کر اپنا وقت نہیں ضائع کریں گے!"

شاہ پسند خاں۔ "جہاں پناہ کا حکم سر آنکھوں پر!"

احمد شاہ۔ "جتنی فوج ہمارے ساتھ ہے، اسی کو لے کر ہم یہیں سے آگے بڑھیں گے یہاں سے فرمان بھیجدو، باقی فوج افغانستان سے ہمارے پیچھے پیچھے آئے گی!"

شاہ پسند خاں۔ "ارشادِ ہمایونی کی فوراً تعمیل ہوگی!"

باب (۳۰)

ابدالی آگیا ــــــ!!

بلوچستان میں احمد شاہ اپنا کام ختم کر چکا تھا۔ ادھر تو اس نے افغانی فوج کو ہندوستان کی طرف بڑھنے کا حکم دیا، اور دوسرے روز جو مختصر سی فوج تھی، اُسے لے کر سندھ کی طرف بڑھا، اور شکار پور میں آکر پڑاؤ کیا، یہاں مختصر سا قیام کر کے وہ پھر آگے بڑھا۔ بالائے سندھ سے دریائے اٹک کے کنارے کنارے شمال کی طرف بڑھ کر پشاور پہنچا۔ یہاں افغان سپاہیوں کی ایک تعداد نظر آئی۔

یہ وہ شکست خوردہ اور تباہ حال سپاہی تھے، جو رگھوناتھ کی فوج گراں کا مقابلہ کرتے ہوئے شکست یاب ہوئے تھے، ان کے کپڑے پھٹ گئے تھے۔ جیب خالی تھی، نہ کھانے کا کوئی انتظام تھا نہ قیام کا، نہ سواری تھی نہ سامان، نہ اسلحہ تھا، نہ ہتھیار یہ ادھر ادھر ٹھوکریں کھا رہے تھے، اور خدا سے گڑگڑا کر دعا کر رہے تھے کہ فتح وظفر کی کوئی صورت نکالے۔ انہوں نے اپنے چند آدمیوں کو احمد شاہ کی خدمت میں افغانستان بھیجا تھا کہ وہ وہاں جا کر تمام حالات گوش گزار کریں، اور جلد از جلد کمک کا انتظام کریں، یہ لوگ اب تک واپس نہیں آئے تھے، انہی کے انتظار میں دن کاٹے جا

رہے تھے۔ اتنے میں یکایک بے سان و گمان ابدالی ایک مختصری فوج کے ساتھ آن موجود ہوا۔ ابدالی کو آتا دیکھ کر ان لوگوں کے حوصلے بڑھ گئے۔ ان کا جوش تازہ ہوگیا۔ ان میں ایک نئی امنگ، ایک نیا حوصلہ پیدا ہوگیا۔

احمد شاہ کے پکار کرنے کے بعد یہ لوگ ڈرتے ڈرتے اس کی خدمت میں حاضر ہوئے اور تمام ماجرا اوّل تا آخر کہہ سنایا۔ احمد شاہ بڑے غور سے ان لوگوں کی داستان سنتا رہا پھر اُس نے بجلی کی طرح کڑک کر کہا۔ "تم لوگ مر کیوں نہ گئے؟ بھاگے کیوں؟"

ایک آدمی اُن میں سے بولا۔ "جہاں پناہ ہم نے مرنا چاہا، لیکن مر نہ سکے قسمت جب خراب ہوتی ہے تو موت بھی ساتھ نہیں دیتی!"

احمد شاہ: "غلط کہتے ہو، تم بزدل ہو!"

اس آدمی نے کانپتی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ "دیکھ لیجئے، جتنے زخم ہیں، وہ سینہ پر لگے ہیں۔ ہم بھگوڑے ہوتے تو پیٹھ پر زخم کھاتے۔ ہم نے آخر وقت تک دشمن سے مقابلہ کیا، لیکن ہم ایک تھے وہ دس، ہم غافل تھے اور وہ چوکس، ہمارے پاس سازوسامانِ جنگ کم تھا، دشمن کے پاس ہر طرح کے اسلحہ کی بہتات تھی۔ ہمیں تیار ہونے کا ذرا بھی موقع نہ ملا۔ دشمن پوری تیاری کے ساتھ دفعتاً ہم پر ٹوٹ پڑا، جہاں پناہ۔"

یہ باتیں سن کر احمد شاہ کا غصّہ ذرا ٹھنڈا ہوا۔ اُس نے کہا: "لیکن یہ سب کیسے ہوا؟ دشمن کو تمہاری کمزوریوں کا علم کیوں کر ہوا؟ دشمن کی آمد سے تم بے خبر کیوں رہے؟ دشمن غفلت کے عالم میں تم پر یکایک کیسے ٹوٹ پڑا؟ ——— یہ تو پہلے سے کوئی سوچی سمجھی اسکیم معلوم ہوتی ہے!"

"جہاں پناہ کا خیال بالکل صحیح ہے، یہی بات ہوئی۔"

احمد شاہ نے برہمی کے ساتھ کہا: "میں تفصیل معلوم کرنا چاہتا ہوں!"

جواب ملا: "یہ ساری شرارت غازی الدین عماد الملک کی ہے!"

احمد شاہ نے جرح کی: "لیکن وہ تو دلّی میں بیٹھا ہے!"

"ادینہ بیگ بھی دلّی گیا تھا، اُس نے غازی الدین سے سازش کی، غازی الدین نے مرہٹوں کو حملہ کی ترغیب دی، وہ تو موقعہ کے منتظر تھے۔ پیشوا کا بھائی رگھوناتھ بہت بڑی فوج لے کر چڑھ آیا!"

"وہ آیا اور تم نے سر جھکا دیئے! کیوں؟"

"نہیں جہاں پناہ! ہمارے کسی آدمی نے اطاعت نہیں کی۔ کسی نے کم ہمتی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ جب ہم زخموں سے نڈھال ہو گئے، تو بے شک جس کا جدھر سینگ سمایا چلا گیا!"

کچھ دیر احمد شاہ خاموش رہا۔ پھر اس نے زہر خند کرتے ہوئے کہا: "تمہارے گورنر صاحب یعنی میرا وہ ناخلف بیٹا تیمور شاہ کہاں ہے؟ زندہ ہے یا قتل ہو گیا ــــــ؟ یا ایسا بھاگا کہ اس کا سراغ ہی نہیں لگتا؟"

"جہاں پناہ! انہوں نے تو ایسے جیالے پن کا ثبوت دیا کہ کیا کوئی دے گا!"

"ہوں ــــــ واقعی تم اپنے آقا کے وفادار ہو!"

"جہاں پناہ! ہم غلط نہیں عرض کرتے۔ لیکن اس وقت جب قلعہ میں دشمن کی زبردست ریل پیل ہو گئی، افراتفری کا عالم پیدا ہو گیا، صرف چند آدمیوں کو ساتھ لے کر تیمور شاہ دشمن کی ان گنت فوجوں پر ٹوٹ پڑے، بہتوں کو مارا، زخمی ہوئے، زخموں سے چُور ہو کر گرے۔ چند جاں نثاروں نے انہیں نرغے میں لیا، اور بچ نکلنے میں کامیاب ہو گئے!"

"کہاں ہے وہ؟"

"دریا کے کنارے جنگل میں ایک چھوٹا سا خیمہ نصب ہے۔ وہیں وہ مقیم ہیں ہمارے زخم تو اچھے ہو گئے، لیکن ان کے زخم اب تک رِس رہے ہیں۔ ایک اچھا ہوتا ہے اور پھر ایک آتا ہے!"

پھر اس نے کچھ رکتے رکتے کہا۔ "ہر روز وہ کمک کا انتظار کرتے ہیں۔ انھوں نے عہد کر لیا ہے کہ جب تک لاہور پھر سے فتح نہیں ہو جائے گا، چین نہیں لیں گے!"

ابدالی نے کہا۔ "اگر وہ اپنے قول میں سچا ہے تو خدا ضرور اس کی مدد کرے گا!"

○

آدینہ بیگ پنجاب کا گورنر بنا ہوا تھا۔

سابا جی، پیشوا کے ایجنٹ کی حیثیت سے مقیم تھا!

یہ دونوں مل کر عوام کو لوٹ رہے تھے، کوئی ظلم ایسا نہیں تھا، جو انھوں نے اٹھا رکھا ہو۔ نئے نئے محاصل عائد کر رکھے تھے، اور دونوں ہاتھوں سے عوام کی گاڑھی کمائی کو روپیہ بٹور رہے تھے۔ ان کی ظلم پرستی کا یہ حال تھا کہ یہ نہ ہندوؤں پر ترس کھاتے، نہ مسلمانوں پر، نہ سکھوں پر، حالانکہ سکھوں نے مرہٹوں کی بڑی مدد کی تھی۔ انہی کی مدد سے اور آدینہ بیگ کی سازش سے مرہٹوں نے اتنی آسانی کے ساتھ پنجاب پر قبضہ کر لیا تھا۔ مرہٹوں کو یہ کہ سکھ ان احسانات کو بھول گئے، جو مسلمانوں نے اپنے عہدِ حکومت میں ان پر کیے تھے۔ وہ یہ سمجھ رہے تھے کہ مرہٹے پنجاب میں مستقل قیام نہیں کریں گے۔ یہ لٹیرے ہیں۔ دولت بٹوریں گے، اور چلے جائیں گے۔ پھر ہمیں پنجاب پر مستقل حکومت کرنے کا موقع مل جائے گا

تاریخ ہند

لیکن ان کی یہ آرزو پوری نہ ہوئی، آدینہ بیگ کچی گولیاں نہیں کھیلے تھا۔ اس کی گرفت اتنی مضبوط تھی کہ سکھوں میں حکومت کرنے کی امنگ ٹھنڈی پڑ گئی۔ انھوں نے لاکھ لاکھ دہائیاں دیں۔ لیکن انھیں بھی وہ روپیہ دینا پڑا۔ جو بے چاروں نے نہ جانے کب سے جمع کر رکھا تھا۔ ایک مرتبہ ہمت کر کے سکھوں نے ساپا جی کو گھیرا۔ اس سے آدینہ بیگ کی شکایت کی کہ یہ روپیہ وصول کرنے میں بڑی زیادتی کرتا ہے اور ہماری گذشتہ خدمات کا کوئی خیال نہیں کرتا۔

ساپا جی نے یہ سب باتیں سُن کر ٹکا سا جواب دے دیا۔ اُس نے بڑی صفائی اور بے مروّتی سے کہا،

"میں آدینہ بیگ کے افعال کا ذمّہ دار ہوں، آدینہ بیگ میرے افعال کا ذمّہ دار ہے اور ہم دونوں پیشوا کی حکومت کو دہ لاکھ روپیہ سالانہ دینے کا عہد کر چکے ہیں، اگر ہم یہ عہد پورا نہ کریں تو خود ہماری خیر نہیں۔ لہٰذا روپیہ تو وصول ہوگا، ہر اُس شخص سے وصول کیا جائے گا جس کے پاس دولت کی جھلک بھی نظر آجائے گی، خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان یا سکھ ہمیں کسی کے مذہب سے سروکار نہیں —— ہمیں روپیہ چاہیے، روپیہ!"

یہ صاف جواب سُن کر سکھوں کا وفد بے نیل و مرام واپس چلا گیا، راستے میں ایک سردار جی نے دُوسرے سے کہا۔ "نہ اِدھر کے رہے نہ اُدھر کے، اگر یہ معلوم ہوتا، مرہٹے ایسے ہیں تو ہم اُن کا ساتھ نہ دیتے؟"

دوسرے سردار نے منہ پر ہاتھ رکھ کر اشارہ کیا: "خاموش —— !"

پھر آہستہ سے کہا۔ "دیوار ہم گوش دارد —— ایسی باتیں آپس میں بھی نہیں کرنی چاہئیں۔ زمانہ بڑا خراب آلگا ہے۔ اگر مرہٹوں کو ان باتوں کی سُن گن مل گئی تو زندہ رہنا مشکل ہو جائے گا!"

ایک روز آدینہ بیگ اور سایاجی اطمینان سے بیٹھے گھل مل کے باتیں کر رہے تھے سایاجی سے آدینہ بیگ نے کہا۔ "کوئی خبر — ؟"

وہ بولا۔ "نئی خبر بس یہ ہے کہ رگھناتھ اپنا لاؤ لشکر لے کر دہلی کی طرف بہت جلد بڑھنے والا ہے۔"

آدینہ بیگ چونک پڑا۔ "کیوں ؟ دہلی جانے کی کیا ضرورت ہے ؟"

سایاجی نے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔ "کیوں نہیں ہے بھائی، جب تک دلّی پر ہمارا تسلط نہ ہو جائے، ایک نہ ایک دشمن پریشان کرتا ہی رہے گا۔ کبھی نجیب الدولہ اٹھ کھڑا ہوگا۔ کبھی شجاع الدولہ پریشان کرے گا، کبھی بنگش کے دل میں امنگیں اٹھیں گی۔ کبھی نظام الملک آصف جاہ کا ولولہ تیز ہوگا۔ سب کو ہمیشہ کے لئے ختم کرنے کی تدبیر یہی ہے، کہ دلّی ہمارے ہاتھ میں ہو۔"

آدینہ بیگ نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ "نہیں سایاجی تم نہیں سمجھے، میری طرف سے رگھناتھ کو لکھ بھیجو کہ آپ کو دلّی تک زحمت کرنے ضرورت نہیں۔ جب تک وہاں عماد الملک غازی الدین موجود ہے۔ پونا میں بیٹھے بیٹھے وہ جو چاہیں گے ہو جائے گا۔"

سایاجی نے ابھی اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا تھا کہ آدینہ بیگ کی فوجوں کا افسر اعلیٰ گھبرایا ہوا آیا، اس کے منہ پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں، ایک رنگ آتا تھا، ایک جاتا تھا۔ آدینہ بیگ اور سایاجی دونوں اسے حیرت سے دیکھنے لگے۔ آخر آدینہ بیگ نے کہا۔ "کیا بات ہے افضل خاں، تم اتنے بدحواس اور پریشان کیوں نظر آرہے ہو ؟ خیر تو ہے۔ ؟"

افضل خاں نے گھبراہٹ کے عالم میں کہا۔ "احمد شاہ ——

اور پھر کچھ نہ کہہ سکا۔

احمد شاہ کا نام سُن کر، سایاجی اور آدینہ بیگ دونوں گھبرائے، انھوں نے پوچھا: "کیا ہوا، احمد شاہ کو؟ مر گیا کمبخت؟ —————— چلو اچھا ہُوا، پاپ تو کٹا، اور ذرا روز کی پریشانی تو گئی!"

افضل خاں:- "احمد شاہ پنجاب کی طرف آندھی اور طوفان کی طرح بڑھا چلا آرہا ہے!"

سایاجی اور آدینہ بیگ، دونوں میں سے کوئی بھی اس خبر بد کے سننے کے لئے تیار نہ تھا دونوں نے ایک ساتھ پُوچھا۔

"احمد شاہ —— کیا احمد شاہ

اور پھر جو کچھ کہنا چاہتے تھے، وہ زبان سے نہ کہہ سکے، خاموش ہو گئے، افضل خاں نے جواب دیا: "جی ہاں میرا مطلب یہی ہے، اگرچہ بہت بڑی فوج اس کے ساتھ نہیں ہے لیکن وہ بڑی تیزی کے ساتھ اس طرف آرہا ہے!"

آدینہ بیگ۔ "تو جاؤ تم مدافعت کرو"

افضل خاں:- "مدافعت کی صورت صرف یہ ہے کہ ہم محصور ہو جائیں!"

سایاجی۔ "کیا مطلب؟ ہم مقابلہ نہیں کر سکتے؟"

افضل خاں:- "باہر نکل کر مقابلہ نہیں کر سکتے!"

آدینہ بیگ۔ "پھر کیا کیا جائے"

سایاجی۔ "محصور ہو جانے کے بعد تو بُری طرح پھنس جائیں گے، نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن کا معاملہ ہوگا۔ نہیں میں اس تجویز سے اختلاف کرتا ہوں۔ ہمیں باہر نکل کر مقابلہ کرنا چاہیئے۔"

افضل خاں:۔ "شوق سے مقابلہ کیجئے مجسور ہو کر ہم ابدالی کو اگر مہینہ بھر روک سکتے ہیں تو باہر نکل کر دو دن سے زیادہ مقابلہ نہیں کر سکیں گے۔ مہینہ بھر میں ممکن ہے کوئی صورت ہو سکا کرنے کی نکل آئے، لیکن دو چار دن میں تو سوا شکست کے ہم کچھ بھی نہیں حاصل کر سکیں گے"

سایاجی:۔ "لیکن مہینہ بھر میں مدد کہاں سے مل جائے گی؟ پونا بہت دور ہے!"

افضل خاں:۔ "پونا جس قدر دور ہے، دلی اتنی ہی قریب ہے!"

آدینہ بیگ:۔ "تمہارا مطلب ہے سندھیا اور ہلکر!"

افضل خاں:۔ "جی میرا یہی مطلب ہے۔ ۲۰ ہزار کے قریب تو فوج صرف سندھیا کے پاس تھی۔ ہلکر کے پاس بھی بہت بڑا لشکر ہے، یہ دونوں دلی ہی کے پاس پڑاؤ ڈالے پڑے ہیں نجیب الدولہ کی گوشمالی ہو چکی۔ اس میں اب مقابلہ کرنے کی سکت نہیں۔ ہلکر اور سندھیا اگر اپنی فوجیں لے کر آجائیں تو بڑی آسانی سے ابدالی کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے!"

سایاجی اچھل پڑا۔ "افضل خاں تمہاری فراست کا میں قائل ہو گیا۔ واقعی خوب تدبیر سوچی۔ شاباش ——— آدینہ بیگ افضل خاں جو کچھ کہہ رہا ہے اُس کے ایک ایک حرف سے ہمیں اتفاق ہے!"

آدینہ بیگ:۔ "مجھے بھی اتفاق ہے، لیکن میں ایک دوسری بات سوچ رہا تھا!"

سایاجی:۔ "وہ کون سی بات ہے؟"

آدینہ بیگ:۔ "جنگ کا دوسرا رخ۔ ہمیں روشن پہلو کے ساتھ تاریک پہلو پر بھی غور کر لینا ہے"

---

[1] تاریخ اودھ

سایاجی :- ضرور، کون منع کرتا ہے، غور کرنے سے ؟"

آدینہ بیگ :- "سوال یہ ہے کہ اگر ہم محصور ہو جائیں، اور ہلکر و سندھیا کے انتظار میں ابدالی سے مقابلہ شروع کر دیں ــــــ"

افضل خاں :- "یہی تو میں نے عرض کیا، محصور ہو کر ہم آسانی سے مدافعت کا سلسلہ کافی عرصہ تک جاری رکھ سکتے ہیں، ابدالی کے ساتھ جیسا کہ میں نے عرض کیا۔ بہت بڑی فوج نہیں ہے، جب تک اسے روکے رہیں گے، اسی اثنا میں ہلکر اور سندھیا بھی اپنی فوجیں لے کر آجائیں گے۔"

آدینہ بیگ :- "لیکن اگر اسی اثنا میں ابدالی کا لشکر پیچھے سے آگیا؟ تو ــــــ وہ کوئی بیوقوف تو ہے نہیں کہ مختصری فوج لے کر چڑھ دوڑے گا، ضرور اس میں کوئی مصلحت ہے، اور مجھے یقین ہے، یا تو اس نے اپنی بڑی فوج ہمیں دھوکا دینے کے لئے کسی پوشیدہ مقام پر اتار رکھی ہے، یا پھر وہ عقب سے آرہی ہے!"

"فرض کیجئے ایسا ہے تو بھی سندھیا راؤ اور ہلکر سے بڑا لشکر تو وہ نہیں لا سکتا!"

سایاجی :- "آدینہ بیگ، وقت نہ ضائع کرو، ہلکر اور سندھیا کو اطلاع بھیج دو کہ وہ فوراً اپنی فوجیں لے کر لاہور کی طرف چل پڑیں اور تم محصور رہ کر مقابلہ کی تیاریاں شروع کر دو!"

آدینہ بیگ :- "سن رہے ہو افضل خاں، سایاجی کیا کہہ رہے ہیں؟"

افضل خاں :- "جی سن رہا ہوں۔"

آدینہ بیگ :- "تو بس ایک لمحہ بھی ضائع کئے بغیر اپنی فوج کو نقل و حرکت کا حکم دے دو! ایسا نہ ہو ابدالی اچانک ہمیں آلے!"

افضل خاں :- "آپ مطمئن رہئے، ایسا نہیں ہو سکتا، ہم لوگ بھی موم کے بنے ہوئے

نہیں ہیں !"

آدینہ بیگ۔ "پھر تم اتنے گھبرائے ہوئے کیوں تھے ؟"

افضل خاں۔ "اس لئے کہ آپ کہیں باہر نکل کر لڑنے کا فیصلہ نہ کریں، وہ صورت واقعی تباہی اور ہلاکت کی تھی۔ اب ہم بچ گئے، اب ہمیں کوئی گزند نہیں پہنچ سکتا!"

سابا جی۔ "ٹھیک کہتے ہو، لیکن ہلکر اور سندھیا کو فوراً اطلاع دو!"

افضل خاں۔ "ابھی لیجئے، تعمیلِ ارشاد میں ذرا بھی تاخیر نہ ہوگی!"

○

انسان سوچتا کچھ ہے، ہوتا کچھ ہے!

افضل خاں نے بڑی دور اندیشی سے جنگ کا نقشہ مرتب کیا تھا۔ لیکن وہ صرف میز کی زینت بنا رہا، جنگ کے میدان میں ذرا بھی کام نہ آیا؛ اور ساری تدبیریں رائیگاں گئیں!

سابا جی کا قاصد ابھی لاہور سے روانہ بھی نہ ہونے پایا تھا کہ احمد شاہ کی فوجوں نے لاہور کو گھیر لیا!

ہلکر اور سندھیا کی فوجوں نے ابھی لاہور کا قصد بھی نہیں کیا تھا کہ احمد شاہ کو تازہ دم کمک بھی افغانستان سے پہنچ گئی۔

سابا جی اس صورتِ حال سے بہت زیادہ پریشان سا ہو گیا، آدینہ بیگ سابا جی سے بھی زیادہ مضطرب تھا، رہ رہ کر اس کے دل میں یہ خیال آرہا تھا، اگر ابدالی کی فتح ہوئی تو اس کا کیا حشر ہوگا! افضل خاں بڑا جیالا آدمی تھا۔ لیکن اس وقت اس کے اوسان بھی خطا ہو رہے تھے! کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کیا کیا جائے؟

سایا جی آدینہ بیگ، اور افضل خاں، رات کی تاریکی میں سہمے ہوئے قلعہ کے ایک کونہ میں بیٹھے تھے۔ سایا جی نے کہا۔ "اب کیا ہوگا؟"

آدینہ بیگ نے جواب دیا۔ "کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔"

افضل خاں۔ "اب صورت حال بالکل بدل چکی ہے۔"

آدینہ بیگ۔ "میرے خیال میں اب اگر ہم محصور بھی ہو جائیں تو اس کے معنی یہ ہیں۔ خود ہی جال میں پھنس رہے ہیں۔"

افضل خاں۔ "بے شک!"

سایا جی۔ "کیا اب بچ نکلنے کی کوئی صورت نہیں؟"

افضل خاں۔ "صرف یہ ایک رات ہمارے قبضہ میں ہے۔ اس سے اگر ہم فائدہ اٹھائیں تو بچ نکلنے میں کامیاب ہو جائیں۔ لیکن سورج نکلنے کے بعد یہ موقعہ ہاتھ سے جاتا رہے گا!"

آدینہ بیگ۔ "سایا جی پھر آپ کی کیا رائے ہے؟"

سایا جی۔ "تم ہی کچھ سوچو آدینہ بیگ۔"

آدینہ بیگ۔ "میرا تو دماغ معطل ہو چکا ہے!"

سایا جی۔ "یہی کیفیت میری ہے ——— تم بتاؤ افضل خاں کیا رائے ہے؟"

افضل خاں۔ "میں تو حکم کا بندہ ہوں، آپ کا حکم ہوگا تو تلوار میان سے نکال لوں گا، اور آخری سانس تک لڑتا رہوں گا۔ آپ فرمائیں گے، تو میان میں ڈال لوں گا، اور جدھر آپ جائیں گے، میں بھی بندۂ بے دام کی طرح چپ چاپ چلا چلوں گا!"

سایا جی۔ "جنگ جیتنے کی کوئی صورت نہیں ہے؟"

افضل خاں۔ "بالکل نہیں ـــــ آپ کو دھوکے میں نہیں رکھنا چاہتا۔"

سایاجی۔ "تو میرا آخری فیصلہ یہ ہے کہ موقعہ سے ہمیں فائدہ اُٹھانا چاہئے۔"

آدینہ بیگ۔ "یعنی؟ ـــــ یعنی؟"

سایاجی۔ "ہاں میرا مطلب یہ ہے کہ ہمیں بچ نکلنا چاہئے!"

آدینہ بیگ۔ "مجھے آپ کی رائے سے اتفاق ہے؟"

سایاجی۔ "اور افضل خاں تمہیں؟"

افضل خاں۔ "میں اختلاف کرنا جانتا ہی نہیں! سپاہی کا کام حکم بجالانا ہے، اختلاف کرنا نہیں!"

سایاجی۔ "تو اب وقت نہ ضائع کرو، باتیں کرنے کے لئے ساری عمر پڑی ہے، یہاں سے نکل چلنے کا جلد بندوبست کر دو!"

افضل خاں۔ "جو ضروری سامان ساتھ لے چلنا ہو۔ اُسے فراہم کر لیجئے۔ ہم ایک گھنٹہ کے اندر یہاں سے روانہ ہو جائیں گے!"

سایاجی۔ "سب سے بڑا سامان ہماری زندگی ہے۔ اِس کے سوا میں یہاں سے کچھ نہیں لے جانا چاہتا۔"

○

افضل خاں انتظامات کرنے چلا گیا۔

آدینہ بیگ نے کہا۔ "بڑا افسوس ہو رہا ہے لاہور چھوڑتے ہوئے، ہم اسے اپنا مرکز بنا کر یہاں سے اور آگے بڑھنے کی فکر میں تھے۔ لیکن واہ ری قسمت اُلٹے قدموں واپس لوٹنا پڑ رہا ہے!"

سایاجی۔ "سچ کہتے ہو، آدینہ بیگ! لیکن حالات کے آگے سب کو گردن جھکانا پڑتی ہے ہم نے شکست نہیں قبول کی ہے، پسپا ہورہے ہیں، اور جنگ کے میدان میں جس طرح آگے بڑھنا سپاہی کا بہترین کام ہے، اِسی طرح بعض اوقات پیچھے ہٹنا بھی ایک کارنامہ بن جاتا ہے!"

آدینہ بیگ۔ "ٹھیک ہے۔ لیکن یہ تو بتائیے، اب قصد کہاں کا ہے؟"

سایاجی۔ "میں پُونا جا رہا ہوں۔ تم دِلّی جاؤ!"

آدینہ بیگ۔ "آپ بھی کیوں نہ دِلّی چلئے؟"

سایاجی۔ "یہ مصلحت کے خلاف ہے۔ میں پُونا جا کر پیشوا کو اکساتا ہوں اور رگھوناتھ کی سربراہی میں تاریخ کی سب سے بڑی فوج لے کر آتا ہوں، تم دِلّی جاؤ، ہلکر اور سندھیا کو آمادۂ کارکرو، غازی الدین کو واقعات کی اطلاع دو، میرا خیال ہے، ابدالی لاہور سے واپس نہیں جائے گا، وہ ضرور دِلّی تک آئے گا، اور اِس مرتبہ ہمیں اُس سے آخری اور فیصلہ کُن جنگ لڑنی ہی پڑے گی!"

آدینہ بیگ۔ "بڑی صائب رائے ہے، آپ کا پُونا ہی جانا مناسب ہے!"

اِتنے میں افضل خاں آگیا، اُس نے کہا۔

"گھوڑے تیار کھڑے ہیں، جلدی کیجئے، اور میرے پیچھے پیچھے چلے آئیے!"

اور افضل خاں کی رہنمائی میں یہ دونوں، خاموشی کے ساتھ رات کے سنّاٹے اور اندھیرے میں نکل گئے!

باب (۴۰)

غازی الدین کا فرار

احمد شاہ ابدالی شاہانہ جاہ و جلال کے ساتھ لاہور میں داخل ہوا، مرہٹہ فوجیں جو لاہور میں رہ گئی تھیں، سابا جی اور آدینہ بیگ کے فرار کے باعث سخت سراسیمہ اور مضطرب ہو رہی تھیں۔ یہ دونوں اگر رہتے تو ممکن تھا ایک آدھ دن وہ مزاحمت کرتیں لیکن ان دونوں کی راتوں رات چپ چاپ روانگی نے خود بخود مرہٹہ سپاہیوں کے قدم اکھاڑ دیئے ابدالی کے سپاہیوں کو دیکھتے ہی وہ سر پہ پاؤں رکھ کر نو کدم بھاگے۔

لاہور اور ملتان کی حکومت پھر تیمور شاہ کے ہاتھ میں آ گئی۔ ابدالی نے اسے ہدایت کر دی تھی، کسی سے انتقام نہ لیا جائے، اُس نے اپنے لختِ جگر کو مخاطب کر کے کہا۔

"یاد رکھو بخشش اور عطا سے بڑھ کر کوئی انتقام نہیں!"

اور تیمور شاہ نے پوری سعادت مندی کے ساتھ اس نصیحت پر عمل کیا۔ سکھوں نے مرہٹوں کی یورش کے بعد بڑی کورنمکی کا ثبوت دیا تھا۔ وہ مرہٹوں سے مل گئے تھے، انھوں نے سازش کی تھی۔ انھوں نے حکومت کا تختہ اُلٹنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا تھا، اور اب وہ پھر تیمور شاہ کے رحم و کرم پر تھے، اُن کے دل دھڑک رہے تھے،

وہ اپنے انجام سے خائف اور ترساں نظر آ رہے تھے، انہیں یہ احساس تھا کہ اُن سے ناقابلِ معافی جرم سرزد ہُوا ہے، اور اس احساس نے انھیں زندہ درگور کر دیا تھا، مگر یہ مجرم اور خطاکار جب تیمور شاہ کے سامنے پہنچے تو اُس نے کسی سے انتقام نہیں لیا سب کو معاف کر دیا۔ صرف ان لوگوں کو سزا دی جو اب بھی شرارت اور سازش میں مصروف تھے۔

لاہور کا انتظام مکمل کرنے کے بعد احمد شاہ نے دِلّی کا قصد کیا۔ شاہ صاحب کے الفاظ اس کے کانوں میں گونج رہے تھے، وہ ایک پل بھی لاہور میں ٹھہرنا نہیں چاہتا تھا۔ اُس نے فیروز بخت سے کہا۔ "میں جلد از جلد دِلّی پہنچنا چاہتا ہوں!"

فیروز بخت نے جواب دیا۔ "دِلّی چیخ چیخ کر آپ کو بُلا رہی ہے، اُس کی فریاد، اس کی آہ و فغاں میرے کانوں میں گونج رہی ہے!"

ابدالی نے کہا۔ "اطمینان رکھو، میں یہ فریاد سُن رہا ہُوں۔"

○

آدینہ بیگ باحالِ تباہ دِلّی پہنچا، غازی الدین عمادالملک نے اس کی پیشوائی کی۔ اسے اعزاز و اکرام کے ساتھ اپنی شاندار حویلی میں ٹھہرایا، پھر اسی سے ساری داستان دردِ دُکھ ... آدینہ بیگ نے بڑی شرح و تفصیل کے ساتھ ابدالی کی آمد، سایاجی کی پریشانی، مغل خاں کے حُسنِ تدبیر اور اپنے بچ نکلنے کی کہانی سنا ڈالی، پھر کہا۔ "سایاجی پُونا گیا ہے وہاں سے رگھوناتھ کو لے کر آئے گا، اور ابدالی کو ایسا سبق دے گا جسے وہ زندگی بھر یاد رکھے گا!"

عمادالملک: "ممکن ہے تمہارا خیال صحیح نکلے، لیکن رگھوناتھ ابھی اور نے العذر تو نہیں پہنچ سکتا۔"

آدینہ بیگ ۔ "ہاں اُسے پہنچتے پہنچتے کئی مہینے لگ جائیں گے !"

عمادالملک ۔ "اور اس عرصہ میں ابدالی دلّی پہنچ جائے گا !"

آدینہ بیگ ۔ "ہوسکتا ہے !"

عمادالملک ۔ "اگر دلّی پہنچگیا تو میرا کیا حشر ہوگا ؟"

آدینہ بیگ ۔ "صرف آپ کا کیوں ؟ میرا بھی ! میں بھی تو کوئی کم مجرم نہیں ۔ آپنے عالمگیر ثانی کو قتل کیا، میں نے تیمور شاہ کو موت کے غار میں دھکیلا، یہ دوسری بات ہے آپ کامیاب ہوگئے، میں ناکام رہا۔ لیکن ہم دونوں کا جرم ایک ہی نوعیت کا ہے اور اگر ہم اس کے ہاتھ آگئے تو سزا بھی ایک ہی سی ملے گی !"

عمادالملک ۔ "یہی تو میں کہہ رہا ہوں میرے بھائی !"

آدینہ بیگ ۔ "تو پھر آپنے کیا سوچا ہے ؟"

عمادالملک ۔ "میں بھرت پور جا رہا ہوں، تم بھی میرے ساتھ چلو !"

؎ عمادالملک غازی الدین، نظام الملک آصف جاہ کا پوتا، امیر الامرا، نواب فیروز جنگ غازی الدین کا بیٹا اور نواب وزیر الممالک اعتماد الدولہ قمر الدین خاں کا نواسا، اس کا نامور باپ نظام الملک اوّل کی خبر وفات سن کر جب اپنی موروثی مسند پر قبضہ کرنے کیلئے دکن روانہ ہوا تو اپنے اس فرزند کو جس کا اصلی نام شہاب الدین تھا دہلی کے والی شفقت اور صفدر جنگ کی سرپرستی میں چھوڑ گیا، نواب فیروز جنگ نے دکن پہنچتے ہی وفات پائی اور لاش بغرض تدفین لائی جا کر اس مقبرے میں سپرد زمین کی گئی جو امیر الامرا نے اپنی زندگی میں بنوایا تھا، اور جس میں ایک مدرسہ بھی قائم کر دیا تھا، آج تک وہ عمارت مدرسہ غازی الدین کے نام سے مشہور ہے اور دار السلطنت دہلی کا واحد اسلامی (اینگلو عربک) کالج اسی میں جاری ہے۔ اس حادثہ کے بعد بادشاہ اور صفدر جنگ دونوں کو شہاب الدین کی یتیمی پر رحم آیا اور انھوں نے اس کے مرحوم باپ کا منصب اور خطاب امیر الامرا، غازی الدین

آدینہ بیگ۔ "ضرور چلوں گا، اب وہی ہمارا ملجا اور ماویٰ بن سکتا ہے۔"

عماد الملک۔ "سورج مل کے پاس جانے میں کئی فائدے ہیں۔ ایک تو یہ کہ اپنی جان بچ جائے گی، ابدالی اگر قبضہ بھی کرلے تو بھی وہ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا، دوسرے وہاں رہ کر ہم بڑی آسانی سے رگھوناتھ سے نامہ و پیام جاری رکھ سکتے ہیں، اور اُسے دلّی پر حملہ کی ترغیب دے سکتے ہیں، اور تیسرے یہ کہ ہلکر اور سندھیا کو موجودہ حال سے مطلع کر کے انھیں دلّی پر قابض ہو جانے کی صلاح دے سکتے ہیں۔ اِس طرح ابدالی کو کئی مشکلوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔"

آدینہ بیگ۔ "بہت مناسب رائے ہے۔"

عماد الملک۔ "تو آج ہی ہم دونوں بھرت پور روانہ ہو جائیں گے۔"

آدینہ بیگ۔ "میں حاضر ہوں، لیکن میری رائے تھی کہ ــــــــ"

عماد الملک۔ "کہو کہو، کیا رائے ہے تمھاری؟"

صفدر جنگ اس کو عطا کر دیا۔ مگر حصولِ اقتدار کے بعد غازی الدین نے صفدر جنگ کے استیصال کی کوشش کی، اور اسی کی نمک حرامی سے چھ مہینہ تک بادشاہ اور وزیر (صفدر جنگ) کی لڑائی باقاعدہ طور پر شہر دلّی میں ہوئی۔

اب عماد الملک غازی الدین کو پھر احمد شاہ کے دلّی آنے کا جب اندیشہ پیدا ہوا تو وہ ڈر کر سورج مل جاٹ (مہاراجہ بھرت پور) کے پاس پناہ گزیں ہو گیا، جس نے اس کی گذشتہ شرارتوں کو نظر انداز کر کے پناہ دے دی۔ آخر انجام اس کو یہاں کی سیاسیات سے دستکش ہو کر ایک مدت تک اِدھر اُدھر گھومتا رہا، پھر گوالیار پہنچا اور اس وقت سندھیا نے اس کی کسمپرسی اور ضعیف و دستی کے خیال سے اس کو ازراہِ عنایت خسروانہ اسے ۵۲ قریات گزارے کے لئے عطا کئے جو اب تک اس کی اولاد کے قبضہ میں ہیں ــــ دیہات کا یہ مجموعہ "ریاست باؤنی" کے نام سے اب بھی موجود ہے اور یہی خاندان اب تک یہاں اپنی زندگی کے دن بسر کر رہا ہے۔

آدینہ بیگ۔ "کیوں نہیں روہیل کھنڈ میں سندھیا اور ہلکر سے مل کر اور انہیں دلی پہنچنے کی ترغیب دے کر بھرت پور پہنچوں! ایک کرشمہ دو کار!"

عماد الملک۔ "بہت خوب، بہت خوب، واقعی بڑی عمدہ تدبیر ذہن میں آئی ہے!"

○

اور دوسرے روز چوروں کی طرح یہ دونوں دلی سے نکل گئے! عماد الملک وزارت عظمیٰ سے دستکش ہو کر، ایک معمولی مسافر کی طرح بھرت پور روانہ ہو گیا، نہ اس کے ساتھ لاؤ لشکر تھا، نہ زر و جواہر، نہ جاں نثاروں کا دستہ، نہ غلاموں کا ہجوم، وہ دائیں بائیں دیکھتا، اس طرح جا رہا تھا جیسے اُسے اندیشہ تھا، کوئی اس کا تعاقب نہ کر رہا ہو، کوئی اُسے گرفتار نہ کرے۔

اور آدینہ بیگ بالکل مخالف سمت، یکہ و تنہا اپنے گھوڑے پر بیٹھا روہیل کھنڈ کی طرف بڑھ رہا تھا تاکہ سندھیا اور ہلکر کو ابدالی کے خطرے سے باخبر کر دے تاکہ دلی پر مرہٹہ فوج کا قبضہ ہو جائے تاکہ دلی کے مسلمان ایک مرتبہ پھر لوٹے جائیں، ان کی عورتیں پھر بے عزت کی جائیں، ان کے مال و زر پر پھر ڈاکہ ڈالا جائے، اُن بے گناہوں کو پھر قتل کیا جائے، آدینہ بیگ کی خواہش تھی، دلی کی گلیاں اور سڑکیں میدانِ جنگ بن جائیں، وہ چاہتا تھا مرہٹوں اور ابدالی کے سپاہیوں کے درمیان جو جنگ ہو وہ کسی میدان میں نہ لڑی جائے۔ لال قلعہ کی دیواروں کے نیچے، چاندنی چوک کی سڑک پر اور دوسرے چوراہوں اور گلیوں میں لڑی جائے اور اس طرح لڑی جائے کہ دریائے جمنا کا پانی، لال قلعے کے پتھروں اور دیواروں کی طرح سُرخ ہو جائے۔ اتنا خون بہے، اتنی خوں ریزی ہو کہ دلی والے پھر کبھی سر نہ اُٹھا سکیں، دلی والوں کی مدد کو پھر کبھی کوئی نہ پہنچ سکے! دلی کئی مرتبہ لٹ کر بس چکی ہے۔ اس مرتبہ ایسی لٹے کہ پھر کبھی آباد نہ ہو سکے، ہمیشہ ہمیشہ کیلئے کھنڈر بن جائے، ایسا کھنڈر، ایسا خرابہ جس کیلئے شاعر نے کہا ہے۔

ع پردہ داری می کند بر قصر کسریٰ عنکبوت — بوم نوبت می زند بر گنبد افراسیاب!

باب (۴۱)

دتّا سندھیا کی ہلاکت

پشیرا کو رگھوناتھ اور سداشیو راؤ پر جتنا اعتماد تھا، اتنا ہی اعتماد اور تعلق خاطر اسے ہلکر اور سندھیا سے تھا۔ رگھوناتھ اور سداشیو راؤ اس کی دونوں آنکھیں تھیں تو ہلکر اور سندھیا اس کے دستِ بازو تھے، یہ وہ چار ستون تھے جن پہ اس کی عظمت و جلال کی بنیاد قائم تھی۔

سندھیا اور ہلکر اپنی تازہ دم اور مسلح[1] فوجوں کے ساتھ روہیل کھنڈ کے اطراف میں نجیب الدولہ سے صلح کر لینے کے باوجود موجود تھے، آدینہ بیگ بجلی کی سی تیزی کے ساتھ ان دونوں کے پاس پہنچا۔ اس نے نمک مرچ لگا کر ساری داستان کہہ سنائی پھر کہا، اگر احمد شاہ سے پہلے آپ نے دلی پر قبضہ نہ کر لیا تو ہمیشہ کے لئے دلی ہاتھ سے نکل جائے گی اور دلی کے ہاتھ سے نکل جانے کے معنی یہ ہیں کہ پھر ہندوستان پر مسلمانوں کا قبضہ ہو جائے گا؟

---

[1] بعض تاریخوں میں ان افواج کی تعداد ۸۰ ہزار بتائی گئی ہے مرہٹوں کے مستند مورخ کپتان گرانٹ ڈف نے ان کی تعداد ۳۰ ہزار لکھی ہے۔

سندھیانے تلوار کے قبضہ پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ جب تک میں زندہ ہوں یہ نہیں ہو سکتا۔

ہلکر نے بپھرے ہوئے انداز میں اعلان کیا۔ اس مرتبہ ابدالی کو ہم ایسا سبق دیں گے کہ وہ کبھی فراموش نہیں کر سکے گا!"

آدینہ بیگ نے مسکرایا۔" یاد رکھئے یہ نادر موقع قدرت نے آپ کو دیا ہے۔ اگر آپ دلّی پہنچ گئے تو آپ کی عظمت پیشوا کی نظر میں بھی اور زیادہ بڑھ جائے گی۔"

ہلکر نے پوچھا۔" وہ کیسے؟"

آدینہ بیگ۔" ساباجی پونا اس ارادے سے گیا ہے کہ وہ رگھوناتھ کو رے کرائے گا۔ اور رگھوناتھ کے ہاتھوں ابدالی کو شکست دلائے گا۔ رگھوناتھ کو اپنی قوت و طاقت پر بہت زیادہ ناز ہے، وہ فوراً تیار ہو جائے گا اور دلّی کی طرف کوچ کر دے گا، اب یہ غور کیجئے کہ اگر پیشوا کے اعلانِ جنگ سے پہلے، رگھوناتھ کی آمد سے پہلے احمد شاہ کی پیش قدمی سے پہلے، آپ نے دلّی پر قبضہ کر لیا تو کون ہے، جو آپ کی عظمت سے انکار کر سکے؟"

بات بظاہر بہت معقول تھی، سندھیا اور ہلکر دونوں کی سمجھ میں آگئی۔ سندھیا نے کہا۔

"تم سچ کہتے ہو، ہمیں بے تامّل دلّی کی طرف بڑھنا چاہیئے!"

ہلکر بھی پوری طور پر آمادہ تھا۔" اگر ذرا بھی دیر ہوئی تو ممکن ہے ابدالی وہاں پہنچ جائے۔ ممکن ہے

" رگھوناتھ آن پہنچے لیکن ایک سوال اور ہے، بہت اہم اور بے حد پیچیدہ، پہلے اس کا کوئی حل ہمیں سوچ لینا چاہیئے!"

آدینہ بیگ۔" فرمایئے، وہ سوال کون سا ہے؟"

سندھیا۔ "اگر ہم دونوں یہاں سے روانہ ہُوئے، تو نجیب الدولہ کو سر اُٹھانے کا پھر موقع مل جائے گا، جو رعب ہمارا اس پر بیٹھ چکا ہے، وہ اُٹھ جائے گا۔ ممکن ہے ایک طرف سے دِلّی پر ابدالی چڑھائی کرے، اور دوسری طرف سے نجیب الدولہ اُٹھ کھڑا ہو ——— ہے نا یہ بات؟"

ہلکر۔ "ہاں یہ بڑا سوال ہے، پھر ایک بات کیوں نہ کی جائے جب ——— میری رائے یہ ہے کہ ہم دونوں میں سے ایک دِلّی کی طرف زیادہ سے زیادہ فوج لے کر بڑھے اور دوسرا حسبِ ضرورت فوج رکھ کر اسی طرف موجود رہے اور یہاں موجود رہ کر مستقل قیام یہاں نہ کرے، کبھی آگے بڑھ جائے، کبھی پیچھے لَوٹ آئے، کبھی اپنے مستقر پر مقیم رہے!"

AMINIA MUSLIM GIRLS SEC. SCHOOL ★ LIBRARY ★
A. No. 18
Date 1.9.90

آدینہ بیگ۔ "بڑی معقول رائے ہے!"

سندھیا۔ "تو میں دِلّی کی طرف بڑھتا ہوں!"

ہلکر۔ "میں کیوں نہ بڑھوں؟"

آدینہ بیگ۔ "آپ کو یہیں رہنا چاہئے، اس لئے کہ آپ نجیب الدولہ کے ممنونِ کرم ہیں۔ وہ آپ کا ممنونِ کرم ہے ——— بہت دنوں کی بات نہیں۔ میں آپ کو، سب کو یاد ہوگا، دِلّی کے محاصرہ کے زمانے میں، اُس نے آپ کو صحیح سلامت جانے دیا تھا اور ابھی روہیل کھنڈ کے معرکہ میں آپ نے اس کے ساتھ رعایت کی تھی۔"[لہ]

ہلکر ہنس پڑا۔ "ہر بات کی خبر رکھتے ہو تم تو!"

آدینہ بیگ۔ "یہ رموزِ مملکت ہیں اور ہم ان کے ماہر ہیں!"

لہ تاریخ اودھ

سندھیا: مانتا ہوں ـــــ تو اب کیا طے پایا؟

آدینہ بیگ: "یہ کہ آپ دِلّی روانہ ہو جائیں، اور مہاراجہ ہلکر فی الحال یہیں تشریف رکھیں۔"

سندھیا: "تم بھی ہمارے ساتھ دِلّی کیوں نہیں چلتے؟ بھرت پور جا کر کیا کروگے؟"

آدینہ بیگ: "وہاں نواب غازی الدین میرے منتظر ہوں گے، وہاں رہ کر ہم دونوں کو بہت سے کام انجام دینے ہیں، سایا جی کی خبر لینی ہے، اُس نے کوئی پیام بھیجا ہو؟"

○

اس قرارداد کے مطابق سندھیا دِلّی کی طرف بڑھا، ہلکر نے بھی کچھ دُور اس کا ساتھ دیا، اور آدینہ بیگ، غازی الدین کے پاس بھرت پور روانہ ہو گیا۔

دِلّی کو سر کرنے میں سندھیا کو کوئی دشواری نہیں پیش آئی۔ کس میں سکت تھی کہ اس کا مقابلہ کرتا، غازی الدین نے اپنی وزارت کے زمانے میں اس گرتی ہوئی عمارت کو اور زیادہ کھوکھلا کر دیا تھا۔ اُس نے اس کا رس چوس لیا تھا، اس کا زور ختم کر دیا تھا۔ سپاہی کم، خزانہ خالی، افسر غدار، عوام کچھ بے فکر، کچھ مجبور، سندھیا نے ان حالات سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ اُس کی فوجیں دِلّی میں داخل ہو گئیں، کسی نے مزاحمت نہ کی، وہ لال قلعہ میں پہنچا

سب نے دیدہ و دل فرش راہ کر دیئے ؎

وہ آئیں گھر میں ہمارے خُدا کی قدرت ہے
کبھی ہم اُن کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں!

وہ زمانہ اب ختم ہو چکا تھا جب ؎

رہے جواہر طرف کلاہ کو کیا دیکھیں!
ہم اوج طالع لعل و گہر دیکھتے ہیں

اب نہ اودھ خالی تھا، نہ لعل و گہر کا خزانہ! ـــــــ سندھیا اس آسانی سے دلّی پر قابض ہوا کہ وہ ایک بڑے فاتح کے الفاظ میں کہہ سکتا تھا۔

میں آیا!

میں نے دیکھا!

میں نے فتح کر لیا!

شاہجہاں ثانی کو غازی الدین کا نعم البدل مل گیا۔

حوریاں رقص کناں ساغرِ مستانہ زدند

اس نئے انقلاب کو دلّی میں کسی نے بھی سنجیدگی کے ساتھ محسوس نہیں کیا، اس لئے کہ اس طرح کی باتیں اب روزمرہ کے معمولات میں داخل ہو چکی تھیں۔

دلّی پر کامل تسلّط اور غلبہ کے بعد سندھیا کو اطلاع ملی کہ احمد شاہ دلّی کی طرف بڑھ رہا ہے، لیکن اب وہ مطمئن تھا، اُس کا خیال تھا کہ دلّی کی فصیلوں سے اپنا سر پھوڑ کر احمد شاہ واپس چلا جائے گا۔ دریائے جمنا کی لہریں اس کے دلاوروں اور سپاہیوں کے لئے آغوشِ محبت کھول دیں گی اور سندھیا کی تلوار اس کش مکش کو جو ایک عرصہ سے مرہٹوں اور پٹھانوں کے مابین چلی آ رہی تھی ختم کر دے گی!

احمد شاہ بھی کچی گولیاں نہیں کھیلے تھا۔ دلّی کے قریب پہنچتے پہنچتے اسے وہاں کے تازہ انقلاب کی ساری داستان معلوم ہو چکی تھی، وہ جب لاہور سے دلّی کے لئے روانہ ہوا تھا، اسی وقت اُس نے فیروز بخت کے واسطہ سے جسونت رائے کو دلّی بھیج دیا تھا۔ جسونت رائے نے اپنی آنکھوں سے یہ انقلاب دیکھا، اور احمد شاہ کو پوری تفصیل سے مطلع کر دیا۔

احمد شاہ نے اپنے سرداروں اور دلاوروں سے مشورہ کیا۔ سب کی یہی رائے تھی کہ دلی پر اب حملہ نہیں کرنا چاہئے۔ یہیں ٹھہر کر حالات کا اندازہ کرنا چاہئے۔ جسونت رائے یہ بھی خبر لایا تھا کہ آدینہ بیگ اور عمادالملک غازی الدین بھرت پور میں سورج مل جاٹ سے گٹھ جوڑ چکے ہیں، سایا جی رگھوناتھ کے ساتھ ایک بہت بڑا لشکر لے کر آرہا ہے۔ سرداروں کی رائے یہ تھی کہ جب تک رگھوناتھ اپنے لشکر سمیت نہ آئے، اُس وقت تک صرف "دیکھو اور انتظار کرو" کی پالیسی پر عمل کیا جائے۔ معمولی فوجی نقل و حرکت پر اکتفا کیا جائے، کسی بڑے حملہ کا ارادہ نہ کیا جائے!

یہ باتیں سُن کر احمد شاہ مسکرایا، اُس نے کہا، "جو کچھ میری آنکھیں دیکھتی ہیں تم نہیں دیکھ پاتے، جو کچھ میری ذات محسوس کرتی ہے تم اسے نہیں محسوس کر سکتے۔ اگر میں رگھوناتھ اور سایا جی کا انتظار کروں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ دلی سے ہمیشہ کے لئے ہاتھ دھولوں۔ سندھیا اور ہلکر کے ہاتھ مضبوط کر دوں۔ رگھوناتھ ان دونوں کی پشت پناہی کرے گا۔ یہ دونوں رگھوناتھ کی تائید و حمایت کریں گے۔ لیکن اگر میں رگھوناتھ کے آنے سے پہلے سندھیا اور ہلکر کو ختم کر دوں، یا کم از کم ان کا زور توڑ دوں، تو جانتے ہو نتیجہ کیا ہوگا؟ نتیجہ یہ ہوگا کہ خود شری رگھوناتھ کے پاؤں کے نیچے سے زمین نکل جائے گی اور ان کے سب سے بڑے پشت پناہ، ہمدرد اور جاں نثار سورج مل جاٹ کو دن میں تارے نظر آنے لگیں گے۔"

احمد شاہ کی یہ مدلل تقریر سُن کر تمام سرداروں نے سر جھکا لئے۔ ایک نے کہا، "بزرگوں نے سچ کہا ہے، کلام الملوک، ملوک الکلام۔ یہ دُور کی باتیں ہمارے ذہنِ نارسا میں آ ہی نہیں سکتی تھیں، واقعی مناسب صورت یہی ہے کہ سندھیا کو مہلت نہ دی جائے!"

احمد شاہ نے زبان سے کچھ نہیں کہا، لیکن محبت آمیز نظر سے شاہ پسند خاں کی طرف دیکھا۔

شاہ پسند خاں سمجھ گیا۔ احمد شاہ اس کی رائے معلوم کرنا چاہتا ہے۔ اس نے زمین ادب کو بوسہ دے کر کہا۔ "غلام ہر خدمت کے لئے تیار ہے۔"

آں نہ من باشم کہ روزِ جنگ بینی پشتِ من
آں منم کاندر میانِ خاک و خوں بینی سرے

○

احمد شاہ جتنا بڑا بہادر تھا، اس سے زیادہ فنونِ جنگ کا ماہر تھا، وہ اپنی فوج کا سارا زور صرف سندھیا کے استیصال میں ختم کر دینا نہیں چاہتا تھا، وہ جانتا تھا۔

ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں!

صرف سندھیا ہی سے نہیں، سورج مل سے، ہلکر سے، رگھوناتھ سے اور شاید شجاع الدولہ سے بھی نپٹنا ہے، ایک ہی مورچہ پہ اگر ساری قوت ختم ہو گئی تو دوسرے محاذوں پر کیا ہوگا؟

ان تمام پہلوؤں پر غور کر کے اس نے بڑی زبردست فوجی تدبیر سے کام لیا۔ اس نے فوج کے ایک چھوٹے سے حصّہ کو بداؤں گھاٹ کے گرد و نواح میں پہنچا دیا اور وہاں اسے کبھی کبھی نقل و حرکت دیتا رہتا۔ سندھیا نے اس فوج کو احمد شاہ کی مکمل فوج خیال کر لیا اور اپنا سارا زور بداؤں گھاٹ کے در و بست میں صرف کر دیا۔ اسے اپنے دفاعی استحکامات پر اتنا ناز تھا کہ وہ بالکل مطمئن اور بے فکر ہو گیا۔

---

[1] پانی پت کا خونیں میدانِ جنگ

ابدالی اسی گھڑی کا منتظر تھا، جب اسے یقین ہوگیا کہ اس کی چال کامیاب ہوگئی اور دشمن بداؤں گھاٹ پر اپنی ساری قوت مجتمع کر رہا ہے تو وہ اپنی دوسری فیصلہ کن چال چل گیا، ابدالی نے پوشیدہ طور پر اپنی بڑی فوج کو لے کر جمنا کا رخ کیا اور دشمن کی بے خبری کے عالم میں اسے پار کر لیا۔ اسی طرح سندھیا دو طرف سے گِھر گیا، بداؤں گھاٹ کی طرف سے بھی اور دریائے جمنا کی طرف سے بھی، اب اس کے بچ نکلنے کا کوئی امکان باقی نہ رہ گیا۔

ابدالی اپنی چال چل رہا تھا اور سندھیا اپنے انتظامات اور استحکامات سے اتنا مطمئن تھا کہ اس کی آنکھوں پر غفلت کے پردے پڑ گئے، وہ اس سے تو مطمئن تھا کہ ابدالی دِلّی میں نہیں داخل ہو سکتا تھا۔ بداؤں گھاٹ کا مورچہ نہیں توڑ سکتا، لیکن اسے یہ بھی معلوم تھا کہ وہ بے لڑے واپس نہیں جائے گا۔ ایک خوں ریز جنگ ضرور ہوگی، اور جلد از جلد ہوگی، لیکن یہ اندیشہ بھی جلد اطمینان سے بدل گیا۔ کیونکہ آدینہ بیگ نے اسے اطلاع دی تھی کہ رایاجی نے لکھا ہے ہم بہت بڑا لشکر لے کر پُونا سے آج ہی کل میں روانہ ہو رہے ہیں۔ سندھیا کا اعتقاد تھا۔ اگر پُونا سے لشکر صحیح سلامت پہنچ گیا تو پھر احمد شاہ افغانستان نہیں واپس جا سکے گا، اس کی اور اس کے سپاہیوں کی قبریں یہیں دِلّی کے آس پاس بنیں گی۔

جیسے جیسے یہ خیال آتا تھا کہ اب پُونا کا لشکر دِلّی کی طرف بڑھ رہا ہے سندھیا کی فوجی تیاریوں میں اضافہ ہوتا جاتا تھا، وہ چاہتا تھا رگھوناتھ جب پہنچے تو اس کی خدمت میں جس طرح زر و جواہر سے بھری ہوئی تھیلیاں پیش کی جائیں گی۔ اسی طرح ایک نہایت منظم اور آراستہ فوج بھی پیش کی جائے اور وہ رگھوناتھ سے مخاطب ہو کر کہے: "لیجئے میری

۱؎ تاریخ ہند

یہ پوچھی جا مخر ہے۔

سامنے مہاں کے جو تھا میسّر کر دیا۔

یہ فوج ظفر موج آپ کے ایک اشارہ پر ہفت اقلیم کو زیر و زبر کر دے گی!"

اور اچانک ——————

ایک روز سدھیا اپنی فوج کی پریڈ کا منظر دیکھ کر خوش خوش اپنے افسرانِ اعلےٰ کو تِل اور چاول شگون کے طور پر تقسیم کر رہا تھا کہ اسے اطلاع ملی۔

ابدالی کی فوجوں نے دِلّی کا محاصرہ کر لیا!

پھر اسے معلوم ہوا۔

ابدالی کی فوجیں استحکامات کو توڑتی اور پامال کرتی ایک سیلِ بلا کی صورت میں دِلّی کے اندر داخل ہو رہی ہیں، ایک تار ہے جو ٹوٹنے میں نہیں آتا۔

پھر اسے پتہ چلا۔

ابدالی کی فوجیں شہر میں پھیل گئیں!

پھر اسے بتایا گیا

ابدالی کی فوجیں قلعہ کی طرف بڑھ رہی ہیں۔

اور پھر اس کے ایک جاں نثار نے کہا۔ "فرار کے تمام راستے مسدود ہو چکے ہیں!"

خر دوع کی خبروں سے سندھیا جتنا ہراساں اور پریشان ہوا تھا، آخری خبر سے —— فرار کے تمام راستے مسدود ہو چکے ہیں —— وہ اتنا ہی مطمئن ہو گیا۔ اُس نے گھوڑے کی لگام کھینچی، اچک کر اس پر بیٹھا، تلوار کے قبضہ پر ہاتھ رکھا اور اپنے افرانِ فوج سے

مخاطب ہو کر کہا۔

"دوستو! ہم کسی طرح بھی بچ نکلنے میں کامیاب نہیں ہو سکتے، دشمن نے اتنا اچانک وار کیا ہے کہ بھاگنے کا کوئی راستہ بھی باقی نہیں رہ گیا۔ میں گرفتار ہو کر ذلت کی موت نہیں چاہتا، لڑتے لڑتے دشمن کو موت کے گھاٹ اتارتے اتارتے قتل ہونا چاہتا ہوں، جسے میری رائے سے اتفاق ہو وہ آگے میں تو چلا!"

اور پھر اس نے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور جنگ کے ارادے سے آگے بڑھا، افسروں اور سپاہیوں نے بھی اس کا ساتھ دیا، یہ سب لوگ ساتھ ساتھ قلعہ سے باہر نکلے، انہیں میدان جنگ تک جانے کی ضرورت نہیں پڑی، شہر میں داخل ہوتے ہی ابدالی کے سپاہیوں سے معرکۂ رستخیز گرم ہوگیا، مرہٹہ اور ابدالی سپاہی ایک دوسرے سے گتھ گئے۔

شروع میں مرہٹہ سپاہیوں نے دلاوری اور مردانگی کے جوہر دکھائے لیکن پٹھانوں کے منظم اور مسلسل حملوں کی تاب نہ لا سکے، جب انھوں نے یہ دیکھا کہ وہ دھڑا دھڑ قتل ہو رہے ہیں تو ان پر ہراس طاری ہوگیا، ان کے قدم اکھڑ گئے اور وہ بھاگ کھڑے ہوئے، ابدالی کے سپاہیوں نے ان کے ساتھ کوئی رعایت نہ کی، جو ہتھیار بند سپاہی نظر کے سامنے آیا موت کے گھاٹ اتر گیا۔ تھوڑی دیر میں کشتوں کے پشتے لگ گئے۔

لیکن سندھیا بے خوفی کے ساتھ لڑتا رہا۔" اس نے پامردی سے مقابلہ کیا اور مارا گیا![1] سندھیا کا بھتیجا جنکوجی، بقیۃ السیف سپاہیوں اور افسروں[2] کو لے کر راجہ سورج مل کے

---

[1] تاریخ ہند

[2] ان سب کی کل تعداد صرف ۳ ہزار رہ گئی تھی باقی سب مارے گئے

پاس جاکر پناہ گزیں ہوگیا۔[1] سندھیا کے قتل اور جنکوجی کے فرار کے بعد میدان صاف ہوگیا۔ احمد شاہ نے اپنی بڑی فوج باہر رکھی، چھوٹی فوج لے کر دلّی آیا اور یہاں کچھ عرصہ قیام کرنے کے ارادے سے ٹھہر گیا۔

لال قلعہ میں جب احمد شاہ داخل ہوا تو شاہ جہاں ثانی نے بڑی دھوم دھام کے ساتھ اس کا پُرتپاک استقبال کیا۔ دِلّی کے باشندوں نے بھی بڑے جوش و خروش کے ساتھ ابدالی کی آمد کا جشن منایا، وہ لوگ جو مرہٹہ فتنہ کے اثرات و نتائج سے دل ہی دل میں دہل رہے تھے خوش ہوگئے کہ بہت بڑی بلا ٹل گئی۔ انھوں نے اطمینان کا سانس لیا اور یقین کر لیا، غم کے بادل چھٹ گئے اور خوشی کا سورج چمکنے لگا۔

لیکن وہ نہیں جانتے تھے، ابھی انھیں ایک اور بہت بڑی خوں ریزی سے دوچار ہونا ہے، یہ خوشی عارضی ہے، یہ اطمینان بے بُنیاد ہے، ایک اور طوفان ہے جو دکن سے دلّی کی طرف بڑھ رہا ہے، یہ طوفان اتنا ہولناک ہے کہ جدھر سے یہ گزرے گا، وہاں کے در و دیوار شجر و حجر، زمین و آسمان کانپنے لگیں گے، اس سیلِ بےک سیر و زمین گیر کی زد میں جو آجائیگا، اسے ہلاک ہونا پڑتا تھا۔ خواہ وہ انسان ہو یا حیوان، جاندار یا بے جان![2]

---

[1] جنکوجی جب راجہ سورج مل کے پاس پہنچا تو یہاں عماد الملک غازی الدین اور راجہ ناگرمل پہلے سے موجود تھے، راجہ ناگرمل بھی یہاں اس امید میں آئے تھے کہ عافیت اور آسائش کی زندگی بسر کرسکیں گے، اردو کے مشہور شاعر میر تقی میر بھی راجہ صاحب کے ساتھ سورج مل کے یہاں مقیم تھے۔ میر نے سورج مل کے ہاں قیام اور ناگرمل کی رفاقت کا ذکر اپنی خود نوشت سوانح حیات "ذکرِ میر" میں کیا ہے، میر صاحب نے گوریلا جنگ کے لئے "جنگ گریزپائی" کی اصطلاح استعمال کی ہے۔

[2] فتنہ اُس کے قدم سے اُٹھتا ہے
ہر قدم کس ستم سے اُٹھتا ہے۔

باب (۴۲)

بچھڑے ملتے ہیں بعد مدّت کے

سندھیا کی ہلاکت[1] نے تاریخ کا ایک صفحہ اُلٹ دیا، دوسرا احمد شاہ ابدالی کے دلی میں شاہانہ داخلہ سے شروع ہوتا ہے۔

ابدالی جب دِلّی میں پہنچا تو اُس نے دیکھا، یہاں کے حالات بالکل بدل چکے ہیں۔ ابتری حدِّ انتہا کو پہنچی ہوئی ہے، نہ حکام فرض شناس ہیں نہ عوام میں ذمّہ داری کا احساس ہے بادشاہ کٹھ پتلی بنا ہُوا ہے جس کے ہاتھ میں وزارت کی باگ آتی ہے، وہ سب سے پہلے بادشاہ پر ہاتھ صاف کرتا ہے اور اپنی مرضی کے کسی آدمی کو تخت حکومت پر بٹھا دیتا ہے۔

ابدالی نے یہ سب باتیں دیکھیں لیکن کسی کام میں مداخلت نہیں کی، اُس کے ذہن د

---

[1] سندھیا کی ہلاکت کو وقت کے شاعروں اور سخنوروں نے خوشی اور مسرت کے جذبات سے کے ساتھ سراہا
میر غلام علی آزاد بلگرامی نے اس فتح کی تاریخ لکھی۔ (دتّا نام - سندھیا لقب)

کرد سلطانِ عصر بہ ورّانی — قتل دتّا بہ تیغِ دشمن کاہ
گفت تاریخ این ظفر آزاد — نصرت بادشاہ عالی جاہ
۱۱۷۳ھ

(حیات حافظ رحمت خاں)

دماغ میں اس وقت کوئی دوسرا ہی خیال گردش کر رہا تھا، اُس نے جتنے انتظامات بھی کئے، وہ عارضی تھے، مستقل انتظامات کے لئے وہ وقت اور موقع کا منتظر تھا۔

شاہ جہان ثانی کی بادشاہت پر اس نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ حالانکہ وہ کسی اعتبار سے بھی تختِ حکومت کا مستحق نہیں تھا، صرف اتنا کیا کہ یعقوب علی خاں بھمن زئی کو اپنی جانب سے قلعدار مقرر کر دیا اور خود ان اسکیموں کی کامیابی پر ہندوستان میں مسلمانوں کو بادشاہت اور تختِ دلّی کے استحکام و بقا کا انحصار تھا، اور ان اسکیموں کی کامیابی کی پہلی شرط یہ تھی، کہ حالات کا ٹھنڈے دل سے جائزہ لیا جائے اور اقدام و عمل کا نقشہ تمام پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد تیار کیا جائے۔

○

فیروز بخت کو دلّی میں آئے ہوئے کئی دن ہو چکے تھے، لیکن اب تک وہ اپنی حویلی میں قدم نہ رکھ سکا تھا، صبح سے شام تک اور شام سے صبح تک وہ ضروری مہمات میں مصروف رہتا تھا۔

ایک روز جسونت رائے نے جب اسے نسبتاً پُرسکون حالت میں پایا تو کہا۔ "آپ وطن میں ہیں، پھر بھی گھر سے دُور ہیں ——— آپ کا جی نہیں چاہتا بچّہ کو دیکھنے کا، بیوی سے ملنے کا، دُوسرے عزیزوں اور بزرگوں کا دیدار کرنے ؟"

فیروز بخت نے آہ سرد بھر کر کہا۔ "کیوں نہیں چاہتا۔ لیکن دم لینے کی فرصت جو اب تک ملی ہو، آج میں نے سوچا ہے، شاہ سے اجازت لے کر چند روز کے لئے گھر چلا جاؤں، وہاں جب تک رہوں گا، وہاں جانے کی مہلت نہیں مل سکے گی !"

اس اثنا میں آصف زماں آگیا، اُس نے کہا۔ "اب تو دیس بھی آپ کے لئے پردیس

بن گیا ہے!

فیروز بخت نے جواب دیا: "بھائی آصف شرمندہ نہ کرو، میرے دل پر جو کچھ گذری ہے۔ میں ہی جانتا ہوں لیکن جن کاموں میں اُلجھا ہوا ہوں، اُن سے نپٹنا بھی تو ضروری ہے!"

آصف زماں۔ (طنز کے ساتھ) میرے خیال میں اگر ضرورت پیش آجائے، تو شاید آپ تجہیز و تکفین میں بھی شرکت نہ کر سکیں!

فیروز بخت۔ (بے قرار ہو کر) کیا کہہ رہے ہو آصف! سب خیریت تو ہے! امی کی طبیعت کیسی ہے؟

آصف زماں۔ "بہت اچھی، آپ انھیں جتنا تندرست چھوڑ گئے تھے، اب اُس سے کہیں زیادہ تندرست ہیں، پہلے وہ چل پھر لیتی تھیں، اب جنبش بھی نہیں کر سکتیں، پہلے بات چیت کر لیتی تھیں، اب اشاروں سے بات کرنا بھی مشکل ہے۔ پہلے حکیم اُمید دلاتے تھے کہ اچھی ہو جائیں گی، اب صاف الفاظ میں کہتے ہیں خُدا ہی ہے جو بچیں، پہلے آپ کا نام سُن کر بیماری اور کمزوری کی حالت میں بھی فخر اور شرم کی سُرخی گالوں پر دوڑ جاتی تھی اب چہرہ اتنا سفید پڑ گیا ہے کہ گھنٹوں آپ کا ذکر ہوتا ہے۔ مگر ان کے چہرے سے کچھ پتہ نہیں چلتا۔ پہلے آپ کے آنے کے دن گنا کرتی تھیں اب یہ حالت ہے کہ جانتی ہیں آپ یہاں موجود ہیں لیکن اشارتاً بھی ملنے کی تمنا نہیں ظاہر کرتیں، پہلے کتنی ہی مغموم اور افسردہ کیوں نہ ہوں، بچہ سامنے آیا اور ان کے ہونٹوں پر تبسم کھیلنے لگا، اب یہ حالت ہے کہ بچّہ کو دیکھا اور آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔"

فیروز بخت نے تقریباً چیختے ہُوئے کہا: "خاموش، آصف خاموش، میرے دل پر تیر نہ چلاؤ، یہ باتیں میں نہیں سُن سکتا!"

آصف زماں کے مُنہ سے طنز کے تیر برسنے لگے: "یہ کہتے ہو، واقعی ان باتوں کے سننے سے تکلیف ہو گی ـــــ سچّی باتیں ہیں نا!"

فیروز بخت ۔ "کیا تمہارا خیال ہے میں ماہ سے محبّت نہیں کرتا؟"

آصف زماں ۔ "میرا خیال کیوں پوچھتے ہو، خود ماہ سے پُوچھ لو۔"

فیروز بخت ۔ "وہ کیا کہتی ہے؟"

آصف زماں ۔ "وہ مر جائے گی، مگر مُنہ سے ایک لفظ نہ نکالے گی، تم اگر فیروز بخت ہو تو وہ بھی ماہ طلعت ہے، اُس کی آن تُم سے کہیں زیادہ ہے!"

فیروز بخت ۔ "کیا وہ مجھ سے خفا ہے؟"

آصف زماں ۔ "خفا کیوں ہوتی؟ بہت خوش ہے ـــــ واقعی دُنیا میں سچے عاشق اور محبت کرنے والے شوہر ایسے ہی ہوتے ہیں ـــــ زندہ باد!"

فیروز بخت ۔ "ماہ مجھ سے رُوٹھ گئی اور تُم نے منایا بھی نہیں۔"

آصف زماں ۔ "باتیں نہ بناؤ فیروز ـــــ تُم نے ماہ پر وہ ظلم کیا ہے جو اُس کا بدترین دُشمن بھی نہیں کر سکتا تھا، تُم نے اس کی خُوشی چھین لی، اُس کی آنکھیں برباد کر دیں۔ اُس کی صحت تباہ کر دی، اُسے زندہ درگور کر دیا۔ اُس نے زبان سے کبھی تمہاری شکایت نہیں کی، لیکن خُدا تمہاری اِن ستم رانیوں کو دیکھ رہا ہے، ماہ معاف بھی کر دے، لیکن وہ معاف نہیں کرے گا۔ بچپن کا دوست ہوں، اسی گھر میں پلا بڑھا، زندگی کی آسودگی حاصل کی، تمہارے سایہ سے محبت کرتا رہا، تمہارے نام پر مرتا رہا۔ آج ماہ کی جو حالت ہے، اُسے دیکھ کر ضبط نہ کر سکا، چلا آیا، جی چاہے تو اگر دیکھ بھال ہوئی تو اُسے زندہ نہ پاؤ گے، میں یہ کچھ نہ کہتا، مگر محض حق دوستی کھلا رہا ہے۔"

یہ کہہ کر آصف زماں جانے کے لئے اُٹھا۔

فیروز بخت نے دامن پکڑ کر اُسے بٹھالیا، "کہاں چلے؟"

"جہاں سے آیا ہوں!"

"ٹھہرو، میں بھی چلتا ہوں!"

"نہیں میں تمہیں اپنے ساتھ نہیں لے جاؤں گا!"

"کیوں؟"

"اگر تم میرے ساتھ گئے تو ماہ طلعت کے قلبِ نازک کو بہت صدمہ پہنچے گا!"

"وہی تو پوچھا ہے کیوں؟"

"وہ سمجھے گی، تم نہیں آرہے تھے، میں جاکر لایا تمھیں، بڑی حسّاس لڑکی ہے یہ صدمہ اُس کی جان لے لے گا!"

"پھر؟ — پھر کیا رائے ہے؟"

"مجھے آگے جانے دو، تم میرے بعد آؤ — لیکن آؤ ضرور، اور جلد آؤ — !"

"تم چلو میں آیا!"

آصف زماں چلا گیا، اُس کے جانے کے بعد فیروز شاہ ابدالی سے رخصت حاصل کرنے کے لئے اُٹھا۔ اُس نے دیکھا، جسونت راؤ کی آنکھیں سوج رہی ہیں، آنسو بہے ہوئے ہیں۔

"کیا بات ہوئی!!"

وہ زور زور سے رونے لگا۔ فیروز نے مزید کچھ پوچھنا چاہا تھا کہ شاہ کا قاصد آیا۔ اُس نے کہا۔ "جہاں پناہ یاد فرما رہے ہیں!"

فیروز بخت قاصد کے ساتھ چلا گیا، تھوڑی دیر کے بعد پھر واپس آیا، اُس نے جسونت سے کہا: "چلو میرے ساتھ ــــــ میں نے ایک ہفتہ کی رُخصت شاہ سے حاصل کرلی ہے!"

جسونت نے کوئی جواب نہ دیا، چُپ چاپ اُس کے ساتھ ہو لیا.

○

ماہ طلعت اپنے کمرہ میں نڈھال پڑی ہے، ابھی ابھی غشی کا دورہ پڑا تھا، حکیم صاحب نے نبض دیکھی، حالات سنے، نُسخہ لکھا اور چلتے چلتے کہہ گئے!

"حالت بہت نازک ہے ــــــ مریض اب چند دن سے زیادہ کا مہمان نہیں!"

حکیم صاحب کو رُخصت کرکے آصف ژیاں پھر اُس کے کمرہ میں آیا، صنوبر پہلے سے بیٹھی تھی، ماہ طلعت کی غشی دُور ہو چکی تھی، مگر کمزوری اور نقاہت کے باعث آنکھیں بند کئے چپ چاپ پڑی تھی، صنوبر نے غمگین آواز میں پُوچھا۔ "اب کیسی طبیعت ہے؟"

ماہ نے آنکھیں کھول دیں، اور کمزور آواز میں جواب دیا۔ "اچھی ہوں!"

اُس نے پوچھا، "شربت لاؤں؟"

وہ بولی۔ "نہیں کچھ نہیں پیوں گی!"

بڑے محبت بھرے لہجہ میں صنوبر نے کہا۔ "اچھا تو دوائی پی لو!"

وہ کہنے لگی۔ "نہیں دوائی بھی نہیں پیوں گی!"

صنوبر ضد کرنے لگی۔ "واہ کیسے نہیں ہو گی، پینی پڑے گی۔"

ماہ بولی، "صنوبر ضد نہ کرو!"

صنوبر نے پھر اصرار کیا۔ "دوا نہ پیو گی تو صحت کیسے ہو گی؟"

ماہ طلعت مسکرائی۔ "صحت ـــــ تم کتنی بے وقوف ہو صنوبر!"

صنوبر نے پوچھا۔ "کیا ہوا، کون سی غلطی سرزد ہوئی، مجھ سے میرے مالک؟"

وہ بولی۔ "تم سمجھتی ہو، میں اچھی ہو جاؤں گی؟"

وہ کہنے لگی۔ "ضرور، خدا نے چاہا تو چند ہی دن میں تندرستی لوٹ آئے گی!"

ماہ نے کہا۔ "اپنے دل کو ان باتوں سے جتنی چاہو تسلی دے لو، لیکن مجھے بیوقوف نہیں بنا سکتیں۔ میں جانتی ہوں کیا ہونے والا ہے!"

صنوبر رونے لگی۔ "خدا کے لئے ایسی باتیں نہ کرو!"

ماہ کی آنکھوں میں بھی آنسو بھر آئے۔ "رو نہیں صنوبر ـــــ مجھے ہنسی ہنسی رخصت کر دو، رونے کے لئے ساری زندگی پڑی ہے، ایسا ہی ہے تو تم میرے بعد روتی رہنا، لیکن میرے سامنے تو نہ رو!"

صنوبر نے آنسو پونچھ لئے۔ "اچھا میں نہیں روتی، لیکن خدا کے لئے ایسی باتیں نہ کرو!"

اتنے میں قدموں کی آہٹ ہوئی، ماہ طلعت کی نظر دروازے پر گئی تو سامنے فیروز بخت کھڑا تھا، اُسے دیکھ کر آصف زماں اور صنوبر کھڑے ہو گئے۔ وہ آیا، ان دونوں سے مخاطب ہوئے بغیر ماہ طلعت کی مسہری پر پیروں کی طرف بیٹھ گیا، ماہ طلعت اُٹھنے لگی، لیکن اُٹھ نہ سکی، اُٹھتے اُٹھتے بستر پر گر گئی، فیروز بخت نے اسے سنبھالا اور کہا۔ "ماہ یہ کیا ہو گیا ہے تمہیں؟"

وہ مسکرائی۔ "کچھ بھی نہیں، اچھی ہوں!"

وہ بولا۔ "اگر تم اچھی ہو تو بیمار کسے کہتے ہیں؟"

اور یہ کہتے کہتے فیروز بخت کا گلا گلوگیر ہو گیا،

ماہ طلعت نے کہا۔ "آپ مرد ہیں حوصلے سے کام لیجئے!"

وہ بولا: "لیکن میرا حوصلہ تمہارے ہی دم سے قائم تھا، ہر مصیبت، ہر تکلیف، ہر آفت کا میں خندہ جبینی کے ساتھ مقابلہ کر لیتا تھا۔ اسی اطمینان اور سہارے پر کہ تم میری ہو۔ تمہیں مجھ سے کوئی نہیں چھین سکتا، تمہارا دامن میرے ہر آزار کا علاج ہے!"

بہت کمزور اور نحیف آواز میں ماہ نے کہا: "ٹھیک کہتے ہیں آپ، لیکن یہ سہارا ٹوٹ نہیں رہا ہے، پھر آپ پریشان کیوں ہیں؟"

"لیکن تمہاری حالت ----؟"

"میری حالت کیا ہے، یہی نا کہ قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھی ہوں۔ سو وہ کون ہے جسے موت نہیں آتی، کوئی آگے کوئی پیچھے، سب ہی کو ایک نہ ایک دن اس دنیا سے رخصت ہونا ہے!"

"یہ تم کیا کہہ رہی ہو ماہ!"

اور یہ کہتے کہتے فیروز بخت کی آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگے۔

ماہ نے ٹوکا: "آپ کو اتنا کم حوصلہ تو میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا، یہ آج کیا ہو گیا ہے آپ کو ---؟"

"میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا!"

بہت وقار کے ساتھ ماہ بولی: "زندگی خدا کی امانت ہے، یہ اسی وقت واپس کی جا سکتی ہے جب خود خدا چاہے!"

"ہاں لیکن میری زندگی تم ہو!"

"اگر یہ بات سچ ہے تو مرنے کے بعد بھی، میرا دامن آپ کے لئے سہارا بنا رہے گا۔ مرنے کے بعد بھی میری روح آپ کی روح سے وابستہ رہے گی --- آپ اپنی حالت پر غور

کہیئے، آپ اپنے راستے سے ہٹ رہے ہیں!

"کون راستہ؟ کون سا راستہ؟"

"جس پر اب تک آپ گامزن تھے، آپ کو خدا نے اس لئے نہیں پیدا کیا ہے کہ عام لوگوں کی طرح کھائیں پئیں اور زندگی عیش و عشرت اور راگ رنگ میں گزار دیں، آپ کو تُمانے کچھ ذمّہ داریاں سونپی ہیں، انھیں انجام دیجئے، انھیں انجام دیتے ہوئے رہیئے!

اس فرض سے تُو میں کبھی غافل نہیں ہُوا!"

"کبھی غافل نہیں ہُوئے، لیکن اب؟ کیا اب بھی آپ یہی کہہ سکتے ہیں؟"

بچوں کی طرح مچلتے ہُوئے فیروز نے کہا: "اوہ یہ باتیں چھوڑو، بس اچھی ہو جاؤ جاری ہے"

وہ بولی: "اچھی ہو جاؤں گی۔ لیکن اگر آپ پر اسی طرح کی جذباتیت طاری رہی تو کبھی تندرست نہ ہو سکوں گی۔ آپ وہی رہیئے جو تھے، پھر دیکھئے میں بھلی چنگی ہو جاتی ہوں یا نہیں؟"

اتنے میں صنوبر، غضنفر کو لے کر آگئی!!

ننھا سا لیکن نہایت تندرست اور خوش جمال لڑکا فیروز کی گود میں تھا!

وہ فیروز کو ایک مرتبہ دیکھنے کے بعد اب تک نہ بھول سکا تھا، فوراً پہچان گیا اور مسکرانے لگا۔

صنوبر نے کہا: "ابھی رو رہا تھا، ابھی ہنسنے لگا، بڑا شریر ہے!"

فیروز نے کہا: "کیوں نہ ہو باپ کی گود پہچانتا ہے!"

آصف زماں سے ضبط نہ ہو سکا۔ "تبھی مروّت باپ کا با مروّت بیٹا!"

ماہ مسکرا دی۔ فیروز بخت بھی ہنسنے لگا۔ اُس نے کہا: "تم باپ بیٹے کے معاملات میں

ملاتک اڑانے والے کون ؟ —— جاؤ ذرا جسونت سنگھ کی بھی تو خبر لو، بیچارہ اکیلا بیٹھا ہوگا!"

"وہ بھی آیا ہے آپ کے ساتھ؟"

"ہاں جب سے تم چھٹے ہو، میرا باڈی گارڈ وہی ہے، جب تک میں یہاں رہوں گا، وہ بھی رہے گا!"

"بہت خُوب!"

آصف زماں باہر چلا گیا، اس کے جانے کے بعد صنوبر بھی کھسک گئی، اب کمرہ میں فروز بخت تھا، اور ماہ طلعت، اور غضنفر!

کچھ دیر تک فیروز بخت، غضنفر سے کھیلتا رہا، اس کے بعد وہ ماہ سے مخاطب ہُوا۔ "میں تو یہ سمجھ رہا تھا کہ تمھیں بالکل تندرست، اور خوش و خرّم دیکھوں گا!"

ماہ بولی "یہ باتیں چھوڑیئے، یہ بتایئے، آپ کی منزل اب کتنی دُور ہے؟ جس مقصد کے حصُول کے لئے، آپ نے گھر بار تج کر، خون پانی ایک کر دیا، اس میں کہاں تک کامیاب ہُوئے آپ؟"

"خدا کا شکر ہے، مایوسی کی بھیانک رات ختم ہو گئی، اور کامرانی کا سورج چمکنے لگا، اب دلّی ہمارے قبضہ ہے، مرہٹوں کی وہ ہیبت جو عام طور پر چھائی ہُوئی تھی، ختم ہوتی نظر آ رہی ہے!"

"لیکن میں نے سُنا ہے، مرہٹے بھی اس بازی پر آخری داؤ لگانے کا فیصلہ کر چکے ہیں؟"

"ہاں بات تو یہی ہے، لیکن ہم بھی تیار ہیں، یہ آخری داؤں اس بات کا فیصلہ کر دے گا کہ اس دیس پر مسلمان حکومت کریں گے یا مرہٹے؟ —— لیکن ماہ تم یہ باتیں نہ سوچو، ان باتوں کو میرے اوپر چھوڑ دو، تمھیں کامل سکون اور ذہنی آرام کی ضرورت ہے!"

"وہ تو جس دن سے آپ آئے ہیں، مجھے حاصل ہے!"

"بہت شرمندہ ہوں کہ دِلّی آتے ہی فوراً تمہارے پاس نہ آسکا!"

ایسی باتیں کر کے مجھے شرمندہ نہ کیجئے، ان باتوں کو بھول جائیے، یہ ذکر چھوڑ دیجئے یہ بتائیے، اب تو آپ کا مُستقل قیام یہاں رہے گا یا نہیں؟"

"ضرور رہے گا ـــــ لیکن آخری بازی کے بعد!"

"ابھی کوئی بازی اور بھی باقی ہے؟"

"ہاں ـــــ تم خود کہہ رہی تھیں، مرہٹے اس بازی پر آخری داؤں لگانے کا فیصلہ کر چکے ہیں، یہی فیصلہ ہم نے بھی کیا ہے۔ اس وقت جو سکون تمھیں نظر آرہا ہے یہ وہ سکون ہے جو طوفان سے پہلے سمندر پر طاری ہوتا ہے۔ اِس سکون کے بعد، پوری ہلاکت سامانیوں اور تباہ کاریوں کے ساتھ گھن گرج کے ساتھ طوفان آتا ہے اور جو کچھ کر سکتا ہے کر گزرتا ہے۔"

"ٹھیک کہتے ہیں آپ، یہ طوفان ضرور آئے گا!"

"ہاں، لیکن ہم اسے جھیل لیں گے!"

"انشاء اللہ!"

تھوڑی دیر کے بعد فیروز بخت اُٹھ کھڑا ہوا۔ اُس نے کہا: "ماہ اب میں جاتا ہوں، ابھی تک خانقاہ بھی نہیں جا سکا۔ آج حضرت شاہ صاحب کی خدمت میں شاہ ابدالی حاضر ہو رہا ہے، اِس موقع پر میرا موجود رہنا ضروری ہے، اسے رُخصت کر کے رات گئے واپس آؤں گا، تم میرے انتظار میں جاگتی نہ رہنا، سو جانا، میں انشاء اللہ آؤں گا ضرور، خواہ کتنی ہی دیر ہو جائے!"

باب (۴۳)

ملہار راؤ ہلکر کا انجام

چند روز تک دِلّی میں بڑی چہل پہل رہی، بریلی سے حافظ رحمت خاں نجیب آباد سے نجیب الدولہ فرخ آباد سے نواب احمد خاں بنگش بھی دِلّی آ گئے تھے، اِن سب نے احمد شاہ ابدالی کی خدمت میں حاضر ہو کر اُسے صُورتِ حال سے آگاہ کیا، اور اصرار کیا کہ جب تک مرہٹوں کا زور کامل طور پر نہ ٹوٹ جائے وہ افغانستان واپس نہ جائے۔

احمد شاہ ابدالی نے یہ بات مان لی، سب سے زیادہ اسے حضرت شاہ صاحب کا خیال تھا۔ انھوں نے کچھ اس انداز میں اُسے آمادہ کیا کہ وہ انکار نہ کر سکا۔ حالانکہ سندھیا کی شکست کے بعد پھر وہ یہ سوچنے لگا تھا کہ یہاں کے معاملات میں مداخلت نہ کرے اور واپس چلا جائے اسی اثناء میں خبر ملی کہ مرہٹے اور ان کے اتحادی روہیل کھنڈ کو تاخت و تاراج کر رہے ہیں احمد شاہ نے حافظ رحمت خاں کو واپس بھیج دیا اور خود دِلّی سے باہر نکل کر بادلی کے میدان میں پڑاؤ ڈالنے کا فیصلہ کیا، تاکہ ایک طرف دِلّی پر بھی نگاہ رہے اور دوسری طرف روہیل کھنڈ میں بھی اگر ضرورت ہو تو ہر وقت مدد پہنچائی جا سکے ـــــ دِلّی میں اتنی بڑی فوج کا ٹھہرانا خلافِ مصلحت بھی تھا ـــــ

ہوشیار تھا، وہ اس دامِ ہمرنگ زمین میں نہ آیا۔ اُس نے صاف کہہ دیا۔ "نہ بھائی، یہ اپنے بس کی بات نہیں ہے۔"

اس نے کہا: "تو تاسندھیا کا حشر میں نے دیکھ لیا، ملہار راؤ ہلکر کے سینے میں پناہ گاہ بن سکتا ہوں، اسلحہ خانہ نہیں، انھیں اگر شکست ہو، وہ شوق سے آئیں، میں انھیں پناہ دوں گا اور آرام سے رکھوں گا، لیکن جنگی اور فوجی مدد نہیں دے سکتا۔"

اس صاف جواب سے گیان چند بہت مایوس ہوا۔ اس نے کہا۔ "ایسے آڑے وقت میں آپ اگر مدد کریں گے، اس کا صلہ بھی ہم دیں گے اور اسے یاد بھی رکھیں گے۔"

سورج مل نے جواب دیا۔ "میری سب سے بڑی مدد یہ ہے کہ میں نیک صلاح دوں۔ میری رائے یہ ہے کہ ملہار راؤ ہلکر، ابدالی پر حملہ کا خیال ترک کر دیں، وہ میں کوئی دوسرا ابدالی سے سر نہیں ہو سکتا، ہم میں اتنی سکت نہیں ہے کہ اسے شکست دے سکیں، ابدالی سے لڑنے کی صرف ایک صورت ہے اور وہ یہ کہ رگھوناتھ کی آمد کا انتظار کیا جائے جب تک ابدالی پر ہم ہر چہار طرف سے تمام رجواڑے، تمام ریاستیں اور تمام مہاراجہ مل کر حملہ نہیں کریں گے، وہ شکست نہیں کھائے گا —— تم ملہار راؤ سے میرا یہ پیام کہہ دو اور چلے جاؤ۔"

پھر کچھ دیر رُک کر سورج مل نے کہا۔ "میں احمد شاہ کا دوست نہیں، دشمن ہوں، دغا دار نہیں، باغی ہوں، لیکن جوش میں آ کر کوئی غلط قدم نہیں اُٹھا سکتا، سایاجی پٹیل اور دتا سندھیا کا حشر زندگی بھر نہیں بھول سکتا۔ میں نے بالاجی پیشوا کو سارے حالات لکھ دیئے ہیں بلکہ یہاں تک لکھ دیا ہے کہ وہ خود اپنے لشکر کی کمان کرتا ہوا یہاں آ جائے۔ اُسے دیکھ کر کوئی راجپوت، کوئی مہاراجہ، کوئی رجواڑہ مدد کرنے اور ساتھ دینے سے انکار نہیں کر سکتا، جب تک

اس بارے میں جب احمد شاہ ابدالی نے اپنے رفقاء سے مشورہ کیا، تو سب نے تائید کی چنانچہ دوسرے روز ابدالی اپنی فوج کے ساتھ باہر چلا گیا، اور یعقوب علی خان بامزئی کو شہر کے امن و امان کا ذمہ دار کر گیا۔

○

ماہ طلعت کی طبیعت اب تک روبہ اصلاح نہیں ہوئی تھی، بلکہ حالت کچھ اور زیادہ خراب ہو گئی تھی، لہٰذا فیروز بخت، ابدالی اور شاہ صاحب کی اجازت سے دلی ہی میں رہا۔ دراصل اس نے اپنے دل میں یہ سوچا کہ فی الحال معرکہ کارزار تو گرم ہے نہیں، لہٰذا کیوں نہ دلی میں قیام کر کے ماہ طلعت کے علاج معالجہ کی طرف توجہ کی جائے۔

○

ملہار راؤ ہلکر کو جب دتا سندھیا کے قتل اور اس کی فوج کی بربادی کی اطلاع ملی، تو وہ روہیل کھنڈ سے ہٹ کر آگرہ کی طرف اپنی فوج لے کر چلا آیا۔ دتا سندھیا کی شکست نے اس کے دل پر ایسا چرکا لگایا تھا کہ وہ ہوش و حواس کھو بیٹھا تھا، اور کچھ کرتے دھرتے بن نہیں پڑ رہا تھا۔ جب دتا سندھیا اتنی بڑی فوج کے باوجود اس بری طرح ہارا اور قتل ہوا، تو اب وہ اکیلا کیا کرے گا؟ اس کے پاس جو فوج تھی وہ لاکھ کار آزمودہ، بہادر اور دلاور سہی، لیکن تعداد میں بہر حال سندھیا کی فوج سے کم تھی۔

پھر ؟

آخر غور و فکر کے بعد ہلکر نے یہ فیصلہ کیا کہ سورج مل سے مدد لی جائے، اور پھر پوری قوت کے ساتھ ابدالی پر حملہ کر دیا جائے۔ اس مقصد کے پیش نظر، ہلکر نے سورج مل جاٹ کے پاس اپنے ایک سفیر گیان چند کو بھیجا اور اس سے فوجی مدد طلب کی لیکن سورج مل بلا کا زیرک

وہ آتے، ہمیں صرف اپنے بچاؤ کی فکر کرنی چاہیئے۔ جارحانہ حملہ کا خیال دل سے نکال دینا چاہیئے!"

گیان چند خاموشی کے ساتھ یہ باتیں سنتا رہا اور دُوسرے دن ہلکر کے پاس واپس چلا گیا۔

○

آگرہ کے قریب سکندرہ میں، شہنشاہ اکبر کے مزار کے حوالی میں ملہار راؤ ہلکر اپنے لشکر سمیت پڑاؤ ڈالے پڑا تھا، وہ بے چینی سے اپنے سفیر کا انتظار کر رہا تھا کہ وہ سورج مل کے پاس سے کب آتا ہے، اور کیا خبر لاتا ہے؟ آخر کئی روز کے بعد وہ واپس آیا۔ ہلکر نے قیافہ سے پہچان لیا، کامیاب نہیں آیا، اُس نے کہا:۔

"معلوم ہوتا ہے، سورج مل نے مدد دینے سے انکار کر دیا!"

گیان چند نے جواب دیا۔ "جی انکار، اور صاف انکار!"

ہلکر نے پوچھا۔ "کہیں سُورج مل نے ابدالی سے ساز باز تو نہیں کر لی ہے؟"

گیان چند۔ "ہو سکتا ہے۔ اُس نے جو الفاظ استعمال کئے وہ ایسے ہی تھے جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے!"

ہلکر۔ "کیا کہا اُس نے؟"

گیان چند۔ "سورج مل نے کہا: میں ملہار راؤ ہلکر کے لئے پناہ گاہ بن سکتا ہوں، اسلحہ خانہ نہیں بن سکتا۔ جب وہ شکست کھائے، تو میرے ہاں آکر پناہ گزیں ہو سکتا ہے، لیکن جب لڑنے کے لئے نکلے تو میں اس کی کوئی مدد نہیں کر سکتا، سوائے دعائے خیر کے!"

ؔ پانی پت کا خونیں میدان

ملکر نے دانت پیس کر کہا۔ "یہ کہا اس بدطینت نے؟"

گیان چند نے جذبات کی کوئی کیفیت اپنے اوپر طاری کئے بغیر جواب دیا۔ "جی۔۔۔۔ صرف یہ!"

ملکر۔ "یقیناً وہ ابدالی سے مل گیا ہے ــــــــــــ پھر تم نے اس کی ان پاجیانہ باتوں کا کیا جواب دیا؟"

گیان چند۔ "میں نے کہا۔ "آپ میں اور میرے آقا ملکر میں یہی فرق ہے، آپ صرف پناہ دے سکتے ہیں، مدد نہیں کر سکتے، وہ مدد بھی کرتا ہے اور پناہ بھی دیتا ہے!"

ملکر۔ "پھر اس نے کیا کہا یہ سن کر؟"

گیان چند۔ "کچھ نہیں ــــ پہلے مسکرایا، پھر زور زور سے ہنسنے لگا!"

ملکر۔ "جی چاہتا ہے ابدالی کے بجائے اسی پر پلٹ پڑوں اور چھٹی کا دودھ یاد دلا دوں!"

گیان چند۔ "رائے تو بہت معقول ہے، لیکن جب تک ابدالی کا فیصلہ نہ ہو جائے، ہمیں اپنے دشمنوں کی فہرست میں کسی نئے آدمی کا اضافہ نہیں کرنا چاہیے!"

ملکر۔ "خیر دیکھا جائے گا ــــــــ سورج مل کے ان الفاظ نے مجھے بڑی قلبی تکلیف پہنچائی!"

گیان چند۔ "لیکن میرے آقا، آپ کے دل پر سورج مل کی باتوں سے جو زخم پہنچا ہے اس کا مرہم بھی لایا ہوں!"

ملکر۔ "وہ کیا؟"

گیان چند۔ "ایک خوش خبری!"

ملکر۔ "تو کہتے کیوں نہیں، بتاؤ کیا ہے وہ خوش خبری؟"

گیان چند۔ "میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے ــــ"

ہلکر ۔ (چیخ کر) کیا دیکھا ہے ؛ جلد کہو؟!

گیان چند ۔ میں نے دیکھا ہے کہ احمد خان بنگش کا ایک سردار تھوڑی سی فوج کے ساتھ بہت بڑی تعداد میں سامانِ رسد اور خزانہ لئے ہوئے ابدالی کے پاس جارہا ہے[1]

ہلکر ۔ سچ کہتے ہو تم ؟

گیان چند ۔ غلام آنکھوں دیکھا حال کہہ رہا ہے ———— اور وہ بدرقہ ابھی راستے میں ہے !

ہلکر ۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کی سرکوبی کی جاسکتی ہے ، سامانِ رسد چھینا جاسکتا ہے خزانہ لُوٹا جاسکتا ہے ۔ مٹھی بھر محافظ سپاہیوں کو قتل کیا جاسکتا ہے !

گیان چند ۔ بجا ارشاد ہوا ، میرا مطلب یہی ہے !

ہلکر ۔ (خوش ہو کر) تم ٹھیک کہتے ہو ، اس مرقعہ کو ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہئے !

گیان چند ۔ تو پھر جلدی کیجئے ، ایسا نہ ہو ، بدرقہ آگے نکل جائے ، اور ہم ہکّا بکّا رہ جائیں !

ہلکر ۔ نہیں ایسا نہیں ہو سکتا ، اس بدرقہ کو تم نے نہیں ، موت نے دیکھا ہے ، وہ اب زندہ بچ کر نہیں جاسکتا ، اسے قتل ہونا پڑے گا ۔ مرنا پڑے گا ۔ مرنا پڑے گا !

«ضرور ، ضرور ، میرے آقا !»

ہلکر نے فوراً بگل بجایا ، ساری فوج ایک اشارہ میں تیار ہوگئی ۔ اس نے منتخب سپاہیوں کا ایک دستہ لیا اور کہا :۔

«بڑھے چلو دوستو ، بڑھے چلو ، چھوٹا دشمن ، بڑے دشمن کی کمک کو بڑھ رہا ہے ، اس کے پاس خزانہ ہے ، سامانِ رسد ہے ، تمہیں خزانہ کی بھی ضرورت ہے ، اور رسد کی بھی ——— اور

---

[1] تاریخ اودھ

شکار کی بھی، خزانہ چھین لو، رسد لوٹ لو، اور دشمن کے سپاہیوں کا شکار کرو!"

"ہاں نوجوانو!"

"شاباش!"

دیکھو جو قدم آگے بڑھے، وہ پیچھے نہ ہٹے! تلوار جب دشمن کے سر پر چمکے تو اس کی گردن کاٹے بغیر میان میں واپس نہ جائے!

چلو!

منزل کھوٹی نہ کرو،

آندھی بن کر چلو، بادل بن کر گرجو، اور بجلی بن کر دشمن کے سر پر گر دو!"

ہلکر کے ان الفاظ نے جادو کا کام کیا، سپاہیوں کے عزم و ہمت میں کئی گنا اضافہ ہو گیا۔

ہلکر آگے آگے تھا۔

اور وہ پیچھے پیچھے!

اور دیکھتے ہی دیکھتے یہ قافلہ طوفان گرد و باد کی طرح روانہ ہو گیا۔ ہلکر نے اپنے سپاہیوں کے ساتھ دریائے جمنا کو عبور کیا۔ کچھ فاصلہ پر جا کر وہ بدرقہ مل گیا۔ ہلکر کے سپاہیوں نے بڑی تیزی سے اچانک حملہ کر دیا۔

خزانہ لوٹ لیا!

سامان رسد چھین لیا!

اور بڑی بے دردی سے محافظ دستہ کے سپاہیوں کو قتل کر دیا۔

یہ سارا کام ہلکر نے بجلی کی سی تیزی کے ساتھ کیا، اور پھر جمنا کو عبور کر کے اپنے فوجی

صدر مرکز سکندرہ میں پہنچگیا۔ پنڈت گیان چند جو سفیر بن کر سورج مل کے پاس گیا تھا ہلکر کے ساتھ تھا، راستے میں ہلکر نے اس سے کہا: "دیکھا تم نے سپہ گری اسے کہتے ہیں!"

گیان چند۔ "میں تو ہمیشہ سے اِس سپہ گری، اور دلاوری کے جوہر دیکھتا ہوں۔ کاش اس وقت"

پھر وہ چپ ہو گیا۔

ہلکر نے پوچھا۔ کیا کہہ رہے تھے تم؟"

وہ بولا: "میں یہ کہہ رہا تھا، کاش اس وقت سورج مل ہوتا، وہ اپنی آنکھوں سے آپ کی سپہ گری، اور دلاوری کا منظر دیکھتا۔ مجھے یقین ہے، دل میں بہت نادم ہوتا، اور عفو تقصیر کا طالب ہوتا۔"

ہلکر: "اس بد نہاد کا ذکر نہ کرو۔ میں اس کا نام بھی سننا نہیں چاہتا!"

گیان چند۔ "میرا تو جی چاہتا ہے، سورج مل کے پاس واپس جاؤں گھڑی بھر کے لئے؟"

ہلکر۔ "کس لئے؟ کیوں؟"

گیان چند۔ "یہ کٹے ہوئے سر، یہ سیم و زر سے بھری ہوئی تھیلیاں، یہ انبار در انبار سامان رسد اس کے سامنے ڈال دوں لے جا کر، اور اس سے کہوں، تجھے مدد کرنے سے انکار تھا، دیکھ یہ ماتما یوں مدد کرتا ہے! پھر دیکھوں وہ کیا کہتا ہے؟"

ہلکر۔ "کہے گا کیا، باتیں بنائے گا!"

گیان چند: "وہی تو سننے کو جی چاہتا ہے!"

اتنے میں سکندرہ آگیا، اور ہلکر شاہانہ وقار کے ساتھ اپنے خیمہ میں چلا گیا!

○

ابدالی اپنے لشکر کی سیر کر رہا تھا، ایک سفید گھوڑے پر سوار تھا، اس کے بائیں نجیب الدولہ اور حافظ رحمت خاں تھے، پیچھے چند اور سوار تھے۔

چلتے چلتے ابدالی نے کہا: "احمد خاں بنگش کو ہم سے وفا کا بڑا دعویٰ تھا، ہمیں آئے ہوئے اتنے روز ہو گئے، مگر جب سے وہ دلّی سے گیا ہے، اس کی کوئی اطلاع نہیں آئی۔ حالانکہ اس نے وعدہ کیا تھا کہ فرخ آباد جاتے ہی بہت کافی مقدار میں رسد بھیجے گا.... بے مروت کہیں کا!"

حافظ رحمت خاں: "وہ آدمی تو ایسا نہیں ہے!"

نجیب الدولہ: "چلتے وقت مجھ سے بھی وعدہ کر گیا تھا کہ جاتے ہی افواجِ شاہی کے لئے بہت کافی رسد بھیجوں گا!"

ابدالی: (دنہسکر) "بھول گیا ہوگا!"

نجیب الدولہ: "نہیں جہاں پناہ! یہ کبھی نہیں ہو سکتا، وہ اس قسم کا آدمی نہیں ہے!"

ابدالی: "پھر آخر کیا بات ہوئی؟"

حافظ رحمت خاں: "ضرور کوئی خاص بات ہے، ورنہ بنگش سے اس طرزِ عمل کی ہرگز توقع نہیں کی جا سکتی ـــــ کیوں نہ کسی آدمی کو اس کی خبر کے لئے فرخ آباد بھیج دیا جائے تاکہ صحیح حالات معلوم ہو سکیں۔"

ابدالی: "ضرور بھیجو، کسی کو!"

یہ باتیں کرتے کرتے احمد شاہ اپنے شاہی خیمہ کے قریب پہنچا، یہاں سے نجیب الدولہ حافظ رحمت خاں اپنے اپنے خیمہ کی طرف مڑنے والے تھے کہ انہوں نے دیکھا چند آدمی بحالِ زار، تباہ و برباد، خستہ اور ماندہ، سیدھے شاہ کی طرف بڑھے چلے آ رہے ہیں، یہ دونوں

یہ منظر دیکھ کر رُک گئے اور ابدالی بھی، جو گھوڑے سے اُتر چکا تھا، کھڑا ہو گیا۔

یہ لوگ قریب پہنچے ابدالی نے پوچھا: "تم لوگ کون ہو؟ کہاں سے آئے ہو، کیا مقصد لے کر آئے ہو؟"

ان میں سے ایک نے کہا "جہاں پناہ! ——— ہمارے ساتھی قتل کر دیئے گئے، خزانہ لوٹ لیا گیا، سامان رسد سارے کا سارا دشمنوں نے چھین لیا!"

ابدالی۔ "کیسا خزانہ؟ کس کا سامان رسد؟ کیسے ساتھی؟"

اس آدمی نے عرض کیا، "ایک بدرقہ کے ساتھ ہمارے آقا احمد خاں بنگش نے بہت بڑا خزانہ اور بہت بڑی مقدار میں سامان رسد دے کر ہمیں حضور کی خدمت میں بھیجا تھا اور کہلا بھیجا تھا کہ وہ خود بھی بہت جلد اپنی سپاہ منظم کر کے آ رہے ہیں:"

ابدالی۔ "ہاں ——— پھر؟"

وہ بولا۔ "نہ جانے کس طرح ہلکر کو پتہ چل گیا، وہ ہم پر ٹوٹ پڑا، اس نے سب کچھ چھین لیا، ہمارے ساتھیوں کو بڑی بے دردی کے ساتھ قتل کیا، صرف ہم چند آدمی زخمی ہو کر بچ گئے، اور گرتے پڑتے حضور شاہ میں خبر دینے کے لئے حاضر ہو گئے!"

یہ الفاظ سُن کر ابدالی کا چہرہ دفرِ غضب سے تمتما اُٹھا۔ اس کی آنکھوں سے خون بہنے لگا۔ نجیب الدولہ اور حافظ رحمت خاں، جیسے بہادر اور خود مختار فرمانرواؤں کا ——— دیکھ کر یہ حال ہوا کہ بید لرزاں کی طرح کانپنے لگے۔

ابدالی نے گرجدار آواز میں کہا۔ "شاہ پسند خاں کو بلاؤ!"

فوراً شاہ پسند خاں کو اطلاع کی گئی، وہ گرتا پڑتا اور ہانپتا کانپتا حاضر ہوا۔

ابدالی نے کہا: "سنو یہ لوگ تمہارے لئے کیا پیام لائے ہیں؟"

پھر اسی آدمی سے کہا۔ "اپنی داستان انھیں سناؤ!"

اس نے وہ ساری رام کہانی پھر دوہرادی: ابدالی نے شاہ پسند خاں سے کہا۔ "سن لیا تم نے؟"

شاہ پسند خاں نے سرِ عبودیت جھکاکر کہا۔ "سن لیا جہاں پناہ!"

ابدالی۔ "تمہاری غیرت حرکت میں آئی؟"

شاہ پسند خاں۔ "صرف حکم کی دیر ہے!"

ابدالی۔ "میں چاہتا ہوں کہ تم ہوا کی سی تیزی سے سکندرہ جاؤ اور ملہار راؤ ہلکر کو ایسی سزا دو کہ وہ زندگی بھر یاد رکھے!"

شاہ پسند خاں۔ "ایسا ہی ہوگا، جہاں پناہ! ——— جب تک میں ہلکر کو اس گستاخی کی قرار واقعی سزا نہ دے لوں میرے اوپر خواب و خور حرام ہے!"

ابدالی۔ "تو جاؤ ——— خدا حافظ!"

شاہ پسند خاںؒ دس ہزار جرار سپاہیوں کا ایک دستہ لے کر سکندرہ کی طرف روانہ ہو گیا۔

○

آج ہولی تھی!

عیش و نشاط، شکر و مسرت، اور سرخوشی کے طوفان کا دن!

ہلکر بہت خوش تھا، اسے بہت بڑا خزانہ ہاتھ آیا تھا، بغیر کسی مزاحمت کے اتنا سامان رسد مل گیا تھا کہ وہ بہت دنوں کے لئے کافی تھا، بہت سے دشمنوں کا بھی اس نے خون

ل تاریخ اودھ

بہایا تھا، یہ خوشی بھی تھی۔

اور پھر ہولی بھی!

ہلکر کی فوج ہولی منانے میں مست تھی، رنگ پھینکا جا رہا تھا، گلال اور عبیر کے چھینٹے دیئے جا رہے تھے، رنگ کی محفلیں جمی ہوئی تھیں، داستانوں اور کہانیوں کا سلسلہ جاری تھا، شراب کا دور چل رہا تھا، ع

کسے را باکسے کارے نہ باشد!

ہر شخص اپنی دھن میں مست تھا، ہر شخص فکرِ فردا سے آزاد تھا، ہر شخص عیش کے نشہ میں سرشار ہو رہا تھا، کسی کو نہ حال کی فکر تھی، نہ کل کا اندیشہ سب پر ایک عجیب قسم کے انبساط کی مستی چھائی ہوئی تھی۔

اور خود ہلکر بھی اپنے خیمہ میں دادِ عیش دے رہا تھا، اس نے اپنے سپاہیوں کو اذن عام دے دیا تھا کہ آج وہ اپنے دل کی کوئی حسرت باقی نہ رہنے دیں، کوئی تمنّا ادھوری نہ چھوڑیں، خوب پئیں، خوب مزے کریں، گائیں، ناچیں، عیش کریں، آج ہر ضابطہ نرم کر دیا گیا تھا، ہر قانون میں لچک پیدا کر دی گئی تھی، ہر پابندی سہولت سے بدل دی گئی تھی۔

اور عین راگ رنگ اور عیش طرب کے اس ہجوم میں دفعتاً شاہ پسند خاں کی فوجیں ہلکر کی فوجوں پر ٹوٹ پڑیں۔ شاہ پسند خاں کی ناگہانی تاخت نے ہلکر کی فوجوں کے چھکے چھڑا دیئے، سب پر ایسی بدحواسی اور سراسیمگی طاری ہوئی کہ اپنے پرائے کا ہوش نہ رہا۔ ایسی افراتفری اور بھگدڑ مچی کہ تھوڑی دیر تک خود ہلکر مبہوت بیٹھا رہا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟ یہ شاہ پسند خاں قضائے مبرم بن کر کہاں سے ٹپک پڑا!

---

[1] تاریخ ہند

شاہ پسند خاں نے جو کہا تھا وہ کر دکھایا۔ اُس نے (اسّی) (۸۰) کوس کا فاصلہ اپنی فوج کے ساتھ بغیر آرام کئے بغیر ستائے، بغیر کھانا کھائے، بغیر پانی پئے، صرف ایک شبانہ روز میں طے کیا تھا، اور جس طرح عقاب ناذک پر ندوں پر جھپٹتا اور ایک ہی وار میں ان کا کام تمام کر دیتا ہے، اسی طرح اُس نے ایک ہی وار میں ملکر کی ساری فوج کے چھکّے چھڑا دیئے، جو سپاہی سامنے آیا، وہ ہلاک ہوا، جو مسلح آدمی نظر آیا، وہ موت کے تیر سے بچ نہ سکا، خود ملکر کی جان کے لالے پڑگئے، بڑی مشکل سے صرف تین سو آدمیوں کے ساتھ وہ گھوڑے کی ننگی پیٹھ پر بیٹھ کر سورج مل کی طرف پناہ لینے بھاگا، اِتنا وقت بھی نہ تھا کہ گھوڑوں پر زین اور چار جامہ کسا جاتا۔ اس کا انتظار کرتا اسے اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑتا۔

ملکر کی ساری فوج، جس پر اسے بڑا ناز تھا، تباہ ہوگئی، قتل ہوگئی!

شاہ پسند خاں نے پُورے اطمینان اور دلجمعی کے ساتھ، نہ صرف وہ سارا خزانہ اور سامان رسد واپس لے لیا، جو ملکر نے احمد خاں بنگش کے آدمیوں سے چھینا تھا۔ بلکہ ملکر نے جو کچھ اپنے پاس ادھر ادھر سے لُوٹ مار کر جمع کیا تھا، وہ بھی چھین لیا اور اپنی مظفر و منصور فوج کے ساتھ اپنے آقا احمد شاہ ابدالی کی خدمت میں روانہ ہوگیا۔

لہ یہ عجیب واقعہ انگریزی اور فارسی کی متعدد مستند تاریخوں میں مذکور ہے۔

لہ پانی پت کا خونیں میدان

باب (۴۴)

پیشوا کا دربار

بالاجی راؤ پیشوا، اپنے دونوں بھائیوں رگھوناتھ اور سداشیو راؤ کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ اس وقت پیشوا بہت خوش تھا، یہ دونوں بھائی بھی خوشی اور مسرت کے عالم میں اس کی ہاں میں ہاں ملا رہے تھے۔ پیشوا نے کہا۔

• رگھوناتھ تم نے پنجاب فتح کر کے بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہے، ہم تم سے بہت خوش ہیں، ہم ہی نہیں پوری مرہٹہ قوم کو تم پر ناز ہے، تم نے تاریخ بدل دی!"

رگھوناتھ راؤ دل میں تو ان تعریفی کلمات سے بہت خوش ہوا، لیکن اس نے ادب سے گردن جھکا کر کہا۔ "یہ سب آپ کی کرپا ہے!"

بالاجی۔ "نہیں بات کہنی چاہئے، تمہاری جگہ ہم ہوتے تو بھی شاید اس سے زیادہ نہیں کر سکتے تھے، جتنا تم نے کر دکھایا۔ —— کیوں سداشیو راؤ ٹھیک ہے نا!"

سداشیو راؤ نے مسکرا کر عرض کیا۔ "ٹھیک تو ہے لیکن ——"

اور پھر وہ سر کھجانے لگا۔

پیشوا نے پوچھا۔ "تم رگھوناتھ راؤ کے اس کارنامے کو کوئی وقعت نہیں دیتے؟"

سداشیو راؤ: "کیوں نہیں دیتا میرے سردار ——— لیکن میری نظر ترازو کے صرف ایک پلڑے پر نہیں، دونوں پر رہتی ہے!"

بالاجی راؤ پیشوا: "کیا مطلب؟ تمہارا مطلب یہ ہے کہ ہم نے رگھوناتھ کی پیٹھ ٹھونک کر غلطی کی؟ ہم نے اس کی تعریف میں مبالغہ سے کام لیا؟"

سداشیو راؤ: "جی نہیں، میرا یہ مطلب نہیں ہے!"

بالاجی راؤ پیشوا: "پھر کیا مطلب ہے؟ صاف صاف کیوں نہیں کہتے؟"

سداشیو راؤ: "میرا مطلب یہ ہے کہ رگھوناتھ بھائی نے جو کارنامہ انجام دیا وہ بے شک تعریف کے قابل ہے، لیکن یہ سودا ہاگھاٹے کا!"

اب رگھوناتھ ضبط نہ کر سکا: "یعنی پنجاب فتح کر کے ہم نقصان میں رہے؟"

سداشیو راؤ: "ہاں، میرا مطلب یہی ہے ——— آپ نے پنجاب کی مہم پر جتنا روپیہ خرچ کیا، اتنا واپس نہیں لا سکے، لوٹ کا جو مال آپ اپنے ساتھ لائے ہیں اسے ملا کر بھی ہم اس گھاٹے کو پورا نہیں کر سکتے، جو اس ساری مدت میں آپ پر، آپ کی فوج پر، آپ کے اسلحہ پر اور دوسری ضروریات پر صرف ہوا ہے۔ کسی علاقہ کے فتح کرنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہمارے مالیات میں اضافہ ہو لیکن اگر خزانہ ختم کر کے علاقے فتح کرتے جائیے تو نتیجہ یہ ہوگا کہ میزان کے وقت نفع کے بجائے گھاٹا نظر آئے گا!"

رگھوناتھ غصے سے بے قابو ہو گیا: "تم جھوٹے ہو!"

سداشیو راؤ کی سنجیدگی قائم رہی: "میں جھوٹ کبھی نہیں بولتا!"

رگھوناتھ کا غصہ اور بڑھ گیا: "تم حسد سے یہ باتیں کر رہے ہو!"

سداشیو کی آنکھیں سُرخ ہوگئیں لیکن الفاظ کی شیرینی قائم رہی۔

"نہیں بھائی صاحب! آپ کا یہ خیال بھی غلط ہے۔ میں آپ سے حسد کروں گا۔ میرے آپ کے درمیان رقابت نہیں، چشمک نہیں، عداوت نہیں، آپ اور میں غیر نہیں، آپ کی عزت میری عزت ہے، آپ کی ذلت میری ذلت ہے، جو آپ، وہ میں، جو میں وہ آپ!"

بالاجی راؤ پیشوا کو مداخلت کرنی پڑی۔ "یہ تو ٹھیک ہے!"

پھر وہ رگھوناتھ سے مخاطب ہوا۔ "تمہارا یہ خیال صحیح نہیں، سداشیو راؤ بھاؤ نے کبھی تمہارے پیچھے بُرائی میں ایک لفظ منہ سے نہیں نکالا ہمیشہ تعریفیں کرتا رہا۔ وہ تمہارا دشمن نہیں دوست ہے"

پھر اس نے سداشیو راؤ بھاؤ سے کہا۔ "لیکن تم نے نفع نقصان کے بارے میں جو کچھ کہا وہ میری سمجھ میں نہیں آیا!"

سداشیو راؤ بھاؤ ہنس پڑا۔ "نہ آیا ہوگا ——— بات یہ ہے کہ آپ تو حساب کتاب کبھی دیکھتے نہیں آپ حکم دیتے ہیں میں تعمیل کرتا ہوں، حساب کتاب کی دیکھ بھال، نگرانی اور ذمہ داری تو میرے اوپر ہے، حکم ہو تو ابھی بہی کھاتہ منگاتا ہوں، دیکھ لیجئے ہم نے خرچ کتنا زیادہ کیا اور وصول کتنا کم کیا[1]"

رگھوناتھ راؤ۔ "اگر تمہارا حساب سچا بھی ہے تو بھی ہر لین دین اصول پر نہیں تولی جا سکتی۔ پنجاب کی فتح بجائے خود اتنا بڑا کارنامہ ہے کہ اس میں کروڑوں کا نقصان ہو تو بھی کوئی مضائقہ نہیں۔ پنجاب پر قبضہ کر لینے کے معنی یہ ہیں کہ کوئی دشمن اندرون ملک میں آکر تباہی اور بربادی نہیں پھیلا سکتا۔ ہم دشمن کا مقابلہ اب گھر کے اندر نہیں دروازے

[1] پانی پت کا خونیں میدانِ جنگ

پر کریں گے۔ کیا یہ کوئی معمولی بات ہے ؟"

رگھوناتھ راؤ کی بات ابھی ختم نہیں ہوئی تھی کہ ایک خادم آ کر ادب سے کھڑا ہو گیا پیشوا نے پوچھا۔ "کیا بات ہے ؟"

وہ بولا۔ "سایاجی پٹیل باریابی کی اجازت چاہتے ہیں ؟"

رگھوناتھ کے مُنہ سے بے ساختہ نکلا۔ "سایاجی !!؟"

بالاجی راؤ پیشوا نے کہا۔ "سایاجی کیوں آیا ؟ ہم نے تو اسے نہیں بلایا تھا۔ اس نے اپنے آنے کی کوئی اطلاع بھی نہیں دی تھی یوں دفعتاً اس کا آجانا ضرور کوئی اہمیت رکھتا ہے ؟"

پھر اس نے حکم دیا۔ "سایاجی کو حاضر کیا جائے ؟"

چشم زدن میں سایاجی با حالِ تباہ پیشوا کے سامنے حاضر ہو کر اپنی داستانِ درد، ابدالی کی آمد اس کی فتحمندی، اپنی شکست آدینہ بیگ کی اور اپنی فرار کی کہانی سُنا رہا تھا!

بالاجی راؤ پیشوا کا منہ غصہ سے سُرخ ہو رہا تھا۔

رگھوناتھ دم بخود گردن جھکائے بیٹھا تھا!

اور ــــــ سداشیو راؤ بھاؤ مسکرا رہا تھا!

پیشوا نے غُصّہ سے پُوچھا۔ "لیکن تم اور آدینہ بیگ بھاگے کیوں ؟ لڑے کیوں نہیں ؟"

سایاجی نے عرض کیا۔ "شری مثت ہم بھاگے نہیں پسپا ہوتے ہیں، آدینہ بیگ دِلّی گیا ہے کہ سندھیا اور ہلکر سے مدد لے کر لاہور کو بچائے۔ میں اس لئے حاضر ہوا ہوں، کہ آپ یہاں سے رگھوناتھ راؤ کی سربراہی میں اپنی فوج بھیجیے، اس مرتبہ ابدالی کا خاتمہ کر دینا چاہئے، وہ نکلنے نہ پائے، اگر بچ گیا تو یاد رکھئے یہ فتنہ بار بار سر اُٹھاتا رہے گا"

شاید سایاجی ابھی کچھ اور کہتا، لیکن بالاجی راؤ پیشوا، اپنا غصہ ضبط نہ کر سکا۔ اُس نے

چیخکر کہا۔ "خاموش بے ادب ——— بزدل، نابکار، بھگوڑا، باتیں بناتا ہے!"

سایاجی خاموش ہوگیا!

کچھ دیر تک حاضرین پر خاموشی طاری رہی!

پھر بالاجی راؤ پیشوا نے سایاجی سے پوچھا۔ "اور فوج؟"

سایاجی کی گھگھی بندھ گئی۔ "جی"

پیشوا نے گرجکر کہا۔ "فوج کہاں ہے؟"

سایاجی۔ "فوج وہیں ہے!"

پیشوا۔ "کہاں؟ کہاں ہے وہ؟"

سایاجی۔ "لاہور میں!"

پیشوا۔ "کیا اسے قتل کرا دیا تُونے؟!"

سایاجی۔ "مجھے کچھ نہیں معلوم، میں تو یہاں چلا آیا، شری منت!"

پیشوا۔ "ابے شری منت کے بچے، تو نمک حرام ہے، غدّار ہے، بزدل ہے ——— کیا تو یہ سمجھتا ہے کہ لاہور پر قبضہ کرنے کے بعد ابدالی نے مرہٹہ سپاہیوں کو چھوڑ دیا ہوگا!

وہ ضرور قتل ہوگئے ——— آہ میرے سپاہی!"

رگھوناتھ راؤ کے چہرے پر شرمندگی طاری تھی!

سداشیو راؤ کنکھیوں سے رگھوناتھ کو دیکھ رہا تھا، اور مسکرا رہا تھا۔

سایاجی گرفتار کر لیا گیا!

سداشیو راؤ کے ہونٹوں پر اب بھی تبسّم کھیل رہا تھا!

○

سایاجی پٹیل کے اس طرح بھاگ آنے اور لاہور میں مرہٹہ فوج کی تباہی سے بالاجی راؤ پیشوا کو اتنا سخت صدمہ پہنچا کہ کئی روز تک اس نے کسی سے کوئی بات نہیں کی۔

کئی دن کے بعد خلوت خاص میں اُس نے رگھوناتھ راؤ اور سداشیو راؤ بھاؤ کو طلب کیا۔ اُس نے کہا: "تم سمجھ گئے ہوگے۔ میں نے تم دونوں کو کیوں بُلایا ہے؟"

دونوں خاموش رہے!

کچھ دیر جواب کا انتظار کرکے پیشوا نے کہا: "دِلّی کے تخت پر قبضہ کرنا، ہمارا آخری مطمحِ نظر تھا۔ میں اس مقصود کو آہستہ آہستہ حاصل کرنا چاہتا تھا۔ لیکن اب وقت آگیا ہے، کہ تدریج کی پالیسی ترک کر دی جائے، اور جو کچھ کرنا ہے فوراً کر لیا جائے۔ جب تک دِلّی کا تخت ہم نہیں حاصل کر لیتے، ہندوستان پر مکمل اقتدار نہیں حاصل کر سکتے، ہندوستان کے مسلمانوں میں یہ اکڑ باقی رہے گی کہ وہ ایک حکمران قوم کے فرد ہیں، اور باہر کے مسلمان فرمانروا بھی جب موقع دیکھیں گے، امداد و اعانت کے بہانے سے آتے رہیں گے، لیکن اگر تختِ حکومت ہمارے قبضہ میں آگیا، تو صورتِ حال بدل جائے گی!"

رگھوناتھ راؤ نے کہا: "بالکل صحیح خیال ہے!"

سداشیو نے بھی تائید کی۔ "میں تو عرصے سے یہی بات سوچ رہا ہوں، یہ ہماری غلطی تھی کہ اب تک ہم صرف تاراج پر اکتفا کرتے رہے، چوتھ اور سردیش مکھی پر قناعت کر لی، اب ہم میں اتنی طاقت ہے کہ سارے ملک پر اپنا پھریرا لہرائیں!"

بالاجی راؤ پیشوا: "اور یہ کام ہمیں جلد از جلد انجام دے لینا ہے۔"

سداشیو راؤ: "بے شک!"

بالاجی راؤ پیشوا: "میرے خیال میں مناسب یہ ہے کہ سورج مل، ملہار راؤ اور دتا سندھیا

کہ یہاں سے فرمان بھیجدیا جائے کہ وہ زیادہ سے زیادہ وسیع پیمانہ پر جنگ کی تیاریاں کریں اور اسی اثنا میں ہم بھی جتنا بڑا اور زبردست لشکر فراہم کر سکتے ہیں فراہم کر لیں!"

سداشیو راؤ۔ "بہت مناسب رائے ہے!"

بالاجی راؤ پیشوا۔ "اور میرا خیال یہ بھی ہے کہ راجگان راجپوتانہ کو بھی ایک خط بھیج دیا جائے، اور اُن سے اپیل کی جائے کہ وہ بھی ہمیں جتنی فوجی، مالی امداخلاقی مدد دے سکتے ہیں، دیں!"

رگھوناتھ۔ "بہت ٹھیک۔"

سداشیو راؤ۔ "لیکن راجگان راجپوتانہ انکار تو نہ کر دیں گے؟"

بالاجی راؤ پیشوا (غصّہ کے عالم میں)، "کسی بڑے سے بڑے راجہ اور مہاراجہ میں یہ طاقت نہیں ہے کہ وہ بالاجی کے فرمان کو ٹھکرا سکے۔ کیا تمہارا خیال ہے کسی میں سرتابی کی مجال ہے؟"

سداشیو راؤ خاموش ہو گیا!

رگھوناتھ نے کہا۔ "اگر کوئی سرتابی کی جرأت کرے تو ہم اس کی سرکوبی کریں گے، اب ہمیں کھلے بندوں اعلان کر دینا چاہئے کہ جو ہمارے ساتھ نہیں ہے، وہ ہمارا دشمن ہے خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان!"

بالاجی راؤ پیشوا۔ "میرا ارادہ ہو رہا ہے کہ میں خود، اس مہم پر چلوں، لیکن یہ اندیشہ بھی ہوتا ہے کہیں میری غیر حاضری سے کمبخت نظام الملک فائدہ نہ اُٹھائے!"

سداشیو راؤ۔ "جب تک غلام زندہ ہیں، آپ کو تکلیف کرنے کی ضرورت نہیں!"

رگھوناتھ راؤ۔ "اگر اتفاق سے ہمیں شکست بھی ہو جائے تو بھی آپ اگر یہاں ہیں، تو مرکز

قائم رہے گا۔ لیکن اگر آپ یہاں سے نکلے، اور آپ کو شکست ہوئی تو مرکزِ تباہ ہو جائیگا تو پھر ہم کبھی نہ پنپ سکیں گے۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائیں گے!"

بات معقول تھی، لیکن سدا شیو راؤ کے لئے اس سے بڑھ کر داد کرنے کا کوئی دوسرا موقعہ نہیں ہو سکتا تھا، اس نے کہا۔ "آپ بھی کیسی باتیں کرتے ہیں!"

رگھوناتھ نے پوچھا۔ "کیوں غلط کہا میں نے؟"

سداشیو راؤ: "بھلا اس موقع پر شکست اور ہزیمت کا ذکر کرنے کی کیا تک تھی ـــــ آخر شگون بھی تو کوئی چیز ہے۔ ہم تو اس بازی پر آخری داؤں لگا دینے کا فیصلہ کر رہے ہیں، اور آپ کو شکست کا اندیشہ پریشان کر رہا ہے، اور صرف یہی نہیں، بلکہ آپ بڑی سے بڑی ہستی کو بھی ڈرا رہے ہیں، کیا آپ کا خیال ہے، بالاجی راؤ کو شکست ہو سکتی ہے؟ وہ جس فوج کا سربراہ ہو، وہ ہار سکتی ہے؟ آپ جیسے سمجھدار آدمی کے منہ سے ایسی باتیں سننے کی مجھے ہرگز توقع نہیں تھی!"

رگھوناتھ شرمندہ ہو گیا، اس نے بات بنائی، "میں نے تو ایک بات کہی تھی!"

سداشیو راؤ: "ہاں، لیکن نہایت بے موقع!"

رگھوناتھ: "کام شروع کرتے وقت، ہر پہلو پر اچھی طرح غور کر لینا چاہئے، تدبّر کا تقاضا یہی ہے!"

بالاجی راؤ پیشوا بڑی دیر سے اپنا غصہ ضبط کر رہا تھا، اب نہ کر سکا۔

"خاموش رگھوناتھ ـــــ واقعی تم بڑے بیوقوف ہو، بالکل نہیں جانتے کہ کون سی بات کس موقع پر کہنی چاہئے!"

رگھوناتھ خاموش ہو گیا۔!

پیشوا نے سلسلۂ گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا: "اگر تمہیں اپنے اُوپر اعتماد نہیں ہے، نہ جاؤ، میں کوئی اصرار تو نہیں کرتا۔ سداشیو راؤ تم سے کم بہادر نہیں ہے۔ وہ چلا جائیگا۔"

رگھوناتھ کو اس بات سے بڑا صدمہ ہوا، بجائے معذرت کرنے کے وہ اُلجھ پڑا: "میں کب کہتا ہوں ورنہ جائیں؟"

سداشیو راؤ: "بھیا آپ چُپ رہیے، واقعی اِس وقت آپ نے بڑی بے تکی بات کہی تھی۔ ایسی منحوس باتیں کرتے وقت آپ کا دِل نہیں دھڑکا؟"

رگھوناتھ: "میں نحوست کا قائل نہیں۔"

بالاجی راؤ پیشوا: "اسی لئے تو چُپ رہنے کو کہہ رہا ہوں، تُم نحوست کے قائل نہیں ہو تو ہوں، سداشیو راؤ تو ہے، ساری دُنیا تو ہے۔"

اِسی اَثنا میں، بالاجی راؤ پیشوا کا ایک درباری ہانپتا کانپتا حاضر ہوا۔ اُس نے آتے ہی بغیر کسی تمہید کے کہا: "غضب ہوگیا سَری منت!"

اور یہ کہہ کر وہ بچّوں کی طرح پھُوٹ پھُوٹ کر رونے لگا۔

بالاجی گھبرا ہر گیا۔ اُس نے ملاطفت کے ساتھ کہا: "کیا ہُوا، کیوں رو رہے ہو؟"

اُس نے کہا: "سِندھیا، دتّا سِندھیا"

اور پھر وہ ملک بلک کر رونے لگا!

دتّا سندھیا کا نام سُن کر، پیشوا، رگھوناتھ، اور سداشیو راؤ سب پر سکتہ طاری ہوگیا۔ کچھ دیر تک تو سب کی زبانیں گنگ رہیں، پھر پیشوا نے اپنے تئیں سنبھال کر کہا۔

"کیا ہُوا سِندھیا کو؟"

وہ بولا: "قتل ہوگیا!"

پیشوا نے تقریباً روتے ہوئے کہا: کیا کہا، قتل ہوگیا؟ کس نے قتل کیا، اس شیرِ نوجواں کو؟
وہ کہنے لگا: احمد شاہ نے ——— ہمارا شور راجنگ کرتا ہوا مارا گیا ——— صرف وہی نہیں اس کی ساری فوج تباہ ہوگئی، صرف چند سو آدمی بچے جو اس وقت راجہ سورج مل کے پاس پناہ گزیں ہیں!"

اور یہ کہتے کہتے اُس کی آنکھوں سے پھر سیلابِ اشک رواں ہوگیا!

لیکن اس مرتبہ وہ تنہا نہیں رو رہا تھا، پیشوا، رگھوناتھ، اور سداشیو راؤ بھاؤ، سب ہی رو رہے تھے، اور پھوٹ پھوٹ کر رو رہے تھے۔

یہ اتنا بڑا سانحہ تھا کہ پیشوا اپنے رُتبہ کو بھول گیا اور بچوں کی طرح رونے لگا۔

باب (۴۵)

پیشوا کا جلال

وفورِ غم سے پیشوا کئی دن تک اس قابل نہیں ہو سکا کہ غور و فکر کر سکے۔ آئندہ کا کوئی پروگرام بنا سکے، بار بار اس کی نگاہ تصوّر میں سندھیا کی مقتول تصویر پھر رہی تھی، وہ بار بار اپنی آنکھوں سے آنسو پونچھتا تھا، لیکن آنسوؤں کا طوفان تھا کہ امنڈا چلا آ رہا تھا۔ ع

جب نام ترا لیجئے، تب اشک بھر آوے!

سدا شیو راؤ، پیشوا کی اِس کیفیت کو دیکھ رہا تھا۔ محسوس کر رہا تھا، وہ اب اپنی امنگیں پوری کرنا چاہتا تھا۔ رگھوناتھ راؤ کو اس نے پیشوا کی نظر میں ذلیل کر دیا تھا، اُسے یقین تھا، پونا سے اب جو مہم بھی دِلّی ابدالی کی سرکوبی کے لئے جائے گی، اُس کا سربراہ وُہ نہیں ہو سکتا اِس مرتبہ قرعۂ فال صرف سدا شیو راؤ بھاؤ ہی کے نام پڑے گا، اور یہ سوچتے سوچتے اس کے لبوں پر تبسّم کھیلنے لگتا تھا۔

رگھوناتھ راؤ کے دِل میں بھی طوفان اُٹھ رہا تھا، سایاجی کی شکست اور فرار، اور سندھیا کے قتل اور کثیر مرہٹہ فوج کی ہلاکت کو وہ قومی توہین سمجھ رہا تھا۔ اُس کے جوش کا یہ عالم تھا کہ اگر تن تنہا صرف اسے ابدالی اور اُس کی فوج کی سرکوبی کے لئے روانہ کیا جاتا، تو وہ گھوڑے

کی ننگی پیٹھ پر تلوار چمکاتا ہُوا روانہ ہوجاتا لیکن ——

لیکن یہ صرف تمنائیں تھیں اور —— ع

آرزوؤں سے پھرا کرتی ہیں تقدیریں کہیں

وہ محسوس کر رہا تھا۔ اس کی تقدیر پلٹ چکی ہے، سداشیو راؤ نے اُس کی قسمت پر، ناموری پر، جنگی صلاحیت پر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مُہر لگادی ہے، وہ اب کچھ نہیں کرسکتا، کسی کام کا نہیں رہ گیا، اب وہ زمین کی پیٹھ پر ایک بوجھ ہے —— اس کا جی چاہ رہا تھا خودکشی کرلے۔

خودکشی!

پھر اُس نے سوچا، خودکشی تو مجھے اور ذلیل کرادے گی، میرا نام اور بدنام ہوجائیگا یہ سوچتے سوچتے اس کا دِل بھر آتا تھا، اُسے زندگی سے، دُنیا سے، دُنیا کی ہر نعمت اور لذّت سے نفرت ہوجاتی تھی۔

○

بالاجی راؤ پیشوا اپنی خلوت میں خاموش بیٹھا تھا، اتنے میں وبے پاؤں سداشیو راؤ بھاؤ آیا، پیشوا نے کہا: "آؤ بھاؤ، بیٹھو، مجھے تم سے باتیں کرنی ہیں!"

وہ بیٹھ گیا: "میں بھی اسی لئے حاضر ہُوا تھا!"

پیشوا:۔ "سوچ رہا ہوں اب ہمارا اقدام کیا ہونا چاہیے؛ کیا ہم چپ چاپ اس ذلت کو سہہ لیں گے —— سابا جی کی شکست سے زیادہ سندھیا کا قتل ہمارے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ ہے!"

سداشیو راؤ:۔ "میرا بھی یہی خیال ہے!"

پیشوا:۔ "میں صرف تائید نہیں چاہتا۔ عمل چاہتا ہوں، عمل، کیا ہم ابدالی کے سامنے ہتھیار

ڈال دیں ؟"

سداشیوراؤ۔ "ہرگز نہیں !"

پیشوا۔ "لڑو گے ؟"

سداشیوراؤ۔ "ضرور لڑیں گے !"

پیشوا۔ "لڑنے کی سکت ہے ؟"

سداشیوراؤ۔ "کیوں نہیں ؛ ہم اس کے دانت کھٹے کر دیں گے !"

پیشوا۔ "بھاگ تو نہ کھڑے ہو گے ؟"

سداشیوراؤ۔ "بھیا آپ کیسی باتیں کرتے ہیں ، نہ میں ساباجی ہوں ، نہ رگھوناتھ ، سداشیوراؤ کو آپ ہمیشہ سے جانتے ہیں وہ کس قسم کا آدمی ہے !"

پیشوا۔ "ہاں جانتا ہوں ، اسی لئے اس وقت صرف تمہیں سے باتیں کر رہا ہوں !"

سداشیوراؤ۔ "ساباجی کا فرار تو واقعی بڑی شرمناک بات ہے ، لیکن میں سندھیا کے قتل کو کوئی اہمیت نہیں دیتا !"

پیشوا۔ "کیا کہا ؛ تم سندھیا کے قتل کو کوئی اہمیت نہیں دیتے ؟"

سداشیوراؤ۔ "جی بالکل نہیں !"

پیشوا۔ "تعجب ہے ـــــ لیکن کیوں ؟"

سداشیوراؤ۔ "بہادر کے لئے لڑتے لڑتے مر جانا باعثِ ننگ نہیں ، ہاں بے لڑے بھاگ کھڑا ہونا ضرور عار کی بات ہے !"

پیشوا۔ "ہاں سچ کہتے ہو ـــــ سندھیا لڑتا ہوا مارا گیا ؟"

سداشیوراؤ۔ لڑتا ہوا مارا گیا۔ اُس نے اپنی بہادری کا سکہ بٹھا دیا ، خود ابدالی بھی اس

بات کا قائل ہوگیا کہ ہاں کسی مرد سے اُسے پالا پڑا تھا!"

پیشوا:- "وہ بھی بہادر ہے، ضرور، دل ہی دل میں اُس نے سندھیا کی بہادری کو پرنام کیا ہوگا!"

سداشیو راؤ:- "بے شک اگر بہادر ہے تو ــــ!"

پیشوا:- "اس کی بہادری سے تو انکار نہیں کیا جا سکتا، بہادر نہ ہوتا تو اتنی مختصر سی فوج کے ساتھ اتنے دور دراز فاصلے سے، ایک چھوٹے سے ملک سے آکر اپنے سے کئی گنی فوج، اپنے سے کئی گنی بڑے ملک کو جھنجھوڑ کر نہ رکھ دیتا!"

سداشیو راؤ:- "اس کا تعلق بہادری سے اتنا نہیں جتنا اتفاقات سے ہے، اسے مواقع ملے، اور ہمارے ہاتھ سے وہ نکل گئے!"

پیشوا:- "خیر ان باتوں کو چھوڑو۔ سوال یہ ہے کہ اب کیا کیا جائے؟ ــــ سایاجی پر لعنت بھیجو۔ سندھیا کے غم میں ہم کب تک آنسو بہاتے رہیں گے؟ اگر کچھ کرنا ہے تو یہی وقت ہے، وہ دلّی تک پہنچ چکا ہے۔"

سداشیو راؤ:- "آپ حکم دیجئے!"

پیشوا:- "بس تو میرا حکم یہ ہے کہ اس مہم کو تم سَر کرو!"

سداشیو راؤ:- "اس خدمت کے بجا لانے کے لئے جان و دل سے حاضر ہوں، اس راہ میں سندھیا کی طرح اگر جان بھی کام آجائے، تو میں اپنے لئے اس کو باعث فخر سمجھوں گا!"

پیشوا:- "مجھے تم سے یہی توقع ہے ــــ بس تو انتظامات شروع کر دو!"

سداشیو راؤ:- "بہت بہتر!"

پیشوا۔ "اتنی بڑی فوج لے کر جاؤ کہ زمین اس کے بوجھ سے تھرانے لگے۔"

سداشیو راؤ۔ "ایسا ہی ہوگا!"

پیشوا۔ "جتنے روپے کی ضرورت ہو، خزانہ سے لے لو، اگر کم پڑے تو ابھی نئے ٹیکس لگاؤ اور جتنا وصول کر سکتے ہو، کر لو!"

سداشیو راؤ۔ "یہی ہوگا!"

پیشوا۔ "میرا ملک کنگال ہو جائے، میری قوم نادار ہو جائے، امیر غریب بن جائیں، میرے محل میں سونے چاندی کی ایک چیز بھی نہ رہے، میرے خاندان کی عورتیں میرے جواہرات سے محروم ہو جائیں، یہ سب مجھے گوارا ہے، لیکن تمہارے پاس کسی چیز کی کمی نہ ہونی چاہیے۔ میں یہ ہرگز سننا نہیں چاہتا کہ ہمارے پاس فلاں چیز کی کمی تھی اس لیے ہمیں یہ نقصان اُٹھانا پڑا!"

سداشیو راؤ۔ "بالکل بے فکر رہیے۔ میں ہر چیز ضرورت سے زیادہ لے جاؤں گا!"

پیشوا۔ "ہاں ــــــ میں بھی یہی چاہتا ہوں!"

سداشیو راؤ۔ "آپ کی یہ خواہش ضرور پوری ہوگی!"

یہ کہہ کر سداشیو راؤ جانے کے لیے اُٹھا، مشکل سے وہ چند قدم ہٹا ہوگا کہ بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا،

"ہائیں گیان چند تم کہاں؟"

پیشوا کا ماتھا گیان چند کو دیکھتے ہی ٹھنکا

"تم کب آئے؟"

گیان چند۔ "بس سیدھا حضور کے پاس آ رہا ہوں!"

پیشوا: "ادھر اودھر کی باتیں بعد میں کرنا، پہلے یہ بتاؤ سب خیریت تو ہے؟ کوئی بُری خبر تو نہیں لائے ہو؟ مجھے سندھیا کا حال معلوم ہو چکا ہے، ہلکر کے بارے میں بھی تو کوئی ویسی خبر نہیں لائے؟"

گیان چند نے کوئی جواب نہ دیا۔

پیشوا نے زور سے کہا: "جواب دو!"

گیان چند اب بھی خاموش رہا۔

پیشوا: "کیا ہلکر بھی قتل ہو گیا؟"

گیان چند: "نہیں وہ زندہ ہے!"

پیشوا: "پھر کیا اس نے شکست کھائی؟"

گیان چند نے کچھ کہنا چاہا، لیکن زبان نے یاری نہ دی۔ پیشوا نے پھر بہ آواز بلند کہا۔ "کیا تم گونگے ہو؟ جواب دو، ورنہ جلاد کو بلاتا ہوں، ابھی گردن اڑا دی جائے گی!"

گیان چند کانپنے لگا۔

سداشیو راؤ نے کہا۔ "گھبراتے کیوں ہو؟ جو بات ہو، صاف صاف کہہ دو!"

گیان چند: "پہلے تو ہم نے وہ خزانہ اور سامان رسد لوٹ لیا، جو نگش نے احمد شاہ کو بھیجا تھا!"

پیشوا: "پھر کیا ہوا؟"

گیان چند: "پھر جب ہم ہولی منا رہے تھے، بے سان و گمان نہ جانے کہاں سے ابدالی کا ایک لشکر ہم پر ٹوٹ پڑا!"

پیشوا: "پھر کیا ہوا۔۔؟"

گیان چند۔ "اس نے ہمارے سپاہیوں کو مُولی گاجر کی طرح کاٹ ڈالا!"
پیشوا۔ "پھر کیا ہُوا؟"
گیان چند۔ "بمشکل چند سپاہیوں کو لے کر گھوڑوں کی ننگی پیٹھ پر بیٹھکر بھاگے!"
پیشوا۔ "شاباش ــــ!"
سداشیو راؤ۔ "اور ملکہ؟"
گیان چند۔ "گھوڑے کی ننگی پیٹھ پر سب سے پہلے وہی بیٹھے تھے!"
پیشوا۔ "اس کے بعد تم؟"
گیان چند۔ "جی!"
پیشوا۔ "کائر ــــ بزدل!"
پھر اس نے تالی بجائی۔
فوراً مسلح سپاہیوں کا ایک دستہ ہال کے مختلف گوشوں سے نکل کر مجتمع ہو گیا۔ پیشوا نے کہا "گرفتار کر لو اس اُلّو کے پٹھے کو ــــ اسے بھی سایاجی کے پاس پہنچا دو!"
گیان چند۔ "شری منت ــــ"
پیشوا۔ "خاموش ــــ میں کچھ نہیں سُننا چاہتا!"
گیان چند۔ "میں بالکل نہیں بھاگا میرے آقا، میرے مالک میرے اَن داتا!"
پیشوا۔ "ہاں ہم جانتے ہیں تم نہیں بھاگے ــــ تمہیں تو گھوڑا لے کر بھاگا۔ اس لئے تُم مجبور ہو گئے، کیوں یہی بات ہے نا؟"
گیان چند۔ "جی، جی!"

پیشوا نے سپاہیوں سے کہا۔ "لے جاؤ اسے!"

سپاہی کشاں کشاں، گیان چند کو کھینچتے ہوئے لے گئے۔

گیان چند کے جانے کے بعد پیشوا نے سداشیو راؤ بھاؤ سے کہا۔ "دیکھ لیا تم نے حالات کتنے نازک ہو رہے ہیں؟"

سداشیو راؤ۔ "جی ہاں دیکھ رہا ہوں، لیکن ان حالات سے میں ذرا بھی بددل نہیں ہوتا۔ اس طرح کا ہر واقعہ میرے سمندِ عزم کے لئے مہمیز ثابت ہوتا ہے!"

پیشوا۔ "ٹھیک ہے، یہی ہونا چاہیئے —— لیکن تمہارے انتظامات کی رفتار اب بہت تیز ہونی چاہیئے۔"

سداشیو راؤ: "بہت خوب!"

باب (۴۶)

محبّت، مُسرّت، اُمنگ

فیروز بخت کی قُربت نے ماہ طلعت کی صحت پر بڑا خوشگوار اثر کیا تھا۔ وہ بالکل تو اچھی نہیں ہُوئی، لیکن پہلے کے مقابلے میں اس کی حالت بہت کچھ سدھر گئی تھی۔ اس کے چہرے کی سفیدی کم ہوگئی تھی، اس کی نقاہت میں بھی کمی آگئی تھی، اب وہ بغیر تھکے ہُوئے باتیں کرنے لگی تھی۔ چلنے پھرنے کی حکیم صاحب نے سخت ممانعت کر رکھی تھی۔ خود اس میں ابھی اتنی طاقت بھی نہیں تھی کہ چل پھر سکے۔ لیکن اب اس میں چلنے پھرنے کی امنگ پیدا ہونے لگی تھی۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ گھر کے باغیچہ میں جائے، ٹہلے، پھولوں کا نظارہ کرے۔ لیکن حکیم صاحب کی لگائی ہُوئی پابندیوں کو توڑنا اس کے بس میں نہیں تھا!"

ننھا غضنفر ماں کے پاس بیٹھا تھا، اور وہ اس سے پیار و محبت کی باتیں کر رہی تھی۔ اتنے میں فیروز بخت آگیا اُسے دیکھ کر ماہ اور غضنفر دونوں پھول کی طرح کھل اُٹھے۔

اُس نے کہا۔ "کیا ہو رہا ہے؟"

ماہ نے کہا: "آپ کے خلاف سازش کر رہے ہیں ہم دونوں!"

اور یہ کہہ کر وہ ہنس پڑی، ماہ کو اتنے دِنوں کے بعد ہنستے دیکھ کر فیروز بخت کو بہت خوشی ہُوئی اُس نے کہا۔ "تمہارا مسکراتا ہُوا چہرہ دیکھ کر میرے دل کو کتنی خوشی ہُوئی ہے،

یں ہی جاتا ہوں! ———— میں چاہتا ہوں، تُم ہمیشہ مسکراتی رہو، ہمیشہ ہنستی رہو، غم کی پرچھائیں بھی تمہارے قریب نہ آئے!"

وہ بولی۔ "آپ اپنی مجاہدات سے فرصت پالیں، تو ایسا ہی ہوگا، پھر غم کبھی میرے پاس پھٹکنے بھی نہ پائے گا۔ ہمیشہ خوش رہوں گی، ہنسوں گی مسکراؤں گی، چہلیں کروں گی!"

فیروز بخت: "انشاءاللہ وہ دن بھی جلد آئے گا۔ ساری سوٹیاں نکل چکی ہیں، خالی آنکھوں کی باقی ہیں!"

ماہ طلعت: "اب تو آپ کو بھی اندازہ ہوگیا ہوگا، آپ کتنے بڑے حکیم ہیں!"

فیروز بخت: "حکیم؟ میں نے تو طب کی ایک کتاب بھی نہیں پڑھی!"

ماہ طلعت: "ہاں! لیکن کتنی آسانی سے مجھے چنگا کردیا، میرا آزار جاتا رہا۔ میں اچھی ہوگئی!"

فیروز بخت: "اوہ، سچ کہتی ہو، ہم دونوں کی یکجائی بہت سی آفتوں کا توڑ ہے!"

ماہ طلعت: "دیکھ لیجئے نا، حکیم صاحب جواب دے چکے تھے، خود میں بھی مایوس ہوچکی تھی، گھر والے بھی گھڑی اور پل دیکھ رہے تھے، آپ آئے اور میں اچھی ہوگئی۔ اب بالکل اچھی ہوں!"

فیروز بخت: "بالکل کہاں؟ لیکن ہاں خدا کے فضل سے پہلے کے مقابلے میں واقعی بہت فرق ہے!"

ماہ طلعت: "لیکن اگر پھر کہیں آپ نے لمبی تانی اور بہت دنوں کے لئے غائب ہوئے تو کہے دیتی ہوں ————"

فیروز بخت: "کیا کہے دیتی ہو، سزا دوگی مجھے؟"

ماہ طلعت ۔ (مسکرا کر) "جی ــــــــ بڑی سخت!"

فیروز بخت ۔ "ذرا اس کی نوعیت بھی ارشاد فرمائیے!"

ماہ طلعت ۔ "آپ کی سب سے بڑی سزا یہ ہو سکتی ہے کہ میں اس دُنیا میں نہ رہوں!"

یہ الفاظ سُن کر فیروز بخت نے بہت مغموم اور ملول لہجہ میں کہا۔ "ماہ ایسی باتیں نہ کرو، خُدا کے لئے مجھ پر رحم کرو!"

ماہ طلعت ۔ "غلط نہیں کہتی، اپنی حالت کا مجھے اندازہ ہے!"

فیروز بخت ۔ "لیکن ایسے خیالات دِل میں کیوں آنے دیتی ہو؟ مطمئن رہو، ہماری دُوری اور فراق کا زمانہ ختم ہو گیا، اب اِنشاء اللہ کبھی ہم ایک دُوسرے سے جُدا نہ ہونگے!"

ماہ طلعت ۔ "لیکن آپ تو کہہ رہے ہیں ایک معرکہ اور باقی ہے مرہٹوں سے!"

فیروز بخت ۔ "ہاں کہہ رہا تھا اور یہ معرکہ ہو کر رہے گا، لیکن اسے سر کرنے کے لئے کہیں دُور تو نہیں جانا ہے!"

ماہ طلعت ۔ "پھر؟"

فیروز بخت ۔ "یہ معرکہ اب خاص دِلّی میں یا دِلّی کے آس پاس برپا ہو گا!"

ماہ طلعت ۔ "آپ جائیں گے تو؟"

فیروز بخت ۔ "ہاں جاؤں گا۔ لیکن زیادہ سے زیادہ چند روز کے لئے!"

ماہ طلعت ۔ "لیکن اگر لڑائی طول کھینچ گئی؟"

فیروز بخت ۔ "نہیں ایسا نہیں ہو گا، یہ لڑائی جلد ہو گی، اور جلد ختم ہو گی!"

ماہ طلعت ۔ "یہ آپ نے کیسے جانا؟"

فیروز بخت ۔ "اس لئے کہ دونوں فریق یہی فیصلہ کر چکے ہیں!"

ماہ طلعت ۔ "میں بھی یہی چاہتی ہوں کہ جو کچھ ہونا ہے جلد ہو جس طرح سند جیا ختم ہوا ہے اسی طرح پشیوا اور اس کے ساتھی بھی ہلاک ہوں!"

فیروز بخت ہنسنے لگا۔ "اب بد دعائیں دینے لگیں ——— آخر عورت ہو نا!"

اسی اثنا میں صنوبر آگئی۔ "اے حضور، مہاراجہ صاحب نے یاد فرمایا ہے آپ کو جلدی جائیے!"

ماہ طلعت: "کون سے مہاراجہ صاحب بگلی؟"

وہ ہنسنے لگی۔ "مہاراجہ صاحب کٹار بُد ——— اے وہی جسونت راؤ اور کون، ہر وقت کٹا باندھے رہتا ہے، جیسے بڑا سورما ہے کہیں کا!"

فیروز بخت کو بھی ہنسی آگئی۔ "کیوں دیوانوں کی سی باتیں کرتی ہے، معلوم ہوتا ہے، بری نیت خراب ہے کچھ ——— ابھی کہتا ہوں جا کر آصف زماں سے!"

فیروز بخت مسکراتا ہوا باہر چلا گیا، صنوبر ماہ طلعت کے سرہانے بیٹھ کر اس کا سر دبانے لگی۔

○

اب ماہ طلعت تقریباً اچھی تھی، بظاہر صرف کمزوری باقی رہ گئی تھی، وہ بھی تھوڑی سی! فیروز اور ماہ نے ساتھ ساتھ صبح کا ناشتہ کیا، پھر فیروز نے کہا۔ "یہاں بیٹھے بیٹھے بیکار ہو گی، چلو ذرا پائیں باغ کی ہوا کھائیں!"

وہ تیار ہو گئی۔ "چلئے میرا بھی بہت جی چاہ رہا ہے!"

دونوں ساتھ ساتھ پائیں باغ پہنچے اور گلگشت کرنے لگے، ماہ نے کہا: "جب سے آپ گئے ہیں، آج پہلی بار یہاں آئی ہوں!"

فیروز بخت۔ "یہ کیوں؟"

ماہ طلعت۔ "آپ کے بغیر یہ خارستان معلوم ہوتا تھا ـــــ دیکھئے کیا حالت ہو رہی ہے بیچارے کی۔ میں نے توجہ نہ کی تو کسی نے بھی مڑ کر ادھر نہیں دیکھا۔ نہ روش ٹھیک ہے نہ کیاریاں؛ بیل ٹیڑھی ہوئی ہے، گھاس آسمان سے باتیں کر رہی ہے۔"

فیروز بخت ہنسنے لگا: "گھاس آسمان سے باتیں کر رہی ہے؟"

وہ بھی مسکرا دی: "اور کیا، دیکھ لیجئے۔"

پھر وہ ایک گلاب کے پودے کی طرف لپکی۔ "آہا یہ دیکھئے!"

فیروز بخت۔ "یہ گلاب کا پھول!"

ماہ طلعت۔ "ہاں، میں نے اپنے ہاتھ سے لگایا تھا!"

فیروز بخت۔ "اسی لیے یہ نہیں مرجھایا، بلکہ اس کا بانکپن کچھ اور بڑھ گیا!"

وہ شرما گئی: "آپ تو مذاق کرنے لگتے ہیں!"

فیروز نے کہا: "نہیں مذاق نہیں کرتا، سچ کہتا ہوں، تم نے اسے اپنے ہاتھ سے لگایا ہے۔ اس میں تمہاری ادائیں بھی آ گئی ہیں!"

ماہ طلعت نے شرماتے ہوئے کہا۔ "پھر وہی باتیں!"

وہ بولا: "جھوٹ تو نہیں کہتا!"

ماہ طلعت۔ "جھوٹ نہیں تو کیا سچ!"

فیروز بخت۔ "بالکل سچ ـــــ یہ دیکھو اس کی پتیاں کتنی نرم و نازک ہیں جیسے تمہارے ہونٹ! اور یہ بھینی بھینی خوشبو، اس نے تمہارے ہی مشامِ جاں سے چرائی ہے اور یہ اس کا رنگ، بالکل وہی ہے جو تمہارے رخسار کا، تیر نے شاید تمہارے

ہی نے تو کہا ہے ؎

نازکی ان لبوں کی کیا کہئے
پنکھڑی ایک گلاب کی سی ہے

ماہ نے ایک دلآویز تبسم کے ساتھ پوچھا: "چپ کیوں ہو گئے، کچھ اور کہئے؟"

فیروز نے کہا: "اور کہوں؟ سنو گی؟ اچھا سُن لو ؎

میرؔ اُن نیم باز آنکھوں میں!
ساری مستی شراب کی سی ہے

ماہ طلعت: "یہ بھی اچھی رہی، گلاب کی تعریف کرتے کرتے میرے قصیدے پڑھنے لگے کہاں تو گلاب کو مجھ سے تشبیہ دی جا رہی تھی، کہاں مجھے گلاب سے تشبیہ دی جانے لگی!"

فیروز: "بات ایک ہی ہے۔ گلاب کا رنگ روپ وہی ہے جو تمہارا ہے، اور تمہارا رنگ روپ وہ ہے جو گلاب کا!"

ماہ طلعت: "اچھا ہوگا، یہ باتیں چھوڑیئے کچھ اور باتیں کیجئے!"

فیروز: "یہ نہیں کہتیں ؎

وہی دُکھڑا ہے فرقت کا، وہی جھگڑا ہے اُلفت کا
تجھے اے داغؔ کوئی اور بھی افسانہ آتا ہے!

اور میرا جواب یہ ہے کہ نہیں، اس کے سوا مجھے کوئی اور کہانی نہیں آتی!"

ماہ طلعت: "توبہ میرے اللہ، سوال یہ ہے کہ آپ سے کہانی سنانے کی فرمائش کس نے کی تھی، یہ آج آپ کو ہو کیا گیا ہے۔ ایسی بہکی بہکی باتیں کیوں کر رہے ہیں آپ؟"

فیروز بخت۔ "بہت دِنوں کے بعد آج ہم دونوں پھر یہاں آئے ہیں، یہاں آکر مجھے پرانے دِن یاد آگئے، یاد ہے تمھیں کتنی چاندنی راتیں، کتنی سہانی شامیں، کتنی نہ بھولنے والی گھڑیاں یہاں ہم نے گذاری ہیں؟ ہم دونوں یہاں بیٹھ کر کیسے کیسے ہوائی قلعے بنایا کرتے تھے۔

ماہ طلعت۔ "ہوائی قلعے نہیں، ریت کے گھروندے!"

فیروز۔ "ہاں سچ کہتی ہو ہوائی قلعے پھر کچھ وزن رکھتے ہیں، ریت کے گھروندے کی طرح بے بُنیاد نہیں ہوتے، ہم نے جو کچھ سوچا، جو کچھ مانگا، جو کچھ چاہا، وہ نہ ہو سکا!"

ماہ طلعت۔ "دیر سویر ہو ہی جاتی ہے، جو کچھ نہ ہو سکا، وہ اب ہو گا۔ انشاء اللہ!"

فیروز۔ "ماہ واقعہ یہ ہے کہ میں نے تمہیں بہت تکلیف پہنچائی ہے، بہت دُکھ دیے ہیں، تمہیں ایک دِن بھی سکھ نہیں پہنچا سکا —— یہ باتیں جب یاد آتی ہیں، تو مجھے اپنے وجود سے شرم آنے لگتی ہے!"

ماہ طلعت۔ "پھر وہی شاعرانہ باتیں، آپ اگر مجھے سکھ نہ پہنچا سکے تو خود بھی تو نہ حاصل کر سکے مجھے اگر آپ کی ذات سے تکلیف پہنچی، تو خود آپ کو بھی تو کیسی جاں گداز تکلیفوں کا سامنا کرنا پڑا —— چلیے حساب کتاب برابر، عوض معاوضہ گلہ ندارد!"

فیروز۔ "یہ تمہاری شرافت اور محبت ہے، جو میری ان کوتاہیوں کا خیال نہیں کرتیں! —— ورنہ مجھے اپنی کوتاہیوں پر بڑی ندامت ہے!"

بادل پہلے سے گھرے ہوئے تھے، اب بوندیں پڑنے لگیں، فیروز نے کہا۔ "بوندیں پڑ رہی ہیں، چلو واپس چلو!"

وہ بولی۔ "آپ تو بڑے بہادر ہیں، ذرا سی بوندوں سے ڈر گئے، واہ، واہ!"

"میں تو موسلادھار بارش میں بھی گھڑا رہوں لیکن تمہاری طبیعت خراب ہے، بھیگ گئیں تو طبیعت پھر خراب ہو جائے گی!"

وہ بولی: "شکریہ اس نوازش کا ــــــ لیکن میں موم کی بنی گڑیا نہیں ہوں!"

فیروز بخت: "ماہ ضد نہ کرو، چلو!"

ماہ طلعت: "ہلکی ہلکی بوندیں پڑ رہی ہیں، ان سے کیا ڈر؟ جانے کو جی نہیں چاہتا ہم تو ابھی ٹہلیں گے یہاں، اگر بارش ہوئی تو چلے چلیں گے!"

دونوں ٹہلتے رہے، ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے، ایک دوسرے کے دل کی دھڑکنیں سنتے، ایکاایکی زور سے بارش ہونے لگی، فیروز نے کہا۔ "دیکھا میں نہ کہتا تھا، اب؟"

وہ بے پروائی سے کہنے لگی۔ "اب کچھ نہیں بھاگ چلئے!"

محلسرا اور پائیں باغ میں کچھ زیادہ فاصلہ نہ تھا، پھر بھی بارش اتنے زور کی ہو رہی تھی کہ یہ دونوں اپنے کمرے میں پہنچتے پہنچتے کافی بھیگ گئے، صنوبر دروازے پر کھڑی تھی، وہ چیخ پڑی۔ "اے ہے یہ کیا غضب کیا بی بی!"

فیروز نے کہا۔ "جلدی سے انگیٹھی گرم کر کے لاؤ!"

وہ بھاگی۔ "ابھی لائی!"

فیروز نے ماہ سے کہا۔ "کپڑے فوراً بدل ڈالو!"

"اور آپ؟ آپ بھی تو بہت بھیگے ہیں!"

"مجھے چھوڑو، تم جاؤ فوراً۔ میں بھی جا رہا ہوں!"

تھوڑی دیر میں دونوں کپڑے بدل کر پھر اپنے کمرے میں آ گئے، ماہ طلعت ایک ہلکے

فیروزی رنگ کا دوشالہ اوڑھے ہوئے تھی۔

فیروز نے پوچھا "سردی لگ رہی ہے؟"

وہ بولی: "ہاں!"

اتنے میں صنوبر انگیٹھی لے کر آگئی، فیروز بخت نے کہا "نہیں میرے پاس نہیں ان کے پاس رکھ دو، اور تم جاکر جلدی سے قہوہ بنا لاؤ!"

صنوبر قہوہ بنانے چلی گئی!

ماہ طلعت نے کہا "کیوں بیچاری کو ایک پاؤں سے دوڑائے جا رہے ہیں آپ صنوبر انگیٹھی لے آؤ، صنوبر قہوہ بنا لاؤ!"

فیروز بخت۔ "بہت سست ہوگئی ہے، اسے خوب دوڑانا چاہئے تاکہ اس میں چستی آئے!"

صنوبر قہوہ بنا کر لائی، فیروز بخت نے کہا۔ "اب تم ایک کام کرو!"

وہ انتظار میں کھڑی ہوگئی کہ کیا کہتے ہیں ماہ طلعت نے ٹوکا: "بتائیے نا بے چاری کو ۔۔۔ کیا کام ہے؟"

فیروز بخت۔ "ہاں صنوبر ۔۔۔ اب تم آدھے گھنٹے تک ہمارے سامنے صحن میں دوڑ لگاؤ!"

ماہ طلعت ہنستے ہنستے بے حال ہوگئی، پھر اس نے صنوبر سے کہا "تم جاؤ، آج انھیں نہ جانے کیا ہوگیا ہے۔ صبح سے یہ ایسی ہی بہکی بہکی باتیں کر رہے ہیں!"

باب (۴۷)

دِلّی کی طرف

دتاسندھیا کی ہلاکت، ملہار راؤ کی ذلت بخش شکست، سایاجی پٹیل کے ادھورے فرار، اور دلّی پر احمد شاہ ابدالی کے قبضہ نے مار دُم بریدہ کی طرح بالاجی راؤ پیشوا کو پیچ و تاب میں مبتلا کر رکھا تھا، وہ سداشیو راؤ کو دن میں کئی کئی مرتبہ تاکید کرتا تھا، کہ وہ اپنا بہت بڑا سا لشکر جلد تیار کرے اور فوراً دِلّی کی طرف روانہ ہو جائے، ایک ایک پل اُسے ایک ایک برس معلوم ہو رہا تھا، خود سداشیو راؤ بھاؤ بھی پُوری سرگرمی اور مستعدی کے ساتھ تاریخ کی بہت بڑی مسلح اور منظم فوج کے تیار کرنے میں مشغول تھا، اِس کام میں اُس نے دِن رات ایک کر دیئے تھے۔ وہ صرف رگھوناتھ راؤ کو زک دینا نہیں چاہتا تھا، وہ چاہتا تھا، تاریخ ہند میں اپنا نام ہمیشہ ہمیشہ کے لئے زندہ اور پائندہ کر جائے، وہ چاہتا تھا، مسلمانوں کو نیست و نابود کر دے، وہ چاہتا تھا مغلیہ سلطنت کو اس طرح پامال کرے کہ پھر کبھی وہ سر نہ اٹھا سکے، وہ چاہتا تھا کہ ایسی توانا اور مضبوط مرہٹہ حکومت قائم کرے جو زمانہ کی بڑی سے بڑی ٹکر سہہ سکے۔ حصولِ مقصد کے لئے وہ ہر ذریعہ استعمال کرنے کا قائل تھا، وہ جائز اور ناجائز، مناسب اور نامناسب صحیح اور غلط کا قائل نہیں تھا،

پیشوا متردد اور متفکر اپنی خلوت گاہ میں بیٹھا ہوا تھا کہ سدا شیو راؤ بھاؤ آیا، زمین ادب کو بوسہ دیا اور سر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔

پیشوا نے اُسے نظر بھر کر دیکھا اور کہا۔ "بیٹھو، بیٹھ جاؤ!"

وہ بیٹھ گیا!

پیشوا نے پوچھا۔ "تمہاری تیاریاں مکمل ہو گئیں؟"

وہ بولا۔ "جی مکمل ہو گئیں!"

پیشوا کو یقین نہ آیا۔ "سچ کہتے ہو؟"

اُس نے جواب دیا۔ "بالکل سچ کہتا ہوں میرے آقا!"

پیشوا خوش ہو گیا۔ "تو کب جا رہے ہو؟"

وہ بولا۔ "نجومیوں کو بلائیے، وہ شبھ گھڑی دیکھ کر جو دن اور ساعت مقرر کریں گے اسی دن اور اسی وقت چل کھڑا ہوں گا!"

"ہاں تم ٹھیک کہتے ہو!"

پیشوا نے حکم دیا۔ فوراً درباری نجم حاضر ہو گئے۔ پیشوا نے ان سے مخاطب ہو کر کہا۔ "میں نے اتنی بڑی فوج تیار کر لی ہے جس کی نظیر ہندوستان کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ میں نے ایک فیصلہ کن اقدام کا فیصلہ کر لیا ہے کہ اس دیس کی حکومت یا میرے ہاتھ میں آئے گی، ورنہ اس دیس کو تباہ کر دوں گا۔ یہ میرا آخری اور اٹل فیصلہ ہے کہ یا مر ہٹے زندہ رہیں گے یا مغل!"

نجومی ادب اور عقیدت کے ساتھ پیشوا کے یہ الفاظ سنتے رہے، پھر اس نے گرج کر کہا۔ "سدا شیو راؤ بھاؤ اپنی فوج لے کر جلد از جلد دلّی کی طرف روانہ ہو جانا چاہتا ہے۔ آپ لوگ وچار کر کے بتائیے کہ کون سا دن اور کون سی ساعت مناسب ہو گی۔"

LIBRARY
No.........
Aminia Muslim Girls School.

نجومیوں نے اپنے اپنے زائچے کھینچے، فکر و تامل سے کام لیا، اور جو ان سب کا سردار تھا۔ اُس نے کہا: "کل صبح سات بجکر سات منٹ پر اگر مرہٹہ فوج نے یہاں سے کُوچ کیا، تو دُنیا تو دنیا بھگوان بھی اسے شکست نہ دے سکیں!"

دُوسرے نجومیوں نے بھی اپنے سردار کی تائید کی۔ سب نے بالاتفاق کہا۔ "یہ گھڑی فتح و ظفر کی ہے، اس گھڑی پر جو فوج روانہ ہوگی وہ اگر سمندر میں کود پڑے تو وہ خشک ہو جائے، پہاڑوں سے ٹکرائے تو وہ ریزہ ریزہ ہو جائیں گے، چاند کی طرف بڑھے تو وہ سر جھکا دے گا کہ آؤ اور مجھے فتح کر لو!"

پیشوا کا چہرہ فرطِ طرب سے یہ باتیں سُن کر چمک اُٹھا!

سداشیو راؤ بھاؤ کی حوصلہ مندی میں کئی گنا اضافہ ہو گیا!

صرف ایک رگھوناتھ تھا جو افسردہ اور مضمحل بیٹھا یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ وہ محسوس کر رہا تھا سداشیو راؤ نے بازی جیت لی اور وہ ہار گیا۔

پھر جب پیشوا نے بھاؤ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: "بھگوان کا نام لے کر تم صبح ہوتے ہی کُوچ کر دو!"

تو رگھوناتھ سے ضبط نہ ہو سکا وہ جوش سے بے قابو ہو کر کھڑا ہو گیا، لیکن اس سے کچھ کہا نہ جا سکا زبان نے یاری نہ دی۔

پیشوا نے کہا: "کیا بات ہے، رگھوناتھ؟"

وہ اب بھی جواب نہ دے سکا۔

پیشوا نے پھر پُوچھا، "رگھوناتھ کیا بات ہے؟"

وہ بے تاب ہو کر بولا: "میں بھی جاؤں گا!"

پیشوا نے پوچھا۔ "کہاں جاؤ گے؟"

رگھوناتھ راؤ۔ "دلّی جاؤں گا، دشمن سے لڑوں گا۔"

بھاؤ مسکرانے لگا۔

رگھوناتھ نے غضب آلود نگاہوں سے اُسے دیکھا اور کہا۔ "میں ضرور جاؤں گا۔"

پیشوا نے فیصلہ کن لہجہ میں جواب دیا۔ "تم نہیں جا سکتے۔"

رگھوناتھ، جو بڑے سے بڑے حادثہ پر کبھی نہ رویا تھا، بچوں کی طرح رونے لگا، پھر اُس نے گلوگیر آواز میں کہا۔ "بھیّا مجھے جانے دیجئے، نہ روکئے، میں سردار بن کر نہیں سپاہی بن کر جانا چاہتا ہوں۔"

پیشوا کا دل پسیج گیا۔

"تم ایک اچھے سردار اور بہت اچھے سپاہی ہو، یہ مجھے معلوم ہے، لیکن یہ تو سوچو، پھر میرے پاس کون رہے گا؟ تم خود سمجھدار آدمی ہو، تمہیں سمجھنا چاہئے، یہاں بھی تو ایک بڑے جیالے کی ضرورت ہے اگر نظام الملک آصف جاہ نے موقع دیکھ کر حملہ کر دیا تو کیا ہوگا؟ بہادری کا جوہر صرف دلّی ہی میں تو نہیں دکھایا جا سکتا۔ یہاں بھی اس کی ضرورت ہے میرے بھائی!"

ان ملاطفت آمیز باتوں سے رگھوناتھ کا دل ٹھہر گیا، اس کے آنسو بند ہو گئے اور وہ خاموشی کے ساتھ اُٹھ کر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد پیشوا نے بھاؤ سے پوچھا۔

"کسے کسے اپنے ساتھ لے جاؤ گے تم؟"

بھاؤ نے کہا۔ "کوئی مرد میدان ایسا نہیں ہے جو پیچھے رہ جائے، سب ہی جائیں گے۔"

اتنے میں پیچھے سے آواز آئی۔ "میں بھی جاؤں گا!"

بھاؤ اور پیشوا نے مُڑ کر دیکھا، تو وسواس راؤ سامنے کھڑا مسکرا رہا تھا۔

وسواس راؤ نہایت وجیہہ اور خوبصورت نوجوان تھا، بڑی بڑی آنکھیں، گورا رنگ، متناسب اعضا، کشادہ پیشانی، موتی کی طرح سفید اور چمکدار دانت، تبسّم اتنا دل کش کہ انتہا نہیں، باتیں اتنی شیریں کہ جو سُنے مسحور ہو جائے، فنونِ جنگ میں ماہر، بڑا اچھا سپاہی، بہت اچھا شہسوار، تیر اندازی اور شمشیر زنی میں آپ اپنا جواب[1]۔

پیشوا نے محبت سے اپنے چہیتے بیٹے پر نظریں گاڑ دیں، پھر کہا۔ "نہیں بیٹے، تم میرے پاس رہو، وہاں جا کر کیا کرو گے؟"

وہ بولا۔ "پتاجی، آپ کے قدموں میں تو ساری زندگی بسر کرنی ہے، لیکن بہادری دکھانے کا جو موقع قسمت نے مہیا کر دیا ہے، اسے اگر میں نے کھو دیا، تو ساتھیوں کو منہ کیا دکھاؤں گا؟ یہ کوئی معمولی لڑائی نہیں ہے، یہ ایسا مورچہ ہے جس پر مرہٹہ قوم کی عزّت اور ناموس کا دارومدار ہے!"

پیشوا اب بھی اپنی رائے پر اڑا رہا۔ "نہیں بیٹے ضد نہیں کرتے!"

وسواس راؤ نے حسرت سے بھاؤ کی طرف دیکھا، بھاؤ نے بھائی سے بھتیجے کی سفارش کی۔ "جانے دیجئے!"

لیکن پیشوا راضی نہ ہوا۔ "کیسے جانے دوں؟ تم بھی جا رہے ہو، یہ بھی چلا گیا تو میرا دل گھبرائے گا!"

بھاؤ بھی اپنی بات کا دھنی تھا۔ "نہیں بھیّا یہ بات نہیں ہے، بات یہ ہے کہ اگر وسواس ہمارے ساتھ گیا، تو اس میں بڑے فائدے ہیں، بہت زیادہ!"

---

[1] مسلم مؤرخین بھی اس پر متفق ہیں کہ وسواس راؤ بڑا خوبصورت اور طرحدار نوجوان تھا!

پیشوا نے تعجب سے پوچھا۔ "فائدے؟ ــــ کس قسم کے؟"

بھاؤ نے عرض کیا۔ "ایک تو یہ کہ وسواس راؤ کو دیکھ کر فوج کا حوصلہ قائم رہے گا، بلکہ بڑھا رہے گا!"

پیشوا نے پوچھا: "یہ کیوں؟"

"اِس لئے کہ وہ آپ کا بیٹا ہے!"

"اور تم؟ ــــ تمہیں میں وسواس سے کم نہیں سمجھتا!"

"بھیا یہ بات تو ہے، لیکن آپ کے دل میں میری جو محبت ہے وہ فوج کے ہر سپاہی کے دل میں تو نہیں ہے تو یہ دیکھتا ہوں کہ سپاہی اس کے نام پر صدقے قربان ہوتے ہیں ــــ پھر ایک اور بات بھی ہے!"

"وہ بھی کہہ ڈالو!"

"وہ بات یہ ہے کہ ہمیں بہت سے راجوں مہاراجوں سے بھی مدد لینی ہے، ممکن ہے دلّی کی بادشاہت سے بھی ہمیں عارضی اور وقتی طور پر عہدنامہ کرنا پڑے، ہو سکتا ہے.... شجاع الدولہ کو ہموار کرنے کے لئے اسے کوئی لالچ دینا پڑے۔ ایسے موقعوں پر مرہٹہ حکومت کے ولی عہد کی شخصیت اور اس کے مُنہ سے نکلے ہوئے بول کی جو اہمیت ہوگی وہ تنہا سداشیو راؤ کی نہیں ہو سکتی!"

پیشوا لاجواب ہو گیا۔ اُس نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر کہا: "اچھا بھئی نہیں مانتے تو لے جاؤ وسواس کو بھی!"

یہ فیصلہ سُن کر وسواس بہت خُوش ہُوا، محبت بھری نظروں سے چچا کی طرف دیکھنے لگا۔ بھاؤ نے اُسے کلیجہ سے لگا لیا اور کہا: "اب تو خُوش ہُوئے تم؟"

وہ بولا۔ "جی بہت زیادہ!"

"تیاری شروع کر دو ـــــ کل سویرے سویرے ہماری فوج کوچ کر دے گی!"

وسواس نے کہا۔ "آپ مجھے بالکل تیار پائیں گے!"

وسواس خوش اور مطمئن ہو کر راج بھون کے زنانہ حصّہ میں چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد پیشوا نے کہا۔ "کیا تم زنانہ کو بھی ساتھ لے جاؤ گے؟"

وہ بولا۔ "جی ہاں ـــــ صرف میں ہی نہیں تمام سردار اور افسر یہ فیصلہ کر چکے ہیں، کہ زنانہ ساتھ لے جائیں!"

پیشوا نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "لیکن میں اسے مناسب نہیں سمجھتا!"

"کیوں بھیا؟"

"جنگ میں ہر طرح کے مرحلے پیش آتے ہیں، یہ عورتیں کبھی زنجیر پا نہ بن جائیں تم سب کے لئے، مجھے یہی ڈر ہے!"

"لیکن بھیا میں تو یہی چاہتا ہوں!"

"پاؤں کی بیڑیوں کو اپنے ساتھ لے جانا؟"

"جی ـــــ بالکل یہی!"

"کیا مصلحت ہے اس میں؟"

"تاکہ ہم اگر بھاگنا بھی چاہیں تو نہ بھاگ سکیں، یہ بیڑیاں ہمیں بھاگنے نہیں دیں گی، یہ غیرت کی بیڑیاں ہوں گی۔ جو ہمیں مجبور کر دیں گی کہ ہم آخر وقت تک لڑیں، ہر حالت میں لڑیں بڑے سے بڑے وار کو سہیں، لیکن پیچھے نہ ہٹیں ـــــ یہ ہے مصلحت بھیا!"

پیشوا مسکرا دیا۔ "جیسا مناسب سمجھو کرو! میں تمہارے کسی فیصلہ میں مداخلت نہیں

کرنا چاہتا ہو۔

○

اور دوسرے روز

پو پھٹنے سے پہلے جب لوگ اپنے اپنے بستروں پر دراز تھے، سارے کیمپ میں ایک ہلچل سی مچی ہوئی تھی!

مرہٹہ فوج آج دلّی کی طرف کوچ کر رہی تھی!

ہر شخص ایک نئے جذبے، نئے جوش سے سرشار تھا!

فوج کے ہر سپاہی کو یقین تھا!

ہم جیتیں گے!

ہم دشمن کو شکست دیں گے۔

ہم انبار در انبار مالِ غنیمت اپنے ساتھ لائیں گے۔

غلاموں اور لونڈیوں کے پرے کے پرے ساتھ ہوں گے! پیشوا خود اپنی فوج کو رخصت کرنے، بھاؤ اور وسواس سے رخصت ہونے آیا تھا۔

جب فوج نے کوچ کیا تو پیشوا نے وسواس راؤ کو کلیجے سے لگا لیا، پھر بھاؤ سے مصافحہ کیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے، خود وسواس کی آنکھیں بھی باپ کو دیکھ کر آب گوں ہو گئی تھیں۔ لیکن بھاؤ پر کوئی اثر نہیں تھا۔ وہ ویسا ہی ہشاش بشاش تھا۔ نہ کوئی فکرمندی تھی، نہ پریشانی، نہ اضمحلال نہ اداسی! اُس نے بھائی کی ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں کو دیکھ کر کہا۔ "بھیّا وہ دن جلد آئے گا، جب ہم لوگ اِس شہر میں پھر واپس آئیں گے اور آپ کو شہنشاہ ہندوستان کی حیثیت سے پرنام کریں گے!"

پیشوا پر اس وقت ایک خاص کیفیت طاری تھی، اس نے بڑے ٹھہرے ہوئے لہجہ میں کہا: "یہ بادشاہت میں اپنے لئے نہیں، اپنی قوم کے لئے چاہتا ہوں"

بھاؤ کے پاس جواب موجود تھا: "ہاں لیکن قوم کے سردار بھی تو آپ ہی ہیں!"

پھر وسواس راؤ اور بھاؤ نے جھک کر پیشوا کے قدموں کی خاک ماتھے پر لگائی، اچک کر گھوڑے پر بیٹھے اور شان و شکوہ کی تصویر بنے ہوئے روانہ ہو گئے، خلقت کا ٹھٹھ کا ٹھٹھ لگا ہوا تھا، یہ منظر دیکھنے کے لئے اس فوج کا ہر سپاہی، مرہٹہ قوم کے نزدیک ایک ہیرو تھا۔

طبل پر چوٹ پڑتے ہی لشکر آہستہ آہستہ روانہ ہوا۔ اس لشکر کے ساتھ فرنگستانی طرز پر قواعد دان سپاہی، کار آزمودہ اور بہت بڑا توپ خانہ بھی تھا۔ جس کا افسر مشہور فرانسیسی جنرل بسی (Bossoy) کا شاگرد ابراہیم خاں (نواب ابراہیم خاں ہربزبنگ عرف گاردی[1]) تھا۔ یہ اتنی بڑی فوج تھی کہ اس کی عظمت و ہیبت سے ہر دیکھنے والا لرزہ براندام تھا۔ اس فوج

---

[1] فیصلہ کن جنگیں

ابراہیم خاں گاردی پہلے نواب آصف جاہ نظام الملک کی ملازمت میں تھا، ان جنگوں میں جو ۱۷۵۸ء میں صلابت جنگ اور مرہٹوں میں ہوئیں اس نے شرکت کی۔ جب صلابت جنگ نے اسے ملازمت سے برطرف کر دیا تو اس نے فوراً ہی پیشوا کی ملازمت اختیار کر لی، اس کے بعد مرہٹوں اور صلابت جنگ میں جو لڑائیاں ہوئیں ان میں ابراہیم خاں نے وہ کارہائے نمایاں کئے کہ صلابت کو مجبور ہو کر پیشوا کی کل شرائط ان لینی پڑیں۔

(تاریخ ہند از مارشمین)

[2] ملاحظہ ہو فیصلہ کن جنگیں۔

مرہٹوں کی تاریخ میں اس قدر بڑی فوج کبھی ایک جھنڈے تلے جمع نہیں ہوئی۔ کیا لحاظ تعداد، کیا بلحاظ سامان، یہ فوج بہترین طور پر زبردست اور مسلح تھی۔ اس فوج کو دیکھتے ہوئے اسی سال پہلے کا وہ زمانہ

کی عظمت و جلالت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ بقول گرانٹ ڈف مرف ابراہیم گاردی کے پاس دس ہزار منجھے ہوئے توپچی تھے۔

اس فوج میں شمشیر جنگ بھی تھا جو بالاجی باجی راؤ کی مسلمان بیوی کے بطن سے تھا۔ شمالی ہند میں مرہٹوں کے جو سردار تھے، انہیں پیشوا کی طرف سے ہدایت بھیجی گئی کہ وہ راستے راہ میں بھاؤ کے ساتھ شریک ہوتے رہیں چنانچہ پونا سے جیسے جیسے یہ لشکر آگے بڑھتا رہا اس کی تعداد، شان و شکوہ اور عظمت و جلال میں اضافہ ہی ہوتا رہا۔

"دریائے چنبل عبور کرنے سے پہلے جھنکوجی سندھیا (داباجی کے کشتہ ستم دتا سندھیا کا بھتیجا)، ملہار راؤ ہلکر، دتاجی گائیکواڑ اور دوسرے بہت سے مرہٹہ اور ہندو سردار شریک ہو گئے، اب کل فوج ۳۰ ہزار کے قریب تھی، توپ خانہ کے دس ہزار آدمی الگ، ۳۰ ہزار

(بقیہ صفحہ ۴۳۹) آنکھوں میں پھر جاتا تھا جب اورنگ زیب شہنشاہ دہلی نے نہایت طمطراق اور جاہ و جلال کے ساتھ دریائے نربدا کو عبور کیا تھا۔ مرہٹہ سرداروں کے خیمے ریشمی تھے جن پر سنہرے کلس چڑھے ہوئے تھے گھوڑے سونے اور چاندی کے سامان سے مزین تھے، اور ان کے پیچھے ہاتھیوں کا جلوس تھا، افسر جو سنہرے اور رُوپہلے لباس میں ملبوس تھے، ایک دوسرے سے دولت و حشمت میں اپنے آپ کو بڑھ چڑھ کر دکھانے کی کوشش کرتے تھے۔ نصف صدی سے مرہٹوں نے ہندوستان کو لوٹ لوٹ کر جو دولت جمع کی تھی، اس کا فوجی کیمپ میں اس کا مظاہرہ ہو رہا تھا، اخراجات جنگ کے لئے دو کروڑ روپیہ ساتھ دکھایا تھا پیشوا کے حکم سے ہر چھوٹا بڑا مرہٹہ سردار بھاؤ کے جھنڈے تلے آکر جمع ہو رہا تھا، اور جب یہ فوج پونا سے نکلی تو اس جنگ کو ایک مذہبی فریضہ سمجھ کر راجپوتوں نے اپنی سوار فوج مہیا کی، پنڈارے جن کا نام پہلی مرتبہ تاریخ میں آتا ہے مرہٹوں سے آکر مل گئے اور جاٹوں کا سردار سورج مل بھی تیس ہزار جاٹوں کو لے کر شامل ہوا۔ (تاریخ ہند از ذکاء اللہ مرحوم)

[1] پانی پت کا خونی میدان

پنڈارے، پھر راجپوتانہ کے راجگان کی مسلح اور منظم فوجیں اور آخر میں سورج مل کے تیس ہزار جاٹ۔ بھاؤ کے ان نئے اور پرانے رفیقوں میں بہت سے ایسے لوگ تھے، جو مرہٹوں کی بربریت، خون آشامی، حرص و طمع اور خود غرضی سے نالاں تھے، مرہٹوں کی سفاکی اور درندگی سے پناہ مانگتے تھے، بایں ہمہ صرف "ہندو مت" کے نام پر یہ مخالف، متضاد اور برسر پیکار جماعتیں ایک مستعد اور منظم فوج بن کر ابدالی کا سر کچلنے اور مغل حکومت کا خاتمہ کرنے کے لئے نکل کھڑی ہوئی تھیں[1]۔

بھاؤ کی نظر جب سپاہیوں کے اس پُرشور سمندر پر پڑتی تھی، تو وہ باغ باغ ہو جاتا تھا۔ اُسے اپنے دست و بازو پر، اور اپنی فوج کی کارگزاری اور صلاحیت پر بڑا ناز تھا، نجومیوں کی پیش گوئی نے اور زیادہ اس کے حوصلوں کو بلند کر دیا تھا، اُسے یقین تھا کہ وہ ناقابل شکست ہے، دُنیا کی کوئی طاقت اُسے شکست نہیں دے سکتی۔

راستہ میں وسواس راؤ نے اپنے چچا بھاؤ سے پوچھا۔[2] "کیا ابدالی کے پاس اتنی ہی بڑی فوج ہوگی؟"

بڑے وثوق کے ساتھ بھاؤ نے کہا۔ "بیٹے وہ اتنی بڑی فوج کہاں سے لا سکتا ہے، اور بفرض محال لے بھی آئے تو اتنے سارے آدمیوں کو کھلائے گا کہاں سے؟"

پھر بھاؤ ہنسنے لگا۔

وسواس راؤ نے کہا۔ "لیکن میں نے سُنا ہے ابدالی بڑا بہادر ہے!"

بھاؤ نے تیوری چڑھا کر کہا۔ "ہوگا ——— کیا ہم بہادر نہیں ہیں؟ کیا میں بہادر نہیں

---

[1] پانی پت کا خونیں میدان [2] اس پر تقریباً تمام مورخ متفق ہیں کہ مرہٹوں نے اس جنگ کو مذہبی جنگ کی حیثیت سے جیتنے کی کوشش کی تھی۔

ہوں ، کیا تم بہادر نہیں ہو؟ کیا ہر مرہٹہ بہادری میں یکتا نہیں ہے؟

فخر کے ساتھ وسواس راؤ کی زبان کھلی۔ "کیوں نہیں ہے، ہم دشمن سے زیادہ بہادر ہیں، ہم میدانِ جنگ میں اُسے ناکوں چنے چبوائیں گے۔ ہم لوہے کے چنے ہیں، ہمیں کوئی نہیں کھا سکتا جو اس کی جراَت کرے گا اس کے دانت ٹوٹ جائیں گے؟"

بھاؤ نے بھتیجے کی محبت کے ساتھ پیٹھ تھپکی۔ "شاباش —— اپنا حوصلہ اسی طرح بلند رکھو، بہت جلد وہ وقت آنے والا ہے کہ تم ہندوستان کے شہنشاہ بنو گے، یہ نواب، تعلقہ دار، راجہ، مہاراجہ سب تمہارے سامنے جھکیں گے، مغلیہ حکومت کا تخت تمہارے قدموں کے نیچے ہوگا۔ دِلّی کے لال قلعہ پر ہمارا پرچم لہرائے گا۔"

وسواس راؤ خوش ہوگیا۔ "بہت دن مسلمانوں نے حکومت کرلی، اب ہماری باری ہے۔"

ابراہیم گاردی پہلو میں موجود تھا، اُس نے ایک قہقہہ لگایا اور کہا۔ "نہیں نہیں یوں کہئے کہ

ع دورِ مجنوں گزشت نوبت ماست!

بھاؤ نے گاردی سے تخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "اس جنگ کا فیصلہ تمہارے آدمی کریں گے؟"

گاردی نے اطمینان بھرے لہجہ میں کہا۔ "مطمئن رہئے —— نہ میں نے ہارنا سیکھا ہے، نہ میرے توپچیوں نے!"

بھاؤ نے اعتراف کیا۔ "ہاں تُم سچ کہتے ہو، میرے اِس قول کی گواہی صلابت جنگ بھی دے گا۔"

وہ یہ کہہ کر بھاؤ کو راس کے ساتھ گاردی نے ایک پُرزور قہقہہ لگایا، پھر بھاؤ نے کہا۔ "ان پٹھانوں کو اس طرح بھُون ڈالو جس طرح بھاڑ میں چنا بھُونا جاتا ہے!"

گارودی نے کہا۔ "اجی حضور، چیتا تو پہاڑ میں گھسنے کے بعد پھر سلامت رہ جاتا ہے، میں تو اپنے آقا کے دشمنوں کو اس طرح جلاؤں گا، جس طرح بھڑکتے ہوئے تنور میں کوئی تنکا آ کر بھسم ہو جاتا ہے کہ پھر اس کا وجود ہی ختم ہو جاتا ہے ——— نہ وہ پہچانا جاتا ہے نہ دکھائی دیتا ہے!"

دونوں پھر ہنسنے لگے۔

وسواس راؤ سے اب خاموش نہ رہا گیا۔ "لیکن سب کچھ اگر یہی کریں گے تو ہم کیا کریں گے؟"

بھاؤ مسکرایا۔ "تمہارا مطلب یہ ہے کہ ———!"

وسواس راؤ۔ "جی میرا مطلب یہ ہے کہ اگر گارودی صاحب نے سب کو بھون ڈالا تو ہم کیا کریں گے؟"

بھاؤ۔ "تم کیا کرو گے؟ ——— تم بڑے اچھے شکاری ہو، شکار کر لینا جو تمہارے سامنے آ گئے، بہت سے پہاڑ تک نہ پہنچ سکیں گے۔ انھیں ٹھکانے لگانا تمہارا کام ہے؟"

وسواس راؤ۔ "ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی!"

بھاؤ نے بڑی محبت کے ساتھ پوچھا۔ "وہ کون سی بات ہے میرے بیٹے؟"

وسواس راؤ۔ "آخر ابدالی اس سے قبل کیوں ہم پر غالب آ گیا؟ کیا ہم بہادر نہ تھے یا اب بنے ہیں بہادر؟"

بھاؤ ہنسنے لگا۔ "نہیں میرے بیٹے، یہ بات نہیں ——— ہم پہلے بھی بہادر تھے، اب بھی ہیں، ہماری بہادری کوئی نہیں چھین سکتا، بات یہ ہے کہ پہلے ہم میں ایکا نہ تھا!"

وسواس راؤ۔ "اور اب؟"

بھاؤ نے بڑے اطمینان کے ساتھ کہا۔ "اب ہم میں ایکا ہے، اب کون ہے۔ وہ ہے جو ہمارے ساتھ نہ ہو؟ وہ راجے مہاراجے جو ہم سے جلتے اور حسد کرتے تھے، وہ بھی ہمارا ساتھ

دینے پر تیار ہوئے ہیں۔"

وسواس راؤ۔ "لیکن ہماری فوج میں مسلمان بھی ہیں —— مثلاً یہی ابراہیم گاردی، جو ابھی آپ سے باتیں کر رہا تھا، اور ہمارے توپ خانہ کا افسرِ اعلیٰ ہے۔ یہ بھی مسلمان ہے!"

بھاؤ نے سمجھاتے ہوئے کہا۔ "ہاں ہے وہ بھی، اور دوسرے مسلمان بھی جو اس لشکر میں موجود ہیں، لیکن ان میں اور ہم میں ایک فرق ہے!"

وسواس راؤ۔ "وہی تو میں پوچھتا ہوں!"

بھاؤ نے جواب دیا۔ "وہ فرق یہ ہے کہ ہم ایک بڑے مقصد کے لئے لڑتے ہیں ہمارا مقصد ہے حکومتِ ہند کا حاصل کرنا، اور یہ گاردی وغیرہ پیٹ کے لئے لڑتے ہیں، ان کے سامنے کوئی مقصد نہیں، گاردی جب صلابت جنگ کا نوکر تھا، تو ہم لوگوں پر آگ برساتا تھا، اب ہمارا ملازم ہے تو صلابت جنگ کو جلا کر اس نے خاکستر کر دیا —— سمجھ گئے بیٹے، یہ ہے بات؟"

وسواس راؤ نے کوئی جواب نہ دیا فضا میں کسی چیز کی طرف اس کی ٹکٹکی بندھی ہوئی تھی —— !

وہ خاموش تھا!

باب (۴۸)

متھرا کی مسجد

بھاؤ کا جو برتاؤ وسواس راؤ کے ساتھ تھا، وہ شمشیر جنگ کے ساتھ نہ تھا، حالانکہ دونوں ایک باپ کے بیٹے تھے، یہ صحیح ہے کہ خود بالاجی راؤ پیشوا بھی اپنے دونوں بیٹوں میں فرق رکھتا تھا، وسواس کو وہ بھی بہت چاہتا تھا۔ لیکن اس کے یہ معنی نہ تھے کہ وہ شمشیر کو نہیں چاہتا تھا، اسے بھی اور نیچ سمجھتا تھا۔ لیکن بھاؤ، وسواس کو جتنا چاہتا تھا، اس سے زیادہ شمشیر سے نفرت کرتا تھا، حالانکہ شجاعت اور بہادری کا جہاں تک تعلق تھا، وہ وسواس کے مقابلہ میں کہیں زیادہ فن کار تھا۔ وسواس ابھی ایک نوخیز نوجوان تھا اور شمشیر جنگ جوان مرد تھا، شمشیر جنگ بھاؤ کے طرزِ عمل اور ذہنیت کو خوب سمجھتا تھا، اس لئے وہ اس سے حتی الامکان الگ تھلگ رہتا تھا، لیکن بہرحال وہ "شاہی خاندان" کا ایک فرد تھا۔ کیونکر ممکن تھا کہ صلاح مشورے میں شریک نہ کیا جائے؛ چنانچہ جب بھی مجلسِ مشاورت بیٹھتی تھی۔ اس میں جس طرح بھاؤ اور وسواس راؤ، جنکوجی سندھیا، اور دتاگا ئیکواڑ، سورج مل اور ملہار راؤ ہلکر شریک ہوتے تھے، اسی طرح شمشیر جنگ بھی شریک ہوتا تھا۔

لیکن آج ایک عجیب واقعہ ہوا، اس واقعہ نے شمشیر جنگ کو مضمحل اور اداس کر دیا!

بات یہ ہوئی کہ آج حسب معمول کھانے کے وقت جب تھال لگنے شروع ہوئے، تو بھاؤ نے شمشیر جنگ کا ہاتھ پکڑا اور کہا۔ "ذرا باہر آؤ!"

وہ چلتا ہوا بولا۔ "کوئی خاص بات ہے؟"

بھاؤ نے کہا۔ "ہاں بہت خاص!"

باتیں کرتے ہوئے دونوں شمشیر جنگ کے خیمہ کے قریب پہنچ گئے۔ بھاؤ نے کہا۔ "آؤ اندر آؤ!"

دونوں اندر داخل ہو گئے!

مسند پر شمشیر جنگ نے بیٹھتے ہوئے کہا۔ "فرمایئے کیا بات ہے؟"

بھاؤ نے سر کھجاتے ہوئے کہا۔ "بھئی بات یہ ہے کہ تم کھانا اپنے خیمہ میں کھایا کرو!"

شمشیر جنگ چونک پڑا۔ "کیوں؟ کس لئے؟ آخر وجہ؟"

بھاؤ نے کہا۔ "بات یہ ہے کہ لوگ اعتراض کرتے ہیں!"

شمشیر جنگ۔ "میں نہیں سمجھا، کس بات پر اعتراض کرتے ہیں؟ اور وہ کون لوگ ہیں جو اعتراض کرتے ہیں — ذرا صاف صاف کہئے!"

بھاؤ۔ "ساتھ کھانے پر!"

شمشیر جنگ۔ "میرے ساتھ کھانے پر؟"

بھاؤ۔ "ہاں!"

شمشیر جنگ۔ "کیوں؟ — کیا میں اچھوت ہوں؟ کیا میں بالاجی راؤ پیشوا کا لڑکا نہیں ہوں؟"

بھاؤ نے بڑی نرمی سے کہا۔ "کیوں نہیں ہو بھئی، تم پیشوا کے لڑکے بھی ہو اور اچھوت

بھی نہیں ہوا لیکن ——— !

شمشیر جنگ۔ "لیکن کیا؟"

بھاؤ۔ "لیکن یہ کہ یہ برہمن سردار جو ہیں نا، یہ بڑے وہ ہیں نہیں مانتے کسی طرح، ساتھ کھانا دھرم کے خلاف سمجھتے ہیں۔"

شمشیر جنگ۔ "لیکن یہ کیسا دھرم ہے جو اب خراب ہو رہا ہے، اور پہلے نہیں ہوا، کیا یہ اعتراض کرنے والے لوگ وہی نہیں ہیں، جو پونا میں بار ہا میرے ساتھ کھانا کھا چکے ہیں؟ کیا میرے ساتھ، میرا باپ بالاجی باجی راؤ پیشوا نہیں کھاتا؟ کیا خود آپ نے اور وسواس راؤ نے میرے ساتھ خاصہ نہیں تناول کیا؟"

بھاؤ۔ "بھئی ان باتوں سے کون انکار کرتا ہے؟"

شمشیر جنگ۔ "پھر اب یہ نیا شوشہ کیوں چھوٹا ہے؟"

بھاؤ۔ "اس لئے کہ اب ہمیں ان کی ضرورت ہے، ہم اُن کے محتاج ہیں، ہمیں ان کی خوشنودی حاصل کرنی ہے، اگر ہم نے انہیں خفا کر لیا تو اس کا نتیجہ جانتے ہو کیا ہوگا؟"

شمشیر جنگ۔ "کیا ہوگا؟"

بھاؤ۔ "یہ ہوگا کہ یہ ہمارے دوست، دشمن بن جائیں گے، ہمارا ساتھ چھوڑ دیں گے۔ ہم جو عظیم و جلیل مقصد لے کر آئے ہیں، اس میں ناکام ہوں گے، ہماری مرہٹہ حکومت کا خواب، خواب پریشاں بن جائے گا ——— میرے عزیز کیا تم اسے برداشت کرو گے؟ کیا تم اپنے محبت کرنے والے بوڑھے باپ سے محبت نہیں کرتے؟"

شمشیر جنگ۔ "کیوں نہیں کرتا!"

بھاؤ۔ "کیا تم اپنے باپ کی قوم کو سربلند دیکھنا نہیں چاہتے؟"

شمشیر جنگ۔ "ضرور دیکھنا چاہتا ہوں!"

بھاؤ۔ "کیا تم ہندو نہیں ہو؟"[1]

شمشیر جنگ۔ "ضرور ہوں!"

بھاؤ۔ "تو پھر تمہیں ایثار کرنا چاہیے۔ تمہیں اپنی خودداری کو مجروح نہیں ہونے دینا چاہیے!"

شمشیر جنگ۔ "یہ سب مجھے گوارا تھا، اگر آپ نے آخری بات مجھ سے نہ پوچھی ہوتی۔ آپ نے مجھ سے پوچھا کیا تم ہندو نہیں ہو؟ اور میں نے جواب میں ہاں کہا تھا۔ جب میں ہندو ہوں تو پھر کوئی دوسرا ہندو مجھے اپنے سے کمتر اور فروتر کیسے سمجھ سکتا ہے!"

بھاؤ۔ "بھئی تم تو ہو۔ لیکن تمہاری ماں؟ ہماری بھابی جان تو ہندو نہیں ہیں!"

شمشیر جنگ۔ "تو اس سے کیا ہوتا ہے؟"

بھاؤ۔ "اسی سے تو ہوتا ہے۔ یہی تو مشکل ہے!"

شمشیر جنگ۔ "اگر میں ہندو باپ کا بیٹا ہو کر بھی مساوات نہیں حاصل کر سکتا، تو پھر مجھے ہندو رہنے سے فائدہ کیا ہے؟"

بھاؤ۔ "کیا مطلب؟ کیا تم مسلمان بننا چاہتے ہو؟"

شمشیر جنگ۔ "پھر آپ ہی بتائیے، میں ہندو بھی رہوں اور ذلت بھی سہوں۔ اس سے کیا حاصل؟"

بھاؤ نے ابھی اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا تھا کہ ابراہیم گاردی آگیا۔ اس نے کہا، "اگر کوئی پرائیویٹ بات ہو رہی ہو تو اس وقت واپس چلا جاؤں؟"

---

[1] بعد میں یہ مسلمان ہوگیا تھا جس کی تفصیل اپنے موقع پر آچکی ہے۔

بجاؤ: "نہیں بھئی تم سے کیا بات چھپی ہے؟ بڑے وقت سے آئے، آؤ، آؤ، بیٹھو!"

ابراہیم گاردی آکر بیٹھ گیا، پھر بجاؤ نے ساری تفصیل اُسے بتائی، اور کہا: "یہ تو سمجھتے نہیں، اب تم ہی سمجھاؤ۔ ہمارے شمشیر جنگ کو!"

ابراہیم گاردی نے جواب دیا: "ایمان کی بات تو یہ ہے کہ شمشیر جنگ کی بات اصولی طور پر صحیح ہے، لیکن مصلحت بھی تو کوئی چیز ہے۔"

شمشیر جنگ: "لیکن میں مصلحت کا قائل نہیں، صرف اصول کا قائل ہوں۔"

انھی باتوں کے درمیان میں گرم گرم کھانے کے تھال خیمہ میں آگئے، شاید بجاؤ پہلے ہی سے ہدایت کر آیا تھا۔

ابراہیم خاں گاردی نے کہا: "لو بھئی ان تمام باتوں کا فیصلہ ہو گیا۔ آؤ میاں شمشیر جنگ ہم تم کھانا کھائیں۔ باقی باتیں پھر دیکھی جائیں گی!"

بجاؤ ہنسنے لگا: "واقعی بڑا اچھا فیصلہ کیا تم نے ——— اچھا تم لوگ کھاؤ، مجھے بھی بھوک لگ رہی ہے!"

بجاؤ چلا گیا۔

ابراہیم نے شمشیر جنگ کا ہاتھ پکڑا: "کیا سوچ رہے ہو بھئی اٹھو ——— مردِ خدا کھانا کھاؤ، وہ اگر تمہارے ساتھ کھانا اپنی توہین سمجھتے ہیں، تو تم ان کے ساتھ کھانے کو اپنی توہین کیوں نہیں سمجھتے؟ میں تو کہتا ہوں کہ اب اگر وہ اصرار بھی کریں تو تم انکار کر دو۔"

شمشیر جنگ: "ٹھیک کہتے ہو، یہی کروں گا۔"

ابراہیم گاردی: "بس تو آؤ۔ تم تو مجھے نیچ نہیں سمجھتے؟"

شمشیر جنگ: "ہرگز نہیں، کیسی بات کرتے ہو!"

ابراہیم گاردی۔ "میں بھی انسان ہوں اور تم بھی انسان ہو۔ ان لوگوں کو دھرم کے چکر میں پڑا رہنے دو، انسانیت کا رشتہ سب سے مضبوط رشتہ ہے، آؤ ہم تم اس رشتہ کو مستحکم کریں!"

ابراہیم اور شمشیر جنگ ایک ہی تھال میں بیٹھ کر کھانے لگے ——— یہ انسانیت کا مذہب تھا!

○

بھاؤ کا لشکر متھرا میں پہنچ گیا۔

سورج مل نے بڑا پر شکوہ استقبال کیا، بھاؤ نے اُسے گلے سے لگا لیا اور پوچھا۔ "کہو کیا ارادہ ہے؟"

سورج مل۔ "وہی جو آپ کا ہے۔"

بھاؤ ہنسنے لگا۔

سورج مل نے کہا۔ "آپ کی خدمت میں ایک تحفہ پیش کرنا چاہتا ہوں۔ کیا آپ قبول فرمائیں گے؟"

بھاؤ۔ "ع ہر چہ از دوست بہ رسد نیکوست ——— تمہاری پیش کی ہوئی ہر چیز میرے لئے لطف و مسرت کا سبب ہوگی ——— کیا ہے وہ تحفہ تمہارا؟"

سورج مل۔ "وہ تحفہ ہے عماد الملک غازی الدین بہادر!"

بھاؤ۔ "وزیر اعظم سلطنت ہندوستان؟"

سورج مل۔ "جی وہی ——— کیا اسے حاضر کروں؟"

بھاؤ۔ "بڑے شوق سے!"

سورج مل۔ "وہ آپ کے آنے کے دن گن رہا تھا"

بھاؤ: "ہمیں اس کے دیدار کا بڑا اشتیاق تھا"

سورج مل: "وہ ابدالی کے ڈر سے میرے پاس آکر پناہ گزین ہو گیا ہے۔ بڑا جیالا اور باہمت آدمی ہے، اُس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو خودکشی کر لیتا، یہ اسی کا دم ہے، کہ بڑی سے بڑی مصیبت میں بھی ہراساں نہیں ہوتا۔ اس سے ہمیں بہت مدد ملی ہے اور آئندہ بھی ملے گی"

بھاؤ: "تم اس کا تعارف نہ کراؤ، میں اُسے خُوب جانتا ہوں، اُسے جلد از جلد میرے خیمہ میں لاؤ۔ میں اس سے ملنا چاہتا ہوں، باتیں کرنا چاہتا ہوں"

سورج مل: "ابھی حاضر ہوا!"

تھوڑی دیر کے بعد سورج مل عماد الملک غازی الدین کو لے کر بھاؤ کے خیمہ پہنچا۔ بھاؤ بہت تپاک اور اخلاق کے ساتھ پیش آیا، اس نے کہا: "ہمیں سورج مل سے سب کچھ معلوم ہو چکا ہے۔ لیکن میرے دوست تم غم زدہ اور پریشان کیوں ہو، کیا تمہیں وزارتِ عظمیٰ سے محرومی کا افسوس ہے؟"

سورج مل بیچ میں بول پڑا: "ہونا ہی چاہیے!"

بھاؤ گرج کر: "نہیں ہرگز نہیں! افسوس سے کیا حاصل ہوگا۔ وزارتِ عظمیٰ صرف عماد الملک کا حق ہے اور اسی کو ملے گا۔ جو عماد الملک کا دشمن ہے، وہ ہمارا دشمن ہے!"

عماد الملک: "اور جو مرہٹوں کا دشمن ہے وہ عماد الملک کا دشمن ہے!"

بڑی دیر تک بھاؤ عماد الملک کو تسکین و تسلّی دیتا رہا۔ سورج مل بھی اس کی ہاں میں ہاں

لے یہ واقعہ ۱۷۶۰ء کا ہے۔

بلاتا رہا۔ عماد الملک نے بہت سی راز کی باتیں بتائیں، بھاؤ نے ان باتوں کو بڑے غور سے سُنا۔

○

بھاؤ زندگی میں پہلی مرتبہ آیا تھا!

متھرا ہندوؤں کا بڑا قدیم اور مقدس مقام ہے۔ یہیں کرشن جی پیدا ہوئے تھے، یہیں اُنھوں نے عظمت و جلال کی منزلیں طے کی تھیں، یہاں کا گوشہ گوشہ اور چپہ چپہ، دامان باغبان و کفِ گل فروش تھا، کرشن کی بانسری کی تانیں، ان کی گوپیوں کی اٹکھیلیاں، ان کی شجاعت اور دلاوری کے افسانے، اُن کے جنگی اور حربی کارنامے، سب اِسی شہر کی خاک سے وابستہ تھے۔

بھاؤ نے یہاں کے ایک مندر کی زیارت سورج مل اور اپنے دوسرے سرداروں کی رفاقت میں کی، اُس کے سپاہیوں نے متھرا کے باشندوں کو خوب جی بھر کے لوٹا اور خود اُس نے یہاں کے پنڈتوں اور پجاریوں کو انعامات دے کر مالامال کر دیا۔

عوام اس فرقِ ظرف مرحج سے خائف اور نالاں تھے۔

آسمان کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ وہاں دعائیں بھی پہنچ رہی تھیں، اور بددعائیں بھی، فرق صرف یہ تھا کہ بددعائیں دل سے نکلی تھیں اور دعائیں پیٹ سے۔

○

کئی دن گذر گئے۔

ایک روز مندروں کے جھرمٹ سے بھاؤ باہر نکلا تو اس کی نظر عالمگیر اورنگ زیب

کی بنائی ہوئی مسجد پر پڑی۔

مسجد بھی شاندار اور اس کے مینارے بھی سربہ فلک، گویا اقبال کے الفاظ میں ؎

یہ بھی عظیم و جلیل وہ بھی عظیم و جلیل!

بھاؤ نے ایک نفرت بھری نگاہ مسجد پر ڈالی، اور سورج مل سے پوچھا: "یہ کیا ہے؟"

سورج مل نے جواب دیا: "مسجد ہے!"

"میں اندھا نہیں ہوں، دیکھ رہا ہوں کہ یہ مسجد ہے، لیکن پوچھنا یہ چاہتا ہوں کہ یہاں کیوں ہے؟"

سورج مل چپ رہا۔

بھاؤ نے پھر ذرا خفگی کے لہجہ میں کہا: "اتنے بڑے مقدس شہر میں کسی جگہ بھی مسجد کا ہونا ناقابلِ برداشت تھا، نہ کہ مندروں کے ہجوم میں، مندروں کے آس پاس گویا جہاں کیرتن اور آرتی اور بھجن کے زمزمے بلند ہوتے ہیں، وہیں یہ مسجد اس کی گواہی دیتی ہے کہ یہاں مسلمان ہیں، یہ مینارے اس کی شہادت دیتے ہیں کہ مسلمان ایسے بلند ہیں، اذان کے نعرے بتاتے ہیں کہ مسلمان اس ملک کے، اس دیس کے، اس شہر کے حاکم ہیں!"

سورج مل نے کہا: "لیکن یہاں کے ہندوؤں اور مسلمانوں میں ان بن نہیں ہے۔"

بھاؤ شیر کی طرح دھاڑا: "ہندوؤں اور مسلمان میں ان بن نہیں ہے، لیکن مندر اور مسجد میں تو ہے!"

سورج مل خاموش ہو گیا۔

بھاؤ نے کہا: "یہ نہیں ہو سکتا۔"

پھر کچھ دیر رُک کر بولا۔ "اس مسجد کو اپنی جگہ چھوڑنی پڑے گی۔"

سُورج مل نے کہا۔ "یعنی آپ ڈھا دیں گے اسے؟"

وہ بولا۔ "ہاں —— کچھ شبہ ہے تمہیں؟"

سورج مل نے جواب دیا۔ "بالکل نہیں!"

بھاؤ نے کہا۔ "میں حکم دیتا ہوں، اس مسجد کو فوراً زمین کے برابر کر دیا جائے اب اس شہر میں اور اس جگہ سے اذان کی آواز نہیں بلند ہو سکتی۔"

سُورج مل ادب کے ساتھ خاموش کھڑا تھا۔

بھاؤ نے کہا۔ "میرے اس حکم کی تعمیل میں تاخیر نہ ہونی چاہیئے!"

سُورج مل نے عرض کیا۔ "آپ کے حکم کی تعمیل ہوگی۔"

بھاؤ نے یہ الفاظ کُنے اور وقار کے ساتھ اپنے خیمہ کی طرف بڑھا چلا گیا۔

سُورج مل جہاں کھڑا تھا، وہیں کھڑا رہا۔

○

رات کے کھانے کے بعد سُورج مل دبے پاؤں وسواس راؤ کے خیمہ میں پہنچا، وہ سونے کی تیاریاں کر رہا تھا، سورج مل کو دیکھ کر چونک پڑا۔ "سورج مل تم؟ اس وقت؟"

سورج مل۔ "بڑے ضروری کام سے آیا ہوں!"

وسواس راؤ۔ "آؤ آؤ، بیٹھو!"

سورج مل۔ "آپ کو ایک کام میں میرا ساتھ دینا ہوگا۔"

وسواس راؤ۔ "کیا ہے وہ کام؟"

سورج مل۔ "یہ نہ پوچھئے، میرے ساتھ چلے چلیے!"

وسواس راؤ۔ "لیکن کہاں؟"

سورج مل۔ "سداشیو راؤ بھاؤ کے خیمہ میں۔"

وسواس راؤ۔ "کیوں خیر تو ہے؟"

سورج مل۔ "خیر ہی تو نہیں ہے، اسی لئے آپ کو تکلیف دینے آیا ہوں!"

وسواس راؤ۔ "مجھے کوئی عذر نہیں، چلو۔"

سورج مل۔ "آپ کی مہربانی کا بہت بہت شکریہ، لیکن ایک بات ابھی گوش گذار کئے دیتا ہوں۔"

وسواس راؤ۔ "کہو کہو، کہہ ڈالو، کیا ہے وہ بات؟"

سورج مل۔ "جو کچھ میں بھاؤ سے کہوں۔ آپ اس کی تائید کیجیے گا۔"

وسواس راؤ ہنس پڑا۔ "آخر ماجرا کیا ہے؟"

سورج مل۔ "یہ نہ پوچھئے"

وسواس راؤ۔ "بہت اچھا جناب چلئے!"

یہ لوگ سیدھے بھاؤ کے خیمہ میں پہنچے، جس کی سجاوٹ دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی، یہ خیمہ اپنے شان و شکوہ کے اعتبار سے ایک شاندار محل سے کم نہ تھا بھاؤ نے اس وقت جو ان دونوں کو اپنے خیمہ میں آتا ہوا دیکھا، تو وہ بھی متحیر ہو گیا۔

"سورج مل تم؟ — وسواس راؤ بیٹے، تم اس وقت کیسے؟"

وسواس نے کہا۔ "سورج مل کے ساتھ چلا آیا — کچھ ضروری بات عرض کرنی ہے آپ سے۔"

بھاؤ نے جواب دیا: "میں ہر بات سنوں گا، کہو!"

اب سورج مل بولا: "میں یہ عرض کر رہا تھا کہ عالمگیری مسجد کے بارے میں آپ نے جو حکم دیا تھا ـــــــ!"

بھاؤ: "ہاں مجھے یاد ہے، میں نے کہا تھا اسے فوراً منہدم کر دو ـــــــ اعتراض ہے تمہیں کچھ؟"

سورج مل: "جی اعتراض تو بالکل نہیں، لیکن ـــــــ!"

بھاؤ: "لیکن ـــــــ لیکن کیا؟ کہتے کیوں نہیں؟"

سورج مل: "میرا مطلب یہ تھا کہ یہ حکم ملتوی ہو جاتا کچھ دن کے لئے تو بہتر تھا!"

بھاؤ: "التوا کی مصلحت؟"

سورج مل: "بات یہ ہے کہ اس وقت اگر یہ مسجد ڈھائی گئی تو ہمیں بڑا بھاری نقصان پہنچ جائے گا، ہو سکتا ہے کہ ایسا نقصان پہنچے کہ پھر اس کی تلافی ہی نہ ہو سکے!"

بھاؤ: "میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔"

سورج مل: "میرا مطلب تو بالکل صاف ہے ـــــــ یعنی یہ کہ جب آپ دِلّی فتح کر لیں ابدالی کو شکست دے لیں، نجیب الدولہ کا خاتمہ کر لیں، تب صرف اسی ایک مسجد کو نہیں جتنی مسجدوں کو چاہیے گا، منہدم کرا دیجئے گا، لیکن اس وقت اگر ایسا کیا گیا، تو بڑی مشکل پیش آ جائے گی!"

بھاؤ: "میں مشکلات کی پروا نہیں کرتا۔"

سورج مل: "ذرا غور تو کر لیجئے، ہماری فوج میں بھی مسلمان ہیں، ہمارے توپ خانہ کا افسر اعلےٰ مسلمان ہے۔"

بھاؤ: تو ——! یہ سب میرے نوکریں چوں نہیں کرسکتے!

سورج مل۔ بے شک نہیں کرسکتے —— لیکن شجاع الدولہ، وہ تو آپ کا نوکر نہیں ہے اور اُسے ہر قیمت پر ہمیں اپنے ساتھ رکھنا ہے!"

بھاؤ کچھ سوچنے لگا، پھر اُس نے کہا: "تو یہ ہے تمہاری رائے؟"

سورج مل۔ "میری دوستانہ صلاح یہی ہے، ورنہ آپ جو حکم دیں، اس کی تعمیل میرے لئے فرض ہے!"

بھاؤ۔ "ہوں —— وسواس راؤ تمہاری کیا رائے ہے کیا تُم بھی سورج مل سے متفق ہو؟"

وہ ادب سے بولا: "جی رائے تو صائب ہے!"

بھاؤ ہنسنے لگا: "تو سازش کرکے تشریف لائے تھے، آپ حضرات کیوں؟"

سورج مل اور وسواس راؤ مسکرا دیئے!"

بھاؤ نے کہا۔ "اچھا، ابدالی کو شکست دینے کے بعد سہی لیکن یہ کام بہر حال کرنا ہوگا؟"

سورج مل: "ضرور ضرور، پہلا پھاوڑہ میں چلاؤں گا، اس مسجد پر، جب اُسے دیکھتا ہوں... آنکھوں میں خون اُتر آتا ہے۔ لیکن اس وقت مصلحت کا تقاضا یہی ہے کہ ہم اُسے اس کے حال پر چھوڑ دیں۔"

بھاؤ: "تمہیں اختیار ہے۔"

باب (۴۹)

بھاؤ کا غرور!

بھاؤ کی فوج تین لاکھ سوار اور پیادوں پر[1] مشتمل تھی۔ فوج کا ہر سپاہی ایک ہی نشے سے سرمست تھا، وہ ایسی جنگ لڑنے جا رہا ہے جو ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ کرنے والی[2] ہے — ہندوستان ہی کا نہیں، ہندوستان میں رہنے والی ہر قوم کا!

فوج کی پریڈ کے بعد بھاؤ نے سورج مل سے کہا: "ہم دلّی سے قریب پہنچ چکے ہیں، ضروری ہے کہ اپنا نقشۂ جنگ مرتب کریں!"

سورج مل نے جواب دیا: "میں بھی یہی عرض کرنے والا تھا جب تک ہم اپنا آئندہ کا پروگرام نہ بنا لیں، اس وقت تک یہاں سے کوچ مناسب نہ ہوگا!"

بھاؤ: "مجھے تمہاری رائے سے اتفاق ہے، بہتر یہ ہے آج ہی مجلس شوریٰ منعقد کر لی

---

[1] فارسی کے تمام مورخین اس تعداد پر متفق ہیں، انگریز مورخین نے کچھ کم تعداد لکھی ہے۔ اس اختلاف بیان میں تطبیق یہ دی جا سکتی ہے کہ انگریز مورخین نے مرہٹہ فوج کے آفاقیوں کو شمار نہیں کیا ہے اور فارسی مورخین نے ان کا شمار بھی کر لیا ہے۔

[2] فیصلہ کن جنگیں

جائے!

سورج مل:۔ بہت مناسب!

بھاؤ:۔ ملکر اور جھنکو سندھیا کو بھی اطلاع دے دو!

سورج مل:۔ بہت بہتر — اور شمشیر جنگ کو؟

بھاؤ:۔ شمشیر جنگ کو؟ — خیر اسے بھی اطلاع دے دینا!

سورج مل:۔ وسواس راؤ کو تو آپ خود بتا دیں گے؟

بھاؤ:۔ ہاں — ! تم اس کی فکر نہ کرو!

وقت مقررہ پر امورِ جنگ کا فیصلہ کرنے مجلسِ مشورت بیٹھی، ایک عجیب مہیب سناٹا چھایا ہوا تھا اس ساری مجلس پر، ہر شخص اپنی ذمہ داری محسوس کر رہا تھا کہ فکر و عمل کی معمولی سی غلطی بھی پوری بساط الٹ دے سکتی ہے، ہر شخص پر غور و تامل کی سنجیدگی چھائی ہوئی تھی کہ بھاؤ کی آواز نے سناٹے کے طلسم کو توڑا، اس نے حاضرین کو مخاطب کر کے کہا:۔

"آپ لوگ جانتے ہیں ہم کس مقصد کے لیے جمع ہوئے ہیں؟ اس دیس پر تقریباً ایک ہزار سال تک مسلمانوں نے حکومت کی ہے، ہم ان کا مقابلہ نہ کر سکے، محض غلامی کی زندگی بسر کرتے رہے، لیکن مقابلہ کیوں نہ کر سکے؟ صرف اس لئے کہ ہم میں یگانگت نہ تھا، ہم میں اتحاد و اتفاق نہ تھا۔ ہم خود غرضی کے مرض میں مبتلا تھے، ہم میں ہر فرد صرف اپنا مفاد پیشِ نظر رکھتا تھا، قوم، ملک اور جماعت کو بے تامل قربان کر دیتا تھا، مسلمانوں نے اس صورتِ حال سے فائدہ اٹھایا، وہ آگے بڑھتے رہے، ایک ایک کر کے ہندو ریاستوں کو ختم کرتے رہے، لیکن اب زمانہ بدل چکا ہے، اب ہم میں اتحاد ہے۔ ہماری تمام منتشر اور پراگندہ قومیں مجتمع ہو چکی ہیں، راجپوت ہمارے سب سے بڑے حریف تھے، اب وہ بھی

ہمارے ساتھ ہیں، دوسری ریاستوں سے بھی ہماری رقیبانہ کشمکش تھی، وہ بھی اب ختم ہو چکی ہے۔ اب مرہٹہ پرچم کے نیچے ہندو قوم کے تمام طبقات موجود ہیں اور ان سب کا مقصد ایک اور صرف ایک ہے کہ مسلمانوں کی حکومت ختم ہو جائے اور اس دیس کے ہر چپے پر ہماری حکومت قائم ہو، اب ہم غلامی کی زندگی نہیں بسر کر سکتے!"

ملہار راؤ ہلکر: "کسی قیمت پر بھی نہیں!"

جھنکو سندھیا: "ہم نے فیصلہ کر لیا ہے کہ آخر وقت تک دشمن سے مقابلہ کریں گے اور جب تک اس کا خاتمہ نہ کر لیں، اس وقت تک نہ چین سے بیٹھیں گے نہ بیٹھنے دیں گے!"

سورج مل: "صرف یہی ایک صورت ہے با عزت زندگی بسر کرنے کی، عزت کے ساتھ زندہ رہنے کی!"

بھاؤ: "میں الفاظ نہیں چاہتا، عمل چاہتا ہوں، تقریر نہیں چاہتا، کارنامہ چاہتا ہوں، باتیں نہیں چاہتا قوت چاہتا ہوں، رائے نہیں چاہتا سرفروشی چاہتا ہوں!"

ملہار راؤ ہلکر: "یہ سب چیزیں آپ کو ملیں گی، اور ضرور ملیں گی، ہم میں سے ہر شخص مرنے یا جیتنے کا فیصلہ کر چکا ہے!"

بھاؤ کچھ کہنے کے لیے اٹھا تھا کہ سورج مل کا ایک افسر گھبرایا ہوا آیا۔ اس نے کہا "سب سے پہلے متھرا کی قسمت کا فیصلہ کیجیے، پھر دلی کی قسمت کا فیصلہ بھی ہوتا رہے گا ــــ"

سورج مل نے پوچھا "کیا ہوا؟"

وہ بولا "مرہٹہ سپاہی شہریوں کو بری طرح لوٹ رہے ہیں، اور ہماری جان بخشے

نہ مال، نہ آبرو!"

سُورج مل نے کوئی جواب نہ دیا۔ نظر اٹھا کر بھاؤ کی طرف دیکھا، بھاؤ نے سورج مل پر ایک نظر ڈالی اور پھر بڑی خشونت کے ساتھ کہا: "نکل جاؤ یہاں سے!"

وہ افسر بھاؤ کا منہ حیرت سے دیکھنے لگا۔

بھاؤ نے کہا: "میں حکم دیتا ہوں، نکل جاؤ یہاں سے!"

وہ بولا: "جاتا ہوں ــــ لیکن فریادیوں کو جواب کیا دوں، بہت سے لوگ کیمپ سے باہر آپ کا جواب سننے کے لیے ننگے سر ننگے پاؤں کھڑے ہیں!"

بھاؤ کا غصہ اور بڑھ گیا۔ ان سب سے کہہ دو، وہ بھی چلے جائیں، اس وقت میں جنگ کے سوا کچھ نہیں سننا چاہتا، تمھیں شکایت ہے کہ مرہٹے لُوٹتے ہیں؟"

افسر نے ادب کے ساتھ عرض کیا: "جی ــ یہی شکایت ہے!"

بھاؤ نے بے پروائی سے کہا: "لیکن اس شکایت کو میں کوئی اہمیت نہیں دیتا، ہمارے سپاہی سر سے کفن باندھ کر میدان میں اُترے ہیں، وہ اس لیے اُترے ہیں، کہ جان کی بازی لگا دیں، دشمن سے کلّہ بہ کلّہ مقابلہ کریں، اپنا خون بہائیں، اگر ضرورت ہو تو خون کا آخری قطرہ بھی ملک اور قوم کی آزادی کے لیے قربان کر دیں، اپنی گردن کٹا دیں، اپنی جانِ شیریں گنوا دیں ــــ اور تُو ــــ اور تُو ان کی شکایت کر رہا ہے! تو چاہتا ہے کہ میں انھیں سزا دوں، بس تجھے میرے پاس میرے بہادروں کی شکایت لے کر آتے ہوئے شرم نہیں آئی، اگر تُو سورج مل کا خاص آدمی نہ ہوتا تو یہاں سے زندہ بچ کر نہیں جا سکتا تھا..... میری آنکھوں کے سامنے سے جلد ہٹ جا۔ ورنہ شاید میں سُورج مل کا لحاظ بھی زیادہ دیر تک نہ کر سکوں اور پھر ضرور تجھے اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑے گا!"

وہ بے چارہ یہ زہر میں بجھی ہوئی باتیں سُن کر چُپ چاپ سر جھکائے، کان دبائے بھاؤ کے سامنے سے ٹل گیا۔

اس کے جانے کے بعد بھاؤ نے کہا۔ "مجلس برخاست!"

وسواس راؤ نے عرض کیا۔ "لیکن پروگرام؟"

بھاؤ نے جواب دیا۔ "اب یہ پروگرام متھرا میں نہیں، بھرت پور میں بنے گا!"

پھر وہ ہلکر سے مخاطب ہوا۔ "فوج کو کوچ کا حکم دو!"

سندھیا سے اُس نے کہا "میں اس شہر میں نہیں رہنا چاہتا۔ جہاں کے لوگ اتنے احسان فراموش اور ناشکرے ہوں! ——— سورج مل تمہیں میرے بھرت پور چلنے پر اعتراض تو نہیں ہے؟ اگر ہو تو میں بھرت پور میں رُکے بغیر دلّی کی طرف بڑھتا چلا جاؤں گا!"

سورج مل نے جواب دیا "یہ میری خُوش قسمتی ہے کہ آپ بھرت پور میں قیام فرمائیں گے۔ اِس مہمان داری پہ مجھے ناز ہے، شوق سے چلیے!"

اور باہر جا کر سورج مل نے اپنے اسی افسر سے کہا۔ "تم ابھی بھرت پور روانہ ہو جاؤ، سب کو بتا دو، بھاؤ، ہم کل وہاں پہنچیں گے، لوگ پہلے سے ہوشیار ہو جائیں۔۔۔ وہی لوگ زیادہ لٹتے ہیں جو اپنے مال و دولت یا سامانِ تجارت کی نمائش کرتے ہیں!"

وہ بولا "لیکن حضور بھرت پور میں وہی آفت آئے گی جو متھرا میں آئی!"

سورج مل نے کہا۔ "ہاں ضرور آئے گی، اسے روکا نہیں جا سکتا، لیکن ایک بات کا اطمینان رکھو، بھرت پور اور متھرا میں فرق ہے، بھرت پور میری راجدھانی ہے اور بھاؤ اچھی طرح جانتا ہے، میں کون ہوں، سندھیا اور ہلکر بھی اس سے ناواقف نہیں کہ میں کیا ہوں ——— اچھا اب وقت نہ ضائع کرو۔ فوراً روانہ ہو جاؤ!"

○

بھرت پور میں مرہٹہ سپاہیوں کی دست اندازیوں کا وہ عالم نہیں رہا جو متھرا میں تھا۔۔ لیکن یہاں بھی وہ نچلے نہیں بیٹھے، لوٹ مار کا سلسلہ محدود پیمانہ پر سہی، لیکن انھوں نے یہاں بھی جاری رکھا[1]۔

بھاؤ کا غصہ اب تک قائم تھا۔ دو تین روز کے بعد اس کی طبیعت راہ پر آئی، اور اس نے وسواس راؤ کے اصرار اور التجا کے بعد پھر مجلس مشاورت طلب کی۔

اس مجلس میں بھی بھاؤ نے ایک شر انگیز تقریر کی، اور مرہٹہ سرداروں نے حسبِ معمول بڑا حوصلہ افزا جواب دیا، سورج مل نے بھی دل و جان سے آخر وقت تک ساتھ دینے کا وعدہ کیا۔

ان تقریروں کے بعد سورج مل نے کہا پھر خوشی کی بات ہے کہ ہماری فوج میں مسلمان بھی ہیں، افسر بھی اور سپاہی بھی!"

بھاؤ:۔ اس سے تمہارا مطلب ؟"

سورج مل:۔ مطلب یہ ہے کہ جب تک ابدالی کا کامل استیصال نہ ہو جائے اور ہندوستان کی حکومت پورے طور پر ہمارے ہاتھ میں نہ آجائے، اس وقت تک ہمیں اپنی جنگ کو پورے طور پر "ہندو مسلم" سوال نہ بنانا چاہیے!"

بھاؤ:۔ "یہ تم کیا کہتے ہو ؟ اسی بنیاد پر مخالفوں اور دشمنوں تک کو ہم نے ساتھ ملا دیا ہے!"

سورج مل:۔ بنیاد بھی صحیح تھی ہے اور بات بھی پکی ہے۔ اس سے تو مجھے ذرا بھی اختلاف نہیں، میں تو صرف یہ کہہ رہا ہوں کہ ظاہری طور پر یہ جنگ مرہٹوں اور پٹھانوں کی ہونی چاہئے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کی نہیں!"

---

[1] لوٹ مار کے سلسلے میں ہم مذہب اور غیر مذہب کی کوئی پروا نہیں کرتے تھے۔

بھاؤ:- "تمہاری رائے بالکل صحیح ہے ـــــ اسی لئے تم دیکھ رہے ہو کہ میری فوج میں مسلمان بھی موجود ہیں۔ ہمارے توپ خانہ کا سارا اور دلبست ابراہیم خاں کے ہاتھ میں ہے اور جہاں تک میں سمجھتا ہوں وہ ہمارا وفادار بھی ہے!"

سورج مل:- "مجھے بھی اس کی وفاداری میں شبہ نہیں!"

بھاؤ:- "پھر ـــــ؟ اور کیا چاہتے ہو تم؟"

سورج مل:- "میں یہ چاہتا ہوں کہ مسلمان رجواڑوں اور سرداروں کو بھی ہمارے ساتھ ہونا چاہئے!"

بھاؤ:- "کیا عماد الملک غازی الدین کافی نہیں ہے؟"

سورج مل:- "وہ بڑا ذاتی دوست ہے۔ میں اس کی وفاداریوں کا قدرشناس بھی ہوں پھر بھی میری رائے یہ ہے کہ موجودہ حالات میں وہ ہمارے لئے زیادہ سودمند نہیں بلکہ ایک حد تک نقصان دہ ہے!"

بھاؤ:- "نقصان دہ ہے؟ ـــــ کیا کہہ رہے ہو تم سورج مل؟"

سورج مل:- "بالکل صحیح عرض کر رہا ہوں!"

بھاؤ:- "میں تو سمجھتا ہوں اُس سے زیادہ کوئی مفید مہرہ ہمارے پاس نہیں!"

سورج مل:- "میری بھی یہی رائے ہے لیکن تھوڑے سے فرق کے ساتھ!"

بھاؤ:- "وہ فرق کیا ہے؟"

سورج مل:- "یہ کہ ہم عماد الملک غازی الدین کی خدمات سے پُورا فائدہ اُٹھائیں، لیکن اُسے زیادہ اچھالیں نہیں۔ اسی طرح وہ ہمارے لئے مفید ثابت ہو سکتا ہے۔ اگر اُسے زیادہ اُچھالا گیا تو اس سے عام اور خاص غرض مسلمانوں کے تمام طبقے نہ

صرف یہ کہ ہمارا ساتھ نہیں دیں گے۔ بلکہ ہمیں اپنا ایسا دشمن سمجھیں گے کہ جس کے مقابلہ پر وہ بھی سر دھڑ کی بازی لگانے میں تامل نہیں کریں گے!"

وسواس راؤ۔ "ٹھیک ہے، ہم غازی الدین کو اپنے ساتھ فی الحال دلی بھی نہیں لیجائیں گے!"

بھاؤ:۔ "وسواس راؤ کی رائے معقول ہے۔"

سورج مل:۔ "بہت معقول ہے، لیکن میری بات کا اب تک جواب نہیں ملا۔ حالانکہ اس کا تصفیہ بھی بہت ضروری ہے!"

وسواس راؤ۔ "وہ کون سی بات ہے؟"

سورج مل۔ "یہ کہ ہمارے ساتھ مسلمان سرداروں اور نوابوں کو بھی ہونا چاہیئے!"

بھاؤ:۔ "مجھے تم سے اختلاف نہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ کیونکر ہم انھیں اپنے ساتھ ملائیں؟"

سورج مل:۔ "یہی سوچنا ہے!"

وسواس راؤ۔ "تو سوچو اور بتاؤ!"

بھاؤ:۔ "نجیب الدولہ، حافظ رحمت خاں، احمد خاں بنگش، ان لوگوں کے بارے میں تو گمان بھی نہیں کیا جا سکتا کہ ہمارا ساتھ دیں گے!"

وسواس راؤ:۔ "یہ بھی پٹھان ہیں اور ابدالی بھی، بلکہ میرا خیال تو یہ ہے کہ انھیں پٹھانوں کو قوت پہنچانے کے لئے ابدالی بار بار آتا ہے!"

سورج مل:۔ "ابدالی ان کے لئے آتا ہے یا اپنے لئے، یا مغل بادشاہ کے لئے۔ اس سے بحث نہیں، سوال صرف یہ ہے کہ جس طرح احمد شاہ ابدالی کے ساتھ پٹھان رئیسوں اور سرداروں کا پرا ہے، کیا ہم اپنے ساتھ بھی ایک جتھا نہیں رکھ سکتے؟"

بھاؤ:۔ اگر رکھ سکتے ہو تو رکھو!

وسواس راؤ:۔ ہمیں کوئی اعتراض نہیں!

ملہار راؤ ہلکر:۔ بلکہ ہم خوش ہوں گے!

جھنکو سندھیا:۔ اس طرح ہماری طاقت بڑھے گی"

بھاؤ:۔ لیکن وہ کون ہے جو ہمارے ساتھ آسکتا ہے؟

سورج مل:۔ شجاع الدولہ!

وسواس راؤ:۔ کیا کہا، شجاع الدولہ؟

سورج مل:۔ جی ـــــ وہ بہت کامیاب مہرہ ثابت ہو سکتا ہے!

بھاؤ:۔ ممکن ہے تمہاری رائے شجاع الدولہ کے بارے میں صحیح ہو۔ لیکن معلوم ہوتا ہے تمہارا
حافظہ بہت کمزور ہے!

سورج مل:۔ یہ آپ نے کیسے سمجھا؟

بھاؤ:۔ تم بھول گئے کہ شجاع الدولہ اگر نجیب الدولہ کا ساتھ نہ دیتا تو مرہٹہ سپاہیوں نے اسے
مار لیا تھا، وہ صرف شجاع الدولہ کی فوجیں نہیں۔ جنھوں نے اُسے بچا لیا، اور مرہٹوں
کو سخت نقصان پہنچا ہے"

سورج مل:۔ مجھے یاد ہے، لیکن وہ دوسری بات تھی، اس نے نجیب الدولہ کا ساتھ اس
لئے نہیں دیا تھا کہ وہ اس کا حامی، طرفدار اور دوست تھا!

وسواس راؤ:۔ پھر کس لئے دیا؟

سورج مل:۔ اس لئے کہ وہ آپ سے بدظن تھا۔ وہ مرہٹوں کی زیادتی سے نالاں تھا اسے
معلوم تھا کہ جو دو سو دیہات مرہٹوں نے لوٹ لئے، کھیت جلا دیئے، رگوں کی

زندگی اجیرن کر دی، ورنہ وہ ہم سے زیادہ پٹھانوں کا دشمن ہے۔ ہم صرف پٹھانوں کے دشمن ہیں، اور دشمنی دوستی سے بدل بھی سکتی ہے، لیکن شجاع الدولہ ان سے نفرت کرتا ہے انہیں اُجڈ اور گنوار، بدتہذیب اور بدسلیقہ سمجھتا ہے۔ ان کی صورت دیکھنا نہیں چاہتا اگر آپ اس کی حوصلہ افزائی کریں، قدر دانی کا وعدہ کریں، اس کی غلط فہمیاں کو دُور کریں تو وہ یقیناً پٹھانوں کا ساتھ چھوڑ کر ہمارے ساتھ مل جائے گا، اور اس طرح ہمیں بڑی تقویت پہنچے گی۔"

وسواس راؤ: "لیکن اسے کس طرح رام کیا جائے؟"

سورج مل: "آپ کی اور سداشیو راؤ بھاؤ کی طرف سے اس کے پاس سفارت جانی چاہئے۔ وہ پٹھانوں کے مقابلے میں ہمیں ترجیح دیتا ہے۔ آپ سے اس کی بدگمانی دُور ہوئی اور وہ ہمارے ساتھ آیا!"

بھاؤ: "اگر یہ بات ہے تو مجھے سفارت بھیجنے اور خط لکھنے میں کوئی تامل نہیں!"

پھر اُس نے ایک نگاہ مجمع پر ڈالی اور کہا: "خط کون لکھے گا شجاع الدّولہ کے نام؟"

سورج مل بولا: "میں لکھوں گا۔"

بھاؤ: "لکھو اور ہمیں سناؤ!"

سورج مل خط پہلے سے لکھ کر لیا تھا، اُس نے جیب سے نکالا اور سنایا۔ بھاؤ نے بہت پسند کیا اور کہا:

"یہ خط ابھی بھیج دو، اور اس میں یہ بھی لکھ دو کہ ہم دِلّی کی طرف بڑھ رہے ہیں جواب وہیں ملنا چاہئے!"

سورج مل: "بہت بہتر — آپ دِلّی کی طرف کب بڑھ رہے ہیں؟"

بھاؤ: "بس اب یہاں رہنے کی کیا ضرورت ہے؟ کل ہی کوچ کر دیں گے!"

سورج مل: "مناسب رائے ہے، لیکن میرا ایک اور مشورہ بھی ہے اور بہت اہم ہے!"

بھاؤ: "وہ کیا؟ ہم تمہارے مشورہ کو قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں!"

سورج مل: "جب آپ دلّی کی طرف بڑھ رہے ہیں تو ضرور ابدالی سے جنگ چھڑے گی!"

بھاؤ: "ظاہر ہے!"

سورج مل: "تو میری رائے یہ ہے کہ عورتوں اور بھاری توپوں کو یہاں چھوڑ جائیے... ہلکے پھلکے ہو کر جائیے، تاکہ نقل و حرکت میں دشواری نہ ہو، وہاں جاکر جنگ قزاولی لڑائیے، روہیلوں (پٹھانوں) کے علاقہ پر تاخت و تاراج شروع کر دیجیے۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ یہ روہیلے سردار جو چاروں طرف سے آ آکر ابدالی کے ارد گرد جمع ہو گئے ہیں، اس کا ساتھ چھوڑ کر اپنے اپنے علاقوں کی طرف بھاگیں گے، ابدالی یکہ و تنہا رہ جائے گا، پھر اُسے مار لینا یا اس کا کامیابی سے مقابلہ کرنا بہت آسان ہو جائے گا۔ یہ منظر دیکھ کر خود ابدالی اپنی عافیت اسی میں سمجھے گا کہ یا تو جہاں سے آیا ہے، وہاں واپس چلا جائے، ورنہ اپنی موت کو اپنے ہاتھوں دعوت دے!"

بھاؤ چپ چاپ سورج مل کا یہ مشورہ سنتا رہا۔

پھر اس نے ایک زور کا قہقہہ لگایا اور طہار راؤ ہلکر سے کہا۔ "تمہاری کیا رائے ہے؟"

وہ بولا "میرے خیال میں سورج مل کی رائے بہت صائب اور مناسب ہے!"

بھاؤ نے زہرخند کرتے ہوئے کہا۔ "تو تم بھی سورج مل کے ہمنوا ہو گئے!"

لہ پانی پت کا خونیں میدانِ جنگ

وہ بولا۔ "جی، میری بھی یہی رائے ہے!"

بھاؤ کو پھر غصّہ آگیا۔ اُس نے کہا: "تم دونوں احمق ہو!"

سورج مل اور ہلکر نے کوئی جواب نہیں دیا۔

بھاؤ نے سورج مل کو مخاطب کیا: "تم ایک معمولی سے زمیندار ہو، رموزِ مملکت ناواقفِ محض، لہٰذا اس احمقانہ مشورے پر میں تمہیں قابلِ معافی سمجھتا ہوں۔ تمہارا دماغ وہی سوچ سکتا ہے جس کا وہ اہل ہے۔ زیادہ دُور کی اور زیادہ بڑی بات کی اس میں سمائی نہیں ہو سکتی۔"[1]

پھر اس نے ملہار راؤ ہلکر سے کہا: "تو بھی ایک گڈریے کا بچہ ہے، جا، اپنا ریوڑ چرا۔ تو کیا جانے حکومت کس طرح کی جاتی ہے! پیشوا کو دعائیں دے کہ اُس نے تجھے ایک گڈریے سے سپاہی اور ایک سپاہی سے شہسوار، اور ایک شہسوار سے ایک فرمانروا بنا دیا۔ لیکن تیرے خُو بُو میں اب تک کوئی فرق نہیں آیا، وہی کا وہی ہے جو تھا۔"

بھاؤ کی یہ کڑوی کسیلی باتیں سُن کر ہلکر اور سورج مل جزبز تو بہت ہوئے، لیکن ان میں سے کسی کو یارائے دم زدن نہ تھا، جانتے تھے کہ اگر ذرا بھی لب کشائی کی تو ابدالی کا خرخرکچھ بھی ہو، یہ یہیں ڈھیر کر دیئے جائیں گے، اور ایسی خانہ جنگی شروع ہو گی جو کسی طرح

[1] تاریخ کی ہر مستند کتاب نے خواہ وہ انگریزی کی ہو یا فارسی کی، بھاؤ کے یہی الفاظ لکھے ہیں، جو اُس نے سورج مل اور ہلکر سے ان کا مشورہ سُن کر کہے تھے، اور اس کی توجیہہ یہی ہے کہ وہ مختارِ کُل تھا، فتح اسی کی ہو گی۔

بھاؤ نے ہلکر کو مخاطب کر کے جو الفاظ کہے، وہ بھی ایک تلخ سچائی کے حامل ہیں، ہلکر واقعی ایک گڈریا تھا، جسے پیشوا نے فرش سے عرش تک پہنچا دیا!"

جو کسی طرح ختم ہونے میں نہ آئے گی!

ان کی خاموشی دیکھ کر بھاؤ اور اکڑ گیا۔

"تم لوگ اگر میرا ساتھ نہیں دینا چاہتے، تو میں مجبور نہیں کرتا۔ لیکن ایک بات سمجھ لو، جو آج ہمارا ساتھ نہیں دے گا، اُسے ثمراتِ فتح میں سے بھی کچھ حصّہ نہیں ملے گا۔ اور جو آج ہمارا ساتھ دے گا، وہ ثمراتِ فتح میں بھی ہمارا برابر کا شریک ہوگا! ——— میں جانتا ہوں ہلکر اس لئے لڑنے سے جی چراتا ہے کہ وہ پٹھانوں کے ہاتھوں شکست کھا چکا ہے، اور سورج مل اس لئے ہچکچاتا ہے۔ اُسے ہماری فتح کا یقین نہیں ہے!"

ہلکر نے کہا: "ہاں میں نے پٹھانوں کے ہاتھوں شکست کھائی ہے، اور اسی شکست کا داغ دھونے کے لئے میں اُن سے لڑنے مرنے کے لئے تیار ہوں، اور اسی لئے میں نے آپ کی یہ کڑوی کسیلی باتیں سن لیں!"

بھاؤ نے تیوری چڑھا کر پوچھا: "ورنہ تم کیا کرتے؟"

سورج مل نے ہلکر کو پیچھے ہٹا دیا اور کہا:

"کیا کرتے۔ کر کیا سکتے ہیں، یونہی ایک بات مُنہ سے نکل گئی، آپ اس سے ذرا بھی اثر نہ لیجئے، رہا میں، سو یقین دلاتا ہوں کہ میرے تمام وسائل و ذرائع آپ کے ہاتھ میں ہیں، آپ جو چاہیں کریں، میں نے آپ کی کڑوی کسیلی باتیں اس لیئے سُن لیں کہ میں آپ کو سردار مان چکا ہوں، اور بہادر کی تعریف یہ ہے کہ سردار کے سامنے چوں بھی نہ کرے اس کے ہر حکم کی تعمیل کرے اُس کے ایک اشارہ پر اپنی گردن کٹا دے۔ اُس کی کسی بات کا بُرا نہ مانے!"

ہلکر نے جو بات بگاڑ دی تھی، سورج مل نے اپنے تدبّر سے اُسے بنا لیا، بھاؤ کا غصّہ

ٹھنڈا پڑ گیا، اُس نے نرمی اور ملاطفت کے ساتھ کہا:۔

"تو ہم کل صبح کوچ کر رہے ہیں؟"

سورج مل:۔ "کل صبح نہیں آج اور ابھی ابھی اگر آپ کوچ کا فیصلہ کر لیں، تو مجھے متامل نہ پائیں گے۔ میرے تیس ہزار جاٹ آپ کے ساتھ ہوں گے اور جاں بازی کا وہی جوہر دکھائیں گے، جس کی توقع آپ مرہٹہ سپاہیوں اور دلاوروں سے رکھتے ہیں۔"

اس گفتگو کے بعد جس مجلس مشاورت کا آغاز تلخی سے ہوا تھا، وہ خوشگوار انجام کے ساتھ برخاست ہو گئی، سب خوش تھے، نیز فیصلہ کن اقدام کے لئے بے چین اور مضطرب! دلی چلنے کی تیاریاں ہونے لگیں۔

باب (۵۰)

بُلاوا ــــــ!

اُس دن پائیں باغ میں فیروز بخت کے ساتھ گل گشت کرتے کرتے بارش سے طلعت خوب بھیگی، لرزہ کے ساتھ بخار آیا اور اُس نے رہی سہی کسر نکال دی، ذرا سی توانائی جو آئی تھی وہ بھی رخصت ہوگئی ــــ معلوم ہوتا تھا برسوں کی بیمار ہے، سوکھ کر کانٹا ہوگئی۔

فیروز بخت نے طلعت کی بیماری میں دن رات ایک کر دیئے، دن رات وہ اس کی پٹی سے لگا بیٹھا رہتا تھا، گھر میں نہ ملازموں کی کمی تھی، نہ عزیزوں کی، سب طلعت کو دل و جان سے چاہتے تھے، ہر ایک کی خواہش تھی کہ وہ اس کی تیمارداری میں حصّہ لے لیکن فیروز بخت کسی کو یہ زحمت نہیں دیتا تھا، حکیم سے حال کہنا، نسخہ اپنے سامنے بندھوانا، دوا اپنی موجودگی میں بنوانا، پھر اپنے ہاتھ سے پلانا، پرہیزی غذا اپنے اہتمام میں تیار کرانا ــــ یہ تھے اس کے فرائض ــــ! اور ان فرائض کو وہ بڑی مستعدی سے انجام دیتا تھا!

ایک روز مسرّت بھرے لہجہ میں ماہ طلعت نے کہا۔ "کمبخت یہ بیماری پیچھا ہی نہیں چھوڑتی!"

بڑے محبت بھرے لہجہ میں فیروز بولا۔ "اچھی ہوجاؤ گی ماہ بیماری صحت کی زکوٰۃ ہے"

وہ بولی۔ "میں ہی رہ گئی ہوں سارے گھر میں زکوٰۃ ادا کرنے والی اور ترکوئی جھوٹوں بھی بیمار نہیں پڑتا!"

فیروز ہنس پڑا۔ "یہ تم نے مجھ پر چوٹ کی ہے، کاش تمہاری بیماری میرے حصّہ میں آجاتی۔ تمہیں چنگا دیکھ کر بیمار پڑنے میں ذرا بھی تو تامل نہیں ہوتا مجھے، ہر روز خدا سے دعا مانگتا ہوں کہ تم اچھی ہو جاؤ، اور تمہارے حصہ کی —— !"

ماہ طلعت بیچ میں بول پڑی۔ "بس آگے کچھ نہ کہئے گا!"

فیروز نے پوچھا۔ "کیوں! یہ زبان بندی کا حکم کیوں؟"

وہ مسکرائی۔ "ہماری مرضی، ہمارا حکم!"

فیروز نے کہا۔ "تم میری زبان بند کر سکتی ہو، لیکن کیا دل کی زبان بھی بند کر دو گی، میرے روئیں روئیں سے یہ دُعا نکل رہی ہے!"

ماہ بولی۔ "خدا کے لئے ایسی باتیں نہ کیجئے، ورنہ میں اور زیادہ بیمار پڑ جاؤں گی!"

فیروز خاموش ہو گیا۔

ماہ نے کہا۔ "اپنی اس بیماری سے اتنی شرمندہ ہوں کہ کچھ نہیں کہہ سکتی!"

فیروز نے پوچھا۔ "بیماری اور شرمندگی میں کیا تعلق ہے؟ کچھ سمجھ میں نہیں آیا!"

وہ کہنے لگی۔ "بجائے اس کے کہ میں آپ کی خدمت کرتی، آپ اپنے تئیں ہلکان کئے دے رہے ہیں، نہ دن کو دن سمجھتے ہیں، نہ رات کو رات، مجھے ڈر لگتا ہے، کہیں خدانخواستہ یہ محنت آپ کو بیمار نہ ڈال دے!"

فیروز نے مسکرا کر کہا۔ "پھر تمہاری حسرت پوری ہو جائے گی!"

وہ گھبرا کر بولی۔ "خدا نہ کرے۔ آپ کے بیمار پڑنے کی میں حسرت کروں گی!"

فیروز نے کہا۔ "بیمار پڑنے کی نہیں، تیمارداری کرنے کی!"

وہ کہنے لگی۔ "چھوڑیئے بھی یہ باتیں ——— میں سوچا کرتی تھی، آپ آئیں گے، تو یوں آپ کے ہاتھ پاؤں دباؤں گی، یوں آپ کے لئے اچھے اچھے کھانے اپنے ہاتھ سے پکاؤں گی۔ آپ کے کپڑے سیوں گی، آپ سے حضرت شاہ صاحب کی کتابیں پڑھوں گی، لیکن یہ کچھ نہ ہُوا، ساری حسرتیں دل کی دل میں رہ گئیں، میں بیمار پڑ گئی، آپ تیمارداری میں لگ گئے، چلو قصّہ ختم، سوچا کیا تھا، ہُوا کیا!"

فیروز نے اُسے تسلی دیتے ہُوئے کہا۔ "بھئی ماہ، تم بڑی جذباتی ہو گئی ہو، یہ سب بیماری کے کرشمے ہیں، خدا نے چاہا جلد اچھی ہو جاؤں گی، ساری زندگی پڑی ہے خدمت کرنے کے لیئے، کوئی میں مرا تو نہیں جاتا ابھی سے!"

ماہ رُوٹھ گئی، "آپ یہ باتیں بند نہیں کریں گے؟ ——— کہہ کہتی ہوں پھر آپ سے بات نہیں کرنے کی کبھی!"

یہ الفاظ کچھ ایسے تیور سے ماہ طلعت نے کہے کہ فیروز بخت سہم گیا اور سہم کر خاموش ہو گیا۔

ماہ اس کی یہ کیفیت دیکھ کر مسکرائی۔ "ڈر گئے آپ؟"

وہ بولا۔ "ہاں بھئی بُری طرح ڈر گیا!"

وہ کہنے لگی۔ "تو پھر اچھی اچھی باتیں کیجئے!"

فیروز نے پُوچھا۔ "کہانی سنو گی، کہوں؟"

ماہ نے کہا۔ "ضرور سنوں گی، کہئے ——— لیکن کوئی بڑی دلچسپ ہو!"

ترنگ میں آ کر فیروز بولا۔ "اتنی دلچسپ کہ دُنیا و مافیہا سے بے خبر نہ ہو جاؤ تو میرا ذمّہ!"

اتنے میں صنوبر ماہ طلعت کا پرہیزی کھانا لے کر آگئی، ابلی ہوئی کھچڑی اور سابودانہ دیکھتے ہی اُس نے صنوبر سے کہا "لے جاؤ! میں نہیں کھاؤں گی!"

فیروز نے پُوچھا۔ "کیوں نہیں کھاؤ گی؟"

ماہ نے جواب دیا۔ "یہ سیٹھا پھیکا کھانا کھاتے کھاتے طبیعت اوب گئی۔ اب اس کے تصور سے اُبکائی آتی ہے!"

صنوبر بولی۔ "بیماری میں تو سب ہی کو پرہیز کرنا پڑتا ہے۔ کھاؤ تو معلوم ہو!"

فیروز نے صنوبر سے کہا۔ "کھچڑی اور ہے؟"

وہ بولی۔ "بہت ——— لیکن ان سے تو یہ اتنی بھی نہیں کھائی جائے گی!"

فیروز نے کہا۔ "تو جاؤ لے آؤ میرے لئے!"

صنوبر نے کہا۔ "آپ کا کھانا تو تیار ہے، چلئے، دسترخوان بچھ چکا ہے، اسے لو باتوں میں ایسی پھنسی کر کہنا بھول ہی گئی ——— چلئے انتظار ہو رہا ہے!"

فیروز نے کہا۔ "میں نہیں کھاؤں گا ——— اور کھچڑی کھاؤں گا، تم بحث نہ کرو لے آؤ جاکر!"

وہ چلی گئی!

ماہ نے کہا۔ "بالکل بچوں کا سا مزاج پایا ہے آپ نے کھچڑی دیکھی، اسی پر مچل گئے، دو چار روز مسلسل کھائیے تو مزہ معلوم ہو!"

بڑے استقلال کے ساتھ وہ بولا۔ "میں نے عہد کر لیا ہے جب تک تمہارا پرہیز جاری ہے۔ میں بھی وہی کھاؤں گا جو تمہیں ملے گا۔ چاہے وہ کھچڑی ہو یا سابودانہ یا آش جَو یا کچھ بھی ——— اس کے علاوہ ہر چیز مجھ پر حرام ہے!"

ماہ سہم گئی۔ "یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟"

وہ بولا۔ "تم نے سُنا نہیں؟"

ماہ۔ "لیکن اس کی ضرورت کیا ہے آخر؟"

فیروز: "یہ میں جانتا ہوں، میرا دل جانتا ہے، میں تمہارا ساتھ دوں گا!"

ماہ۔ "جو ساتھ آپ دے رہے ہیں وہ کم ہے کچھ؟ دن رات ترستی رہتی ہیں آپ!"

فیروز۔ "ہاں کم ہے ——— میری محبت کا حکم یہی ہے، تم منع نہ کرو، ورنہ مجھے بڑا صدمہ ہوگا!"

ماہ چپ ہوگئی۔

اتنے میں صنوبر گرماگرم کھچڑی لئے ہوئے آن موجود ہوئی "بیٹھیے، اٹھائیے، دیکھوں گی، کتنے لُقمے کھائے جاتے ہیں آپ سے!"

فیروز نے کوئی جواب نہ دیا، چپ چاپ کھانے لگا۔ ماہ نے صنوبر سے کہا "کچھ دیوانی ہوگئی ہے تو؟"

وہ بولی۔ "کیا ہوا؟ کوئی خطا ہوئی مجھ سے؟"

ماہ بولی۔ "خالی خولی کھچڑی لے آئی ——— نہ گھی، نہ چٹنی، نہ اچار، جاایب چیزیں لے آ!"

صنوبر۔ "ابھی لائی، ابھی!"

فیروز بخت۔ "صنوبر سنو تو!"

صنوبر۔ "جی فرمائیے!"

فیروز بخت۔ "گھی، چٹنی، اچار، مربہ، ان چیزوں کی ماہ کو بھی اجازت ہے؟"

صنوبر۔ "اے بالکل نہیں میرے سرکار، اب ذرا جان میں جان آئی ہے، ذرا بھی بدپرہیزی ہُوئی، تو پھر اللہ دے اور بندہ دے! حکیم صاحب نے بڑی سختی سے منع کیا ہے!"

فیروز بخت۔ "ٹھیک ہے تو ہم بھی یہ چیزیں نہیں کھائیں گے!"

صنوبر۔ "کیوں؟ آپ کو تو کسی نے منع نہیں کیا ہے؟ آپ کس لئے پرہیز کر رہے ہیں؟"

فیروز: "یہ فلسفہ ذرا اونچا ہے، تمہاری سمجھ میں نہیں آسکتا —— لیکن ہاں آ بھی سکتا ہے.. آصف زماں سے پوچھنا وہ سمجھا دے گا تمہیں!"

صنوبر: "اللہ قسم آپ تو ہر وقت مذاق کیا کرتے ہیں، ہاں!"

فیروز بخت۔ "تم چھیڑتی ہو تو ہم بھی دو گال ہنس بول لیتے ہیں!"

صنوبر: "سرکار کی باتیں بھلا میں چھیڑوں گی!"

ماہ خاموشی سے ان دونوں کی یہ باتیں سُن رہی تھی اور مسکرا رہی تھی۔

○

آج ماہِ طلعت کا غسلِ صحت تھا!

بڑی سادگی، لیکن نہایت اہتمام کے ساتھ یہ تقریب انجام پائی۔ اس تقریب کے بعد فیروز بیٹھا ماہ سے باتیں کر رہا تھا کہ آصف زماں نے کہلا بھیجا۔ "آج حضرت شاہ صاحب نے یاد فرمایا ہے!"

فیروز چونک پڑا، اُس نے ماہ سے کہا۔ "کتنے دن گذر گئے۔ میں حضرتِ شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر نہیں ہو سکا۔ آخر انہوں نے خود یاد فرمایا، اب تو جاتے ہُوئے شرم آتی ہے!"

ماہ نے ہمت بندھائی۔ "اِس میں شرم کی کیا بات ہے؛ میں کہتی ہوں وہ کچھ نہیں

کہیں گے!"

فیروز دوڑتا دوڑتا حضرت شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اندیشے کے بالکل برخلاف اور معمول کے مطابق، حضرت شاہ صاحب بڑے تپاک اور اخلاق سے پیش آئے فرمایا۔

"تم سے ملنے کو جی چاہ رہا تھا!"

فیروز نے عرض کیا۔ "یا حضرت میں خود حاضر ہونے کا ارادہ کر رہا تھا، لیکن گھر میں۔"

حضرت شاہ صاحب نے فرمایا۔ "ہاں میں جانتا ہوں گھر میں طبیعت خراب تھی اب کیا حال ہے؟"

وہ بولا۔ "اب خدا کا فضل ہے ——— آج غسل صحت سے بھی فراغت ہوگئی!"

حضرت شاہ صاحب: "الحمدللہ ——— تو اس کے معنی یہ ہیں کہ دلّی سے تمہارا کوچ کرنے کا وقت آگیا!"

یہ الفاظ سن کر فیروز بخت ہکّا بکّا رہ گیا۔ کیونکہ ابھی فی الحال نہ اس کا دلّی سے باہر جانے کا ارادہ تھا اور نہ بظاہر کوئی ضرورت ہی تھی۔ اس نے کہا۔ "جی میرا ارادہ تو"

حضرت شاہ صاحب: "جس لئے تم دلّی میں ٹھہرے تھے وہ مقصد پورا ہوگیا، خدا نے تمہاری پریشانی رفع کر دی۔ تم مردِ مجاہد ہو، میدانِ جہاد تمہیں بلا رہا ہے، تمہیں ابدالی کے لشکر میں جانا چاہئے، وہاں تمہاری ضرورت ہوگی!"

سرِ اطاعت خم کرتے ہوئے فیروز بخت نے جواب دیا۔ "بہت بہتر، میں جلد از جلد روانہ ہونے کی کوشش کرتا ہوں!"

حضرت شاہ صاحب: "جزاک اللہ ——— یہ دنیا اور اس کی آسائشیں یہ کامیابیاں

اور ان کے نتائج، یہ دشواریاں اور ان کے ثمرات، صرف اسی وقت لطف دے رہی ہیں۔ جب چوکنے رہو، سستی اور غفلت کسی وقت تم پر غالب نہ آنے پائے، تم اپنی زندگی خدا کے ہاتھ بیچ چکے ہو، یہ زندگی اب تمہاری نہیں رہی، اگر خدا کی طرف سے کوئی لمحہ تمہیں آسائشِ حیات کا میسر آجاتا ہے، تو اُسے انعامِ الٰہی سمجھو اسے اپنی جاگیر نہ سمجھ لو ——— تمہیں میری یہ باتیں ناگوار تو نہیں گذر رہی ہیں؟"

فیروز بخت۔ "یا حضرت بالکل نہیں، یہ معرفت کی باتیں ہیں، ان سے حقیقت کا جلوہ سامنے آرہا ہے، اور غفلت کے پردے اُٹھ رہے ہیں!"

حضرت شاہ صاحب۔ "میں دیکھ رہا ہوں، جو تم نہیں دیکھ سکتے!"

فیروز بخت۔ "بجا ارشاد ہوا!"

حضرت شاہ صاحب۔ "میری نگاہیں اس طوفان پر ہیں، جو آنے والا ہے، آرہا ہے سر پر پہنچ چکا ہے!"

فیروز بخت۔ "طوفان، یا حضرت میں سمجھا نہیں؟"

حضرت شاہ صاحب۔ "ہاں تم نہیں سمجھ سکے، اسی لئے مطمئن تھے، سمجھ لو گے، تو اطمینان کافور ہو جائے گا، تم پر بھی اضطراب کی ایسی کیفیت طاری ہو جائے جو ایک آن چین نہ لینے دے گی! ——— ہاں تو تم کب جاؤ گے؟"

فیروز بخت۔ "انشاء اللہ کل ہی روانہ ہو جاؤں گا، جانا ہی کتنی دُور ہے!"

حضرت شاہ صاحب۔ "ہاں، لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ دُوری قرب سے اور قربت دُوری سے بدل جاتی ہے، اسی لئے میں چاہتا ہوں کہ تم جلدی کرو، آثار

مجھے اچھے نہیں نظر آرہے ہیں، میری بصیرت یہ کہہ رہی ہے کہ دِلّی سے نکل جانے کے بعد تم زیادہ مفید ہوسکو گے بہ نسبت دِلّی میں رہنے کے، ممکن ہے میرا یہ خیال غلط ہو، میں بھی بہرحال آدمی ہوں، فکر خیال کی لغزش میں مبتلا ہوسکتا ہوں۔ لیکن میرا دل یہی کہہ رہا ہے، اس لئے میں جلد از جلد تمہیں ابدالی کے پاس پہنچا ہوا دیکھنا چاہتا ہوں!"

فیروز بخت۔ "یا حضرت اب میں ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کروں گا۔ جاتے ہی تیاری شروع کرتا ہوں اور صبح ہوتے ہی انشاء اللہ روانہ ہوجاؤں گا!"

اس گفت گو کے بعد فیروز بخت سیدھا گھر واپس پہنچا، ماہ طلعت نے محسوس کر لیا۔ اس وقت کیفیت کچھ بدلی ہوئی تھی، جتنا خوش و خرم واپس گیا تھا، اتنا ہشاش بشاش واپس نہیں آیا، ضرور کوئی خاص بات ہے!"

فیروز بخت واپس آکر چپ چاپ بیٹھ گیا، اتنے میں ننھا غضنفر کھیلتا آیا اور باپ کے پاؤں سے لپٹ گیا، فیروز نے اُسے گود میں بٹھالیا۔ ماہ نے پُوچھا۔ "اس وقت چہرہ کچھ اترا اترا دیکھ رہی ہوں — کوئی خاص بات تو نہیں؟"

فیروز نے پہلو بدل کر کہا۔ "نہیں کوئی خاص بات تو نہیں، حضرت شاہ صاحب نے یاد فرمایا تھا، وہیں سے آرہا ہوں!"

ماہ طلعت: "وہ تو میں بھی جانتی ہوں مگر دشمنوں کے چہرے پر یہ پریشانی کیسی نظر آرہی ہے؟"

فیروز بخت۔ "کوئی خاص پریشانی نہیں، حضرت نے فرمایا ہے، خُدا نے تمہاری پریشانی رفع کردی — یعنی تم اچھی ہوگئیں — اب ابدالی کے لشکر میں واپس جاؤ، وہاں تمہاری ضرورت ہے۔"

یہ سُن کر ماہ طلعت کے چہرے پر ذرا کے ذرا پریشانی نمایاں ہوگئی۔ لیکن بہت جلد

وہ سنبھل گئی، اُس نے بڑے ثبات اور وقار کے ساتھ کہا: "تو کیا ہوا؟ سدھاریئے خدا کی امان میں، جب حضرت شاہ صاحب یہ فرماتے ہیں، تو ضرور اس میں کچھ مصلحت ہو گی، اور واقعی میں اب خُدا کے فضل سے اچھی ہوں اور میں تو سمجھتی ہوں کہ خدا نے اتنی جلدی اور اتنی مکمل صحت حضرت شاہ صاحب کی دعاؤں کی برکت ہی سے عطا فرمائی ہے!"

فیروز بخت۔ "ہاں یہ تو ٹھیک ہے، میرا بھی یہی عقیدہ ہے۔ لیکن حضرت نے کچھ ایسی باتیں فرمائیں، جو سمجھ میں نہیں آئیں، ان کے تصوّر سے طبیعت پریشان ہونے لگتی ہے!"

ماہ طلعت۔ "کیسی؟ کس قسم کی باتیں؟"

فیروز بخت۔ "حضرت نے فرمایا ایک طوفان آ رہا ہے ——— اور یہ اس طرح الفاظ نے ٹھہر ٹھہر کر فرمایا کہ میں سمجھا واقعی کوئی طوفان ہے جو آ رہا ہے، اور حضرت شاہ صاحب کی نگاہ اسے دیکھ رہی ہے!"

ماہ طلعت۔ "ہو سکتا ہے حضرت شاہ صاحب کا ارشاد مرہٹوں کی طرف ہو، وہ شاہ ابدالی کی خبر سُن کر نچلے تو نہیں بیٹھیں گے، ضرور کوئی طوفان اُٹھائیں گے، اور واقعی ایسے وقت میں آپ کا یہاں کے بجائے وہاں موجود رہنا زیادہ مناسب اور قرینِ مصلحت ہے! ——— میں اب اچھی ہوں، میری فکر نہ کیجئے۔ اور خدا کا نام لے کر سدھاریئے!"

فیروز بخت۔ "میں حضرت شاہ صاحب سے کہہ آیا ہوں کہ انشاءاللہ صبح ہوتے ہی ابدالی کے لشکر کی طرف روانہ ہو جاؤں گا۔"

اتنے میں ایک خادمہ آئی، اُس نے کہا: "سرکار آپ سے ملنے کوئی صاحب آئے ہیں!"

"کون صاحب ہیں؟ کیوں آئے ہیں؟ کہاں سے آئے ہیں؟ مقصد کیا ہے؟ یہ سب بھی تو پوچھ لیا ہوتا!"

وہ بولی۔ "میں تو سب کچھ پوچھ لیتی، لیکن یہ مُوا حبشونت بھی کچھ پوچھنے دے، وہ بڑے ٹھکانے کہتا گیا ہے، جا بُلا لا سرکار کو جلدی سے!"

"میں نے پوچھا: کیا کام ہے؟"

کہنے لگا۔ "ابدالی کے لشکر سے ایک ضروری پیام آیا ہے!"

میں نے پوچھا: "کس کا پیام ہے؟"

کہنے لگا: "نجیب الدولہ بہادر کا!"

میں نے کہا: "لاؤ کوئی رقعہ وقعہ ہو تو دے دو، میں اندر دے آؤں گی جا کر — لے یہ سنتے ہی بگڑ گیا۔ میں اس کی نوکر ہی تو ہوں، کہنے لگا: "جاؤ بلا لاؤ، زیادہ باتیں نہ کرو!"

"میں کیوں دبتی، میں نے بھی کہہ دیا: "میں کوئی ایسی ویسی نہیں ہوں، مجھے تم نے سمجھا کیا ہے —؟"

یہ سننا تھا کہ کھڑا ہو گیا اور بڑے غصہ میں چیخ کر کہا۔ "جاؤ فوراً!"

ماہ نے پوچھا۔ "پھر تم نے کیا کیا؟"

وہ بولی: "چلی آئی!"

ماہ نے چھیڑا۔ "ڈر گئیں!"

فیروز بخت نے بھی چوٹ کی۔ "اور ذرا غضب تو دیکھو، سب کچھ معلوم کر آئیں مگر انہیں کچھ معلوم ہی نہیں کیوں بُلایا ہے!"

ماہ ہنسنے لگی۔ "بڑی بے وقوف ہے یہ! — جا کہہ دے ابھی آتے ہیں —

ہر کسی سے لڑتی رہتی ہے۔ اور پھر بھاگ کھڑی ہوتی ہے!

خادمہ بڑبڑاتی ہوئی چلی گئی۔ ماہ نے کہا "ضرور کوئی خاص بات ہے!"

فیروز نے جواب دیا۔ "مجھے بھی ایسا ہی معلوم ہوتا ہے! ـــــ میں ابھی آیا!"

یہ کہہ کر وہ محلسرا کے مردانہ حصّہ میں پہنچا، یہاں نجیب الدّولہ کا ایک خاص آدمی گل خاں بیٹھا جسونت سے باتیں کر رہا تھا۔ فیروز کو دیکھتے ہی دونوں سروقد تعظیم کھڑے ہو گئے فیروز بڑے تپاک کے ساتھ گل خاں سے ملا، اُس نے کہا۔ "کیسے آنا ہوا خانصاحب"

خاں صاحب نے ایک خریطہ نکالا جس میں نجیب الدولہ کا ایک مکتوب لفافہ تھا۔

"برادرِ عزیز

اگر حالات سازگار ہوں، اور گھر میں سب خیریت ہو تو آپ فوراً شاہ ابدالی کے لشکر میں پہنچئے، بعض مہمات امور آپ کی عدم موجودگی کی وجہ سے تشنۂ توجہ ہیں... آپ گل خاں کو فوراً واپس کیجئے اور مطلع کیجئے، آپ کب آ رہے ہیں؟

فیروز بخت نے اس خط کا فوراً ایک مختصر سا جواب لکھ کر گل خاں کے حوالہ کیا، اور اُسے زبانی بھی کہہ دیا کہ "میں کل پہنچ رہا ہوں!"

گل خاں جواب لے کر روانہ ہو گیا۔

جسونت نے پوچھا۔ "میرے آقا کوئی خاص بات تو نہیں تھی؟"

فیروز نے جواب دیا۔ "تھی ـــ نجیب الدولہ نے جلد از جلد مجھے واپس بلایا ہے کل صبح میں یہاں سے روانہ ہو جاؤں گا!"

بڑی بے بسی کے ساتھ جسونت نے پوچھا۔ "اور میں؟"

فیروز نے اس کی کیفیت محسوس کئے بغیر کہا۔ "تم؟ ـــ تم ابھی یہیں رہو!"

وہ بولا۔ "مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلئے۔ میں وہیں رہوں گا، جہاں آپ ہوں!"

فیروز ہنسنے لگا۔ "اچھا تو سامان سفر تیار کرو۔ صبح صبح ہم روانہ ہوجائیں گے۔ اس مرتبہ میں نے سوچا تھا آصف زماں کو ساتھ لے جاؤں گا اور تمہیں یہیں چھوڑ جاؤں گا! لیکن تم نہیں مانتے تو تم ہی چلو، آصف زماں کو یہاں چھوڑ جاؤں گا!"

جیونت کا چہرہ پھول کی طرح کھل اٹھا۔ "ہاں یہ انتظام مناسب ہے!"

پھر فیروز اندر آیا، ماہ سراپا انتظار بیٹھی تھی، دیکھتے ہی پوچھا۔ "پہلے یہ بتایئے، خیریت تو ہے سب؟"

فیروز نے جواب دینے کے بجائے نجیب الدولہ کا خط سامنے ڈال دیا خط پڑھ کے ماہ نے کہا۔ "آپ تو ویسے بھی صبح جا رہے تھے!"

"ہاں اب اور فرض ہو گیا!"

"نجیب الدولہ کا بلانا کچھ معنے ضرور رکھتا ہے!"

"کیوں نہیں رکھتا، جس وقت مجھے اطلاع ملی کہ نجیب الدولہ کا آدمی آیا ہوا ہے اسی وقت میں نے سمجھ لیا تھا کہ طلبی ہوئی ہے!"

"خدا کے حفظ و امان میں جایئے، کامیاب و کامران واپس آیئے۔ اس غیر یقینی اور ناہموار زندگی سے طبیعت تنگ آ چکی ہے!"

"ہاں ماہ ـــ میں بھی خدا سے دن رات یہی دعا کرتا ہوں!"

باقی وقت یہ دونوں ایک دوسرے کی دلجوئی اور حوصلہ افزائی کی باتیں کرتے رہے انھی باتوں میں دن کا باقی حصہ بیتا اور ساری رات گذر گئی۔ صبح کی نماز کے بعد فیروز بخت

گھر سے باہر نکلنے کی تیاریاں کرنے لگا، سارا سامان باہر جا چکا تھا، فیروز نے کہا۔ "ماہ آج بھی تم مجھے اس طرح رخصت کرو جس طرح تم نے پہلے پہل رخصت کیا تھا!"

"مجھے تو پہلے کی بات نہیں یاد —— بتائیے کس طرح رخصت کیا تھا؟"

وہ بولا۔ "مسکرا کر" یہ تبسّم زادِ راہ بن کر میرے ساتھ جائے گا، مشکلوں میں میری ہمّت بندھائے گا، مصیبتوں کے برداشت کرنے کا ولولہ پیدا کرے گا —— سوچو نہیں ماہ بس مسکراؤ!"

ماہ مسکرا دی!

اور فیروز بخت تبسّم کا جواب تبسّم سے دیتا ہوا باہر نکلا، دونوں کے دل اس وقت زور زور سے دھڑک رہے تھے، لیکن دونوں کو اپنے دلوں پر قابو تھا، دل کی کیفیت چہرے تک کسی نے نہ آنے دی۔

○

فیروز کے جانے کے بعد ماہ اپنے بستر پر نڈھال اور افسردہ ہو کر لیٹ گئی۔

اور فیروز نے گھوڑے کو ایڑ لگاتے ہوئے جسونت سے کہا۔ "آج میرے اور تمہارے گھوڑے کے درمیان ریس ہوگی۔ دیکھنا ہے کون آگے نکلتا ہے؟"

جسونت نے جواب دیا۔ "نہ میری یہ ہمّت ہے نہ میرے گھوڑے کی کہ وہ اپنے آقا سے آگے نکلنے کی کوشش کرے!"

دونوں کے گھوڑے ہوا سے باتیں کرتے، ابدالی کے لشکر کی طرف بڑھ رہے تھے۔

باب (۵۱)

بھاؤ کا دِلّی میں داخلہ

برسات کا موسم شروع ہو چکا تھا!

نالوں نے ندی کی صورت اختیار کر لی تھی، اور ندیاں طغیانی کے باعث سمندر سے چشمک زنی کر رہی تھیں، عام آمد و رفت میں بھی دشواریاں محسوس ہو رہی تھیں، نہ کہ فوج کی نقل و حرکت — یہ تو اور بھی دشوار تر اور ناممکن ہو گئی تھی۔

ابدالی صرف ایک بہت بڑا سپاہی، ایک بہت بڑا سپہ سالار، ایک بہت بڑا شجاع اور دلاور ہی نہیں تھا، وہ اس سے بھی کچھ زیادہ تھا، وہ مدبّر بھی تھا، موقعہ شناس بھی تھا، وہ جلدی میں کوئی فیصلہ نہ کرتا تھا، وہ پھونک پھونک کر قدم اُٹھاتا تھا، اِسی لئے دوسروں کے مقابلے میں اس کے پاس استقلال و استقامت کی پُونجی زیادہ تھی، اِسی لئے اپنی زندگی میں وہ کبھی ناکام نہیں ہوا، موسلا دھار بارش اور جمنا کی طغیانی کا اندازہ کر کے اُس نے دریائے جمنا کو پار کیا اور انوپ شہر میں آکر مقیم ہو گیا[1] اس میں مصلحت یہ تھی کہ مرہٹوں کے حملوں سے محفوظ ہو کر اُسے مزید تیاری کا موقعہ مل گیا۔

---

[1] پانی پت کا خونیں میدان جنگ

مرہٹہ لشکر ایک سیلِ باخیز کی صورت میں جب بھرت پور سے آگے بڑھا تو بھاؤ کی رائے یہ تھی کہ بلا تاخیر مزید ابدالی کے لشکر پر چھاپہ مارا جائے، اور اُسے شکستِ فاش دینے کے بعد دِلّی پر قبضہ کیا جائے، تاکہ بعد میں کوئی اندیشہ نہ رہے۔ لیکن جب وہ دریائے جمنا کے سامنے پہنچا تو اس کی سر بفلک موجیں سدِّ سکندری بن کر حائل ہو گئیں —— خبردار قدم آگے نہ بڑھانا!

بھاؤ کی ہمت نہ پڑی کہ وہ تیز و طرار جمنا کے سامنے ٹھہرتا، اُس نے اس مقدس دریا کو ادب و عقیدت کے ساتھ سلام کیا اور پیچھے ہٹ آیا۔

اب کیا کیا جائے؟

اُس نے اپنے مدبروں اور مشیروں سے صلاح لی، سب نے رائے دی کہ "قدرت کا منشا یہ معلوم ہوتا ہے کہ پہلے آپ دِلّی پر قبضہ کریں پھر ابدالی کی سرکوبی کریں!"

بھاؤ کی سمجھ میں یہ بات آگئی اُس نے کہا "ٹھیک ہے پہلے ہم دِلّی کے لال قلعہ پر اپنا جھنڈا لہرائیں گے، پھر ابدالی کا سر کچلیں گے!"

اشارہ کی دیر تھی، مرہٹہ فوجیں ہندوستان کی راجدھانی دِلّی میں داخل ہو گئیں، قتانندھیا کی سرکوبی کے بعد ابدالی نے دِلّی میں زیادہ ٹھہرنا مصلحت کے خلاف سمجھا تھا، خود تو اپنی فوج لے کر دِلّی سے ہٹ گیا اور عارضی انتظام یہ کیا کہ "اپنے ایک سردار یعقوب علی خاں کو قلیل جمعیت کے ساتھ وہاں چھوڑ گیا۔"[1]

یعقوب نے بھاؤ کے لشکرِ کثیر کی ذرا بھی پرواہ نہ کی، وہ اپنے آقا کا جاں نثار اور فداکار خادم تھا، مقابلہ پر ڈٹ گیا، لیکن چند ہزار کی جمعیت کئی لاکھ کے لشکر پر کیونکر غالب

---

[1] پانی پت کا خونیں میدان جنگ

آسکتی تھی، جبکہ اس لشکر کے ساتھ ابراہیم گاردی کا توپ خانہ بھی تھا۔

بھاؤ نے گاردی سے کہا: "میں اپنے لشکر کو تکلیف نہیں دینا چاہتا، دیکھتے کیا ہو، بھون دو ان مُٹھی بھر دشمنوں کو!"

گاردی نے سر جُھکا کر کہا: "ابھی لیجئے!"

اور پھر لال قلعہ پر اس کے خوفناک توپ خانہ نے ہولناک گولہ باری شروع کر دی!

یہ رنگ دیکھ کر یعقوب خاں افسردہ اور مضمحل ہو گیا۔ اُس نے اپنے ساتھیوں سے کہا: "اب ہم کیا کر سکتے ہیں! ——— اگر فوج سے مقابلہ ہوتا تو آخر وقت تک ڈٹ کر مقابلہ کرتے، ہم مرتے، لیکن بہتوں کو مار کر! لیکن اب مقابلے اور دست و بازو کی قوت کا سوال نہیں ہے، اُدھر سے آگ برس رہی ہے اور ہمارے پاس کچھ نہیں کہ ہم جواب دے سکیں۔ ہم بہادر کی طرح مرنا چاہتے ہیں: کتے اور بلّی کی طرح نہیں!"

ساتھیوں نے رائے دی: "اس صورت میں بہتر یہ ہے کہ یہاں سے نکل چلئے!"

یعقوب خاں نے اس رائے پر عمل کیا، اور اپنے تمام لوگوں کو بچا کر نکال لے گیا۔

سیدھا احمد شاہ ابدالی کے لشکر میں پہنچا اور اسے صورتِ حال کی اطلاع دی۔

احمد شاہ نے کہا: "تم چلے آئے، اچھا کیا، کوئی فکر نہ کرو، یہ نہ سمجھو کہ دشمن دلّی پر قابض ہو گیا ہے، یہ سمجھو کہ وہ جال میں پھنس گیا ہے ——— اب وہ بچ کر نہیں جا سکتا!"

○

اور یعقوب نے جیسے ہی مقابلہ نہ کیا، مرہٹہ فوجیں آن کی آن میں لال قلعہ پر قابض ہو گئیں! اس طرح قابض ہو گئیں کہ گاردی کے توپ خانہ کے چند گولے تو ضرور ضائع ہوئے لیکن کسی مرہٹہ سپاہی کی نکسیر تک نہیں پھوٹی، کوئی تو پچی تک ضائع نہیں ہوا۔

بھاؤ نے گاردی کی خوب پیٹھ ٹھونکی۔ اسے شاباشی دی، اور اُس کے جیب و دامن کو سیم و زر سے بھر دیا۔

این کار از تو آید و مرداں چنیں کنند!

گاردی نے فخر سے سربلند کر کے کہا: "میں نہ کہتا تھا، ہماری فوجی قوت کی جان ہمارا توپ خانہ ہے؟"

بھاؤ نے اُس کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے جواب دیا: "ہاں ——— اور ہم مانتے ہیں تمہاری رائے بالکل صحیح تھی، آج تُم نے ثابت کر دیا، توپ خانہ سے ہم کیسے کیسے کام لے سکتے ہیں!"

گاردی مسکرا دیا: "یہ تو اُس دن بتاؤں گا، جس دن ابدالی کی فوجوں پر بیرے آگ کے گولے برسیں گے!"

بھاؤ نے شفقت کے ساتھ اُس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔

"ہمیں امید ہے، ابدالی بھی اسی طرح نوک دم بھاگے گا، جس طرح یعقوب خاں کو راہِ فرار اختیار کرنا پڑی، بلکہ ابدالی یعقوب خاں سے زیادہ تیز بھاگے گا۔ کیونکہ وہ دُبلا پتلا ہے اور یعقوب خاں موٹا تازہ!"

اس پھڑکتے ہوئے اور برجستہ فقرہ پر تمام حاضرین ادب و احترام کو بالائے طاق رکھ کر زور زور سے ہنسنے لگے۔

خود بھاؤ کی یہ حالت تھی کہ وہ بھی اپنی ہنسی ضبط نہ کر سکا۔ اس کے قہقہے کا شور سب سے بالا تھا! ——— کلام الملوک، ملک الکلام

○

جن مرہٹہ فوجوں نے متھرا کو معاف نہیں کیا اور وہاں لوٹ مار کا بازار گرم کر دیا۔ ان سے بھلا اس کی کیا توقع ہو سکتی تھی کہ وہ دِلّی کو معاف کر دیں گی!

قبضہ کرتے ہی لُوٹ مار کا ایسا لامتناہی سلسلہ شروع ہوا کہ ہر طرف سے فریاد والغیاث کی صدائیں آنے لگیں۔

سُورج مل، بھاؤ کے مقابلے میں زیادہ مصلحت اندیش اور دُور بین تھا۔ اس سے یہ منظر نہ دیکھا گیا، وہ سیدھا بھاؤ کے پاس پہنچا، وہ ندیموں کے جھرمٹ میں اپنے خاص خیمہ کے اندر اس وقت مجلس آرائی میں مصروف تھا۔ نا وقت سُورج مل کو آتا دیکھ کر کہا۔ "خیر تو ہے؛ اس وقت کیسے آنا ہُوا؟"

سُورج مل جلا ہُوا تو تھا ہی، اُس نے ذرا ترش لہجہ میں کہا۔ "اگر میری حاضری ناگوار ہوئی ہو تو واپس چلا جاؤں؟"

بھاؤ نے اُسے ہاتھ سے پکڑ کر بٹھا لیا۔ "تم تو خفا ہو گئے!"

سورج مل نے بیٹھتے ہوئے کہا۔ "نہیں؛ بالکل خفا نہیں ہوں ——— بھلا آپ سے خفا ہونے کی ہمت کس میں ہے؛ کم از کم سُورج مل میں تو نہیں!"

بھاؤ پھر ہنسنے لگا۔ "تم اب تک خفا ہو، حالانکہ میں بہت خُوش ہوں، اتنا خوش کہ بیان نہیں کر سکتا!"

سُورج مل۔ "آپ کی خوشی ہماری خُوشی ہے، ہمیں بھی اپنی خُوشی کا راز بتایئے کہ آپ کا ساتھ دیں۔"

بھاؤ۔ "اگرچہ بہت کافی روپیہ اپنے ساتھ لایا ہوں، پھر بھی مجھے روپے کی ضرورت تھی۔"

سورج مل: "ضرور رہو گی، روپے کی ضرورت کسے نہیں ہوتی؛ پھر آپ نے کیا انتظام کیا!"

بھاؤ۔ "نے لیا، اور کیا کیا؟"

سورج مل۔ "کہاں سے لے لیا؟ کیا پُونا سے منگوایا ہے؟"

بھاؤ۔ "تم بھی کیسی طفلانہ باتیں کہتے ہو۔ پونہ کو جتنا روپیہ دینا تھا، اُس نے دے دیا، اب وہ ایک پائی نہیں دے گا۔ اب جتنے روپے درکار ہوں گے ——"!

سورج مل۔ "دِلّی سے وصول کیئے جائیں گے؟"

بھاؤ۔ "ہاں اور کیا، اور کہیں سے؟"

سورج مل۔ "تو یہ روپے آپ نے دِلّی ہی سے لیئے ہیں؟"

بھاؤ۔ "—— ۱۰ لاکھ کی پہلی قسط —— جانتے ہو یہ رقم کہاں سے ملی؟"

سورج مل۔ "نہیں جانتا، آپ بتائیں گے تو جان لوں گا!"

بھاؤ۔ "لال قلعہ سے صرف لال قلعہ سے!"

سورج مل۔ "یعنی بادشاہ سلامت سے؟"

بھاؤ۔ "تمہارے بادشاہ سلامت کے پاس اتنی دولت کہاں؟"

سورج مل۔ "تو پھر کیا لال قلعہ کی زمین نے سونا اگلا ہے؟"

بھاؤ۔ (ہنس کر) "نہیں، نہیں، زمین نے نہیں، یہ چاندی لال قلعہ کی چھت نے برسائی ہے!"

سورج مل۔ "میں اب بھی نہیں سمجھا۔"

بھاؤ۔ "تم نے لال قلعہ کی نقرئی چھت نہیں دیکھی؟"

سورج مل۔ "بارہا دیکھی ہے!"

بھاؤ۔ "تو وہی چھت ہے جو روپیہ بن کر میرے سامنے آگئی! —— دیکھا تم نے دبدبہ؟"

سورج مل: "اچھا یہ بات ہے؟"

بھاؤ۔ "ہاں ——— میں نے تختِ شاہی اور چتر شاہی کو سُنار کے حوالہ کر دیا ہے کہ ان دونوں چیزوں میں جس قدر سونا چاندی ہے، اس کے روپے اور اشرفیاں ڈھال دے۔"

سورج مل۔ "بہت اچھا کیا آپ نے۔"

بھاؤ۔ "یہ طلائی شمعدان دیکھ رہے ہو؟"

سورج مل۔ "جی ہاں دیکھ رہا ہوں۔"

بھاؤ۔ "جانتے ہو یہ کہاں سے آئے ہیں؟"

سورج مل۔ "لال قلعے سے؟"

بھاؤ۔ "نہیں بھائی ہر چیز لال قلعہ سے کہاں تک آئے گی۔"

سورج مل۔ "پھر؟ آپ ہی ارشاد فرمائیے۔"

بھاؤ۔ قدم شریف، درگاہ محبوب الٰہی اور قطب صاحب کے مزار پر یہ خوبصورت طلائی شمعدان رکھے تھے۔ میں اُٹھا لایا۔ اب یہ ہمارے قصر شاہی کی زینت بنیں گے بھلا مقدس مقامات کو سونے چاندی کی کیا ضرورت ہے[1]؟

سورج مل۔ "کم سے کم آپ نے یہ نہ کیا ہوتا!"

بھاؤ۔ "کیوں؟ کس لئے؟ کیا اس لئے کہ اس حرکت سے مسلمان خفا ہو جائیں گے؟"

---

[1] سید جالب دہلوی نے اپنی بہترین اور مستند ترین اور نادر تاریخ "پانی پت کا خونیں میدان" میں لکھا ہے "بھاؤ نے دیوانِ خاص کی نقرئی چھت اکھڑوا کر، ۱۷ لاکھ روپے ڈھلوائے، تخت و چتر کو بھی توڑ ڈالا۔ نیز قدم شریف، درگاہ محبوب الٰہی، اور قطب صاحب وغیرہ سے طلائی شمعدان لے لئے!"

تو اب وہ کب خوش ہیں؟"

سورج مل :"دوسروں کے مقدس مقامات کا احترام تو بہر حال کرنا ہی چاہیئے، اس میں مسلمانوں کی خوشی یا ناخوشی کا کوئی سوال نہیں ہے!"

بھاؤ۔ (ہنس کر) "اچھی بات ہے، آئندہ سے خیال رکھیں گے!"

سورج مل۔"میں تو کسی اور ہی مقصد سے آیا تھا، لیکن اب کچھ کہنا بیکار ہے!"

بھاؤ۔"نہیں، کہو کہو، کیا بات ہے، تم کیا کہنے آئے تھے؟ میں سنوں گا، غور سے سنونگا!"

سورج مل:"میں یہ کہنے آیا تھا کہ دلّی کی رعایا، جس میں ہندو مسلمان سب شامل ہیں، چیخ رہی ہے!"

بھاؤ۔"لیکن میں تو ہر روز شہر کا گشت کرتا ہوں، میرے کانوں تک تو اس کی چیخ نہیں پہنچی!"

سورج مل:"ممکن ہے آپ کے کانوں تک نہ پہنچی ہو، لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ آسمان سے پرے پہنچ چکی ہے!"

یہ الفاظ سن کر بھاؤ بگڑ گیا۔

"گویا میں ظالم ہوں، لٹیرا ہوں، لوگ میرے خلاف بھگوان سے شکائتیں کر رہے ہیں، اور وہ سن رہا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ میرا تختہ اُلٹ جائے گا۔ میں تباہ ہو جاؤں گا، برباد ہو جاؤں گا —— کیوں تم یہی کہنا چاہتے تھے نا؟ لیکن تمہارا یہ خیال غلط ہے، یہ دُنیا قائم اسی بنیاد پر ہے، یہاں زوردار کمزور کو ستاتا ہے، اور ستاتا رہے گا، جب تک مجھ میں طاقت ہے میرے سامنے کوئی نہیں ٹھہر سکتا، نہ میں بھگوان سے ڈر سکتا ہوں، نہ وہ مجھے ڈرا سکتا ہے، بھگوان بھی انہی لوگوں کو ڈراتا ہے، جو بزدل ہوتے ہیں، کمزور ہوتے

ہیں، جن میں دم نہیں ہوتا، حوصلہ نہیں ہوتا —— سورج مل آج آخری دفعہ میں تمہیں منع کرتا ہوں، اب اِس طرح کی باتیں میرے سامنے کبھی نہ کرنا۔ میں تمہیں زبردستی اپنے ساتھ نہیں لایا، جب تم چاہو واپس جا سکتے ہو۔ تمہارے تیس ہزار جاٹ نہ میرا کچھ بنا سکتے ہیں، نہ بگاڑ سکتے ہیں۔ ان کے بھروسہ پر میدان میں نہیں کُودا ہوں۔ مجھے بھروسہ ہے اپنی قوت پر صرف اپنی قوت پر، میں نصیحت کرنے والوں کا منہ توڑ سکتا ہوں، میں مقابلہ کرنے والوں کا سر توڑ سکتا ہوں۔ میں بددعا دینے والوں کی زبان کھینچ سکتا ہوں، میں جانتا ہوں مجھے کیا کرنا چاہئے۔ میں وہی کرتا ہوں جو مناسب ہوتا ہے، تم شاید یہ چاہتے ہو کہ میں اپنی فوج کو مہاتما اور دھرماتما بنا دوں، یہ فوج کے سپاہی ہیں، اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر میدان میں اُترے ہیں، یہ سادھو نہیں بن سکتے، ان کے سینہ میں دل ہے، ان کے دل میں امنگیں ہیں، ان کی امنگوں میں قوت ہے، انھیں کوئی نہیں روک سکتا، یہ جو کچھ کرتے ہیں اچھا کرتے ہیں، جو ان کی شکایت کرتا ہے، وہ میرا دُشمن ہے۔ میں ان کے خلاف ایک حرف بھی نہیں سُننا چاہتا۔ کیوں سورج مل تم سمجھ گئے۔ میرا مطلب کیا ہے؟ میں کیا کہہ رہا ہوں؟"

سورج مل:۔ "جی سمجھ گیا، بہت اچھی طرح سمجھ گیا، اب ایسی غلطی آئندہ کبھی سرزد نہ ہو گی:"

بھاؤ:۔ "اب تم جا سکتے ہو:"

سورج مل:۔ "صرف آپ کے سامنے سے یا دِلّی سے؟"

بھاؤ:۔ "اس کا تمہیں اختیار ہے!"

سورج مل غصہ کے عالم میں چلا گیا ء

○

اس کے جانے کے بعد بھاؤ کے ایک ساتھی نے کہا۔ "بہت خفا ہو کر گیا ہے!"
بھاؤ پھر بھڑک اُٹھا۔ "خاموش ——— ! میں اس کا ذکر سننا نہیں چاہتا دوسری باتیں کرو!"

ساتھی خاموش ہو گیا، خود بھی بھاؤ خاموش ہو گیا، تھوڑی دیر کے بعد یہ خاموش مجلس برخاست ہو گئی اور بھاؤ خاموشی لیکن برہمی کے عالم میں خیمہ کے اندر ٹہلنے لگا۔

باب (۵۲)

ننّھا مُجاہد

ماہ طلعت خاموش اپنے چھپر کھٹ پر بیٹھی تھی! ـــ کچھ خاموش سی اور افسردہ سی!

اِتنے میں غضنفر کھیلتا ہُوا کمرہ میں آ گیا۔ ماہ طلعت نے محبت بھری نظروں سے اُسے دیکھا، جھپک کر اُٹھی، اور کلیجہ سے لگا لیا، وہ بھی خُوش ہو گیا، غضنفر کی مُٹھی بند تھی۔ ماہ نے کہا: "مٹھی میں کیا ہے بیٹے؟"

وہ مسکرایا اور مُٹھی کھول دی!

ایک چھوٹے سے بند چاقو کا خوبصورت دستہ اس کی ہتھیلی پر چمک رہا تھا!

ماہ نے جلدی سے چاقو لے لیا ـــ غضنفر بے تاب ہو کر بلکہ مچل کر گود سے اُتر پڑا، اترتے وقت اس کے کوٹ کی جیب کی کسی سخت چیز نے ماہ کے کولہے سے رگڑ کھائی، ماہ نے جلدی سے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا، تو ایک چمکتی ہُوئی چھری برآمد ہُوئی!

ماں کا غمزدہ دِل کانپ گیا ـــ اُس نے چھری پر قبضہ کر لیا۔ ذرا تیکھی نظروں سے محبوب بیٹے کی طرف دیکھا، لیکن وہ ذرا نہ سہما، مچل گیا۔

"میری چیزیں مجھے دے دو!"

ماہ نے کہا: "بیٹے بُری بات ایسی چیزوں سے نہیں کھیلتے، ان سے آدمی زخمی ہو جاتا ہے، بہت سارا خون نکل جاتا ہے، اور پھر —— اور پھر ——!"

اور آگے وہ کچھ نہ کہہ سکی، وہ چھری اور چاقو کے انجام سے غضنفر کو ڈرانا چاہتی تھی لیکن اس انجام کا ذکر اپنی زبان تک لاتے ہوئے ہچکچاتی تھی!

بدشگونی کی بات تھی نا! —— بھلا بچّے کے قتل اور خون کا ذکر کیسے کیا جا سکتا تھا ——!

لیکن غضنفر نے ان نصیحتوں پر ذرا بھی توجہ نہ کی، وہ ضد پر ضد کئے جا رہا تھا:۔

"میرا چاقو دو!"

"میری چھری لاؤ!"

ماہ نے پھر سمجھایا: "بیٹے گھر میں بہت سی کھیلنے کی چیزیں ہیں، ان سے کھیلو۔ ایسی خطرناک اور مہلک چیزوں سے اچھے بچّے نہیں کھیلتے —— شاباش، شاباش!"

اس شاباشی سے بھی یہ منچلا بچّہ متاثر نہ ہوا، وہ پھر چاقو کی طرف لپکا، ماہ نے کہا:۔

"کو بڑی ہو گیا ہے لڑکے —— آخر کیا کرے گا تو چھری اور چاقو کا؟"

برجستہ غضنفر کے منہ سے نکلا: "لڑوں گا!"

ماہ مسکرا دی: "لڑوں گا —— تو لڑے گا؟ کس سے لڑے گا؟"

غضنفر نے کہا: "مرہٹوں سے۔"

ماہ طلعت نے پوچھا: "تو مرہٹوں سے لڑے گا؟"

وہ بولا: "ہاں امّی میں مرہٹوں سے لڑوں گا، انھیں قتل کر ڈالوں گا —— ایسے"

اور یہ کہہ کر چشم زدن میں اُس نے ماہ کے ہاتھ سے چھری لے لی، سامنے تکیہ پڑا تھا،

اس میں بھونک دی، آر پار نکل گئی۔

یہ منظر دیکھ کر ماں کے مُرجھائے ہوئے چہرے پہ تازگی آگئی۔ اس نے پھر غضنفر کو کلیجہ سے لگا لیا اور اُسے پیار کرنے لگی غضنفر نے اپنے تئیں ماں کی گود سے چھڑا لیا، اور لپکا باہر کی طرف، ماں نے جلدی سے بڑھ کر اُسے پکڑا۔

"ارے کہاں جا رہا ہے تو؟"

اُس نے اپنے آپ کو چھڑاتے ہوئے کہا "جانے دو مجھے!"

ماں نے پھر اُسے گود میں اُٹھا لیا اور تھپکی دیتے ہوئے کہا: "بیٹے آج نہیں کل ہم بھی چلیں گے تمہارے ساتھ مرہٹوں سے لڑنے!"

غضنفر نے پوچھا "تم بھی چلو گی امی؟"

وہ بولی۔ "ہاں ضرور چلوں گی، تم اکیلے اتنے سارے مرہٹوں کو کیسے مار پاؤ گے؟ میں تمہارا ہاتھ بٹاؤں گی۔ ماں بیٹے مل کر ان سب مرہٹوں کو مار ڈالیں گے جو زبردستی دلّی میں گھس آئے ہیں ——— شاباش یہ اپنی چھری میرے پاس رکھا دو، نہیں تو کوئی چرا لے گا۔ صبح جب تُم ناشتہ کر چکو گے، تب چلیں گے ہم تم!"

یہ باتیں غضنفر کی سمجھ میں آگئیں، اُس نے چپکے سے چھری ماں کے ہاتھ میں تھما دی اور کہا۔ "ضرور چلنا!"

ماں نے اطمینان دلا دیا۔ "ہاں ضرور چلوں گی میرے بچّے!"

اتنے میں صنوبر آئی۔ ہاتھ میں پٹی بندھی ہوئی، لیکن آنکھیں مسرت سے چمک رہی تھیں۔ ماں نے پوچھا "یہ کیا ہوا صنوبر؟"

وہ بولی۔ "زخمی ہو گئی، اور کیا ہوا!"

ماہ نے کہا۔ "وہی تو پوچھتی ہوں۔ زخم کس طرح آیا؟"

صنوبر، غضنفر کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "بتادوں؟"

ماہ طلعت۔ "اس سے کیا پوچھ رہی ہو، کیا اس نے زخمی کیا ہے تمہیں؟"

صنوبر: "جی ہاں، یہ انھی ننھے ننھے ہاتھوں کا لگایا ہوا چرکا ہے!"

ماہ طلعت۔ "خدا کے لئے پوری بات بتاؤ!"

صنوبر۔ "ہوتا کیا، صاحبزادے کئی دن سے اُن کے (آصف زماں کے) پیچھے پڑے ہوئے تھے۔ ہمیں چاقو لادو، ہمیں چھری لادو، دیکھو خوب تیز سی لانا۔ اچھی اچھی خوبصورت، آج وہ بازار گئے، تو لے آئے جاکر، اتنے میں کھیلتے ہوئے غضنفر میاں پہنچے، انھوں نے ان کی چیزیں انھیں دے دیں، میری جو شامت آئی۔ پوچھ بیٹھی۔ "بھیا کیا کروگے چھری چاقو کا؟"

سینہ تان کر کہنے لگے۔ "مرہٹوں کو ماروں گا!"

میں نے کہا۔ "کیوں نہ ہو، مجاہد باپ کا مجاہد بیٹا، ضرور ماریو، لیکن کیسے مارو گے بھلا؟"

اسے میرا یہ کہنا تھا کہ چھری چمکی اور میرا ہاتھ لہولہان کر گئی بس ——— وہاں سے بھاگے ہیں تو ماں کی گود میں دم لیا ہے آکر میرے ننھے سپاہی نے!"

ماہ نے غضنفر سے پوچھا۔ "یہ کیا کیا بیٹا؛ صنوبر خالہ کو زخمی کر دیا، وہ تو تمہیں بہت چاہتی ہیں۔"

غضنفر نے کہا۔ "میں بھی تو چاہتا ہوں انھیں!"

ماہ بولی۔ "پھر کیوں زخمی کر دیا انھیں؛ دیکھو کتنا سارا خون نکل گیا بے چاری کے!"

کہنے لگا۔ "پھر انہوں نے پوچھا کیسی تھا؟"

صنوبر ہنسنے لگی، اُس نے بڑھ کر غضنفر کو گود میں اُٹھا لیا اور پیار کرنے لگی۔ "کیوں نہ آخر کس باپ کا بیٹا ہے! ـــــ میرا بچہ!"

غضنفر نے محبت بھری نظروں سے صنوبر کو دیکھا۔ "تم بھی چلنا کل ہمارے ساتھ!"

وہ بولی کہاں میرے بچے"؟

غضنفر نے سوالیہ نظروں سے ماہ کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "امی انھیں بھی لے چلو گی؟"

ماہ نے جواب دیا۔ "ضرور لے چلوں گی ـــــــ ہم تم مرہٹوں کو قتل کریں گے۔ یہ اُن کا خون پئیں گی!"

بے ساختہ صنوبر کے مُنہ سے نکلا۔ "اے فرح! میں کیوں پیتی موذی کا خون لیکن یہ کیسا پروگرام بن رہا ہے؟"

ماہ طلعت:- "بھئی پروگرام یہ بن رہا ہے کہ کل ہم اور غضنفر شہر جائیں گے، اور جو مرہٹہ سپاہی نظر کے سامنے آئے گا اُسے قتل کر دیں گے۔ کیا مجال ہے جو وہ زندہ بچ کر جا سکے ـــــ ظاہر ہے یہ پروگرام تمہارے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا، لہٰذا غضنفر کی فرمائش ہے کہ تم بھی چلو ہمارے ساتھ!"

صنوبر:- "او ہو یہ بات ہے!"

غضنفر:- "چلو گی ہمارے ساتھ!"

صنوبر:- "اے میرے لال ضرور چلوں گی، تیرے پسینہ پر اپنا خون بہا دوں گی، ذرا بڑا ہو کے تو دیکھ!"

غضنفر خوش ہو گیا، اُس نے چھری ماں کے ہاتھ سے لے کر صنوبر کی طرف بڑھائی

"اِسے اپنے پاس رکھ لو!"

صنوبر نے چھری لے لی، اتنے میں اُس کی نظر چھپرکھٹ پر پڑی، اُس نے تکیہ کو بامال تباہ جو دیکھا تو پوچھا۔ "یہ کیا ہوا؟"

ماہ طلعت نے کہا: "دیکھو خدا یوں بچاتا ہے۔ تُم سے پہلے اگر میں نے غضنفر سے پوچھا ہوتا کہ چھری چاقو کا کیا کرو گے؟ تو وہی گت میری بنتی جو تمہاری بن چکی ہے۔ تمہیں زخمی کر کے سہم چکے تھے، للذا وہی سوال جو تم نے کیا تھا، جب میں نے کیا تو آئی گئی تکیہ غریب پر ہو گئی!"

صنوبر ہنسنے لگی۔

تھوڑی دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں، غضنفر پھر کہیں کھیلنے چلا گیا۔ صنوبر نے کہا:۔

"نہ جانے دِلّی اور دِلّی والوں کی قسمت میں کیا لکھا ہے، شاہ ابدالی کے آنے کے بعد ہم تو سمجھے تھے، اب نجات ملی مرہٹوں سے، لیکن وہ تو پھر قابض ہو گئے!"

ماہ طلعت نے بے پروائی سے کہا۔ "ہو جانے دو ——— وہ یہاں ٹک نہیں سکتے، بھاگنا پڑے گا انھیں ——— اور میرا دل تو یہ کہتا ہے کہ اس مرتبہ جو لڑائی ہوگی، وہ بڑی زبردست ہوگی۔"

صنوبر بیچ میں بول پڑی: "اور فیصلہ کُن بھی!"

ماہ طلعت نے پوچھا۔ "بات تو یہی ہے جو تُم نے کہی، لیکن تم جیسی بیوقوف عورت دور کی کوڑی کہاں سے لائی؟ تُم نے کیسے جانا کہ یہ فیصلہ کُن جنگ ہوگی؟"

وہ مسکرائی۔ "یہ لو، جیسے ہمارے پاس خبریں پہنچنے کا کوئی ذریعہ ہی نہیں!"

ماہ ہنس پڑی۔"ہاں یہ تو میں بھول ہی گئی تھی۔تمہارے پاس تو وہ ذریعہ ہے کہ میرے پاس بھی نہیں۔کیا آصف زماں کے پاس کوئی خاص اطلاع آئی ہے؟"

"یہ تو میں نہیں جانتی۔لیکن اتنا جانتی ہوں وہ ہمارے گھر کا تہ خانہ موجود ہے نا وہاں ہر روز رات کو کچھ خاص لوگ آتے ہیں۔تمام ہتھیار وہیں پہنچا دیئے گئے ہیں۔اور اور وہاں روز تلواروں پر صیقل ہوتی رہتی ہے۔میں نے تو ایک دفعہ پوچھا بھی تھا۔"یہ کیا ہو رہا ہے؟ کچھ ہمیں بھی تو بتاؤ!"

"پھر کیا کہا تھا آصف نے؟"

"کہتے کیا۔میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔اور کان کے پاس منہ لے جا کر کہا۔"خبردار— دیوار ہم گوش دارد——"

میں بھی ذرا موج میں تھی۔میں نے بہت آہستہ سے کہا۔"اونچا سنتی ہوں۔ذرا زور سے کہو۔"کھلکھلا کر ہنس پڑے اور باہر چلے گئے۔

باب (۵۴)

بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے

سورج مل نے سداشیو راؤ بھاؤ سے تلخ تند گفتگو کے بعد فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ بھرتپور واپس چلا جائے گا، وہ اب مرہٹہ لشکر میں ایک لمحہ بھی رہنا نہیں چاہتا تھا، لیکن بعض مرہٹہ سرداروں، راجپوت مہاراجوں، اور خود وسواس راؤ نے منت سماجت کر کے اُسے روکا، وسواس راؤ نے تو یہاں تک کہہ دیا۔ "اگر آپ کا فیصلہ اٹل ہے، تو پھر میرا بھی قطعی فیصلہ ہے کہ واپس چلا جاؤں گا!"

آخر بڑی منت سماجت کے بعد سُورج مل رہنے پر راضی ہوا۔

اِس تلخ و تند گفتگو کا خود بھاؤ کے مزاج اور طبیعت پر اتنا گہرا اثر تھا کہ کئی روز تک وہ اپنے زرنگار خیمہ سے باہر نہیں نکلا۔ جس سے گفتگو کرنا ہوتی وہیں خیمہ میں بات چیت کر کے اُسے رخصت کر دیتا، لوگ اس کی افتادِ مزاج سے واقف تھے، لیکن یہ کسی کو اندازہ نہیں تھا کہ اس کی برہمی اِتنی نازک شکل بھی اختیار کر سکتی ہے، بھاؤ، وسواس راؤ کو بہت چاہتا تھا، خود اپنی اولاد سے بھی وہ اتنی محبت نہ کرتا تھا جتنی وہ اس سے کرتا تھا۔ وسواس کو اپنے لاڈلے پن کا اندازہ تھا، اِس لئے وہ بھاؤ کی جناب میں تھوڑا بہت

گستاخ بھی تھا۔ بھاؤ اگر کسی کی ضد کے سامنے ہتھیار ڈالتا تھا تو وہ وسواس راؤ ہی تھا اس کی یہ کیفیت دیکھ کر ایک روز وسواس، بھاؤ کے زرنگار خیمہ میں پہنچا، وہ اُس وقت بھی منتغض تھا، غصّہ کے نشانات، اس کے چہرے پر موجود تھے۔ لیکن وسواس کو دیکھ کر اس کے دِل کی کلی کھل گئی۔ بولا:۔

"آؤ بیٹے آؤ!"

وسواس قریب آکر چپ چاپ بیٹھ گیا، وسواس کی خاموشی بھاؤ سے نہ دیکھی گئی: کیا بات ہے بیٹے، آج تمہارا چہرہ کچھ اُترا اُترا سا ہے، خاموش بھی بہت ہو؟"

وسواس نے اپنی کیفیت کو قائم رکھتے ہُوئے کہا۔ خود آپ کی بھی تو یہی کیفیت ہے کئی دِن سے!

بھاؤ: "لیکن بیٹے مجھ پر صدہا ذمہ داریاں ہیں سینکڑوں فکریں ہیں، بڑے بڑے مرحلے طے کرنا ہیں لیکن جب تک میں زندہ ہوں تمہیں تو کوئی فکر نہیں ہو سکتی!"

"جی ہاں یہ تو صحیح ہے، لیکن آپ کی بھی تو یہ حالت نہیں دیکھی جاتی مجھ سے!۔۔ آخر آپ اتنے خاموش اور متفکر کیوں ہیں؟ کئی روز سے خیمہ کے اندر بیٹھے ہیں، باہر بھی نہیں نکلتے!"

"کیا بتاؤں بیٹا!"

"آخر کچھ تو!"

"ایک تو یہ سورج مل میرے لئے مستقل دردِ سر بنا ہُوا ہے، میری ہر تجویز کی مخالفت کرتا ہے، میری ہر اسکیم کو رد کر دیتا ہے، اور تم جانتے ہو میں اپنے حکم اور فیصلہ کے بعد کسی نکتہ چینی کا متحمل نہیں ہو سکتا!"

"وہ تو میں جانتا ہوں، لیکن سورج مل کو غلط نہ سمجھئے، وہ ہمارا سچا دوست ہے، ہمارا کھرا ساتھی ہے۔ وہ تن من دھن سے ہمارے ساتھ ہے، وہ اگر کسی بات میں مخالفت کرتا ہے تو ضد اور دشمنی سے نہیں، اخلاص اور محبت سے ہے ـــــ ہو سکتا ہے اس کی رائے غلط ہو، لیکن اس کی نیت غلط نہیں ہوتی!"

بھاؤ خاموشی سے یہ باتیں سنتا رہا، وسواس راؤ نے گفتگو کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے کہا: "وہ تو بھرت پور واپس جا رہے تھے!"

"پھر؟ ـــــ چلا گیا؟"

"جی نہیں، میں نے روک لیا! ـــــ اب آپ انھیں معاف کر دیجئے، آپ کی اس خاموشی کو وہ اپنی توہین سمجھ رہے ہیں!"

بھاؤ اپنے زہر خند کو ضبط نہ کر سکا۔

"توہین! ـــــ سورج مل میری خاموشی کو اپنی توہین سمجھ رہا ہے ـــــ شاید وہ نہیں جانتا اس سے بات کرنا، اور اُسے منہ لگانا اور اُسے اپنے برابر بٹھانا میری کتنی بڑی توہین ہے! ـــــ خیر تم نے اسے روک لیا، اچھا کیا، جب تک یہ مرحلہ طے نہیں ہو جاتا ہمیں اپنے مخالفوں اور دشمنوں کی بھی خاطر کرنی ہے، اس کے بعد پھر دیکھ لوں گا، کون کتنے پانی میں ہے!"

وسواس راؤ نے تبسم کرتے ہوئے کہا، "بالکل ٹھیک، یہی تو میں بھی کہتا ہوں، ضرورت کے وقت گدھے کو باپ بنا لیتے ہیں!"

بھاؤ اپنے سعادت مند بھتیجے کی یہ باتیں سُن کر ہنسنے لگا، پھر اُس نے کہا: "لیکن بیٹے تم یہ نہ سمجھو کہ اپنے خیمہ میں نظر بند رہ کر میں نے وقت ضائع کیا ہے۔ یہ چند دن میں نے

صرف سرچتے میں گذارے ہیں اور آج میں ایک ایسے اہم فیصلہ پر پہنچا ہوں کہ اب اس کا اخفا میرے بس سے باہر ہے!"

بڑی پریشانی کے ساتھ وسواس نے پوچھا" وہ کون سا فیصلہ ہے آپ کا؟"

بھاؤ نے محبت بھری نظروں سے وسواس کو دیکھا اور مسکراتے ہوئے کہا: بتاؤں گا. وہ فیصلہ تمہارے ہی بارے میں ہے، اس کا تعلق صرف تمہاری ذات سے ہے لیکن ابھی نہیں بتاؤں گا، ذرا صبر کرو!"

وسواس کی بے چینی اور بڑھ گئی۔" تو آخر کب بتائیں گے آپ؟ — بتا دیجئے نا! میں کسی سے اس کا ذکر نہیں کروں گا!"

بھاؤ کو پھر ہنسی آ گئی۔ کل ذرا مجھے اور سوچ لینے دو — تم ایسا کرو کہ تمام افسروں اور سرداروں کو مطلع کر دو کہ کل ایک اہم مشورتی مجلس میرے ہی خیمہ میں سویرے سویرے منعقد ہو گی!"

وسواس راؤ نے سرِ تسلیم خم کیا اور تعمیل حکم کے لئے چلا گیا۔ لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ کیا بات ہے؟ کس قسم کا فیصلہ ہے؟ اس کا میری ذات سے کیا تعلق ہے؟ اس کا انکشاف کل کی مشورتی مجلس ہی میں کیوں ہو گا۔ آج بتا دینے میں کیا حرج تھا؟

○

دوسرے دن بھاؤ کے زرنگار خیمہ میں مجلس مشورت منعقد ہوئی۔ تمام چنے ہوئے افسر، سردار، مہاراجگان اور مستقبل کی مرہٹہ حکومت کے وزراء موجود تھے۔ ایک کونے میں سورج مل بھی بیٹھا تھا، وہ سوچ رہا تھا، دیکھئے آج کیا گل کھلتا ہے، کہیں یہ بھاؤ کوئی ایسی بات نہ کہہ دے جس سے مجھے پھر اختلاف کرنا پڑے، وسواس راؤ بھی اس کے پاس

بیٹھا ہوا تھا۔ اور بالکل یہی بات وہ بھی سوچ رہا تھا!"

اتنے میں بھاؤ کھڑا ہوا۔ اُس نے کہا۔

"دوستو! میں ایک حقیقت پسند آدمی ہوں، تخیّل پرست نہیں آپ سب کو معلوم ہے۔ مرہٹہ لشکر یہاں کیوں آیا ہے؟ شاہ ابدالی سے جنگ و پیکار کے لئے ہم کیوں تیار ہیں، سیواجی مہاراج کے وقت سے لے کر اب تک ہم کس مقصد کے لئے جد و جہد کرتے آئے ہیں؟ صرف ایک بات کے لئے!

ہم مسلمانوں کی غلامی برداشت نہیں کر سکتے، اب ہم کمزور نہیں ہیں، اب ہم منتشر اور پراگندہ نہیں ہیں، اب ہمارے اندر اختلاف اور نزاع باہمی کا مرض نہیں ہے۔ اب ہماری طاقت ایک ثابت شدہ حقیقت ہے، ہندوستان پر اس وقت عملاً ہم ہی حکومت کر رہے ہیں، ہماری پراگندگی دُور ہو چکی ہے، ہم میں اتحاد اور تنظیم کا جوہر پیدا ہو چکا ہے، ہمارے باہمی اختلافات رفع ہو چکے ہیں ممکن ہے کسی حد تک اب بھی باقی ہوں لیکن وہ ایسے نہیں ہیں جو ہمارے قومی مقاصد کے راستہ میں حارج و مانع ہوں!

حاضرین نے بڑے جوش و خروش کے ساتھ بھاؤ کے ان الفاظ کی تائید کی، بھاؤ نے سلسلۂ تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"میں نے ابھی عرض کیا تھا، کہ اب ہم کمزور نہیں ہیں اب ہماری طاقت ایک ثابت شدہ حقیقت ہے، ہندوستان پر اس وقت عملاً ہم حکومت کر رہے ہیں! ——— میں غلط تو نہیں کہتا؟

کئی آوازیں۔ "بالکل نہیں!"

بھاؤ۔ "تو جب سارے ہندوستان پر عملاً ہم حکومت کر رہے ہیں تو کیا وجہ ہے، کہ

بادشاہت کے اُس ڈھونگ کو قائم رکھیں جس کا سوانگ اب تک لال قلعہ میں کھیلا جا رہا ہے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ اس ڈھونگ کو ہمیں ختم کر دینا چاہئے:

ایک سردار۔ "آپ کا ایک ایک حرف حقیقت اور صداقت کا علمبردار ہے لیکن ان الفاظ سے اس وقت آپ کا مقصد کیا ہے' وہ سمجھ میں نہیں آیا۔"

دوسرا سردار۔ کیا آپ کا مقصد یہ ہے کہ موجودہ بادشاہ کو معزول کر دیا جائے؟

بھاؤ۔ "ہاں میرا مقصد یہی ہے ـــــ میرا مقصد یہ ہے کہ نہ صرف موجودہ بادشاہ کو معزول کر دیا جائے، بلکہ مغلیہ بادشاہت کا سلسلہ ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا جائے، کوئی وجہ نہیں کہ ہم مغلیہ خاندان کے کسی فرد کے سامنے ظاہری اور نمائشی طور پر بھی سر جھکائیں وقت آ گیا ہے کہ سب کے سر ہمارے سامنے جھکیں:

پہلا سردار۔ "اگر آپ نے بادشاہ کو معزول کر دیا، اور مغلیہ خاندان کو بادشاہت سے محروم کر دیا تو یہ اعزاز کسے حاصل ہوگا؟ میرا مقصد یہ ہے کہ تاج شہریاری کس کے سر پر رکھا جائے؟"

بھاؤ۔ "تاج شہریاری اس سر پر رکھا جائے، جو اس عزّت کا سب سے زیادہ مستحق ہے!"

شمشیر بہادر۔ "یعنی؟ کون ہو سکتا ہے وہ شخص؟"

بھاؤ۔ "وہ شخص وسواس راؤ کے سوا کوئی نہیں ہو سکتا۔ اس دیس پر مستقل حکمرانی اب وہی کریگا یہ اسی کا حق ہے، اور یہ حق اسے ملے گا!"

یہ الفاظ سنکر خوشی سے وسواس راؤ کا چہرہ گلنار ہو گیا!"

مرہٹہ سرداروں کی یہ کیفیت تھی کہ تاج شہریاری سامنے پڑا تھا، ورنہ اسی وقت سے سر پر رکھ کر اپنی حسرت پوری کر لیتے؛

راجپوت راجاؤں کو بھاؤ کی یہ بات ناگوار گذری، اس لئے کہ مرہٹے صرف سپاہی تھے اور وہ "راج۔پوت" تھے۔ بادشاہت کو وہ اپنا حق سمجھتے تھے، لیکن کسی راجپوت راجہ یا مہاراجہ میں یہ ہمت نہ تھی کہ دلی اختلاف کے باوجود حرفِ اختلاف زبان پر لاتے۔ سب کو معلوم تھا کہ اگر اختلاف کیا گیا تو اس کا حشر کیا ہوگا؟

بھاؤ نے گرجدار آواز میں پُوچھا۔ "تو پھر آپ حضرات کی کیا رائے ہے؟"

مرہٹہ سرداروں نے نعرہ لگایا "منظور، منظور —— مغل بادشاہ کو تخت سے اتار دو! بادشاہت صرف بسواس راؤ کا حق ہے، اور یہ حق اسی کو ملنا چاہئے، ابھی اسی وقت —— یہیں!"

ایک مرہٹہ سردار نے کہا۔ "مجھے اجازت دیجئے کہ میں بادشاہ کے سر سے تاج شہریاری اتار لاؤں اور ابھی سب کے سامنے بسواس راؤ کے سر پر رکھ دوں!"

بھاؤ۔ "ہاں میرے دوست یہ کام تم ہی سے لیا جائے گا۔ اطمینان رکھو، لیکن سب کی رائے تو لینے دو!"

دُوسرا مرہٹہ سردار۔ "رائے لینے کی کیا ضرورت ہے، کون ہے جو اس رائے سے اختلاف کر سکے!"

تیسرا مرہٹہ سردار۔ "اور اگر کسی نے اختلاف کی جرأت کی تو ہماری تلوار ——"

بھاؤ۔ "خاموش!"

وہ سردار خاموش ہو گیا۔

پھر بھاؤ نے کہا۔ "تو حضرات آپ لوگ میری اس تجویز سے متفق ہیں؟"

جو لوگ غیر متفق تھے وہ خاموش رہے کسی نے کوئی جواب نہیں دیا۔

بھاؤ نے سُورج مل کی طرف دیکھا مسکرایا، پھر اُس کی آواز فضا میں گونجی۔ "میرے دوست سُورج مل، تم اب تک خاموش ہو!"

وہ اب بھی خاموش رہا، وسواس راؤ کو یقین تھا، سُورج مل اِس تجویز سے اختلاف نہیں کر سکتا، اس نے پُرامید نظروں سے اُسے دیکھا، "آپ جواب کیوں نہیں دیتے؟"

سُورج مل مسکرا کر خاموش ہو گیا۔

بھاؤ نے کہا: "سورج مل جی، تمہاری رائے معلوم کرنا چاہتا ہوں!"

سورج مل اُٹھ کھڑا ہوا، سب لوگ ہمہ تن انتظار بن کر اس کی طرف دیکھنے لگے۔

اُس نے کہا: "بڑے ادب لیکن نہایت شدّت کے ساتھ میں اس تجویز سے اختلاف کرتا ہوں۔"

یہ ایک بم کا گولہ تھا، جو حاضرین کے ہوش و حواس پر گرا، سب دم بخود ہو کر حیرت و استعجاب کے ساتھ سُورج مل کو دیکھنے لگے۔

بھاؤ کے چہرے پر ناگواری کے اثرات پیدا ہو گئے، اُس نے ذرا تلخی کے ساتھ پُوچھا۔ "کیوں آخر کوئی وجہ؟"

سُورج مل ذرا آگے بڑھ کر۔ "یہ سینہ حاضر ہے، جو صاحب اپنی تلوار کی نوک چبھونا چاہتے ہوں وہ آگے بڑھیں میری طرف سے کسی قسم کی مزاحمت نہ ہوگی؟"

پھر اس نے ذرا زوردار آواز میں کہا: "وسواس راؤ سے بڑھ کر ہندوستان کے تخت و تاج کا کوئی مستحق نہیں۔ یہ تخت اسی کو ملے گا، یہ تاج اسی کے سر سے زینت پائے گا لیکن ابھی نہیں —— جب تک احمد شاہ ابدالی کو کامل شکست نہ ہو جائے، جب تک روہیلہ حکومت کا قلع قمع نہ کر دیا جائے، جب تک ہندوستان کے مسلمان رجواڑے ہتھیار اُٹھانے کی طاقت سے محروم نہ ہو جائیں، اس وقت تک ہمیں یہ ڈھونگ قائم رکھنا پڑے گا اس وقت

تک ظاہری اور نمائشی طور پر ہم مغل بادشاہ کو بادشاہ مانیں گے، اور اس کے آگے سرِ تسلیم خم کریں گے۔ اس وقت ضرورت اس کی ہے کہ عام مسلمانوں اور مسلمان رئیسوں کو کسی قسم کی بدگمانی کا موقع نہ دیں، ان پر یہ ظاہر کریں کہ جنگ ہندوؤں اور مسلمانوں کی نہیں مرہٹوں اور پٹھانوں کی ہے، اور جب یہ جنگ جیت لیں تو وہ کریں گے جو ہمیں کرنا ہے — میں آپ حضرات کو یقین دلاتا ہوں کہ سورج مل وہ پہلا شخص ہوگا جو مغل بادشاہ کے سر سے تاج چھین کر وسواس راؤ کے سر پہ رکھے گا! لیکن ابھی نہیں، ابھی تو ہمیں اس کٹھ پتلی مغل بادشاہ سے کام بھی لینا ہے!"

بھاؤ: "پھر تمہاری کیا رائے ہے؟"

سورج مل: "میری رائے یہ ہے کہ شجاع الدولہ کے پاس پھر سفارت بھیجی جائے کہ وہ احمد شاہ ابدالی کا ساتھ نہ دے، ہمارا ساتھ دے، موجودہ بادشاہ کو معزول کرکے اسی خاندان کے کسی نئے شخص کو تختِ حکومت پر بٹھایا جائے اور شجاع الدولہ کی وزارتِ عظمیٰ کا اعلان فوراً کر دیا جائے!"

بھاؤ: "لیکن شجاع الدولہ اگر راضی نہ ہوا تو؟"

سورج مل: "اس کی رضامندی یا نارضامندی کا کوئی سوال نہیں، ہمیں اس کی وزارت کا بہرحال اعلان کر دینا چاہئے، اس اعلان کے بعد اس کی پوزیشن مشکوک ہو جائے گی۔ ابدالی پھر ہرگز اس پر اعتماد نہیں کرے گا اور اسے مجبور ہو کر ہمارے پاس آنا پڑے گا۔ ہمارا ساتھ دینا پڑے گا!"

خوشی سے بھاؤ کا چہرہ چمک اٹھا! "بڑی اچھی رائے ہے، یہی ہوگا ——— سورج مل میرا دل تم سے صاف ہے، میں تمہاری اس مدبرانہ رائے کی قدر کرتا ہوں۔"

سورج مل نے سر جھکا کر شکریہ ادا کیا اور خاموش ہو گیا!

○

اور دوسرے روز!

• بھاؤ نے محی السنتہ کو تخت سے اتار کر عالمگیر ثانی کے بیٹے شاہ عالم کا حق وراثت تسلیم کیا، مگر چونکہ وہ بہار و بنگال میں ایک مہم کے سلسلہ میں گئے ہوئے تھے۔ لہٰذا ان کے بڑے بیٹے جواں بخت عرف جہاں قدر کو تخت پر بٹھایا، اور جہاں قدر کی طرف سے فرمانِ وزارت شجاع الدولہ کے نام جاری کرایا تاکہ ابدالی اس سے بدظن ہو جائے[1]!

---

[1] پانی پت کا خونیں میدانِ جنگ۔ (تاریخ ہند از ذکاء اللہ)

باب (۵۴)

لائے اُس بُت کو التجا کر کے!

اس معرکہ کا سب سے اہم مُہرہ شجاع الدولہ تھا، وہ اپنی قیمت اور اہمیت پُورے طور پر محسوس کر رہا تھا۔ وہ جانتا تھا اسے پاسنگ کی حیثیت حاصل ہے، جس طرف وہ ہو جائے گا اُدھر کا پلّہ بھاری ہو جائے گا۔ لیکن وہ جتنا زیادہ ہوشیار تھا، اُس سے زیادہ دُور اندیش بھی تھا وہ اب اس نتیجہ پر پہنچا تھا کہ کسی کا ساتھ نہ دے، نہ مرہٹوں کا، نہ احمد شاہ ابدالی کا، اور کبھی صاف الفاظ میں انکار بھی نہ کرے، معرکہ کے وقت جس کا پلّہ بھاری دیکھے اس کے ساتھ ہو جائے، جنگ سے پہلے کا یہ زمانہ محض گفت و شنید اور ٹال مٹول میں صرف کر دینا چاہتا تھا لیکن بھاؤ اور ابدالی بھی کچی گولیاں نہیں کھیلے تھے۔ دونوں کے دونوں اس پر اڑے رہے کہ معاملہ یکسو کر لیں، شجاع الدولہ اس بات کا اعلان کر دے کہ وہ کدھر ہے، کس کے ساتھ ہے؟

پہلے دو پے بھاؤ کی طرف سے دو سفارتیں آ چکی تھیں لیکن شجاع الدولہ نے ابتک کوئی جواب نہیں دیا تھا!

احمد شاہ اور نجیب الدولہ کی طرف سے فیروز بخت آیا ہوا پڑا تھا، لیکن اس سے اب تک اُس نے ملاقات بھی نہیں کی تھی۔ آخر تنگ آکر فیروز بخت نے جسونت راؤ کو

الوپ شہر واپس کیا۔ احمد شاہ ابدالی کے نام خط دیا۔ جس میں شجاع الدولہ کی اس دو رخی پالیسی کا تذکرہ کیا اور اصرار کیا کہ جلد از جلد نجیب الدولہ بھی یہاں بھیجا جائے، جسونت راؤ روانہ ہو چکا تھا، لیکن ابھی تک اس کی طرف سے کوئی اطلاع نہیں آئی تھی۔

فیروز بخت اپنے خیمہ میں بیٹھا یہی باتیں سوچ رہا تھا کہ شجاع الدولہ کا پیامبر پہنچا۔ معلوم ہوا یاد فرمایا ہے۔ وہ فوراً اُٹھ کھڑا ہوا اور سیدھا شجاع الدولہ کے حضور میں پہنچا۔ وہ تپاک لیکن خشکی کے ساتھ پیش آیا، اُس نے کہا۔ "تم پھر آ گئے؟"

فیروز بخت: "ذاتِ ہمایونی کی کشش ایسی نہیں کہ غلام اس کا مقابلہ کر سکے۔"

شجاع الدولہ۔ (مسکرا کر) "لیکن تم تو شاہ ابدالی کے بھیجے ہوئے آدمی ہو!"

فیروز بخت۔ "جی ——— لیکن آیا تو آپ کے پاس ہوں!"

شجاع الدولہ مسکرایا۔ اُس نے کہا۔ "تم جس لئے آئے ہو، میں جانتا ہوں!"

فیروز بخت۔ "میں جہاں پناہ کی روشن ضمیری کا ہمیشہ سے قائل ہوں!"

شجاع الدولہ۔ "تو کیا پیام لے کر آئے ہو، اسے سُنے بغیر میں اپنا فیصلہ سُنا دینا چاہتا ہوں!"

فیروز بخت۔ "ارشاد!"

شجاع الدولہ۔ "زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتا ہوں کہ کبھی فرنگی کا ساتھ نہ دوں ——— بس اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتا، کیا یہ کافی نہیں ہے؟"

فیروز بخت۔ "بہت کافی ہے، لیکن اس کے معنی یہ ہوئے کہ جہاں پناہ، ابدالی کو برحق نہیں سمجھتے!"

شجاعُ الدّولہ: "معنی اور مطلب تم سوچتے رہو، مجھے جو کچھ کہنا تھا میں نے کہہ دیا! ———

میں کسی کی دوستی میں اپنا نقصان نہیں کرسکتا!"

یہ کہہ کر شجاع الدولہ نے ایک خط جیب سے نکالا، اور فیروز بخت کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔" اسے پڑھو! یہ بھاؤ کا خط ہے!"

فیروز بخت خط کا مطالعہ کرنے لگا۔ شجاع الدولہ نے کہا: "زور سے پڑھو!"

فیروز بخت نے بآوازِ بلند پڑھنا شروع کیا۔

"ہم اور آپ ایک کشتی کے بادبان ہیں، بادشاہ ہندوستان کے خیرخواہ ہیں اور پٹھان تمام اہلِ ہندوستان کے مال، جان، اور ناموس کے دشمن ہیں یہاں کے مسلمانوں کو وہ ہندوؤں سے بھی بدتر جانتے ہیں امرائے ہندوستان میں جس شخص کو اس قوم سے دلی نفرت ہے، وہ ایک آپ ہیں، باقی سب ایک دوسرے سے متفق ہیں۔ ہمارا مقصد پٹھانوں کا استیصال ہے، لہٰذا اس کے ہم امیر تیمور صاحبقران کے مکان کو آباد کرنا چاہتے ہیں، ہم یہ پسند نہیں کرتے کہ دوسرے ان کی جگہ لے لیں، اور ان کی اولاد بھیک مانگتی پھرے، اگر آپ بھی اس مکان کا پاسِ نمک رکھتے ہیں، اور آپ کو اپنے ولی نعمت کے مکان کی رونق منظور ہے، تو بے تامل ہماری شرکت کیجئے، اگر آپ ہمارے شریک ہونگے اور ہم نے افغانوں پر کامیابی حاصل کرلی، تو شاہ عالم کو بادشاہ اور آپکو وزیر مقرر کرکے اور اپنا حصّہ ٹھہرا کے ہم دکن واپس چلے جائیں گے![1]"

خط پڑھ کر فیروز بخت خاموش ہوگیا، شجاع الدولہ نے کہا۔ "یہ خط راز کا تھا لیکن

---

[1] تاریخ اودھ

میں نے تم سے نہیں چھپایا، تم خود اندازہ کرسکتے ہو کہ اس خط کے بعد میرا رویّہ کیا ہونا چاہیے؟ کیا نجیب جانبدار رہ کر میں ابدالی اور روہیلہ سرداروں پر احسان نہیں کر رہا ہوں؟"

فیروز بخت نے کوئی جواب نہیں دیا! ——— شجاع الدولہ نے کہا: خاموش کیوں ہو؟ کچھ بولتے کیوں نہیں؟"

فیروز بخت۔ "صرف ایک بات دریافت کرنا چاہتا ہوں!"

شجاع الدولہ۔ "ضرور دریافت کرو، ہم جواب دیں گے!"

فیروز بخت۔ "کیا آپ کو مرہٹوں کے اس وعدہ کا اعتبار ہے؟"

شجاع الدولہ۔ "نہ ہونے کی کیا وجہ؟ ضرور ہے!"

فیروز بخت۔ "دُنیا میں آپ پہلے شخص ہیں جو مرہٹوں کے وعدے پر اعتماد کر رہے ہیں. ورنہ اس ملک کا ہر فرد خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان، اس حقیقت سے اچھی طرح واقف ہے کہ یہ مرہٹے وعدے کرتے ہی اس لئے ہیں کہ ان کی پابندی نہ کریں۔ ان کی دوستی کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ دوست کی گردن کاٹ لیں، یہ کسی کا ساتھ اگر دیتے ہیں تو صرف اس لئے کہ اُسے لُوٹ لیں ——— میں اسے ایک لمحہ کے لئے باور نہیں کرسکتا کہ مرہٹے ابدالی کا استیصال اور روہیلہ سرداروں کا قتل اور دِلّی پر قبضہ کے بعد اتنے بےنفس اور ایثار پیشہ ہو جائیں گے کہ شاہ عالم کو تختِ حکومت پر بٹھالیں گے... آپ کو وزارتِ عظمٰی کا منصب عطا کریں گے اور خود آمدنی میں اپنا حصّہ مقرر کر کے جہاں سے آئے تھے وہاں واپس چلے جائیں گے!"

شجاع الدولہ۔ "لیکن انھیں جھُوٹ بولنے کی کیا ضرورت تھی؟"

فیروز بخت۔ "تاکہ آپ کا تعاون حاصل کریں، آپ کی گرانقدر شخصیت، آپکے جاہ و جلال

آپ کی ذہانت و ذکاوت، آپ کے اثر و رسوخ، آپ کی ہردل عزیزی اور مقبولیت... آپ کے دبدبہ اور طنطنہ سے وہ خائف ہیں۔ یاد رکھئے، خائف ہیں۔ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ آپ کی باری بعد میں آئے گی۔ احمد شاہ اور روہیلوں سے نپٹنے کے بعد وہ شجاع الدولہ کی قلمرو پر قبضہ کریں گے، اور شجاع الدولہ کا بھی وہی حشر کریں گے جو اپنے دُوسرے دوستوں کا کرتے آئے ہیں!"

شجاع الدولہ ۔ "تم حد سے بڑھ رہے ہو!"

فیروز بخت ۔ "ہاں مجھے بھی اس کا احساس ہے، جانتا ہوں، یہاں سے زندہ واپس نہیں جاؤں گا، لیکن جو کچھ کہنا چاہتا ہوں، اسے ضرور سُن لیجئے!"

شجاع الدولہ ۔ "سُن رہا ہوں، کہو!"

فیروز بخت ۔ "یہ مرہٹے وہ ہیں جنھوں نے متھرا میں پہنچکر جامع مسجد ڈھا دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ لیکن سُورج مل کے سمجھانے بجھانے سے رُک گئے، جنھوں نے دلی پر قبضہ کرنے کے بعد مزارات کے شمعدان اور قلعہ کے زیورات تک پر قبضہ کر لیا، بھاؤ اس بات پر اڑ گیا تھا کہ وسواس راؤ کو تخت حکومت پر بٹھائے گا، اس تقریب کی تیاریاں بھی شروع ہو گئی تھیں، سُورج مل پھر آڑے آیا اور فیصلہ یہ ہُوا کہ ابدالی کی شکست اور روہیلہ سرداروں کے قتل کے بعد وسواس راؤ دلی کے تخت پر بٹھایا جائے گا، پھر بھی اپنی شرارت سے باز نہ آیا، اُس نے محی السنۃ کو معزول کر کے جواں بخت، عرف جہاں قدر کو عارضی طور پر بادشاہت عطا کی اور اعلان کر دیا کہ اس بادشاہ کا وزیر اعظم شجاع الدولہ ہے، تاکہ آپ کے اور ابدالی کے درمیان بدظنی پیدا ہو جائے!"

شجاع الدولہ۔ "یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟"

فیروز بخت۔ "غلام آقا کے سامنے جھوٹ بولنے کی جرأت نہیں کر سکتا!"

شجاع الدولہ۔ "تمہارا ذریعۂ معلومات؟"

فیروز بخت۔ "وہی حضور کا جانا پہچانا، میرا جاں نثار رفیق جسونت سنگھ!"

شجاع الدولہ۔ "ہوں —— یہ بات ہے!"

فیروز بخت۔ "عالی جاہ!"

شجاع الدولہ۔ "اچھا اب تم جاؤ، مسئلہ اہم ہے، ابھی ہم کسی کو جواب نہیں دیتے ذرا اور غور کر لیں۔"

فیروز بخت واپس چلا آیا۔

O

دوسرے دن صبح جب فیروز بخت کی آنکھ کھلی، اور وہ خیمہ سے باہر نکلا تو اُسے ایک نیا لشکر نظر آیا۔ اس لشکر کے لوگوں کی وضع قطع اور صورت شکل اسے کچھ مانوس سی نظر آئی —— معلوم ہوا نجیب الدولہ ایک مختصری جمعیت کے ساتھ وارد ہوا ہے۔ فیروز بخت فوراً نجیب الدولہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور ساری رام کہانی کہہ سُنائی۔ نجیب الدولہ بڑے غور سے فیروز بخت کی باتیں سُنتا رہا۔ پھر اُس نے کہا۔

"میرا اندیشہ صحیح ثابت ہوا۔ میں پہلے ہی سے شجاع الدولہ کی طرف سے غیر مطمئن تھا، وہی ہوا۔ اب بتاؤ کیا کیا جائے؟ شاہ ابدالی کا اصرار ہے کہ شجاع الدولہ کو کسی طرح بھی اس کے حضور میں پہنچایا جائے۔ وہ کہتا ہے جب راجپوت، مرہٹے، سکھ اور جاٹ اپنے تمام معلوم و مشہور اختلافات و نزاعات کے باوجود متحد ہو سکتے ہیں تو کیا وجہ ہے کہ مسلمان

وہ ہیں سدِّ سکندری نہ بن جائیں ؟ ہندو اگر ہار بھی جائیں تو بھی انھیں اس دیس میں رہنا ہے، لیکن مسلمان اگر ہارے تو وہ کہاں جائیں گے ؟ اجالی نے بڑی امید اور توقع کے ساتھ مجھے بھیجا ہے، لیکن تمھاری باتیں سُننے کے بعد جو تھوڑی بہت آس تھی وہ بھی یاس سے بدل گئی !

فیروز بخت۔ "آپ کا خیال ہے شجاع الدولہ آپ کے ساتھ نہیں جائے گا ؟"

نجیب الدولہ۔ "کیا تمھارا یہ خیال نہیں ہے ؟"

فیروز بخت۔ "پہلے تھا، اب نہیں ہے !"

نجیب الدولہ۔ "وہ کون سی چیز ہے جس نے تمھیں پر امید بنا رکھا ہے ؟"

فیروز بخت۔ "آپ کا وجود، آپ کی شخصیت، آپ کا اثر !"

نجیب الدولہ۔ "کاش ! شجاع الدولہ کے دل میں بھی میرا وہی وقار ہوتا، جو تمھارے دل میں ہے، وہ تو مجھے نہ صرف مجھے بلکہ تمام روہیلہ سرداروں کو اُجڈ گنوار سمجھتا ہے !"

فیروز بخت۔ "ہاں سمجھتا ہے، خود میرے سامنے بھی کئی مرتبہ وہ اس خیال کا اظہار کر چکا ہے، لیکن دو باتیں ہیں جن سے مجھے امید بندھتی ہے، ایک تو یہ کہ، وہ بھی بہرحال مسلمان ہے، اب تک اس کی سمجھ میں یہ بات نہیں آسکی، کہ یہ اسلام کے وقار کا سوال ہے، مسلمانوں کی زندگی اور موت کا مسئلہ ہے، جب بھی یہ بات اس کے ذہن میں آگئی وہ روہیلوں سے خفگی اور بدگمانی کے باوجود ہمارا ساتھ دے گا !"

نجیب الدولہ۔ "خدا کرے ایسا ہی ہو !"

فیروز بخت۔ "مجھے خدا کے فضل و کرم سے امید ہے ایسا ہی ہوگا لیکن آپ بھی ایک

بات کا خیال رکھئے!"

نجیب الدولہ۔ "کس بات کا خیال رکھوں؟"

فیروز بخت۔ "شجاع الدولہ خواہ کیسی ہی تلخ اور تُرش باتیں کرے مگر آپ مشتعل نہ ہوں!"

نجیب الدولہ۔ "نہیں بھئی ایسا نہیں ہو سکتا، وہ میری توہین بھی کرے تو بھی مشتعل نہیں ہو سکتا! اس لئے کہ یہ میرا ذاتی معاملہ نہیں، اسلام کی عزت اور مسلمانوں کی زندگی کا سوال ہے!"

فیروز بخت۔ "بس تو انشاء اللہ آپ ضرور کامیاب ہوں گے!"

نجیب الدولہ۔ "خدا ہم چنیں کند!"

○

شجاع الدولہ کو جب یہ معلوم ہوا کہ نجیب الدولہ اس سے ملنے کے لئے بنفس نفیس آیا ہے، تو وہ بہت سٹ پٹایا، نجیب الدولہ بہر حال اس کا معاصر تھا، ہم چشم تھا، عزت مرتبے اور وقار کے لحاظ سے کسی طرح اس سے کم نہیں تھا، اختلافات خواہ کتنے ہی ہوں پٹھانوں کے بارے میں اُس کی رائے خواہ کتنی ہی بُری ہو، لیکن اگر نجیب الدولہ گھر پر آجائے، تو وہ اُسے دھتکار نہیں سکتا۔

شجاع الدولہ نے بڑے کرّ و فر اور شاہانہ شان و تجمل کے ساتھ نجیب الدولہ کی کئی دعوتیں کیں، اس کی خاطر واشت میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا، دربار میں اس کی کرسی اپنی کرسی کے پاس بچھوا تا تھا، تمام حکام اور سرداران فوج کو تاکید کی تھی کہ خبردار ہمارے بھائی کے اعزاز و احترام میں فرق نہ آئے۔

چند روز مہمان رہنے کے بعد اب وہ شجاع الدولہ کا بھائی بن گیا تھا، لیکن

اِس ظاہری حسنِ سلوک کے باوجود اب تک نجیب الدولہ کو حرفِ مطلب زبان پر لانے کا موقع شجاع الدولہ نے نہیں دیا تھا۔ وہ دنیا جہان کی باتیں کرتا تھا، دُنیا کے ہر موضوع پر تبادلۂ خیال کرتا تھا، لیکن اتنی ہوشیاری کے ساتھ کہ نجیب الدولہ کو زبان کھولنے کا موقع ہی نہیں ملتا تھا۔ جہاں شجاع الدولہ نے یہ محسوس کیا کہ اب نجیب الدولہ اصل موضوع زیرِ بحث لائے گا۔ فوراً وہ پلٹا کھا کر دوسری باتیں شروع کر دیتا تھا۔

اسی طرح کئی دن گذر گئے، ایک روز نجیب الدولہ نے کہا "میں نے ارادہ کر لیا ہے کہ کل واپس چلا جاؤں!"

شجاع الدولہ۔ "جی نہیں یہ نہیں ہو سکتا، آپ ابھی نہیں جا سکتے، آپ ہمارے مہمان ہیں اور مہمان کے بارے میں ہم مشرقی لوگوں کا یہ کلیہ ہے کہ

آمدن بہ ارادت رفتن بہ اجازت

"ابھی آپ کو رہنا پڑے گا!"

نجیب الدولہ۔ "آپ نے جس ٹھاٹھ کے ساتھ میری مہمانداری کے فرائض انجام دیے ہیں، انھیں کبھی نہ بھول سکوں گا، آپ کی سیرچشمی، اولوالعزمی، عالی ظرفی، وسعتِ اخلاق، خلوص اور محبت کی داستانیں سنا کرتا تھا، خدا کا شکر ہے جو کچھ کانوں سے سُنا تھا، اُس سے زیادہ دیکھ لیا۔"

شجاع الدولہ۔ "آپ تو میری شان میں قصیدے پڑھنے لگے۔"

نجیب الدولہ: "کاش میں شاعر ہوتا۔"

شجاع الدولہ۔ "یہ باتیں چھوڑیئے ——— ابھی چند روز اور رہیے پھر چلے جایئے گا!"

نجیب الدولہ۔ "نہیں میرے بھائی یہ نہیں ہو سکتا، میں تو اِس لئے آیا تھا، کہ آپ کو

اپنے ساتھ لے جاؤں اور آپ مجھی کو نہیں جانے دیتے!"

شجاع الدولہ۔ "آپ کا اگر کوئی کام ہو، تو بے بلائے سر آنکھوں پر حاضر ہونے کو تیار ہوں!"

نجیب الدولہ۔ "لیکن اگر اسلام کا اور مسلمانوں کا کام ہو تو؟"

شجاع الدولہ۔ "یہ مولویانہ باتیں آپ پر زیب نہیں دیتیں، آپ سپاہی ہیں!"

نجیب الدولہ۔ "ہاں میں سپاہی ہوں ——— لیکن مسلمان بھی ہوں، میری تلوار اس لئے کہ اسلام کے دشمنوں کا سر کاٹے، اس لئے نہیں ہے کہ میری ذات کی حفاظت کرے!"

شجاع الدولہ۔ "اس طرح کی باتیں فیروز بخت بھی کرتا تھا لیکن یقین کیجئے، نہ وہ مجھے قائل کر سکا، نہ آپ کر سکیں گے!"

نجیب الدولہ۔ "اس لئے کہ آپ قائل نہ ہونے کا فیصلہ کر چکے ہیں، سوتے کو جگایا جا سکتا ہے لیکن جاگتے ہوئے کو بیدار نہیں کیا جا سکتا!"

شجاع الدولہ۔ "بھائی صاحب یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ — آپ خود غور کیجئے، میں شاہ ابدالی کا ساتھ کیوں دوں۔ کیا میرے باپ صفدر جنگ نے اسے سرہند کے مقام پر شکست نہیں دی تھی[1]۔ کیا آپ سمجھتے ہیں ابدالی کے دل سے وہ داغ دھل گیا؟ اس کے علاوہ ہم بادشاہ دہلی کے خادم ہیں، دوسرے شاہوں اور فرمانرواؤں کو کب خاطر میں لاتے ہیں؟ ——— علاوہ ازیں مرہٹوں کے وکیل آئے ہیں، ہم سے کبھی مزاحم نہ ہونے کا عہد کرتے ہیں، اگر شاہ ابدالی شاہ ہند بن گیا، تو

---

[1] سیرۃ المتاخرین۔ عماد السعادت نیز تاریخ مالوہ (تاریخ اودھ)

کیا ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ دے گا؟"

نجیب الدولہ: "آپ کی یہ باتیں سُن کر مجھے تعجب ہوا، اور افسوس بھی!"

شجاع الدولہ: "کیوں؟ کس لئے؟"

نجیب الدولہ: "ابدالی کے بارے میں کتنے بُرے خیالات رکھتے ہیں آپ! اور اس کی یہ کیفیت ہے کہ گھنٹوں اور پہروں آپ کا ذکر کرتا ہے، اس کی نظر میں سارے ہندوستان میں کوئی رئیس بھی اتنا شائستہ، اتنا مہذّب، اتنا مستقلین، اور با تنا شریف، باوضع نہیں جتنا شجاع الدولہ!"

شجاع الدولہ: "یہ آپ نے کیسے جانا؟"

نجیب الدولہ: "اس کا سب سے بڑا ثبوت میرا وجود ہے، ایسے نازک مرحلہ پر وہ ایک معمولی سپاہی کو بھی اپنے لشکر سے باہر جانے کی اجازت نہیں دے سکتا لیکن مجھے اصرار کرکے اُس نے بھیجا ہے کہ آپ کی خدمت میں پہنچوں اور آپ کو اس سے ملاقات کرنے اور اُس کا ساتھ دینے پر آمادہ کروں!"

شجاع الدولہ: "ثبوت تو آپ نے واقعی بڑا زبردست دیا۔"

نجیب الدولہ: "پھر ایک اور بات بھی سوچیے کہ ان مرہٹوں کے استیصال کا یہی وقت ہے، اور اگر اب قلع قمع نہ ہوا تو لکھ لیجئے ہندوستان کی حکومت ان کے ہاتھ میں ہوگی، اور یہ بھی لکھ لیجئے کہ ان کی حکومت میں نہ نجیب الدولہ کا علاقہ بچ سکتا ہے، نہ شجاع الدولہ کی ریاست۔!"

شجاع الدولہ نے ان باتوں کا کوئی جواب نہیں دیا۔ نجیب الدولہ نے کہا: جب دلّی کا بادشاہ معزول کر دیا جائے تو آپ وزیر کس کے بنیں گے، مجھے بتائیے بھائی صاحب!"

باب (۵۵)

شاہِ ابدالی کی تقریر

بھاؤ اپنے تمام لاؤ لشکر سمیت دِلّی میں مقیم تھا، فوجی نقطۂ نظر سے یہ اُس کی بہت بڑی غلطی تھی۔ احمد شاہ نے اس غلطی کو محسوس کر لیا تھا۔ اس لئے وہ دِلّی مرہٹوں سے چھین لینے کے باوجود وہاں نہ ٹھہرا۔ اتنی بڑی فوج کے ساتھ شہر میں رہ کر اس کا انتظام کرنا ناممکن تھا۔ احمد شاہ اس دشواری سے محفوظ رہا۔ لیکن بھاؤ مصیبت کے چکر میں پھنس گیا، رسد کی کمی، اس کے لشکر میں بُری طرح محسوس ہو رہی تھی!

بھاؤ نے اپنے سرداروں سے مشورہ کیا۔ سب نے بالاتفاق یہ رائے دی کہ دِلّی کا قیام مصیبت کی جڑ ہے۔ ابدالی کی طرح کسی کھلی جگہ کو منتخب کیجئے اور وہاں پڑاؤ ڈالئے۔

بھاؤ نے کہا۔ "ہاں یہی کرنا پڑے گا۔ کیونکہ برسات کے باعث دریائے جمنا طغیانی پر ہے اور بغیر اسے عبور کئے ابدالی کے لشکر پر حملہ نہیں کیا جا سکتا!"

سُورج مل نے رائے دی۔ "آپ کا یہ فیصلہ بہت مناسب ہے، دِلّی سے کسی اور مناسب مقام کی طرف نکل چلئے۔ وہاں رسد آسانی سے دستیاب ہو سکے گی اور جو کمی ہو گی اسے میں پورا کروں گا!"

بھاؤ نے پوچھا۔ "وہ کس طرح؟"

سورج مل نے جواب دیا۔ "اس طرح کہ میں بھرت پور چند روز کے لئے جاتا ہوں وہاں سے کافی رسد بھیجوں گا، اور جب واپس آؤں گا تو اپنے ساتھ رسد کا بہت بڑا ذخیرہ لیتا آؤں گا!"

بھاؤ کو یہ تجویز پسند آئی۔ اُس نے سورج مل کو اجازت دے دی کہ وہ بھرت پور چلا جائے۔ سورج مل اس طرح بھاؤ کو بے وقوف بنا کر اپنی فوج سمیت اس کے لشکر سے نکل آیا۔ اور ایک دوسری جگہ پڑاؤ کیا، اور خود کچھ روز کے لئے بھرت پور چلا گیا کہ وہاں سے "دہن سگ بہ لقمہ دوختہ بہ" کے اصول پر کچھ رسد بھیجے، درحقیقت اُس نے بھاؤ کی تلوّن کیشی اور سیماب وشی، اور بے تدبیری سے بددل ہو کر یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ اب وہ اس کا ساتھ نہیں دے گا لیکن مصلحتاً اس فیصلہ کا اعلان نہیں کیا تھا۔ اعلان نہ کرنے کی وجہ یہ تھی کہ وُہ بھی شجاع الدولہ کی طرح تیل اور تیل کی دھار دیکھنا چاہتا تھا، وہ خاموش رہ کر موقع کا منتظر تھا۔ اسی خیال کے پیشِ نظر اُس نے درپردہ ابدالی سے سازباز کر لی تھی اور یہ رائے اُسے شجاع الدولہ نے دی تھی۔ سورج مل نے بھاؤ کی ناعاقبت اندیشانہ حرکتوں سے عاجز آ کر اُسے ایک خط لکھا تھا، اور اس سے مشورہ کیا تھا کہ اب وہ کیا کرے؟ شجاع الدولہ نے جو بات اپنے لئے مناسب سمجھی تھی، وہی سورج مل کو بھی لکھ بھیجی، اور سورج مل نے بڑی دُوربینی سے کام لے کر اس کا مشورہ قبول کر لیا[1] چنانچہ شجاع الدولہ کے مشورہ کے بموجب وُہ

---

[1] شجاع الدولہ نے سورج مل کو جو طویل خط لکھا تھا، اُس کا خلاصہ چند سطروں میں درج کرتا ہوں:۔

"ہمہ سرداران بہ رفاقت بادشاہ ابدالی عہد موافقت بستند و برائے مقابلہ بھاؤ یکدل و یک جہت گشتند، چوں آمدن بھاؤ، سرمایہ دکن موجب اختلال ہندوستان و دفع ایں فساد کشور و آشوب بجد و اتفاق د

بھاؤ کے لشکر سے علیحدہ ہوگیا، تو شجاع الدولہ نے احمد شاہ کے دربار سے خلعت اور فرمان اس کے پاس بھجوا دیا۔

سورج مل کے جانے کے بعد بھاؤ نے دلّی سے ہٹ کر شمال کی طرف بڑھنا شروع کیا[۱]

احمد شاہ کو جونہی یہ اطلاع ملی کہ بھاؤ لشکر سمیت دلّی سے باہر نکلا ہے، اُس نے تعاقب کا فیصلہ کرلیا۔ دریائے جمنا کی طغیانی اگرچہ زوروں پر تھی، لیکن اُس نے فیصلہ کرلیا کہ دریا کو عبور کرے گا۔ وہ کنارے کنارے بڑھتا ہوا، باغپت کے قریب[۲] پہنچا، یہاں بھی گہرائی کافی تھی، لیکن بہت زیادہ نہیں، اُس نے اس موقع پر ایک دل ہلا دینے والی تقریر کی۔ اُس نے کہا۔

دوستو، اور ساتھیو!

۔ تمہاری آنکھوں کے سامنے یہ لہریں مارتا ہوا دریا ہے ذخّار ہے۔ اس کی موجیں اُٹھ کر آسمان سے باتیں کر رہی ہیں، اس کی گہرائی کا کوئی اندازہ نہیں، اس دریا میں اُترنے

(بقیہ صفحہ ۵۲۷) ہمراہ فقت ہر رئیس نامدار صورت نے بندہ واینڈا القلم می آید کہ آں مہربان کہ پیش آمدہ، ہند وستان از مصلحت کار چہ اندیشیدند بہتر ہمیں است کہ از سادگی اوکنارہ کشیدہ و عرضداشت متضمن وثوق ارادت مصدق مجودیت بجہت حضور والاالبفر ستند چوں قدم ایں جانب درمیان است حسن ارادت آں مہربان را وحضور گزارش کردہ شقہ خاص ہیچ عہدنامہ حضور باقدس کہ نسلاً فنسل وبطناً بعد بطن مراعات خاندان ذی شان از بیش گاہ مقدس بعمل آید حاصل نمودہ خواہد فرستاد!

[۱] پانی پت کا خونیں میدان جنگ [۲] پانی پت کا خونیں میدان جنگ

[۳] پانی پت کا خونیں میدان جنگ

والے ہر آدمی کے لئے اس کی ترغیب کا وبانہ بن سکتی ہے، اس طوفان خیز دریا کی موجیں موت اور ہلاکت کا پیغام ہیں لیکن کیا تم موت سے ڈرتے ہو؟ کیا ہلاکت تمہارے نزدیک کوئی خوفناک چیز ہے؟ میں اس بات کے ماننے سے انکار کرتا ہوں، موت سے کافر ڈرتا ہے مسلمان نہیں، مسلمان تو مسکرا مسکرا کر موت کا استقبال کرتا ہے، وہ جانتا ہے، موت صرف ایک بار آتی ہے اور اس موت سے اچھی کوئی موت نہیں ہو سکتی، جو خدا کے راستے میں آئے، اگر تم مالِ غنیمت کے لالچ میں نکلے ہو، دُنیا کمانے کے لئے اپنے گھروں سے تم نے جُدائی اختیار کی ہے، سیم و زر کے سکوں کی خاطر تُم نے اس طویل سفر کی مصیبتیں جھیلیں ہیں تو میں نصیحت کرتا ہوں کہ دُور ہٹ جاؤ، اس مچلتی ہوئی موجوں والے خوفناک دریا کے قریب بھی نہ پھٹکو لیکن اگر تُم رضائے الٰہی کا توشہ لے کر گھر سے نکلے تھے، اگر خُدا کے آخری دین کی سربلندی کے لئے تم نے وطنِ عزیز کو خیرباد کہا، اگر اسلام کی حُرمت اور مسلمانوں کے وقار کی خاطر تُم نے یہ کڑیاں جھیلی ہیں، تو میں تمھیں حکم دیتا ہوں کہ اس دریا میں کود پڑو، اس دریا کو پار کرو، اور دیکھو وہ دُشمن سامنے ہے، اپنے نیزے اس کے سینہ میں پیوست کر دو، تم میں کچھ سوار ہیں کچھ پیادے، ہر سوار اپنے ساتھ ایک پیادے کو بٹھائے اور خدا کا نام لیکر گھوڑے کو دریا میں ڈال دے ـــــ لیکن نہیں میں حکم نہیں دیتا، اپنا نمونہ پیش کرتا ہوں... تمہارا جی چاہے پیروی کرو، جی چاہے واپس چلے جاؤ ـــــ اللہ اکبر!"

اور یہ نعرہ لگاتے ہی ابدالی نے ایک پیادے کو اپنے پیچھے بٹھایا، اور گھوڑا پانی میں ڈال دیا!

سارے لشکر میں ہلچل مچ گئی، ہر سوار ایک ایک پیادے کو لے کر دریا میں کود پڑا اور دیکھتے دیکھتے ابدالی کے سارے لشکر نے طوفان خیز جمنا کو عبور کر لیا۔

بھاؤ یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ وہ اس شجاعت کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا، لشکر کو اترتے دیکھ کر اس نے کچھ سپاہی قراؤلی لڑنے کے لیے چھوڑ دیئے اور اپنی فوج کو لے کر سونی پت کی طرف بڑھا۔ قراؤلی لڑنے والوں کو احمد شاہ کے لشکر نے شکست دی اور تعاقب جاری رکھا، یہاں تک کہ تاریخ کے مشہور پانی پت کے میدان میں دونوں فوجوں نے آمنے سامنے پڑاؤ ڈال دیئے[1]

---

[1] پانی پت کا خونیں میدان جنگ

کاشی راؤ نے جو شجاع الدولہ کا خاص آدمی تھا، اور اس کی وکالت کے فرائض انجام دیا کرتا تھا اور مرہٹوں سے صلح کی بات چیت میں برابر پیش پیش رہا تھا، اور اپنی چشم دید سرگزشت میں مرہٹہ سواروں کی تعداد ۴۰ ہزار لکھی ہے اور پیادے ۳۰ ہزار۔

گرانٹ ڈف کا بیان بھی اس کی تائید کرتا ہے، اس نے مرہٹہ سواروں کی تعداد ۵۸ ہزار لکھی ہے

الفنسٹن نے باقاعدہ اور بے قاعدہ فوج کی مجموعی تعداد ۳ لاکھ لکھی ہے۔

گرانٹ ڈف نے کل افغان فوج کی تعداد، جس میں سوار پیادہ باقاعدہ بے قاعدہ سب شامل تھے، ۶۹ ہزار لکھی ہے، ان بیانات سے فریقین کی فوجی تعداد کا صحیح اندازہ ہو سکتا ہے!

باب (۵۶)

گوبندراؤ پنڈت کا قتل

انتربید یعنی دوآبہ گنگ وجمن (گنگا جمنا) اور بندیل کھنڈ میں، گوبند راؤ پنڈت، بالاجی باجی راؤ پیشوا کی طرف سے، چوتھ اور سردیش مکھی اور منصوبہ علاقوں سے مال گزاری وصول کیا کرتا تھا۔

یہ بڑا ظالم اور سفاک شخص تھا!

وہ گوبند راؤ پنڈت ہی تھا جس نے مرہٹوں کے جوشِ انتقام میں روہیلوں کو تباہ کرنے کے لئے اودھ کے تیرہ سو دیہات جلا کر خاکستر کر دیئے تھے۔ مرہٹوں کی طرف سے نجیب الدولہ کا محاصرہ کرنے والا - اور اسے تباہ کرنے کا منصوبہ بنانے والا بھی گوبند راؤ پنڈت ہی تھا۔ اگر کہیں شجاع الدولہ وقت پر پہنچ نہ جاتا تو اس میں کوئی شبہ نہیں پنڈت نے نجیب الدولہ کو مار لیا تھا۔

بھاؤ نے جب دیکھا کہ دشمن سامنے کھڑا ہے تو وہ بھی اپنی تدبیروں میں مصروف ہو گیا اس نے گوبند راؤ پنڈت کو تاکیدی حکم بھیجا کہ ہر قسم کے بہترین ساز و سامان سے مسلح جتنی فوج بھی کمک کے طور پر بھیج سکتے ہو بھیجو کہ دشمن سر پہ کھڑا ہے، اور لڑائی چھڑ جانے کا ہر وقت اندیشہ ہے۔ اس نے یہ تاکید بھی کی کہ افغان لشکر کو باہر سے رسد بالکل

نہ پہنچنے پائے![1]

○

گوبند راؤ حکم کا بندہ تھا!

بھاؤ کا فرمان پاتے ہی وہ کیل کانٹے سے لیس ہونے کی تیاریاں کرنے لگا بہت جلد اس کی تیاریاں مکمل ہو گئیں۔ اُس نے بارہ ہزار فوج[2] فراہم کی اور خود بندیل کھنڈ سے اُٹھ کر سید حا میرٹھ چلا آیا۔ اُس نے طے کر لیا کہ جب تک یہ مرحلے نہ ہو جائے، اس وقت تک اس کا مستقر میرٹھ ہی رہے گا، یہ ایسا مقام تھا کہ یہاں بیٹھ کر وہ بڑی آسانی سے ابدالی کو رسد پہنچانے والی پارٹیوں پر حملہ کر کے انھیں تتر بتر کر سکتا تھا، اور وہی رسد لوٹ کر نہایت اطمینان سے بھاؤ کے لشکر میں پہنچا سکتا تھا، اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ گوبند راؤ کی یہ چال بڑی اہم تھی، اور وہ اس میں بڑی حد تک کامیاب بھی ہوا، ابدالی کے علاوہ اگر کوئی اور شخص ہوتا تو وہ اس مرحلہ پر بغیر لڑے بھڑے شکست کھا جاتا، کیونکہ بہادر سے بہادر فوج بھی پیٹ پر پتھر باندھ کر بھوک اور پیاس سے نڈھال ہو کر نہیں لڑ سکتی، اور گوبند راؤ کی چال یہی تھی کہ ابدالی کے لشکر میں رسد کا ایک دانہ بھی نہ پہنچنے پائے۔

پانی پت سے دِلّی تک کا سارا علاقہ پُورے طور پر مرہٹوں کے قبضہ اور تصرف میں تھا، اس راستے سے ابدالی کے لشکر کو رسد پہنچنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا، اب صرف بنگش اور روہیلہ سرداروں کے علاقے رہ گئے تھے، جہاں سے رسد آ سکتی تھی، اور آہی تھی گوبند راؤ پنڈت نے یہ راستہ بھی مسدود کر دیا۔

---

[1] پانی پت کا خونیں میدانِ جنگ

[2] پانی پت کا خونیں میدانِ جنگ

اِس اقدام نے ابدالی کے لشکر میں ہلچل پیدا کر دی اور خود ابدالی بھی باوصف اپنی شجاعت اور استقلال کے اِس صورتِ حال سے گھبرا اُٹھا۔

جب پے در پے یہ خبر اس کے کان تک پہنچنے لگی کہ لشکر فاقے کر رہا ہے، نہ گیہوں ہے نہ چاول، نہ چارہ، آدمی بھی بھوکے مر رہے ہیں اور جانور بھی، تو وہ بہت چوکنا ہُوا۔ اس نے احمد خاں بنگش سے کہا۔

"تم نے تو بڑے بڑے وعدے کئے تھے رسد پہنچانے کے، پھر تمہارے ہاں سے رسد کیوں نہیں آئی؟ میں لشکر میں یہ کیسی افراتفری دیکھ رہا ہوں؟"

بنگش خود بہت نادم تھا، اُس نے رُکتے ہُوئے جواب دیا۔ "رسد کی کمی نہیں، مگر...."

ابدالی نے جھنجھلا کر کہا۔ "مگر وہ آنے سے انکار کرتی ہے؟"

بنگش: "نہیں اعلیٰحضرت، وہ آنے پر تیار ہے، لیکن گوبند پنڈت مارِ خزانہ بن کر راستے میں بیٹھا ہے، وہ رسد چھین لیتا ہے، یہاں تک پہنچنے نہیں دیتا ——!"

احمد شاہ ابدالی، حافظ رحمت خاں کی طرف مخاطب ہُوا۔ "اچھا صاحب! بنگش کی رسد اس لئے نہیں پہنچتی، مگر آپ کے علاقہ میں قحط کیوں پڑ گیا؟"

حافظ رحمت خاں۔ "جہاں پناہ! میرے علاقہ میں قحط نہیں پڑا، بلکہ اِس مرتبہ فصل خاص طور پر اچھی ہُوئی ہے مگر....."

یہ "مگر" کا لفظ سُن کر ابدالی پھر چڑ گیا۔ اُس نے گرج کر کہا۔ "مگر مگر —————— آخر کیا کہنا چاہتے ہو تم؟"

حافظ رحمت خاں۔ "گوبند پنڈت کی شرارتیں وہاں بھی جاری ہیں!"

غصّہ سے ابدالی کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔ اُس نے نجیب الدولہ کی طرف رُخ کیا۔ "تمہارے

علاقہ پر بھی گوبند راؤ پنڈت کی حکومت ہے، کیوں؟"

نجیب الدولہ کچھ جواب نہ دے سکا، گردن جھکا کر خاموش ہو گیا!

احمد شاہ نے بآوازِ بلند کہا: "ہم میدانِ جنگ میں جامِ شہادت نوش کرنے آئے ہیں چوروں کی طرح مرنے کے لئے نہیں۔ میں پوچھتا ہوں یہ گوبند راؤ پنڈت کون شخص ہے؟ کہاں ہے؟"

نجیب الدولہ۔ "پیشوا کا خاص اور معتمد آدمی!"

حافظ رحمت خاں۔ "رہزن، لٹیرا، ڈاکو ——— یہ وہی شخص ہے جس نے اودھ کے تیرہ سو دیہات جلا کر بھسم کر دیئے، جس نے نجیب الدولہ کا محاصرہ کر لیا تھا، جس کے نام سے انسانیت پناہ مانگتی ہے، جو نہیں جانتا رحم کسے کہتے ہیں؟ انسانیت کسے کہتے ہیں؟ شرافت کس چیز کا نام ہے؟ جو خون میں نہاتا، خون سے کھیلتا ہے، خون ریزی کو پسند کرتا ہے، جو انسان کی زندگی کو مچھر اور کھٹمل سے بھی زیادہ بے وقعت سمجھتا ہے، جس کے دل پر بیواؤں کی آہیں اثر نہیں کرتیں، جس کے کانوں تک یتیموں کی فریاد نہیں پہنچتی، جو بوڑھوں، بیماروں، اپاہجوں کے ساتھ بھی رعایت نہیں کرتا!"

احمد شاہ ابدالی۔ "ایسے شخص کو دُنیا میں زندہ رہنے کا حق نہیں، اسے مرنا پڑے گا!"

اور پھر بآوازِ بلند کہا: "عطائی خاں!"

ایک خوش اندام، قوی ہیکل اور وجیہہ نوجوان سامنے آ کر کھڑا ہو گیا، اُس کا سر اپنے آقا کے سامنے جھکا ہوا تھا۔ لیکن آنکھوں کی چمک کہہ رہی تھی کہ وہ موت کو ایک کھیل سمجھتا ہے۔ زندگی کی اُس کی نظر میں کوئی وقعت نہیں!

ابدالی نے کہا: "جلد از جلد گوبند راؤ پنڈت کا سر ہماری خدمت میں پیش کرو!"

عطائی خاں نے سر جھکا کر عرض کیا: "جہاں پناہ! ——— غلام تعمیلِ ارشاد کے لئے حاضر ہے

جاتا ہے!

ابدالی۔ "تمہارے ساتھ کتنی فوج جائے گی؟"

عطائی خاں: "حضور کے ارشاد پر اس امر کا انحصار ہے!"

ابدالی۔ "ہمیں معلوم ہوا ہے، گوبند راؤ پنڈت کے پاس بارہ ہزار مسلح فوج ہے، تم زیادہ سے زیادہ پانچ ہزار سپاہی[1] لے جا سکتے ہو!"

عطائی خاں۔ "جہاں پناہ!"

ابدالی۔ "تم راستہ سے ناواقف ہو، تمہاری رہنمائی کے لئے کون ساتھ جائے گا؟"

فیروز بخت سامنے آکر کھڑا ہو گیا، ابدالی نے اس پر ایک نظر ڈالی اور کہا۔ "تم جاؤ گے؟ میں تم ہی کو بھیجنا چاہتا تھا، اچھا ہوا تم خود سامنے آگئے، جاؤ —— خدا تمہارا حامی و ناصر ہو!"

عطائی خاں سہ پہر کو لشکر سے نکل کر روانہ ہوا، رات بھر میں اس نے چالیس کوس کی مسافت طے کر لی، عین طلوعِ آفتاب کے وقت اس مقام پر جا پہنچا، جہاں گوبند پنڈت اپنے لشکر کے ساتھ آموں کے ایک باغ میں مقیم تھا، افغانوں کو یکایک اپنے سر پر پاکر وہ گھبرا گیا۔ لیکن سنبھلا، لڑا اور مارا گیا، اس کا سارا لشکر تباہ ہو گیا، اس کا سارا ساز و سامان مع اس کے سر کے عطائی خاں نے لاکر ابدالی کے قدموں پر ڈال دیا[2]۔

---

[1] پانی پت کا خونیں میدانِ جنگ

[2] . . . .

باب (۵۷)

ایک نیا حادثہ

ابدالی اور بھاؤ کے لشکر میں یوں تو ابھی باقاعدہ جنگ نہیں شروع ہوئی تھی، لیکن جھڑپیں ہورہی تھیں، مگر دورمقام دیکھ کر کبھی بھاؤ کے سپاہی آتے تھے اور افراتفری مچا کر چلے جاتے تھے۔ کبھی ابدالی کے سپاہی پہنچتے تھے اور معرکہ دار وگیر برپا کر کے واپس ہو جاتے تھے،

جسونت بڑا منچلا سپاہی تھا، ان جھڑپوں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصّہ لیتا تھا، اگرچہ فیروز بخت نے اُسے منع کر رکھا تھا کہ وہ ان ہنگامی معاملات سے دُور رہے۔ لیکن اس کی امنگ مجبور کرتی تھی کہ کارنامے دکھائے، اُس کا جذبہ اُبھارتا تھا کہ اپنی بہادری کے جھنڈے گاڑ دے۔ اس کی حمیتِ دینی اُکساتی تھی کہ دین کے راستہ میں سرفروش مجاہد کی حیثیت سے کافروں کی سرکوبی کرے — وہ اب ہندو نہیں مسلمان تھا، اور اپنے جذبہ اسلامی کے مظاہرے کے لئے بے چین رہتا تھا۔

کئی مرتبہ وہ دشمن کے لشکر سے قیمتی قیمتی چیزیں چھین لایا۔ دُشمن نے اُس کے تعاقب میں پوری سرگرمی دکھائی۔ مگر گرد بھی نہ پا سکا!

○

ایک اسی طرح کی مہم سے فارغ ہو کر جسونت سنگھ شاداں و فرحاں اپنے ساتھیوں کے ساتھ واپس آ رہا تھا۔ لیکن رات کی تاریکی میں ساتھی بچھڑ گئے، اور وہ راستہ بھول کر ایک سنسان مقام کی طرف جا نکلا۔ وہ اس علاقہ کے راستوں سے ناواقف تھا، پھر اندھیرا، اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کدھر جائے۔ کس طرف اپنے گھوڑے باگیں موڑے؟

اتنے میں پیچھے سے کسی نے تلوار ماری، وہ پھسلتی ہوئی اُس کے شانہ پر پڑی، وہ خود تو معمولی طور پر زخمی ہوا، لیکن گھوڑا ایسا گرا کہ پھر نہ اُٹھ سکا!

دو مضبوط ہاتھوں نے اُسے اپنی گرفت میں لے لیا، اُس نے اپنے آپ کو چھڑانے کی بڑی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔ اُس نے برہمی اور غصّہ کے عالم میں پوچھا۔

"تم کون ہو؟ کیا چاہتے ؟"

جواب ملا۔ "تمہیں چاہتے ہیں، تم پر ہزار جان سے فدا ہیں، آج سے نہیں بہت دنوں سے!"

یہ الفاظ سنکر جسونت کے کان کھڑے ہوئے۔ "میں نے تمہیں بالکل نہیں پہچانا تمہیں مغالطہ ہوا ہے، تُم مجھے کیا سمجھ رہے ہو آخر؟"

آواز آئی۔ "تم نہ پہچانو، ہم تو پہچانتے ہیں ــــ کیا تم تارا بائی نہیں ہو؟"

جسونت کے مُنہ سے بے ساختہ نکلا۔ "تارا بائی؟ تارا"

"ہاں ہاں، کیا تمہارا نام یہی نہیں ہے؟ کیا تم مرہٹہ عورت نہیں ہو، کیا تُم آننت پرشاد کو بھول گئیں؟"

تارا کانپ گئی۔ "اننت پرشاد ــــ"

"ہاں ــــ کیوں شرما گئیں؟ کیا سوچ رہی ہو آخر؟ اطمینان رکھو۔ اننت پرشاد تمہیں تکلیف نہیں پہنچا سکتا!"

تارا نے ایک مرتبہ پھر اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کی، اور زور سے کہا "میں تارا نہیں ہوں!"

اننت پرشاد۔ "تو مجھے مجبور نہ کرو، کہ میں یہ ثابت کر دوں تم تارا ہو، پھر کیا بھرم رہ جائیگا تمہارا؟ بولو؟"

تارا نے کوئی جواب نہیں دیا — سسکیاں لے کر رونے لگی، اننت پرشاد نے کہا۔ "زور زور رونے سے کیا مل جائے گا تمہیں؟ آؤ یہاں درخت کے تنہ کے پاس بیٹھیں، کچھ باتیں کریں، تاکہ رین کٹے!"

تارا اُس کے ساتھ چلنے لگی، سامنے ایک بہت بڑا برگد کا درخت تھا، اُس کے تنہ کے اردگرد ایک چبوترہ بنا ہوا تھا، اننت پرشاد نے چبوترہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ یہاں بیٹھو، لیکن تارا نہ بیٹھی، چپ چاپ کھڑی ہو گئی، اننت نے ذرا زور سے خفگی کے لہجہ میں کہا۔ "میں کہتا ہوں بیٹھو!"

تارا نے جواب دیا۔ "یہاں نہیں"

اننت۔ "اچھا یہاں نہیں تو میرے ساتھ مرہٹہ لشکر میں چلو!"

تارا۔ "تم میری گردن کاٹ لو — لیکن یاد رکھو، وہاں میری لاش جا سکتی ہے میں نہیں جا سکتی!"

اننت نرم پڑ گیا۔ "تمہیں بہرحال تم سے ضروری باتیں کرنا ہیں بغیر باتیں کئے تم یہاں سے ہل بھی نہیں سکتیں!"

تارا۔ "وہ دیکھو، سامنے چھوٹا سا مندر نظر آ رہا ہے، وہاں چلو!"

اننت۔ "وہاں سہی — آؤ۔"

چند قدم کے فاصلہ پہ مندر تھا۔ دونوں وہاں پہنچ گئے۔ یہ ایک بہت چھوٹا سا مندر تھا

اور بہت دنوں سے ویران پڑا ہوا تھا۔ یہاں پہنچنے کے بعد اطمینان سے چبوترہ پر بیٹھتے ہوئے اننت نے کہا: "آخر گفت گو کے لئے تم نے مندر کو کیوں منتخب کیا؟ یہاں کیا بات ہے جو وہاں نہیں تھی؟"

تارا نے جواب دیا: "اس لئے کہ یہاں تم اپنی طاقت کا غرور نہیں دکھا سکو گے!"

اننت۔ "کیوں؟ کیا یہاں آکر میں کچھ کمزور ہو گیا ہوں؟"

تارا۔ "اِس گھر کا مالک تُم سے بہت زیادہ طاقتور ہے!"

اننت۔ "اس گھر کا مالک کیا وہاں نہ تھا — برگد کے پاس؟"

تارا۔ "تھا — لیکن کیا اُس کے گھر میں بھی دھاندلی کرتے تم نہ ڈرو گے، تمہیں اتنا ہتیا را تو میں نہیں سمجھتی!"

ان الفاظ میں نہ جانے کیا جادو تھا کہ اننت کچھ سہم سا گیا۔ اُس نے کہا: "ہاں بھگوان کا گھر ہے، میں اس کا ادب کرتا ہوں، میں یہاں کوئی دھاندلی نہیں کروں گا!"

تارا۔ "کیا میں تمھیں اتنا کا ارمان لوں کہ تم یہاں بھی پاپی پن سے باز نہ آؤ گے؟ — کہو کیا کہتے ہو؟"

اننت۔ "تُم نے یہ سوانگ کیا رچا رکھا ہے؟ تم عورت سے مرد کیوں کر بن گئیں!"

تارا۔ "یہ تو کوئی تعجب کی بات نہیں، میں نے بہت سے مردوں کو دیکھا ہے جو عورتوں سے بدتر ہوتے ہیں!"

اننت۔ "اچھا مان لیا — لیکن مسلمانوں کے لشکر میں سپاہی بن کر رہنے کے کیا معنی؟"

تارا۔ "اس لئے کہ مسلمان سپاہیوں کی قدر کرتے ہیں!"

اننت۔ "کیا تم مسلمان بھی ہو گئیں؟"

تارا۔ "الحمد للہ!"

اننت۔ "تمھیں اپنے پرکھوں کا دھرم چھوڑتے لاج نہ آئی؟"

تارا۔ "لاج اس وقت آتی ہے جب کوئی بڑا کام کیا جائے، میں نے کوئی بڑا کام نہیں کیا۔"

اننت۔ "اس سے بڑھ کر بڑی بات کیا ہوگی کہ تم نے باپ دادا کا دھرم چھوڑ دیا، اور ان لوگوں کا دھرم قبول کر لیا، جن میں نہ انسانیت ہے نہ شرافت!"

"تارا ہنس پڑی۔"

اننت۔ "تم ہنس رہی ہو شاید میری بے وقوفی پر، کیوں؟"

تارا۔ "بات تو یہی ہے، تمہاری تلوار تو اوچھی پڑی، پھر بھی ہلکا سا زخم آ ہی گیا، تم یہاں پکڑ لائے گئے۔ مرہم پٹی بھی نہ کر سکی، خون اب تک رس رہا ہے، اور درد بھی ہو رہا ہے لیکن تمہاری اس بات پر میں اپنی بات بھول گئی مجھے ہنسی آ گئی۔"

اننت۔ "آخر میں نے کون سی ایسی بات کہہ دی؟"

تارا۔ "یہی کہ مسلمانوں میں نہ انسانیت ہے نہ شرافت!"

اننت۔ "کچھ غلط کہا میں نے؟"

تارا۔ "اننت تم دنیا کو دھوکا دے سکتے ہو لیکن اپنے آپ کو نہیں دے سکتے، اپنے گریبان میں منہ ڈالو، اور بتاؤ کیا تمہارے پاس انسانیت ہے؟ شرافت ہے؟ تم مسلمانوں کو برا سمجھتے ہو حالانکہ اگر ان کا دھوون بھی تم پر پڑ جائے، تو پاک ہو جاؤ!"

اننت۔ "تارا ـــــ میں یہ باتیں نہیں سن سکتا!"

تارا۔ "تو کانوں میں انگلیاں دے لو، اپنا راستہ لو، میرے پاس بیٹھو گے تو یہ باتیں سننا پڑیں گی تمھیں!"

اننت۔ "لیکن ایسی باتیں؟"

تارا۔ "ہاں ایسی، بلکہ ان سے بھی بڑھ کر، تم لال پیلی آنکھیں کر کے مجھے ڈرا نہیں سکتے، تمہاری گرج سے میں سہم نہیں جاؤں گی، جانتی ہوں بڑے اچھے تلوار یئے ہو، لیکن تلوار میری رائے نہیں بدل سکتی!"

اننت۔ "آخر تم نے مسلمانوں میں کیا ایسی بات دیکھی کہ ان کا کلمہ پڑھنے لگیں؟"

تارا۔ "مسلمان آدمی نہیں اوتار ہیں، وہ کسی پر ظلم نہیں کرتے، کسی کے ساتھ وشواس گھات نہیں کرتے، کسی عورت کی آبرو نہیں لوٹتے، کسی غریب کا دل نہیں دکھاتے، کسی کے مال و دولت پر للچائی ہوئی نگاہ نہیں ڈالتے، وہ کون سا گن ہے جو ان میں نہیں؟ اور وہ کونسی برائی ہے جو تم میں نہیں؟"

اننت۔ "تارا — یہ تم کہہ رہی ہو جس کے ماں باپ ہندو تھے جس کے دادا نانا ہندو تھے جس کی ساری قوم ہندو ہے، تم؟ — تارا تم؟"

تارا۔ "ہاں اننت، یہ میں کہہ رہی ہوں، وہ کون سا دکھ تھا جو مجھے میری قوم نے نہیں دیا، وہ کون سی ذلت تھی جو مجھے اپنی قوم کے ہاتھوں نہیں اٹھانا پڑی، وہ کون سی آسانی تھی جو میرے دھرم نے مجھے دی؟ — میں خوبصورت تھی، جوان تھی، لیکن غریب اور لاچار تھی میرے لئے میرے دادا کا ہم عمر شوہر تلاش کیا گیا، میرے پاس گن تھا، سندرتا تھی، لیکن روپیہ دے کر شوہر کو خریدنا میرے بس میں نہیں تھا، تم، اننت تم، ہمیشہ مجھ پر ڈورے ڈالتے رہے کہ مجھے اپنا لو، لیکن اس کے لئے کبھی تیار نہ ہوئے کہ میرے بن جاؤ، تم چوری چھپے میرے گھر میں آتے، مجھے اڑا لے جانے کے لئے تیار تھے، لیکن اس کیلئے تیار نہ تھے کہ ڈنکے کی چوٹ دن دہاڑے برادری اور کنبہ کے سامنے میرا ہاتھ پکڑو

اور اپنی والمن بنالو! میں اگر ہندو بنی رہتی تو آج جانتے ہو میرا حشر کیا ہوتا؟

اننت۔ "کیا ہوتا؟"

تارا۔ میرا بوڑھا شوہر میرے دل پر کچوکے لگاتا، اس کا بڑھاپا میری جوانی کے سامنے آٹھ آٹھ آنسو روتا۔ میری جوانی اس کے بڑھاپے کے سامنے انگڑائی لیتی، اور ادھر اُدھر بُری نظر ڈالتی، اگر وہ مرگیا ہوتا تو تم جیسے عاشق اور پریمی کہیں کا نہ رکھتے!

اننت۔ "اور مسلمانوں نے کیا کیا تمھارے ساتھ؟"

تارا۔ "انھوں نے میرا دل نہیں دُکھایا۔ اُنھوں نے میری مجبوریوں کا مذاق نہیں اُڑایا میں ان کے پاس ایک ہندو ہی بن کر رہی۔ انھوں نے کبھی میرے مذہب پر اعتراض نہیں کیا۔ مجھے مذہب بدلنے پر مجبور نہیں کیا۔ میرے سامنے دکھیاری ہندو عورتیں آئیں، ان کی سہائتا کی، نہ ان کے روپ کو چھینا، نہ خریدا، نہ بُری نظر سے دیکھا، آج اگر یہ معلوم ہو جائے کہ میں عورت ہوں تو ان کے بُوڑھے مجھے اپنی لڑکی اور جوان اپنی بہن سمجھیں گے۔ شرم کرو اننت، شرم کرو۔ کیا تم بھی ایسے ہو، کیا تمھارے لشکر کے لوگ بھی ایسے ہیں یا کیا تمھاری قوم میں یہی گُن ہے —— لاج تمہیں آنی چاہئے اور کہتے مجھے ہو۔"

اننت اُٹھ کھڑا ہوا، غصّہ کے عالم میں ہونٹ چبانے لگا، پھر وہ تارا کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔ "کیا تم سمجھتی ہو کہ میں تمہاری باتیں مان لوں گا؟ تم جھوٹی ہو!"

تارا۔ "چلو جھوٹی سہی، نہ تمہارے بس میں مجھے انعام دینا ہے، نہ تُم مجھے سزا دے سکتے ہو!"

اننت۔ "انعام کی مستحق ہوتیں، تو ضرور انعام دیتا۔ لیکن سزا کی سزاوار ہو لہٰذا تمہیں سزا ملے گی۔"

تارا۔ "کیا سزا دو گے مجھے؟"

اننت۔ "مار ڈالوں گا!"

تارا۔ "بڑے بہادر ہو ـــــ ایک عورت کو مار ڈالوگے؟ اُفوہ، کیا کہنے ہیں تمہاری بہادری کے!"

اننت۔ "بکواس بند کرو۔"

تارا۔ "ورنہ تم مار ڈالوگے مجھے؟ ـــ شاید تم یہ سمجھتے ہو میں موت سے ڈرتی ہوں مسلمانوں سے یہی ایک بات تو خاص طور پر میں نے سیکھی ہے کہ موت سے ڈرنا حماقت ہے!"

اننت۔ "میں مسلمانوں کا ذکر سننا نہیں چاہتا!"

تارا۔ "دل پر چوٹ لگتی ہوگی کیوں؟"

اننت۔ "وقت ضائع نہ کرو، اُٹھو!"

تارا اُٹھ کھڑی ہوئی۔

اننت۔ "میرے ساتھ چلو!"

تارا۔ "تمہارے ساتھ چلوں؟ ـــ نہیں یہ نہیں ہو سکتا!"

اننت۔ "ہوگا، اور ضرور ہوگا، اگر خوشی سے نہیں چلوگی تو زبردستی چلنا پڑے گا!"

تارا۔ "میں کہہ چکی ہوں تم میری لاش لے جا سکتے ہو، مجھے نہیں لے جا سکتے، تلوار نکالو میرے پاس بھی تلوار ہے، اگر غالب آنا تو میری لاش اپنے ساتھ لے جانا، میں غالب آئی تو جنگل کے درندوں کے لئے تمہاری لاش چھوڑ جاؤں گی!"

اننت۔ "میں تم پر ہاتھ نہیں اُٹھانا چاہتا، اب بھی مان جاؤ، ناسمجھی کی باتیں نہ کرو!"

تارا۔ "اس مہربانی کا شکریہ"

اب صبح ہو چکی تھی، اتنے میں کچھ سوار اِدھر آتے ہوئے نظر آئے، تارا اور اننت دونوں حیرت سے دیکھنے لگے کہ یہ کون لوگ ہیں، سوار جب قریب پہنچے تو معلوم ہوا، یہ مسلمان ہیں! جسونت سنگھ کے ساتھی!

سواروں نے اننت کو گھیرے میں لے لیا۔ اننت کے ہاتھ سے تلوار گر پڑی، وہ بید لرزاں کی طرح کانپنے لگا۔ جسونت نے ایک نظر اس پر ڈالی اور مسکراتے ہوئے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ "اسے چھوڑ دو!"

سپاہیوں نے راستہ دے دیا!

اننت نے تلوار سنبھالی اور بھیگی بلّی کی طرح چُپ چاپ ایک سمت چلا گیا۔

○

جسونت اپنے لشکر میں پہنچا، اُس نے سجدۂ شکر ادا کیا کہ اس کا بھرم رہ گیا، اُس کے دل میں بار بار یہ خیال آ رہا تھا کہ اگر کسی طرح اس کے ساتھیوں کو یہ معلوم ہو جاتا کہ وہ مرد نہیں عورت ہے، تو کیا ہوتا؟

فرخندہ بخت کیا سمجھتا؟

شجاع الدولہ کیا خیال کرتا؟

نجیب الدولہ کیا سوچتا؟

اور سارے لشکر کا ردِّ عمل کیا ہوتا؟ وہ بار بار دل سے پُوچھ رہی تھی۔ یہ بھرم کب تک قائم رہ سکیگا؟ قبل اس کے کہ لوگ میری ماہیت سے واقف ہوں، کیا میرے لئے یہ مناسب نہ ہوگا کہ خود اپنے آپ کو ظاہر کر دوں؟ —— لیکن کس طرح؟"

اور پھر اُس کی آنکھوں کے سامنے اننت کی تصویر پھرنے لگی۔

اُس نے سوچا کہ اگر میرے ساتھی مجھے ڈھونڈھتے ہوئے واپس نہ آ جاتے تو میری کیا گت بنتی؟ کیا اننت مجھ پر غالب نہ آ جاتا؟ کیا غالب آنے کے بعد وہ میری عزت اور ناموس پر ڈاکہ نہیں ڈالتا؟ پھر اس وسیع دُنیا میں کوئی گوشہ بھی ایسا ملتا کہ میں جہاں پناہ

لے سکتی ؛ پھر کون سامُنہ لے کر میں اپنے محبوب، اور آقا فیروز بخت کے سامنے پہنچتی؟ اُسے جب میرا حال معلوم ہوتا.....

آہ! نہیں! میں وہیں جان دے دیتی، اپنے آپ کو خود ہلاک کر ڈالتی، لیکن پھر فیروز بخت کو اپنی منحوس جھلک نہ دکھاتی! ———— وہ دل ہی دل میں خدا کا شکر پھر ادا کرنے لگی، کہ اُس نے صرف اُس کی جان ہی نہیں بچائی، عزت اور آبرو بھی بچا لی، اسی طرح کروٹ بدلتے بدلتے دوپہر ہو گئی، لیکن نیند نہ آئی۔

رات بھر جاگنے کا خمار بھی باقی تھا اور تھکن بھی!

اتنے میں دروازے پر کچھ آہٹ سی محسوس ہوئی، اُس نے چاہا کہ اٹھ کر دروازے پر جائے، اور دیکھے کون ہے، مگر اضمحلال اتنا غالب تھا کہ ہمت نہ پڑی، چپ چاپ اپنے بستر پر پڑی رہی، پھر دفعتاً دیکھتی کیا ہے،

فیروز بخت سامنے کھڑا ہے۔

وہی معصوم چہرہ، وہی دل نواز تبسم، وہی دل میں کھب جانے والی وجاہت، وہی دل سے نہ نکلنے والی عظمت!

فیروز بخت کو دیکھ کر وہ گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی، لیکن فیروز بخت نے اُسے اُٹھنے نہیں دیا۔

"جسونت اگر تم نے تکلّف کیا تو میں چلا جاؤں گا، صرف تمہاری خیریت مزاج دریافت کرنے آیا ہوں، معلوم ہوا تم کچھ زخمی ہو گئے تھے رات؟"

وہ بولا۔ "جی یونہی سی خراش آ گئی تھی، اب اچھا ہوں۔"

فیروز بخت۔ اسی لئے تو منع کرتا ہوں اپنی بہادری کو جنگ کے دن کے لئے محفوظ

رکھو۔ میرے شانہ بشانہ دُشمن سے لڑنا، ان جھڑپوں میں حصّہ نہ لیا کرو!

جسونت۔ "اب ایسی غلطی نہ ہوگی!"

فیروز بخت۔ "اب تکلیف تو نہیں ہے زخم میں؟"

جسونت۔ "جی بالکل نہیں!"

فیروز بخت مسکراتا ہوا باہر چلا گیا اور تارا پھر اپنے بستر پر لیٹ کر سوچنے لگی۔

"میرے آقا کو میرا کتنا خیال ہے! ——— خود میری مزاج پُرسی کو تشریف لائے!

کس مُنہ سے شکر کیجیے اس لُطف خاص کا

باب (۵۸)

پانسہ پلٹتا ہے!

دونوں لشکر آمنے سامنے موجود تھے!
جیسے دو مست ہاتھی ایک دوسرے پر حملہ کرنے کے لئے تُلے ہوں مگر پھر جھجک کر پیچھے ہٹ جاتے ہوں!

شروع میں مرہٹوں کی اسکیم یہ تھی کہ ابدالی کے لشکر کو گھیرے میں لے لیں اور ہر چہار طرف سے رسد اور کمک کا سلسلہ مسدود کر دیں، گوبند راؤ پنڈت نے یہ کام کیا بھی لیکن وہ مارا گیا، اور اس کے قتل ہوتے ہی پانسہ پلٹنے لگا، بھاؤ جو کچھ ابدالی کے ساتھ کرنا چاہتا تھا وہی ابدالی بھاؤ کے ساتھ کر گزرا، اب صورت حال یہ تھی، کہ بھاؤ کا لشکر عملی طور پر محاصرہ میں آگیا تھا اور اس لشکر کی ابدالی نے ایسی مکمل ناکہ بندی کی تھی کہ سورج مل یا کسی کے پاس سے بھی رسد کا حاصل کرنا ایک ناقابل حل مسئلہ بن گیا تھا، شجاع الدولہ اور حافظ رحمت خاں نجیب الدولہ احمد خاں بنگش، اشرف الوزرا، اور شاہ پسند خاں عطائی خاں فیروز جنگ اور دوسرے سردار شاہ ابدالی سے با اصرار مطالبہ کرتے تھے کہ اب ہمیں اجازت مرحمت ہو، دشمن کو دیکھ کر ہمارا خون کھولنے لگتا ہے، اب ہم سے صبر نہیں ہوتا، آخر کب تک ہم اس طویل وعریض میدان میں

پڑے رہیں گے۔ لیکن ان جوشیلی باتوں کو سن کر شاہ ابدالی صرف مسکرا دیتا، اگر کچھ کہتا تو صرف اتنا،

"تم نے مجھے سردار بنایا ہے، تو میری تدبیر پہ چلو۔ ہم یہاں اس لئے جمع ہوئے ہیں کہ لڑیں، لیکن اُسی وقت لڑیں گے جب وقت آئے گا.... ابھی وقت نہیں آیا۔"

اور نیازمندانِ بارگاہ یہ ارشادِ ہمایونی سُنکر ادب سے گردن جُھکا لیتے!

○

ایک روز ابدالی اپنے سرداروں کے جھرمٹ میں بیٹھا تھا، کہ ایک سردار نے کہا۔

"مرہٹوں کی ہر چیز کا ہمارے پاس توڑ ہے۔"

ابدالی نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا۔ "لیکن نہیں ہے تو کس چیز کا؟"

سردار نے جواب دیا۔ "ابراہیم گاردی کے توپ خانے کا ۔۔۔ نہ اتنا بڑا توپخانہ ہمارے پاس ہے۔ نہ اتنے اچھے توپچی، نہ اتنا ماہر آتش انداز! ۔۔۔ بس اگر کچھ خطرہ ہے تو اسی سے، ورنہ ان مرہٹہ سپاہیوں کو تو ہم مولی گاجر کی طرح کاٹ کر ڈال دیں گے!"

یہ باتیں سنکر ابدالی کا چہرہ غُصّہ سے سُرخ ہو گیا، اُس نے برہم لب ولہجہ میں پوچھا۔

"کیا کہا؟"

سردار بے چارہ سہم گیا۔ "میری مراد توپخانہ سے تھی۔"

ابدالی۔ "تم توپ سے ڈرتے ہو؟ تمہارے دل پہ مرہٹہ توپخانے کی ہیبت چھائی ہوئی ہے۔ زندگی تمہیں عزیز ہے اور موت ناگوار ۔۔۔ کیوں؟"

سردار نے کہا۔ "نہیں جہاں پناہ، میرا مطلب یہ نہ تھا۔"

ابدالی۔ "خاموش ۔۔۔ ہم جانتے ہیں تمہارا مطلب کیا تھا؟"

پھر وہ ایک دوسرے افسر کی طرف مخاطب ہوا، اس کے ہتھیار چھین لو، یہ اس قابل

نہیں کہ ہماری فوج میں رہ سکے!"

عطائی خاں نے تائید کی: "جہاں پناہ کا فیصلہ قرینِ انصاف ہے، ابدالی کے لشکر میں صرف وہی رہ سکتا ہے، جو موت سے کھیلنے کی جرأت رکھتا ہو، جو زندگی کے لئے مرتا ہو اس کے لئے یہ وسیع دُنیا موجود ہے، جہاں چاہے چلا جائے!"

ابدالی نے عطائی خاں کی پیٹھ ٹھونکی: "جزاک اللہ ——— مجھے ایسے ہی جری آدمی کی ضرورت ہے، میں ان لوگوں کو ذرا بھی پسند نہیں کرتا، جو زندہ رہنے کے لئے موت کے آگے سر بسجدہ ہو جاتے ہیں!"

حافظ رحمت خاں۔ "یہ لوگ شاید نہیں جانتے کہ موت بار بار نہیں آتی!"

نجیب الدولہ۔ "اسی لئے موت سے پہلے بار بار انھیں مرنا پڑتا اور موت کی اذیت اٹھانی پڑتی ہے!"

ابدالی۔ "اس کج فہم شخص نے یہ نہ سوچا کہ

ہر سخن وقتے و ہر نکتہ مقامے دارد!

کتنے غلط موقع پر کتنی مہمل بات کہہ رہا ہے!"

عطائی خاں۔ "جہاں پناہ!"

حافظ رحمت خاں۔ "یہ بے چارہ شخص قابلِ رحم ہے، یہ اسلام کی تاریخ سے ناواقف ہے، یہ نہیں جانتا کہ مسلمانوں نے حق کی خاطر اپنے دین کی سربلندی کے لئے خُدا کے آخری پیغام کو پہنچانے کے لئے کیسی کیسی قوتوں کا مقابلہ کیا ہے، کیسی کیسی طاقتوں سے ٹکر لی ہے، کیسے کیسے مورچوں کو فتح کیا ہے ——— اور یہ بے وقوف توپخانہ سے ڈرا مرا جاتا ہے ——— لاحول ولا قوۃ

ابدالی: "میں تو ابراہیم گاردی کا نام بھی سُننا نہیں چاہتا جو شخص مسلمان ہو کر مسلمانوں کی تباہی کا درپے ہو، جو یہ جانتا ہو کہ مرہٹے، بہر حال یہ جنگ "ہندو مسلم" سوال پر لڑ رہے ہیں، وہ کتنے اطمینان اور فخر کے ساتھ اپنی قوم کو چھوڑ کر، اپنے آقاؤں کی عارضی خوشنودی حاصل کر رہا ہے وہ نہیں جانتا کہ اس زندگی کے بعد بھی ایک زندگی ہے، اس دُنیا کے علاوہ بھی ایک دُنیا ہے، اور وہاں دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہو کر رہے گا! وہاں ہر شخص معلوم کرے گا کہ اس کے اعمال کیا ہیں، اور ان کا وزن کیا ہے؟

احمد خاں بنگش۔ "بیشک ——— کاش گاردی اُس دن کے انجام سے ڈرتا!"

فیروز بخت۔ "جی نہیں! نہ وہ اس دن کا قائل ہے نہ اُس کے انجام کو کوئی اہمیت دیتا ہے!"

حافظ رحمت خاں: "تم تو اتنے یقین سے یہ بات کہہ رہے ہو، گویا تم اِس سے مِل چکے ہو، اور اس کے الفاظ دُہرا رہے ہو!"

فیروز بخت۔ "جی بالکل یہی واقعہ ہے۔ میں اس سے مِل چکا ہوں، اور اس کے الفاظ بیان کر رہا ہوں!"

ابدالی: "کب ملے تھے تم اُس سے ؟"

فیروز بخت: "کل رات کو ——— میں بھیس بدل کر مرہٹوں کے لشکر میں پہنچا تھا!"

حافظ رحمت خاں۔ "کیا کیا دیکھا تم نے وہاں ؟"

فیروز بخت: "بھاؤ کا عظیم لشکر قحط سے دوچار ہو رہا ہے، ہماری ناکہ بندی بالکل کامیاب ہے، غلّہ کا ایک دانہ اور گھاس کا ایک تنکا بھی وہاں نہیں پہنچ پاتا، بھاؤ کے اوسان خطا ہو رہے ہیں!"

حافظ رحمت خاں۔ "وہ تو ہو رہے ہوں گے۔ تمہارے کہے بغیر ہمیں علم ہے ——— یہ

بتاؤ ابراہیم گاردی سے کیا باتیں ہوئیں ؟"

فیروز بخت۔ "بھاؤ کے لشکر میں سب سے زیادہ بددل پیشوا کی مسلمان بیوی کا بیٹا شمشیر جنگ ہے اور سب سے زیادہ ہشاش بشاش ابراہیم گاردی ہے، شمشیر جنگ اس لئے بددل ہے کہ اس کے ساتھ برابری کا سلوک نہیں ہوتا، اور گاردی اس لئے خوش ہے کہ وہ مستقبل کے سنہرے خواب دیکھ رہا ہے' میں نے اُسے چونکانے اور ہوشیار کرنے کی کوشش کی۔ لیکن وہ اپنے نشہ میں مست ہے' میں نے اس سے کہا کہ تم مسلمان ہو' اور مسلمانوں کے خلاف صف آرا ہوتے ہوئے نہیں ڈرتے ؟ کیا تم یوم آخرت کے قائل نہیں ؟" وہ زور سے ہنسا اور کہنے لگا، صرف اتنی رعایت تمہارے ساتھ کر سکتا ہوں کہ تم زندہ واپس چلے جاؤ' یہ رعایت بھی اس لئے نہیں کر رہا ہوں کہ میرا اور تمہارا مذہب ایک ہے۔ اس لئے کر رہا ہوں کہ تم جا کر اپنے لشکر میں شاہ ابدالی کو تباہ و کر گاردی افغان لشکریوں بھگون — دے گا، جس طرح بھاڑ میں چنے بھونے جاتے ہیں۔ اس کے توپخانہ کی زد سے بچ کر ایک متنفس بھی نہیں جا سکتا، میرا دین و مذہب صرف پیسہ ہے' اور وہ ضرورت سے زیادہ مجھے مل رہا ہے میں اپنی ہستی سے ٹکر اہی نہیں کر سکتا !"

ابدالی۔ "تمہارے ساتھ کر او کون تھا ہے — یا اکیلے گئے تھے تم ؟"

فیروز بخت۔ "ارادہ تو تنہا ہی جانے کا تھا، لیکن مجھے جاتا دیکھ کر جسونت بھی ساتھ ہو لیا اور اس کے ساتھ یہ حضرت بھی چپک کر آ گئے !"

ابدالی۔ "کون ؟ کسے کہہ رہے ہو تم ؟"

فیروز بخت۔ "یہ — یہی مراد خاں' جن کے ہتھیار چھینے جانے کا آپ نے ابھی حکم صادر فرمایا تھا !"

ابدالی: "اچھا یہ بات ہے اب سمجھ میں آیا کیا راز تھا اس دہشت اور سراسیمگی کا، تم نے دہیلا کی گردن کیوں نہ مار دی؟"

فیروز بخت: "اس وقت تک تو یہ اچھے بھلے تھے اگر وہاں یا راستے میں اس قسم کی باتیں کرتے تو یقیناً میں وہی کرتا جو جہاں پناہ نے فرمایا ہے لیکن معلوم ہوتا ہے وہاں سے واپس آکر جب سوئے تو خواب میں انھوں نے توپ خانہ دیکھا اور اس کی تعبیر اب اس وقت نظر آئی کہ نہ ادھر کے رہے نہ اودھر کے رہے!"

فیروز بخت کی اس بے ساختہ گفتگو پر ابدالی مسکرا دیا، اُسے مسکراتا دیکھ کر دوسرے سردار بھی مسکرانے لگے۔

فیروز بخت نے جب دیکھا کہ ابدالی کا غصہ اُتر چکا ہے تو اس نے دست بستہ کہا۔
"اگر جہاں پناہ کی طبع نازک پر گراں نہ گذرے تو ایک التماس رکھتا ہوں!"

ابدالی: "نہیں کوئی بات ہمیں ناگوار نہیں گذر سکتی، شوق سے کہو کیا کہنا چاہتے ہو؟"

فیروز بخت: "مراد خاں کے ہتھیار اسے واپس کر دیے جائیں، وہ بزدل نہیں جواں مرد ہے میں اس کے کارنامے دیکھ چکا ہوں، آمد سخن میں ایک بات اس کے منہ سے نکل گئی، اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ مرہٹوں یا ان کے توپخانہ سے خائف ہے، مجھے یقین ہے جس دن جنگ چھڑے گی اس دن مراد خاں کے کارنامے ہم سپاہیوں میں ہرگز کسی سے کم نہیں ہوں گے!"

ابدالی نے مسکرا کر مراد خاں کو دیکھا اور اپنے خیمہ میں واپس چلا گیا، جاتے جاتے اُس نے مراد خاں سے کہا۔ "اب کبھی ہمیں برہمی کا موقع نہ دینا۔"

ابدالی کے جانے کے بعد فیروز بخت نے مراد خاں سے کہا "کان پکڑو!"
سب لوگ ہنسنے لگے!

باب (۵۹)

صلح کی سلسلہ جنبانی

احمد شاہ ابدالی کے زیر کمان کل فوج اڑتیس ہزار پیادوں اور اکتالیس ہزار آٹھ سو سواروں پر مشتمل تھی، اس کے ساتھ ستر توپیں بھی تھیں اور کچھ بے قاعدہ فوج بھی، مورخین کا اس پر اتفاق ہے کہ ابدالی کی فوجیں تعداد میں مرہٹوں سے ایک تہائی بھی نہیں تھیں۔

"پانی پت کے میدان میں دونوں فوجیں ایک دوسرے کے مقابل آکر ٹھہریں، جہاں ہندوستان کی قسمت کا تیسری مرتبہ فیصلہ ہونے والا تھا، بھاؤ نے اپنی فوج کو بچانے کے لئے ایک خندق کھودی جو چالیس قدم چوڑی اور بارہ قدم عمیق تھی (اس خندق کی حفاظت ابراہیم خاں گاردی کے ذمہ تھی) ابدالی نے درخت کاٹ کر ان کے تنوں سے حفاظتی دیوار تعمیر کی تھی، شجاع الدولہ نواب اودھ اور روہیلہ سردار حافظ رحمت خاں فوری طور پر مرہٹوں پر حملہ کرنے کے لئے بیتاب تھے۔ لیکن احمد شاہ ابدالی کی دور رس نگاہیں اور جنگی تجربہ نے ان کو تاَمّل پر آمادہ رکھا، اس نے جان لیا تھا کہ اس قدر بڑی فوج کو سامان رسد

لہ تاریخ ہند (مارشمین) بحوالہ فیصلہ کن جنگیں،

اطراف سے مہیا ہونا مشکل ہے۔ اُس نے اپنی فوج سے یہ صرف کام لیا کہ مرہٹوں کو سامانِ رسد پہنچنے نہ پائے، اسکا نتیجہ یہ نکلا کہ مرہٹی فوج میں سامانِ خوراک ختم ہونے لگا، اور ان کے جانوروں کو دانہ و گھاس ملنا مشکل ہوگیا کیونکہ ابدالی کی فوجیں مرہٹوں کی ان جماعتوں کو جو اس کام پر مامور تھیں پریشان کرکے گھاس دانہ اور سامانِ خوراک پہنچنے نہیں دیتے تھے، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ چند دن بعد مرہٹہ کیمپ میں قحط کے آثار نمایاں ہوگئے، ایک تو فوج بھوک کے مارے اور دوسرے جانور چارہ نہ ملنے سے مرنے شروع ہوئے اور ایک محدود رقبہ میں ان لاشوں کی بدبو ناقابل برداشت ہوگئی جس سے تنگ آکر بھاؤ نے نواب شجاع الدولہ کے ذریعہ کئی مرتبہ صلح کی سلسلہ جنبانی کی، (تاریخ مرہٹہ از گرانٹ ڈف) لیکن روہیلہ سردار جو دہلی اور خود اپنے ملک کی تباہی دیکھ چکے تھے، جانتے تھے کہ اگر صلح ہوگئی تو مرہٹے موقع پاکر مسلمانوں کو پنپنے نہیں دیں گے، انھوں نے ہر وقت اور ہر طرح اس کی مخالفت کی،

آخر مرہٹوں کا پیمانۂ صبر لبریز ہوگیا، انھوں نے متفقہ طور پر بھاؤ سے درخواست کی کہ اس طرح کتوں کی موت مرنے کے بجائے اُن کو دشمن کے خلاف فوراً جنگ کی اجازت دی جائے، اس رات سب نے بچے بچائے رسد سے پیٹ بھر کر آخری وقت کھانا کھایا اور بھاؤ نے ایک آخری درخواست صلح کی شجاع الدولہ کے پاس بھیجی، اُس میں لکھا تھا:۔

"اب پیالہ لبالب ہے ایک بوند کی بھی اس میں سمائی نہیں، اگر کچھ بن پڑے تو کیجیے"[1]

---

[1] فیصلہ کن جنگیں

شجاع الدولہ کے پاس یہ پیام اس کا معتمدِ خاص کاشی راؤ لایا تھا، شجاع الدولہ نے فوراً ابدالی کو اس کی اطلاع دی، اس کے خیمہ میں مجلسِ مشورت منعقد ہوئی، ابدالی نے شجاع الدولہ سے کہا۔ "فرمایئے آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟"

شجاع الدولہ: "میں کچھ نہیں کہنا چاہتا، بھاؤ کا پیامِ صلح میرے پاس آیا۔ میں نے آپ کی خدمت میں پیش کر دیا، میرا معاملہ تو وہ ہے کہ ؂

سپردم بتو مایۂ خویش را
تو دانی حسابِ کم و بیش را

جب آپ کو سردار مان لیا، تو چون و چرا کا حق میں نے خود سلب کر لیا۔"

شاہ ابدالی: "اس جذبہ کی میں قدر کرتا ہوں، پھر بھی آپ کی ذاتی رائے بھی تو کچھ ہوگی؟"

شجاع الدولہ: "میری ذاتی رائے تو یہ ہے کہ اگر مناسب شرائط پر صلح ہو جائے تو کوئی مضائقہ نہیں!"

ابدالی نے حافظ رحمت خاں کی طرف دیکھا۔ "آپ کیا فرماتے ہیں؟"

حافظ رحمت خاں: "مجھے شجاع الدولہ کی رائے سے اتفاق ہے!"

اب ابدالی نجیب الدولہ سے مخاطب ہوا۔ "اور آپ؟"

نجیب الدولہ: "نہایت ادب لیکن نہایت شدت کے ساتھ میں صلح کا مخالف ہوں مرہٹے صرف اس لئے صلح کے جویا ہیں کہ وہ جنگ کی تیاریوں کے لئے مزید مہلت چاہتے ہیں۔ میرے خیال میں مومن کی یہ شان نہیں کہ وہ ایک بل سے دو دفعہ ڈسا جائے۔ ہمیں مرہٹوں کی جبلّت اور ذہنیت کا خوب تجربہ ہے ہم نے اگر ان کا استیصال نہیں کیا اور صلح کر لی، تو وہ بازی جیت جائیں گے ہم ہار جائیں گے پھر ان کی قوت کو

کوئی نہیں شکست دے سکے گا۔ پھر مسلمان کبھی اس دیس میں سر نہیں اُٹھا سکیں گے میری نہایت اصرار کے ساتھ یہ رائے ہے کہ پوری قوت کے ساتھ مقابلہ کیا جائے!

شاہ ابدالی: "کوئی اور صاحب کچھ فرمائیں گے؟"

حاضرین میں سے کسی نے جنبش تک نہ کی!

پھر ابدالی کھڑا ہوا، اور اُس نے کہا۔ "دوستو! اور عزیزو! تم نے بلایا، میں چلا آیا۔ تم کہو گے، واپس چلا جاؤں گا، کسی قسم کی ذاتی غرض اور منفعت کا خیال لیکر میں یہاں نہیں پہنچا۔

نہ مال غنیمت نہ کشور کشائی

اگر ہماری قسمت میں ہار لکھی ہے تو تمہارے ساتھ میں بھی مروں گا اور اگر جیت لکھی ہے تو اس سے صرف تم لوگ نفع اٹھاؤ گے میں ہندوستان پر حکومت نہیں کرنا چاہتا اس مہم کے سر کرنے کے بعد اپنے وطن واپس چلا جاؤں گا۔ میرے لئے وہاں کی حکومت اور فرمانروائی کافی ہے۔ اس وقت جو گفت گو ہوئی وہ میں نے توجہ اور دلچسپی کے ساتھ سنی۔ آپ حضرات کی فکر و رائے کی میرے دل میں وقعت ہے لیکن میں اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ جو میری ذاتی رائے ہے اُسے نہ چھپاؤں۔ میری ذاتی رائے یہ ہے کہ مرہٹوں کے ظلم و سفاکی اور خیانت و بدعہدی کو دیکھتے ہوئے ان کے عہد و پیمان پر بھروسہ کرنا حماقت ہے۔ آپ حکم دیں تو میں ابھی بوریہ بستر باندھ کر جہاں سے آیا ہوں، وہاں واپس چلا جاؤں گا۔ لیکن اگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ یہ مہم میرے ہاتھوں تکمیل کو پہنچے تو آپ کو میرے اشاروں پر چلنا ہوگا، اور میری رائے یہ ہے کہ ہمیں صلح کا خیال ترک کر دینا چاہئے اور جنگ کے لئے تیار ہو جانا چاہئے!"

ابدالی کی اس تقریر نے آگ پر تیل کا کام کیا، سب سے پہلے شجاع الدولہ نے کہا:

لہ پانی پت کا خونیں میدان جنگ

مجھے آپ کی صائب رائے سے پورا اتفاق ہے ہمیں صلح کا خیال دل سے نکال دینا چاہیے!

تمام حاضرین نے شجاع الدولہ کی پُرزور تائید کی اور فیصلہ یہ ہوا کہ جنگ جلد از جلد شروع کر دی جائے۔ شجاع الدولہ نے بھاؤ کو معذرت لکھ بھیجی کہ بھائی میں بے بس ہوں ابدالی نہیں مانتا!

○

لیکن بھاؤ اب اپنی اکڑ بھول چکا تھا، اُس کا غرور دور ہو چکا تھا، اس کا نشہ ہرن ہو چکا تھا، اس نے محسوس کر لیا تھا کیا ہونے والا ہے۔ شجاع الدولہ کے جواب سے اگرچہ وہ بہت مایوس ہوا۔ لیکن اُس نے کاشی راؤ کو راضی کر کے پھر ایک مکتوب شجاع الدولہ کے پاس بھیجا اور اس سے استدعا کی کسی طرح بھی وہ بیچ میں پڑ کر ابدالی سے صلح کرا دے۔ اُس نے اپنے نامے میں یہاں تک لکھ دیا کہ میں ابدالی کی خدمت میں زادِ راہ اور ہرجانہ کے سوا "ملتان اور پنجاب کا سارا علاقہ نذر کے طور پر پیش کرتا ہوں[1]!"

کاشی ناتھ بہر حال ہندو تھا، وہ اگرچہ شجاع الدولہ کا وفادار تھا لیکن مرہٹوں کی تباہی نہیں چاہتا تھا اُس نے بھی شجاع الدولہ کو رائے دی کہ اس معاملہ کا خاتمہ مصالحت پر ہو جائے تو اچھا ہے۔ شجاع الدولہ کو کاشی راؤ کی خاطر عزیز تھی، وہ کاشی راؤ سے گفت گو کے بعد آدھی رات کو ابدالی کے خیمہ پر پہنچا، دربان سے کہا: بڑا ضروری کام ہے، اسی وقت شاہ کو جگا دو اور میرے آنے کی اطلاع کر دو قبل اس کے کہ دربان اندر جائے۔ احمد شاہ ابدالی خیمہ کے اندر سے ہتھیار بند برآمد ہوا، شجاع الدولہ نے بھاؤ کا پیام سنایا[2]، احمد شاہ نے کہا۔

"میں اپنے فیصلے بدلا نہیں کرتا!"

اور اپنے خیمہ میں واپس چلا گیا ——— اور شجاع الدولہ اپنا سا منہ لے کر واپس آ گیا!

---

[1] پانی پت کا خونیں میدان جنگ۔ [2] پانی پت کا خونیں میدان جنگ۔

باب (۶۰)

طبلِ جنگ

جب مرہٹہ لشکر بھوک سے نڈھال ہوگیا، اور نہ فرار کی کوئی صورت باقی رہی، نہ قیام کی، تو بھاؤ نے اپنے لشکر میں منادی کرادی،

"صبح ہوتے ہی جنگ شروع ہوجائے گی!"

اور جب صبح ہوئی تو بھاؤ نے اپنے سرداروں کر پان کے بیڑے تقسیم کئے، سپاہیوں نے کیسری بانے پہنے اور ——— ۷ جنوری ۱۷۶۱ء کے دن پو پھٹنے سے ایک گھنٹہ پیشتر مرہٹہ فوج میدانِ جنگ میں صف آرا ہوگئی!

اس وقت مرہٹوں کے دل میں فتح کی امنگیں نہیں تھیں، بلکہ ایک مایوسی کا عالم طاری تھا جنگ کا آغاز ابراہیم خاں گاردی کی جانب سے ہوا، جو اپنی دس ہزار کی نہایت ہی تربیت یافتہ فوج کو لیکر روہیلوں پر ٹوٹ پڑا، مگر روہیلے اس وقت تک پیچھے نہیں ہٹے جبتک ان کے آٹھ ہزار آدمی کام نہ آگئے، دوسری طرف ابراہیم خاں کی نصف فوج بھی کٹ گئی، روہیلوں کا پیچھے ہٹنا تھا کہ افغان فوج کا قلب بالکل کمزور ہوگیا، یہ دیکھ کر اس وقت بھاؤ، اور وسواس راؤ نے پوری مرہٹہ فوج سے حملہ کر دیا، یہ حملہ اس وقت شدت کا تھا کہ سلام

ہوتا تھا کہ مسلمانوں کے قدم اکھڑ جائیں گے، لیکن عین اُسی وقت احمد شاہ ابدالی نے اپنی آزلہ فوج کے ساتھ حملہ کیا، اور اب جنگ عام ہو گئی اور نہایت شدت سے لڑی جانے لگی[1]

مرہٹوں نے ―― چونکہ وہ زندگی سے مایوس ہو چکے تھے ―― جان کی بازی لگا دی تھی، لیکن مسلمان بھی پورے طور پر تیار تھے، انھوں نے اس ناقابلِ برداشت حملے کو بہادری سے روکا، بے جگری اور دلاوری کے ساتھ ان کے سپاہی اور سردار، آگ برساتی ہوئی توپوں کی پروا نہ کرتے ہوئے تلوار کے وار سہتے اور نیزوں کی نوک سے سینہ چھلنی کراتے بڑھتے رہے، بڑھتے ہوئے وہ پیچھے مڑ کر نہیں دیکھتے تھے، اُن کی نظر صرف سامنے تھی!

اس وقت قیامت کا عالم طاری تھا، دوست، دوست سے، ساتھی، ساتھی سے بچھڑا ہوا تھا، دوست دوست کے سامنے قتل ہوتا تھا، ساتھی ساتھی کے سامنے زخمی ہوتا ہوتا تھا، لیکن وہ پروا نہ کرتا تھا ―― اُسے آگے بڑھنا تھا، اُسے دشمن کا سر قلم کرنا تھا.

شجاع الدولہ، رحمت خاں، نجیب الدولہ، بنگش، عطائی خاں، شاہ پسند خاں بڑے بڑے سردار خود اپنی فوجوں کی کمان کر رہے تھے، آگ برس رہی تھی، نیزے لپک رہے تھے، تلواریں چمک رہی تھیں، بندوقیں اور توپیں گرج رہی تھیں، لیکن وہ سب بے نیاز بے خوفی اور دلیری کے عالم میں لڑ رہے تھے ―― اپنے سپاہیوں کو لڑا رہے تھے،

بھاؤ اپنے لشکر کا سپہ سالارِ اعلیٰ تھا، وہ ایک گھوڑے پر سوار اپنی فوج کا دل بڑھا رہا تھا، نازک نازک مرحلوں پر وہ خود پہنچتا تھا، اور اپنے سپاہیوں کے سامنے شجاعت اور بہادری کا نہ مٹنے والا نمونہ پیش کر دیتا تھا، اس کے دوسرے سردار جھونسد، گوبکراڑا اور سندھیا بھی زندگی سے بے پروا ہو کر بڑے جوش و خروش کے ساتھ اپنی اپنی

---

[1] فیصلہ کن جنگیں

فوجوں کو جنگ میں الجھائے ہُوئے تھے، یہ سب جانتے تھے، آج اگر شکست ہو گئی، تو کل نہ زندگی رہے گی، نہ آبرو، نہ دولت، نہ حشمت، انھیں یقین تھا، صرف اس جنگ کے جیت لینے ہی پر ان کی زندگی اور وقار کا انحصار ہے ——— یہی وجہ تھی کہ یہ بڑی بے جگری اور بے خوفی سے لڑ رہے تھے، ان کی بہادری دیکھ کر موت ان کے سامنے آتے ہوئے لرزتی اور کانپتی تھی۔

اور فیروز بخت! اس کا تو عالم ہی دوسرا تھا، وہ شعلہ بنا ہوا میدانِ جنگ پر چھایا ہوا تھا، وہ بجلی کی طرح چمکتا تھا، اور چمک دمک دکھا کر غائب ہو جاتا تھا، کبھی اِس صف میں ہے کبھی اُس صف میں، کبھی یہاں ہے کبھی وہاں، جہاں اُس نے کمزور پہلو دیکھا وہیں پہنچ گیا ——— وہ سوار بھی تھا، اور سپاہی بھی، وہ بے دھڑک ہر جگہ پہنچتا تھا، ہر کام کرتا تھا، وہ نہ توپ کے گولے سے ڈرتا تھا، نہ تلوار کی نوک سے وہ ایک مرتبہ جب بڑھا تو پھر اُس نے پیچھے ہٹنے کا نام نہیں لیا۔

دشمن کے کئی سوار گھات میں لگے ہوئے تھے، فیروز بخت کی دلاوری دیکھ کر پیچ و تاب کھا رہے تھے، بھاؤ نے اس کی سرفروشی اور بے باکی دیکھ کر کئی مرتبہ اپنے سرداروں سے رشک کے ساتھ کہا۔

"کتنا جیالا ہے یہ جوان؟ ——— کون ہے یہ؟"

لیکن کوئی نہ بتا سکا۔

اور جب اس جیالے جوان کی ترک تازیاں، اور دست درازیاں حد سے بڑھ گئیں، بہت سے مرہٹہ جوانوں، اور سرداروں کو جن کے جیالے پن کا بھاؤ قائل تھا، اس نے چشم زدن میں ہلاک کر دیا، تو وہ بپھر گیا، اُس نے کہا، "کوئی اس کی گردن کیوں نہیں کاٹ لاتا؟"

اور پھر ایک سردار کی طرف دیکھ کر بولا: "مجھے اس نوجوان کا سر مطلوب ہے، تم اعلان کر دو۔ جو اس کا سر کاٹ کر لائے گا۔ اُسے منہ مانگا انعام ملے گا۔ اُسے مَیں وہ سب کچھ بخش دوں گا جو وہ چاہتا ہو گا!"

اس اعلان نے فیروز بخت کی جان کو بڑا قیمتی بنا دیا۔ ہر طرف سے اُس پر یورش ہونے لگی، لیکن وہ اس یورش سے ذرا بھی خائف نہ ہوا، مسکراتا، ہنستا اپنے کام میں مصروف رہا —— وہ بلا کا تیغ زن تھا، اُس کی تلوار کے آگے کسی کا ٹھہرنا مشکل تھا۔ جو آیا ہلاک ہوا، جو مقابلہ میں پہنچا اُسے اپنی جان سے ہاتھ دھونے پڑے!

اور فیروز بخت کے ساتھ ایک اور سپاہی بھی تھا۔

طرح دار، خوش اندام، خوبصورت —— ہر وار جو فیروز بخت پر ہوتا تھا اُسے اپنے سینہ پر روکنے کے لئے وہ آگے بڑھ آتا تھا!

فیروز بخت نے کہا: جسونت —— تم میری فکر نہ کرو، مجھے لڑنے دو، میں اکیلا کافی ہوں جاؤ، ذرا دیکھو شجاع الدولہ کے لشکر میں کیا گذر رہی ہے؟"

وہ بولا: "زندگی میں پہلی مرتبہ نافرمانی کی جرأت کر رہا ہوں —— آپ کو چھوڑ کر نہیں جا سکتا!"

فیروز بخت مسکرایا: "کیا تم مجھے موت سے بچا لوگے؟"

اس کی پیشانی شکن آلود ہو گئی۔ "نہیں —— لیکن آپ کے ساتھ مر تو سکتا ہوں!"

اتنے میں —— فیروز بخت کو اپنے ساتھی جسونت سے باتیں کرنے میں مصروف دیکھ کر —— دو مرہٹہ سوار انعام کے لالچ میں فیروز بخت کی طرف لپکے اور بڑی تیزی سے اس پر حملہ آور ہوئے، فیروز بخت جب تک سنبھلے سنبھلے ان کی تلواریں چمک چکی تھیں۔

جسونت نے بلا کی پھرتی سے ایک سوار کے سینہ میں تلوار بھونک دی،

دُوسرے کی تلوار چھلتی ہوئی فیروز کے شانے پر پڑی، اور وہ زخمی ہو گیا۔ لیکن فوراً سنبھل کر اس نے جو تلوار کا ایک وار کیا ہے، تو وہ زمین پر گر کر رقصِ بسمل کا تماشہ دکھانے لگا۔ جسونت نے

جان دیکھی تنِ بسمل میں جو آتے جاتے

فوراً نیزے کا بھرپور وار کر کے اس کی سسکتی ہوئی زندگی کا چراغ گل کر دیا۔

فیروز بخت نے کہا۔ "تم نے ہماری جان بچالی ——— کتنے وفادار اور جاں نثار سپاہی ہو تم بھی۔"

جسونت نے کہا۔ "دیکھئے ایک اور شکار آ رہا ہے ——— ہوشیار!"

فیروز نے نظر اُٹھائی تو دو تلواریں چمکتی ہوئی دکھائی دیں ——— ایک دشمن کی ایک جسونت کی ——— جسونت کی تلوار کام کر گئی اور وہ ہائے کر کے گر پڑا۔

فیروز نے شکر گذاری کی نظروں سے جسونت کو دیکھا اور کہا۔ "جسونت ———"

جسونت نے بات کاٹ دی۔ "یہ باتیں کرنے کا وقت نہیں، دیکھئے ایک صاحب نیزہ گھماتے اور تشریف لا رہے ہیں!"

فیروز بخت تیار تھا، دشمن نے نیزے کا وار کیا، فیروز نے نیزے کو نیزے پر روکا، دو چار ہاتھ چلے ہوں گے کہ جسونت کے نیزے نے کام تمام کر دیا۔

بھاؤ یہ تماشہ دیکھ رہا تھا۔ اس نے پوچھا۔ "یہ دُوسرا نوجوان کون ہے؟"

اننت پاس کھڑا تھا، وہ مسکرا کر رہ گیا۔

بھاؤ نے پوچھا۔ "تم جانتے ہو اسے؟"

وہ بولا۔ "جی ——— یہ تارا بائی ہے!"

بیساختہ بھاؤ کے مُنہ سے نکلا۔ "تارا ——— تارا؟ ——— وہ! وہ؟"

وہ کہنے لگا۔ "جی وہی، وہی"

بھاؤ نے پوچھا: "پھر وہ یہاں کیسے؟"

اننت نے ساری سرگزشت سُنا ڈالی اور کہا: "یہ معاملہ ہے میرے آقا کے نامدار!"

بھاؤ غصّہ سے سُرخ ہوگیا۔ "لیکن تُم نے اسے چھوڑ دیا؟ مار کیوں نہ ڈالا؟"

اننت۔ "دقت کی بات؟"

بھاؤ۔ "میں تمہیں حکم دیتا ہوں گھوڑا بڑھاؤ، جاؤ، اس کا سر لے کر آؤ۔"

گاردی بھی پاس کھڑا تھا۔ اُس نے کہا: "نہیں انھیں نہ بھیجیے، وہ علاقہ توپ خانہ کی زد میں ہے اگر گولا ان کے قریب بھی پھٹا تو یہ مرے بغیر نہ رہیں گے۔"

بھاؤ خاموش ہوگیا۔

گاردی نے اندازہ لگا لیا۔ یہ خاموشی کیا معنی رکھتی ہے، اُس نے کہا: "حضور — فتح ہماری ہوگی ——— یہ تارا بائی ہو یا وہ نوجوان، یا ابدالی، ان سب کی قسمت میں یا موت لکھی ہے یا گرفتاری، گرفتار ہوئے تو حضور کے سامنے پیش ہوں گے، مارے گئے تو..... خس کم جہاں پاک ———!"

بھاؤ مسکرا دیا!

گاردی نے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور سیدھا اپنے توپخانہ کی طرف چل پڑا۔ جہاں سے گن گرج کی آواز آرہی تھی۔

اس جنگ میں مسلمانوں نے ایسی عدیم المثال شجاعت کا ثبوت دیا جس نے ان کی دھاک بٹھا دی۔

مسلمان سرداروں نے بڑے سے بڑے خطرات کی پروا نہ کی، اپنے ساتھیوں کا دل

بڑھاتے رہے، اور خود بھی پیشقدمی کرتے رہے۔

ابراہیم گاردی آج اپنے ہوش میں نہ تھا، وہ جیسے جیسے مسلمانوں کی ہمت اور دلاوری مرہٹوں کی پستی اور پسپائی کے مناظر دیکھتا تھا، اس کا خون جوش کھانے لگتا تھا، اُبلنے لگتا تھا جب اسے یہ خیال آتا تھا، کہیں ایسا نہ ہو مسلمان جیت جائیں اور مرہٹے شکست کھا جائیں تو اس کی نبض کی رفتار بگڑ جاتی تھی، اُس کے دل کی حرکت سریع ہو جاتی تھی، وہ ایک لمحہ کے لئے بھی اس کا تصوّر نہیں کرنا چاہتا کہ

مسلمان جیت سکتے ہیں؟

مرہٹے ہار سکتے ہیں!

وہ جانتا تھا، مسلمانوں کے جیتنے، اور مرہٹوں کے ہارنے کا نتیجہ کیا ہوگا؟ اور یہ نتیجہ خود ابراہیم گاردی کی زندگی پر کس طرح اثر انداز ہوگا، اگر کوئی اور غنیم ہوتا، تو ممکن تھا، ہارنے کے بعد بھی وہ اپنی جان سلامت لے جاتا، لیکن مقابلہ مسلمانوں سے تھا، اور مسلمانوں کی یہ کچھ فطرت بن چکی ہے کہ وہ دشمن کو معاف کر دیتے ہیں لیکن غدّار کو معاف نہیں کرتے، وہ دشمن کے ساتھ زیادہ سے زیادہ فراخدلی اور رواداری کا برتاؤ کرتے ہیں لیکن غدّار کو سزا دیئے بغیر نہیں چھوڑتے —— مرہٹے دشمن تھے اور گاردی غدّار —————— ! ہو سکتا تھا کہ مرہٹوں کے ساتھ مسلمان رعایت کریں، ان کے باقی ماندہ لوگوں کو معاف کر دیں لیکن کیا، اپنی ملّت کے ایک غدّار —— گاردی —— کو بھی معاف کر دیں گے؟"

خود بخود اس کے کانوں میں آواز گونجنے لگتی ہے: نہیں نہیں!

اور وہ پہلے سے بہت زیادہ جوش و خروش کے ساتھ توپخانہ سے آگ برسانے لگتا، اس وقت اس کا توپخانہ جہنّم کی بھٹی بنا ہوا تھا، وہ بے قراری کے ساتھ سارے

لشکر کا جگر کاٹ رہا تھا اور جب وہ مرہٹوں کا کوئی کمزور پہلو دیکھتا، تو اُس کے تن بدن میں آگ لگ جاتی۔

وہ دانت پیسنے لگتا ——!

ہونٹ چبانے لگتا ——!

انگلیاں کاٹنے لگتا ——!

اور بڑی تیزی کے ساتھ، اپنے توپ خانے کی طرف لوٹ آتا!

یہاں جس توپچی کو ذرا اپنے کام سے غافل دیکھتا اُس پر برس پڑتا۔ "نمک حرام کچھ تو آقا کے نمک کا پاس کرو دشمن کو دیکھو کس بے جگری اور بہادری سے لڑ رہا ہے، اور تم سست رہے ہو؟ یہ نہیں جانتے کہ تمہاری ذراسی غفلت پوری مرہٹہ قوم کو تباہ کر دے گی!"

اور پھر وہ ایک ولولۂ تازہ کے ساتھ اپنے توپچیوں کی ہمت بڑھاتا۔ "شاباش نوجوانو، مرہٹہ لشکر کی زندگی تمہارے ہی دم سے قائم ہے، تم ہندوستان کی تکتی ہو، تمہارے کارنامے تاریخ کبھی فراموش نہیں کر سکتی، ذرا سوچو —— دوستو، اور ساتھیو، وطن کی لاج قوم کی عزت مرہٹہ حکومت کی بقا، سب کچھ تمہارے ہاتھ میں ہے —— ہاں میرے ساتھیو! دیکھو ہمت میں کمی نہ آنے پائے، تھکنے کا نام نہ لو، کام کئے جاؤ، تمہاری توپیں ایک لمحہ کے لئے بھی بند نہ ہوں، یہ آگ اگلتی رہیں، تاکہ دشمن کا ایک فرد بھی بچکر اِس میدان سے نہ جا سکے۔ شاباش، دیکھو، دیکھو دشمن اپنی جانوں سے بیزار ہو کر آندھی اور طوفان کی طرح بڑھ رہا ہے، تم اِس کے رستے میں انگارے بچھا دو، اس کے سینے گولوں سے چھلنی کر دو تمہاری یہ محنت رائگاں نہ جائے گی، اِس لشکر کا سارا ساز و سامان صرف تمہارا ہے، اِس لشکر کے تمام غلام اور لونڈیاں صرف تمہارا حصّہ ہیں، اِس لشکر کی تمام چاندی سونا

سونا، ہیرے، جواہرات، احمد شاہ، شجاع الدولہ، احمد خاں بنگش، رحمت خاں، یہ سب بڑی مالدار آسامیاں ہیں۔ ان کے پاس ہیرے جواہرات کے انبار لگے ہیں، یہ سارے ہیرے، سارے جواہرات، سب کچھ صرف تمہاری جھولی میں پڑے گا۔ شاباش، شاباش، دیکھو، دشمن زندہ بچ کر نہ نکلنے پائے، تمہاری آج کی بہادری قسمت کا فیصلہ کر دے گی ——— تمہاری قسمت کا، تمہارے دیس کی قسمت کا، تمہاری قوم کی قسمت کا!"

گاردی کے یہ الفاظ آگ پر تیل کا کام کرتے، اس کے توپچی اور زیادہ جوش و خروش کے ساتھ اپنے کام میں مصروف ہو جاتے، ان کی توپوں سے انگارے برسنے لگتے، اور اس کا دل کنول کی طرح کھل جاتا!

گاردی کے بس میں نہ تھا، ورنہ وہ مرہٹہ فوج کے ہر سپاہی کے ہاتھ میں بندوق اور تلوار کے بجائے ایک ایک توپخانہ تھما دیتا!

○

نواب نجیب الدولہ کے مورچے کی یہ کیفیت تھی کہ اس پر جھاجی سندھیا اور ملہار راؤ ہلکر دونوں نے مل کر حملہ کیا تھا مگر نجیب الدولہ کی فوج نے بڑے استقلال و پامردی کے ساتھ مقابلہ کر کے ملہار راؤ ہلکر کو تو شروع ہی لڑائی میں بھگا دیا اور جھاجی سندھیا بھی بعد جنگ و پیکار بسیار راہ فرار اختیار کرنے پر مجبور ہوا۔ نواب نجیب الدولہ دست بہ شمشیر ہو کر اور خدا پر بھروسہ کر کے مع اپنے جاں نثار وفاداروں کے مرہٹوں کی فوج پر جا پڑے، بھاؤ اور وسواس راؤ نے اس جانب شکست ہوتی دیکھ کر بیس ہزار تازہ دم فوج کو حملہ کرنے کا حکم دیا، اس وقت نواب نجیب الدولہ اور ان کی فوج نے سینہ سپر ہو کر خوب حق مردانگی ادا کیا، تمام میدان اور زمین و آسمان تاریک نظر آتے تھے، خاک ہوا میں اس قدر

اُڑتی تھی کہ آفتاب نظروں سے غائب تھا۔ زمین پر خون کے ندی نالے بہہ رہے تھے، گویا غبارِ ابرِ خونبار تھا، جس میں تلوار مثل بجلی کے چمک رہی تھی۔ بڑے کشت و خون کے بعد مرہٹوں کو شکست ہوئی اور نجیب آباد کے پٹھانوں نے دس کوس تک ان کا تعاقب[1] کیا۔

حاجی عطائی خاں اور شاہ پسند خاں کی ولایتی فوج نے بھی جس نے اپنے سرداروں کے مارے جانے سے میدان نہیں چھوڑا تھا، جوشِ انتقام میں لشکرِ مرہٹہ کے خیموں میں آگ لگادی اور ڈیروں کو تاخت و تاراج کر دیا، بھاؤ وغیرہ بڑے بڑے سرداران مرہٹہ اپنے ڈیرے خیموں کی تاخت و تاراج کی خبر سُنکر سراسیمہ و مضطرب ہو گئے، وہ ابھی اسی فکر میں تھے کہ شاہ درّانی نے اپنے غلاموں کے ایک دستے کو حکم دیا کہ سرداران مرہٹہ جو ایک جگہ کھڑے ہوئے کمکی فوجیں بھیجنے کی تجویزیں کر رہے ہیں، ان پر ایک فیر بندوقوں کا کریں اس کے بعد تلواریں نکال کر دشمن کو قتل کرنا شروع کر دیں، غلاموں کا دستہ حسب الحکم حملہ کر کے گھس گیا اور جہاں بھاؤ، وسواس راؤ، رگھوناتھ راؤ، شمشیر بہادر اور جنکو وغیرہ بکثرت سرداران مرہٹہ کھڑے ہوئے تھے پہنچکر بندوقیں چھوڑ دیں، بتائیدِ الٰہی و اقبالِ شاہی مرہٹوں کے قریب قریب تمام نامور سردار مع بھاؤ ہدفِ تیرِ تقدیر بن گئے اور ہاتھیوں کے ہودوں میں بندوقوں سے گولیاں کھا کھا کر گر گئے[2]۔

---

[1] تاریخ نجیب آباد، مؤلفہ مولانا اکبر شاہ خاں

[2] تاریخ افغانستان موسوم بہ نقشِ سلیمانی کے مؤلف لکھتے ہیں کہ بھاؤ کا قتل عنایت خاں کے ہاتھ سے ہوا، چنانچہ ان کی تحریر ہے۔

"عنایت خاں نے اسی دار و گیر میں بعد جنگ و جدال بسیار اپنے آپ کو اس گروہ میں کہ جس کا بھاؤ افسر تھا۔ قریب اس کے پہنچایا۔ بھاؤ نے اول نیزہ عنایت خاں پر مارا۔ عنایت خاں نے ازراہِ چالاکی و چستی اپنے آپکو نیزے کی انی سے بچا کر برچھا اسکا

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

اس وقت ایک طرف سے فوج درانی شمشیر بکف مرہٹوں کے قتل پر پل پڑی اور دوسری طرف افغانانِ روہیلکھنڈ جو ملک کے منتظر تھے۔ فوج شاہی کے ہمراہ دشمنوں کے قتل میں مصروف ہوگئے کشتوں کے پشتے لگ گئے اور مرہٹہ فوج اپنے سرداروں کے قتل ہونے سے حیران و پریشان ہو کر میدانِ جنگ سے منہ موڑ کر مائل فرار ہوگئی، اس کو مشاہدہ کر کے احمد شاہ درانی نے حکم دیا کہ سرزمین کا دلی تک تعاقب کیا جائے اور جس مرہٹہ کو جہاں پائیں قتل کریں اسی اثنا میں حافظ الملک بھی پالکی میں سوار ہو کر میدانِ جنگ میں تشریف لائے اور عنایت خاں اور فیض اللہ خاں وغیرہ سردارانِ روہیل کھنڈ کو بخیریت و سلامت پا کر نہایت مسرور و محظوظ ہوئے عنایت خاں کا یہ حال تھا کہ زخموں سے چور تھے لیکن تلوار ہاتھ میں تھی کیونکہ کثرتِ شمشیر زنی سے ہاتھ ورم کر گیا تھا، اور اس میں اس قدر خون جم گیا تھا کہ تلوار کا قبضہ چپک کر رہ گیا تھا[1] ولایتی فوج اور سارے ہندوستانی سپاہ مرہٹوں کا تعاقب کرتی ہوئی دہلی تک گئی جو وہاں سے تین دن کی راہ پر تھی۔ میدانِ پانی پت میں اور اس تین روز کے عرصہ میں دو لاکھ سے زاید مرہٹے مارے گئے، باقی زخمی ہوئے اور کُل لشکر میں سے صرف ایک چوتھائی جان بچا کر بھاگ سکے[2] جو وہیں

بقوت تمام ہاتھ سے پکڑ کر ایسا جھٹکا دیا کہ جا و پشت اسپ سے اکھڑ کر زمین پر گرا ہے

ز شمشیر عنایت خاں راں ہنگ — اجل گفتا سر بجا و تماش

عنایت خاں نے چابکدستی سے راس کا کاٹ کر اور پل فتح بجوا کر سعادت کی۔ ذاں بعد

عنایت خاں نے حاضر ہو کر سر بجاؤ احمد شاہ درانی کی پیش کش کیا۔"

[1] عنایت خاں مشہور ہیں کہ ان کے ہاتھ اس قدر لانبے تھے کہ گھٹنوں سے بھی نیچے تھے جس کے باعث تلوار چلانے میں وہ اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔

[2] ہسٹری آف دی مرہٹاز۔ گرانٹ ڈف۔ پانی پت کی یہ لڑائی مہابھارت کے بعد سب سے بڑی لڑائی خیال کی جاتی ہے۔

سوار بہ ہزار خرابی اپنی جان بچا سکے۔ ان میں ملہار راؤ ہلکر اور مہاراجی سندھیا بھی شامل تھے۔ ملہار راؤ سابقہ احسانات کی وجہ سے نجیب الدولہ کی چشم پوشی سے بچ گیا۔ سندھیا پر یہ واقعہ گذرا کہ ایک ولایتی سوار نے ساٹھ کوس تک اس کا تعاقب کر کے پاؤں میں گولی کی ضرب ماری۔ جب وہ زخمی ہو کر گھوڑے سے گرا تو صرف اس کا ساز و سامان لے لیا۔ جان سے نہیں مارا۔ لڑائی کے بعد تمام سردار ان افغان کو جھنکو کی بہت تلاش تھی کہ مارا گیا، یا فرار ہوا۔ جھنکو کا یہ حشر ہوا کہ عام بھاگڑ میں وہ بھی ایک تیز رو گھوڑے پر تنہا بھاگا ہوا جا رہا تھا کہ اس کے زیورات طلائی اور اس کی جواہرات سے جڑی ہوئی تاج نما کلاہ پر ہمراہیان عنایت خاں میں سے ایک افغان کی نظر پڑی۔ کلاہ کی لالچ میں فوراً اپنا گھوڑا جھنکو کے پیچھے ڈال دیا۔ جھنکو نے جو دیکھا کہ سوار برارادۂ قتل تعاقب کئے چلا آتا ہے، بخوفِ جان اپنے گھوڑے کو اور تیز کر دیا۔ لیکن سوار کو طمع کلاہ نے باز نہ رکھا، پیچھا ہی کئے چلا گیا۔ تیس کوس پر جا کر افغان بلائے ناگہاں اور قابض ارواح کی طرح جھنکو کے سر پر نازل ہو گیا۔ پہلے ایک ہاتھ تلوار کا مارا تو اس سے جھنکو کے گھوڑے کی گردن کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ جس کی وجہ سے جھنکو زمین پر گر پڑا، دوسرے ہاتھ میں افغان نے جھنکو کا سر کاٹ لیا، اور کلاہ و زیور وغیرہ کے ساتھ سر کو لے کر شاد کام اپنے لشکر کی طرف واپس آیا۔ قریب کرنال پہنچا تو کلاہ کو گوبر کے ایک ڈھیر میں چھپا کر جھنکو کے سر کو عنایت خاں کے رُو برُو لا کر پیش کر دیا۔ عنایت خاں نے کہا:-

"خان! جھنکو کا سر تم کاٹ لائے اور اس کی کلاہ کون لے گیا؟"

چونکہ یہ لوگ راستبازی میں مشہور تھے۔ افغان نے کہا۔

"اُس کی کلاہ ہم نے گوبر میں چھپا دیا ہے، وہ بہت اچھی ہے، آپ لے لیگا۔ ہمیں نہیں دے گا!"

عنایت خاں نے کہا: "نہیں تم کلاہ لے آؤ۔ ہم تمہیں بہت سی اشرفیاں دیں گے۔" افغان جلد واپس گیا اور کلاہ لاکر پانچسو اشرفیوں کے عوض عنایت خاں کے حوالہ کر دی اُسی روز عنایت خاں نے جنکو کا سر شاہ درّانی کو نذر کیا جس کو دیکھ کر بادشاہ بہت خوش ہوئے اور عنایت خاں کی پیٹھ ٹھونک کر فرمایا کہ

"ایں فتح بنام تو نہادم مبارکباد
آفریں بر تو رحمت خدا بر پدر تو"

شاہ درّانی کے حکم سے مرہٹوں کا لشکر لوٹا گیا تو سوا کھانے کے سامان کے ہر قسم کا اسباب موجود تھا خیمے اور بازار ہر طرح کے مال سے بھرے ہوئے تھے سیر المتاخرین میں مرقوم ہے کہ جواہرات نقود و جنس اور توپخانہ کے علاوہ اِس معرکہ میں افغانوں کو دو لاکھ بیل، کئی ہزار اُونٹ، پانچسو ہاتھی اور پچاس ہزار گھوڑے ہاتھ لگے۔ جامِ جہاں نما میں لکھا ہے کہ میدانِ جنگ کے بھاگے ہوئے مرہٹے ایسے مفلوک الحال تھے کہ ان میں سے بیس ہزار مدت تک برہنہ بھیک مانگتے پھرے، آخرکار سورج مل جاٹ نے ایک ایک کمبل اور دو دو روپے دے کر دکن کو روانہ کیا۔ دوسرے راجپوت سرداروں نے بھی یہی سلوک کیا، اور بارہ ہزار مرہٹوں کو شجاع الدولہ نے دو دو روپے دلا دیئے جو کاپی کی طرف چلے گئے۔

مرہٹوں کو ایسی بھاری شکست کبھی پیش نہ آئی تھی۔ اِس شکست کی ملک کے طول و عرض میں شہرت ہو گئی، تمام مرہٹہ قوم میں گھر گھر صفِ ماتم بچھ گئی، اور عالمِ مایوسی چھا گئی،

---

[1] تاریخ سلیمانی

بالاجی بیشوا بھی اس صدمے سے چند روز کے بعد مر گیا، اور اس کی موت کے ساتھ مرہٹوں کا آفتابِ اقبال بھی ہمیشہ کے لئے غروب ہو گیا، برعکس اس کے احمد شاہ درّانی کو ایسی عظیم فتح حاصل ہوئی کہ جس کو عظیم ترین فتوحات میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ اِس فتح کی غلام علی آزاد نے یہ تاریخ نظم کی ہے۔

شاہ بھاؤ را پس از تا بگشت
کرد در آغاز در انجام فتح
صورنائی خامہ تاریخش نواخت
شاہِ درّانی مژدہ باز فتح!

یہ جنگ عظیم ۶ر جنوری ۱۷۶۱ء مطابق ۶ر جمادی الآخر ۱۱۷۴ھ کو بدھ کے دن واقع ہوئی تھی ایک ہندی تاریخ کہنے والے نے بھی حسب ذیل تاریخ کہی ہے۔

گیارہ چوہتر میں دن بدھ پڑا جو جھارہ
چھٹی جمادی الثانی کو شہ جیتا بھاؤ ہارا[1]

○

اِس فتح نے مسلمانوں میں ایک نئی زندگی پیدا کر دی۔ انھیں ایک نئے ولولے سے دوچار کر دیا۔ یہ بہت بڑا معرکہ تھا، جسے انھوں نے سر کیا تھا۔ مسلمانوں کی اِس کامیابی نے مرہٹوں کو ایسی شکست دی تھی کہ وہ زندہ درگور ہو گئے، ان کا سارا غرور ختم ہو گیا کہاں تو وہ سارے ہندوستان پر بادشاہت کے خواب دیکھ رہے تھے، کہاں دانہ دانہ کو محتاج ہو گئے، ان کے پاس محرومی اور مایوس زندگی کے سوا کچھ نہ رہ گیا۔

---

[1] حیات حافظ رحمت خاں۔

ابدالی اپنے خیمہ میں سر جھکائے خاموش بیٹھا تھا، اُس نے نجیب الدولہ سے کہا، ۔

"میرے وہ سورما، اسلام کے وہ مجاہد، غازی' اور شہید کہاں ہیں جنھوں نے اپنے دین' اپنے مذہب اور اپنی قوم پر سب کچھ' حتیٰ کہ اپنی زندگی تک قربان کردی! ــــ میں انھیں آخری بار دیکھنا چاہتا ہوں ــــ اُن غازیوں کو، اسلام کے فداکاروں کو!"

نجیب الدولہ نے گلوگیر آواز میں سامنے کی طرف اشارہ کیا، اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

ابدالی نے نظر اٹھائی تو دیکھا، تین جنازے سفید کفن میں ملبوس رحمت خاں اور دوسرے سردار اپنے کاندھوں پر رکھے' اسی طرف آرہے ہیں ــــ ابدالی کی آنکھیں آنگوں ہو گئیں!

باب (۶۱)

ہونہار بروا

غضنفر کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی بندوق ہے، اور وہ ماہ طلعت کے کمرے میں ایک سپاہی کی شان سے ٹہل رہا ہے، ماہ نے محبت بھری نظروں سے اپنے بچّہ کو دیکھا اور کہا :-

"بیٹھ جاؤ بیٹے تھک جاؤ گے!"

وہ بے پروائی سے بولا "نہیں تھکوں گا ——!"

ماہ نے مسکراتے ہوئے پوچھا "اپنی اس بندوق سے تم نے کتنے مرہٹے مارے؟"

وہ مسکرا کر بڑی شان سے بولا "سب مرہٹوں کو مار ڈالا"

ماہ ہنسنے لگی، اتنے میں صنوبر آئی، ماہ نے اُس سے کہا "اور سُنا کچھ؟"

صنوبر نے پوچھا "کوئی خاص بات؟"

ماہ طلعت "ہاں غضنفر میاں نے اپنی ننھی سی بندوق سے تمام مرہٹوں کو مار ڈالا!"

صنوبر ہنسنے لگی —— پھر اُس نے پوچھا، رات شہر میں گولے دغ رہے تھے —— آپ نے نہیں سُنے؟"

"بتاؤ کیا ہوا؟"

آصف زماں :- فیروز ——— ہائے وہ شہید ہوگیا!

سارے گھر میں کہرام مچ گیا، نوکر چاکر، عزیز اقارب، دوست دشمن سب کی آنکھوں سے آنسوؤں کی بارش ہو رہی تھی۔

لیکن ماں کی حالت سب سے جدا تھی!

اُس کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا، لیکن اس کی آنکھوں میں آنسو کا ایک قطرہ بھی نہیں تھا اُس نے بے کسی سے ادھر اُدھر دیکھ کر، اور سینہ پر ہاتھ رکھ کر آصف زماں سے کہا۔

"کیا یہ سچ ہے؟"

اور پھر بے ہوش ہو کر گر پڑی۔

فیروز بخت کی شہادت کا سانحہ ایسا نہ تھا کہ چھپا رہتا، جبکہ فوجی اعزاز کے ساتھ اُس کی لاش بھی وطن کے سرفروش سپاہیوں اور ملت کے جانباز مجاہدوں کے کاندھوں پر آئی تھی، لاش پہلے فیروز بخت کی ڈیوڑھی پر گئی اور وہاں سے خانقاہ ولی اللٰہی کی طرف، عطائی خاں اور شاہ پسند خاں کی لاشیں پہلے سے وہاں پہنچ چکی تھیں ——— سارا شہر جنازوں کے ساتھ خانقاہ کی طرف بڑھ رہا تھا، یہ معلوم ہوتا کسی بادشاہ کا جلوس نکل رہا ہے۔

حضرت شاہ صاحب نے نمازِ جنازہ پڑھائی، اور وہیں خانقاہ کے ایک گوشہ میں دفن کر دیا گیا۔ ہمیشہ کے لئے! ——— اس کے ساتھ اس کے دو بہادر رفیق تھے... عطائی خاں اور شاہ پسند خاں!

نجیب الدولہ بھی نمازِ جنازہ میں شریک تھا، اُس کی داڑھی آنسوؤں سے بھیگ

چکی تھی، وہ بات کرنا چاہتا تھا، لیکن گریہ گلوگیر ہوجاتا تھا، اُس نے حضرت شاہ صاحب سے کہا۔ "مرد ہو تو ایسا، اپنی زندگی سے بے پروا ہو کر دشمن کی صف پر بجلی کی طرح گرتا تھا، ایک ایک وار میں کئی کئی کافروں کو تہ تیغ کر دیا تھا، شہادت کے بعد جب اُس کی لاش آئی تو میں نے خود گنا ۱۶ زخم تھے اس کے شانہ وگلو اور دست و بازو پر!"

حضرت شاہ صاحب نے ایک تاثر کے عالم میں فرمایا۔ "وہ مردِ مجاہد تھا، وہ شہادت کی عظمت سے فیضیاب ہوا۔ اس کی عارضی اور فانی زندگی ختم ہوگئی اُس نے وہ زندگی پائی جسے کبھی فنا نہیں ہے، اُس نے وہ مقام حاصل کر لیا جو صرف خوش قسمتوں کو حاصل ہوتا ہے، وہ ہم سب سے بازی لے گیا!"

نجیب الدولہ نے روتے روتے کہا۔ سچ فرمایا حضور نے، واقعی وہ ایسا ہی تھا ہم سب پیچھے رہ گئے اور وہ ہم سے کہیں آگے نکل گیا ——— لیکن یہ سوچتا ہوں کہ اس کی نوجوان بیوی اور ننھے بچے کا کیا حشر ہوا ہوگا۔ یہ خبر سن کر تو کلیجہ منہ کو آنے لگتا ہے!"

حضرت شاہ صاحب نے فرمایا: "اس کی بیوی بھی بڑے کردار کی خاتون ہے۔ کوئی شبہ نہیں یہ بہت بڑا سانحہ ہے، مگر وہ مردانہ وار اسے جھیل لے گی، وہ خدا کو پہچانتی ہے، مذہب کو مانتی ہے، قرآن پڑھتی ہے، ضرور خدا اُسے صبر دے گا!"

نجیب الدولہ۔ "شاہ ابدالی کے بڑے دلاور اور چہیتے سردار عطائی خاں اور شاہ پسند خاں بھی اِس جنگ میں شہید ہوئے، جب ان کی خبر ملی تو وہ اناللہ پڑھ کر خاموش ہو گئے۔ جب فیروز بخت کی خبر آئی تو بے ساختہ رونے لگے۔ ان کے دِل پر بھی اِس واقعہ کا بے حد اثر ہے!"

حضرت شاہ صاحب۔ "ہونا ہی چاہئے ابدالی کا دل مردِ مسلمان کا دِل ہے، اور

ہاں وہ فیروز بخت کا ساتھی — کیا نام تھا اُس کا؟

نجیب الدولہ۔ "جبونت —؟"

حضرت شاہ صاحب۔ "ہاں وہی!"

نجیب الدولہ۔ "وہ بھی بڑی بہادری سے لڑا، ایسے ایسے موقعوں پر پہنچا، جہاں بڑے بڑوں کا پہنچتے ہوئے پتہ پانی ہوتا تھا، فیروز بخت کی شہادت کے بعد ایک مرتبہ جوش میں آکر جو وہ بڑھا، تو گاردی کی آتش باری کی زد میں آگیا، توپ کا گولہ عین اس کے سینہ پر پڑا، اور اُس کی لاش اس طرح ٹکڑے ٹکڑے ہوئی کہ اس کا پہچاننا ناممکن ہوگیا۔ پتہ لگانا دشوار ہوگیا، کہ کہاں گری؟ کدھر گری؟ اس کے اعضائے بدن کے ٹکڑے ٹکڑے ہوکر فضا میں بکھرے اور پھر اُن کا پتہ نہ چل سکا!"

حضرت شاہ صاحب۔ "انا للہ وانا الیہ راجعون!"

نجیب الدولہ۔ "یا حضرت یہ کیا؟ — وہ تو کافر تھا!"

حضرت شاہ صاحب۔ "نہیں اُسے کافر نہ کہو، اس کے اسلام کی میں گواہی دیتا ہوں۔"

باب (۶۲)

تعزیت ——— تحفہ

دوسرے روز لال قلعہ کے دربارِ عام میں غازی احمد شاہ ابدالی نے ایک زبردست تقریر کی فرمایا:

• خدا نے بہت بڑے خطرے سے مسلمانانِ ہند کو نجات دی، خدا نے بہت بڑے شر سے ہندوستان کے باشندوں کو بچالیا، خدا نے بہت بڑا کام اپنے ایک حقیر بندہ سے لیا۔

یہ اس کی دین ہے جسے پروردگار دے!

مرہٹوں کے استیصال کے بعد ہندوستان کے مسلمان اور ہندو رئیسوں میں سے اکثر نے اصرار کیا کہ اس ملک کی بادشاہت قبول کر لوں۔ ممکن تھا، اس دعوت کو قبول کر لیتا۔ لیکن میں نے نہایت خوشی کے ساتھ اس دعوت کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ میں خدا کے حضور میں طامع بن کر نہیں پہنچنا چاہتا؛ مانع بن کر حاضر ہونا چاہتا ہوں، وہ چھوٹی سی مملکت جو خدا نے مجھے مرحمت فرمائی ہے میرے لئے کافی ہے۔ میں یہاں جہاد کی نیت سے آیا تھا، اپنے جہاد کا ثواب یہاں کی بادشاہت قبول کر کے ضائع کرنا نہیں

چاہتا۔ میں واضح الفاظ میں اعلان کرتا ہوں کہ مجھے اِس دیس کی بادشاہت نہیں چاہیے۔ اِس ملک میں صدہا سال سے مغل خاندان حکومت کرتا چلا آرہا ہے، یہ اسی کا حق ہے۔ میں غاصب بننا نہیں چاہتا۔ میں کسی کا حق مارنا نہیں چاہتا۔ میری تمنّا اور دُعا ہے کہ یہ خاندان پھلے پھولے اور وہی مقام حاصل کرے جو اسے کبھی حاصل تھا!

ہندوستان کی طرف یہ میرا تیسرا پھیرا ہے۔ میں یہاں بار بار نہیں آسکتا۔ لہٰذا میں چاہتا ہوں کہ اپنے سامنے کچھ ایسے انتظامات کرتا جاؤں کہ یہاں کی حکومت مضبوط اور مستحکم بنیادوں پر قائم ہو جائے، اور وہ افراتفری نہ پیدا ہو جو گذشتہ کچھ عرصہ سے تباہ کن ثابت ہو رہی ہے۔

میں نجیب الدولہ کو وزارتِ عظمٰی کا منصب سونپتا ہوں، اور مجھے امید ہے کہ وہ اپنے بادشاہ ذی جاہ کا وفادار خادم ثابت ہوگا!"

جو لوگ یہ خیال کئے ہوئے تھے کہ اب احمد شاہ مُغل خاندان کو معزول کر کے اپنی بادشاہت کا اعلان کر دے گا، انھیں بڑی مایوسی ہوئی۔ لیکن جو لوگ احمد شاہ کی مقبولیت، اصول پرستی، اور دیانت سے واقف تھے، انھوں نے مسرت اور اطمینان کے ساتھ یہ الفاظ سُنے!

○

چند روز قیام کرنے کے بعد احمد شاہ نے کابل روانہ ہونے کی تیاریاں شروع کر دیں، چلتے وقت اُس نے نجیب الدّولہ سے کہا۔

"ہم فیروز بخت کے گھر جانا چاہتے ہیں!"

نجیب الدولہ۔ "جہاں پناہ یہ زحمت کیوں گوارہ فرمائیں گے؟"

شاہ ابدالی:- "ہم بنفسِ نفیس اس کے گھر جا کر اس کی غمزدہ بیوی سے تعزیت کرنا چاہتے ہیں ہمارے دل پر اس کی شہادت کا بڑا گہرا اثر ہے۔ وہ بڑا مخلص اور جاں باز مسلمان تھا اگر وہ زندہ رہتا تو ممکن ہے امیر الامراء اور وزیرِ اعظم کے منصب پر تمہارے بجائے میں اسی کو فائز کرتا۔"

نجیب الدولہ:- "اور حقیقت یہ ہے کہ وہ مجھ سے زیادہ اس منصب کا اہل بھی تھا!"

اس گفتگو کے بعد وہ اپنے چیدہ سرداروں کے ساتھ نجیب الدولہ کی معیت میں ماہ طلعت کے غم خانہ پر آیا، آصف زماں کو اُس نے وسیلہ بنایا اور مناسب الفاظ میں پیامِ تعزیت ماہ طلعت کی خدمت میں بھجوا دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد آصف زماں آیا... اُس نے موزوں الفاظ میں ماہ طلعت کی طرف سے شکر و سپاس کے جذبات کا اظہار کیا، پھر اُس نے غضنفر کو اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا:-

"یہ فرزندِ بخت کا بچہ ہے!"

احمد شاہ کی آنکھیں پُرنم ہو گئیں، اُس نے اسے اپنی گود میں بٹھا لیا اور پیار کیا۔

آصف زماں نے کہا:- "اس کی ماں نے کہا ہے:-

اپنی یہ آخری پونجی آپ کو نذر کرتی ہوں، میری دلی تمنا ہے کہ یہ بچہ بھی اپنے باپ کی طرح سپاہی بنے، اور اسلام کے راستے میں شہید ہو!"

احمد شاہ ابدالی یہ الفاظ سُن کر رونے لگا، اُس نے کہا:- "خدائے واحد و قدوس کی قسم، جس قوم میں ایسی جواں ہمت اور ایثار پسند عورتیں ہوں وہ کبھی فنا نہیں ہو سکتی اسے کوئی طاقت تباہ نہیں کر سکتی!"

پھر وہ نجیب الدولہ کی طرف مخاطب ہوا:-

• یہ غضنفر آج سے میرا بیٹا ہے، اگر یہ بڑا ہوتا تو ضرور اسے اپنے ساتھ لے جاتا، اسے تمہاری تحویل میں دیتا ہوں، اس کی تعلیم و تربیت کے تم ذمہ دار ہو، اس میں وُہی صلاحیتیں پیدا کرو وُجو فیروز بخت میں تھیں، جس طرح یہ صورت میں باپ کی تصویر ہے۔ اسی طرح سیرت میں بھی اسے ویسا ہی بنا دو!"

نجیب الدولہ نے سر جُھکا کر عرض کیا۔ "ایسا ہی ہوگا!"

اور پھر احمد شاہ بصد جاہ و تجمّل اپنے وطنِ مالوف کی طرف روانہ ہوگیا — اور نجیب الدولہ تاحیات، خود بڑی نیک نامی کے ساتھ اپنے منصب کی خدمات انجام دیتا رہا[1]۔

احمد شاہ ابدالی چلا گیا اور مرہٹوں کی کمر ہمیشہ کے لئے توڑ گیا۔

N(2687)
1-9-90

[1] گزیٹیر ضلع بجنور مطبوعہ ۱۹۰۸ء

کتبہٗ اصغر حسین انیس رقم، دسمبر ۱۹۵۸ء